پردہ اور تعدّدِ ازدواج

مسلمانوں کے معاشرے کی زبوں حالی کا سائنٹفک تجزیہ

از

مظہر الحق خان

یکے از مطبوعات ناشرانِ علم و ترقیت

پردہ اور تعدّدِ ازواج

ملنے کا پتہ :

پیپلز پبلشنگ ہاؤس

۲۶۔ شاہراہ قائد اعظم لاہور

بار اول : دسمبر ۱۹۷۵ء

مطبع : الکتاب پرنٹرز لاہور

ناشر : مظہر الحق خان، علم و ترقیت
گل روڈ، گوجرانوالہ

پردہ اور تعدّدِ ازدواج

مسلمانوں کی پردہ سوسائٹی کے مُعاشری
تخریب و زوال کا ایک سائنٹفک تجزیہ

از

مظہر الحق خان

علم و ترقیت

گل روڈ، گوجرانوالہ

اندراجات

مسلمانوں کے معاشرے

کی زبوں حالی کا ایک

سائنٹفک تجزیہ

مقدمہ

گذشتہ ایک ڈیڑھ سو سال سے مسلمانوں کے ذہن و فکر میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ مسلمان قومیں، ملک اور معاشرے کیوں صدیوں سے انحطاط و جمود اور زوال و سقوط اور بعض اوقات تباہی و بربادی کا شکار ہوتے ہیں؟ جواب میں کئی وجوہات پیش کی جاتی ہیں، مگر کوئی جواب بھی ایسا پیش نہیں کیا جو بااصول اور باقاعدہ تجزیہ اور سائینٹفک استدلال کی بنا پر ان حالات اور واقعات کی صحیح اور حقیقی توجیہ کرے۔ میں نے اس کتاب میں ان معاشری محرکات اور عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے جو انسانی زندگی اور معاشرے میں کام، عمل اور تکمیل کو مخرب اور مفلوج کرتے ہیں، مسلمان معاشرے میں پردہ اور تعدد ازدواجگی کے اداروں، اور طرز معاشرت اور آئیڈیالوجی کو انحطاط و انتشار، جمود و زوال کا باعث قرار دیا ہے۔ اس نظرئے کے بارے میں رائے کا اختلاف ہو سکتا ہے، میں ہی پہلا شخص نہیں جس نے ان اداروں کو مسلمانوں کی زندگی اور معاشرے اور تاریخ میں ان خرابیوں اور نتائج کا ذمہ دار قرار دیا ہو۔

بیشک، پردہ، تعدد ازدواجگی اور خاندان اور معاشرے میں عورت کا مقام اور رول ایسے مسائل ہیں جو گہرے جذبات اور مضبوط روایات کے حامل ہوتے ہیں مگر میں ان کا تجزیہ اور مطالعہ مناظرانہ یا غیر ذمہ دارانہ موڈ یا مقصد کے لئے نہیں کیا ہے۔ بلکہ حق و صداقت کی تلاش میں مسلمان معاشرہ اور قوتوں کی ترقی، خوشحالی، استحکام فلاح و بہبود اور بقاء و سلامتی کے مقاصد کے لئے خالصتاً سائینسی اور منطقی اصولوں کی روشنی میں اس نظرئے کو پیش کیا ہے کہ یہ ادارے اور ان کی آئیڈیالوجی مسلمانوں کے کردار اور شخصیت اور معاشرت و معیشت کو انحطاط پذیر اور جمود زدہ کرتے ہیں جو بالآخر ان کے زوال اور تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ اگر میرا تجزیہ درست ہے تو پردہ اور تعدد ازدواجگی کے مسائل تمام مسلمان لوگوں اور قوموں کے ہر فرد و بشر

اور مرد اور عورت کے مسائل بن جاتے ہیں۔

مسلم معاشرہ اس وقت سے جب اس میں پردہ اور تعدد ازدواجگی کا آغاز ہوا آج تک ایک عجیب وغریب مخمصے میں مبتلا ہے: وہ ہے حقیقت سے روگردانی اور بے مقصد منفیت کی جانب میلانِ طبع۔ اس انحراف کی وجہ ہمارے معاشرے میں قرابتدارانہ نظام زندگی ہے جو پردہ اور تعدد ازدواجگی کے اداروں کی بنا پر قائم ہے۔ مسلمانوں کا یہ عام رجحان ہے کہ جو چیز معاشرتاً ضروری ہے اس کو نہ کریں اور جو معاشرتاً غیر ضروری ہے اس کو کریں۔ اس لئے مسلم معاشرہ اپنی معاشریات، اقتصادیات، سیاسیات اور تاریخ میں ہمیشہ مائل بہ جمود و تنزل رہا ہے۔ زندگی کے حقائق سے روگردانی کے رجحان کی ابتدا اس منفی اور غیر فعال ماحول اور حالات میں ہوتی ہے جو قرابتدارانہ نظام اور اس کے ان دونوں اداروں نے ہمارے گھروں، خاندانی زندگی اور معاشرے میں پیدا کر دیئے ہیں تاہم یہ ماحول اور حالات بدلے بھی جاسکتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ ہم اپنی غیر فعال اور بے عمل زندگی کے اسباب سے آگاہی پیدا کرلیں تو فعال اور مثبت تکمیلات لازماً شروع ہو جائیں گی۔

اس کتاب میں میں نے بارہا پردے اور تعدد ازدواجگی اور ان کی آئیڈیالوجی کے حامیوں کے خیالات، نظریات اور رایوں کی تنقید کی ہے، خاص کر ان علماء پر جو ان اداروں پر انحصار کی متصور ہوتے ہیں۔ میں نے اُن کی رایوں اور نظریات کا تجزیہ کیا اور ان کے خیالات اور دلائل کو غلط اور گمراہ کن ثابت کیا ہے۔ لیکن میں نے مناظرہ بازی یا بحث برائے بحث سے احتراز کیا ہے۔ کیونکہ میں حامیانِ پردہ و تعدد ازدواجگی کی آزادیٔ رائے کا احترام کرتا ہوں۔ مگر اس سے زیادہ ہماری قوم، مذہب اور کل مسلمانانِ عالم کی فلاح و بہبود اور ترقی اور خوشحالی، بقا و سلامتی کو مقدم اور قابلِ احترام تصور کرتا ہوں اور ان سب سے زیادہ حق و صداقت کی تلاش کو۔ بحیثیت ایک محقق کے، میں نے حق و صداقت کا معیار اور اصول مسلمانوں کی معاشری زندگی اور تاریخ کے حقائق میں تلاش کیا ہے۔ لہٰذا اگر میرے اخذ کردہ نظریات

اور نتائج کی تکذیب یا تردید منظور ہو، تو خالی خولی اعتراض سے نہیں، بلکہ ان حقائق کی بنا پر کی جاسکتی ہے جو پردہ اور تعدد ازدواجگی کی وجہ سے مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی معاشری نظام اور تاریخ میں ایسے نفسیاتی، کرداری اور معاشری محرکات اور عوامل کی صورت میں پائے جاتے ہیں اور بالآخر ان معاشری رجحانات اور قوانین کو جنم دیتے ہیں جو مسلمان معاشروں اور قوموں اور تہذیب تمدن میں انتشار انحطاط اور جمود و زوال کا باعث ہوتے ہیں۔

مظہر الحق خان

مورخہ یکم مئی ۱۹۷۵ء
۶۔ بشیر لین
پشاور صدر

باب تعارفیّہ

انسانی معاشرے کی ترقی و تنزل میں عورت کا مقام

پردہ اور تعدد ازدواج کے مسائل مدت سے لوگوں کی توجہ کے مرکز بنے ہوئے ہیں ان کے بارے میں مختلف نظریئے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا تعلق صرف عورتوں سے ہے، جبکہ مردوں سے ان کا تعلق محض اتفاقی اور بالواسطہ قسم کا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مصری عالم علامہ فرید وجدی نے پردہ کے بارے میں اپنی کتاب کا نام "مراۃ المسلمہ" یعنی "مسلمان عورت" رکھا، کیونکہ وہ پردے اور عورت کو لازم وملزوم تصوّر کرتے تھے۔ ایک اور عالم مولانا جلال الدّین انصر عمری نے اپنی کتاب "عورت اسلامی معاشرہ میں" عورت کا مقام پردہ اور کثرت ازدواج کے نقطۂ نظر سے بیان کیا ہے۔ یہ تو عموماً علماء اور حامیان پردہ کا خیال ہے۔ دوسرا نظریہ قدرے عمومی ہے۔ اس کے مطابق پردہ و تعدّد ازدواج کو مردوں نے عورتوں کو اپنی رضا و رغبت کے تابع بنانے کے لئے رائج کیا۔ یہ خیال نسبتاً درست ہے، مگر دقیق نہیں۔ انسانی معاشرے میں عورت کا مقام بادی النظر سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر ان معاشرتی اداروں پر غور و فکر کیا جائے تو معلوم

ہو جائیگا کہ ان کا تعلق صرف عورتوں ہی سے نہیں، بلکہ مردوں اور بچوں سے بھی ہے بلکہ ان کا اثر تمام مسلم معاشرے اور اس کی تاریخ اور ارتقاء پر پڑتا ہے۔ یہ ادارے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کی ترقی کی راہوں میں حائل رہے ہیں۔ مسلمانوں کی تباہ حالی اور پسماندگی کا سبب اور ان کی حکومتوں اور سلطنتوں کے انحطاط اور زوال کا باعث ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا تعلق مسلمانوں کے ہر فرد و بشر، مرد و زن، جوان و پیر سے ہے۔ لاطینی کہاوت کے مصداق "ان کی کہانی آپ کی اپنی زبانی ہے۔"

اگرچہ پردہ اور تعدد ازدواج صدیوں سے مسلمانوں میں رائج ہیں، تاہم ان کے بارے میں علمی اور عقلی بحث و مباحثہ اور غور و خوض اس وقت شروع ہوئے، جب عالم اسلامی پر یورپی سامراجی تسلط قائم ہوا اور مغربی تہذیب و تمدن کا اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ اس وقت سے ان کے حق اور مخالفت میں متعدد مسلم اور غیر مسلم اہل رائے نے بہت سی کتابیں اور مضامین شائع کئے ہیں۔ مگر ان کے حامی اور مخالفین مسلم ہوں یا غیر مسلم، ان کی نوعیت اور حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں، حامی جن میں اکثریت علماء کی ہے۔ اس لئے کہ ان کا نقطۂ نظر قرون وسطائی ہے اور مخالفین، جن میں اکثریت مغربی مصنفین کی ہے، اس لئے کہ ان کا علم و فکر اور بصیرت یورپی یا مغربی تعصب اور مرکزیت پسندی سے آلودہ ہیں۔ ہمیں فکر و نظر کی ایسی کمزوریوں سے بالاتر ہو کر پردے اور تعدد ازدواج کے مسائل پر غور کرنا ہے۔ یہ مسائل نہایت پیچیدہ اور دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ مگر اس حقیقت کو نہ تو ان اداروں کے حامی صحیح طور سے سمجھ سکے اور نہ ہی ان کے مخالفین اس کی تہ کو پہنچ سکے۔

یہاں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پردہ اور تعدد ازدواج کس طرح مسلم معاشرے اور تہذیب وتمدن کو متاثر کرتے ہیں اور ان کے انحطاط و زوال کے باعث بنتے ہیں؟ بالفاظ دیگر، وہ کونسی وجوہات اور حالات تھے اور ہیں جن کے باعث مسلمانوں کا معاشرہ اپنے ابتدائی تین چار صدیوں کے بعد تقریباً آج تک انحطاط و زوال، پسماندگی اور بدحالی کا شکار رہا ہوا ہے؟

یہ نہایت اہم اور سنگین سوال ہیں اور میں ہی وہ پہلا شخص نہیں جس نے ان پر غور و فکر کیا ہو۔ مگر مسلم مفکرین نے، جن میں علما اور جدید تعلیم یافتہ طبقے شامل ہیں، ان سوالات اور مسائل کا حل تجزیۂ حقیقت کی بجائے قیاس آرائی میں تلاش کیا۔ مثلاً گذشتہ زمانوں کے مسلم معاشروں اور حکومتوں کے انحطاط و جمود، زوال و سقوط کے اسباب کا حقیقی اور سائنٹفک تجزیہ کرنے کی بجائے نظریاتی قیاس آرائی کا سہارا لیا۔ اس لحاظ سے جدید علوم و فنون کے ماہرین اور مفکرین بھی حقیقی اور واقعاتی تجزیہ کی بجائے مغربی اصطلاحات اور نظریات کا سہارا لیکر بے محل اور بے ربط خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً مسلمان عورت کے مسائل کو وہ مغربی عورت کے حالات کی روشنی میں دیکھتے ہیں جو پانچ چھ سو سال کی ترقی کا نتیجہ ہیں۔ علمائے نیابیت کا سہارا لیتے ہیں، مغربی تعلیم یافتہ عالم داخلیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر ایک گروہ قرونِ وسطیٰ کی فرسودہ نظامِ معاشرت کی باتیں کرتا ہے تو دوسرا دور افتادہ مغربیّت کے خواب دیکھتا ہے۔ ان غلطیوں کی دو بنیادی وجہ ہیں۔

اوّل مسلم مفکرین اور علماء کے پاس کوئی سائنٹفک طرزِ فکر اور طریقِ تحقیق اور تکنیک نہیں۔ وہ محض اصول اور سند کی باتیں کرتے رہتے ہیں اور قیاس اور رائے کا سہارا لیتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی، حالات اور ماحول کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اگر ہمارے علماء نے زمانۂ جدید کے معاشری علوم اور تجزیہ کے نفسیاتی اور کرداریاتی طریقوں اور تکنیکوں کو اپنایا ہوتا تو وہ گذشتہ زمانوں کے مسلمانوں کے انحطاط و سقوط کے اسباب اور دورِ جدید کے مسلمانوں کی پسماندگی اور بدحالی کی وجوہات یقیناً معلوم کر لیتے۔ اس کے برعکس جدید تعلیم یافتہ مفکرین مغربی علوم و فنون کی اصطلاحات اور نظریات تو خوب جانتے ہیں، مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جدید سائنس عقیدہ نہیں ہے بلکہ علم کی تلاش کرنے کی ایک میتھوڈولوجی یعنی اصول اور طریقِ تحقیق ہے یہ صداقت کی تلاش ہے جس کے بارے میں کوئی ماقبل (a priori) علم نہیں ہوتا۔ یہ صداقت حالات اور ماحول کے اندر ہی سے کوشش اور تحقیق سے معلوم کرنی ہوتی ہے۔ کوئی غیر ملکی مفکر، خواہ وہ کتنی ہی عظیم شخصیت کیوں نہ ہو، ہمیں یہ دریافت کر کے نہیں دے سکتا۔

دوم۔ ہمارے اہل علم و فکر، خاص طور پر ہمارے علماء کے اذہان و افکار پر جمود و سکوت طاری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا معاشرہ خود بینی اور خود پسندی کا شکار ہے۔ یہ ایسا رجحان پیدا کرتا ہے جس کے باعث ہم لوگ صرف اپنے سابقہ کمالات پر فخر کرتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ہم میں علم و دانش کی تلاش اور جستجو پیدا نہیں ہوتی اور ہمارے ماحول اور معاشرے سے باہر کے حالات اور ترقیات کے جاننے کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے علماء اسلامی علوم و فنون کے علاوہ کوئی غیر اسلامی علم و فن کی جانب توجہ نہیں دیتے۔ اُن کا یہ طریقہ غیر مسلم علماء مثلاً عیسائی پادریوں کے وطیرے سے بالکل برعکس ہے۔ جو نہ صرف دوسرے مذاہب کے علوم و فنون کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ بلکہ جدید ترین سائنسی انکشافات اور نظریات کو بھی خوب جانتے ہیں یہ طریقہ اُن کے اثر و رسوخ اور اُن کے مذاہب کے فروغ کا راز ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے جدید سائنس اور فن کو تو خوب جانتے ہیں، مگر وہ ان کو نظریاتی قلعے بنا کر ان کے اندر بیٹھ کر لڑتے ہیں، جب کہ ضرورت یہ ہے کہ ان جدید سائنسی طریق تحقیق اور اصولوں کو ہمارے قومی مسائل اور معاملات کے تجزیئے کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس خامی کے باعث ان کا علم اُن کی داخلیت پسندی کی نمائش ہوتا ہے۔ مگر ہماری زندگی اور حقائق سے کوسوں دور رہتا ہے۔ اگر ہمارے علماء کے قرون وسطائی نظریات اور خیالات بے وقت کا راگ ہوتے ہیں تو ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقوں کے افکار، جو دوسروں سے عاریتاً لئے ہوئے ہوتے ہیں، دُور کے ڈھول ثابت ہوتے ہیں۔

ہر سائنس کی طرح معاشری سائنس کا بھی ایک پیمانہ ہوتا ہے، جس کی مدد سے وہ معاشری عمل یا پروسس (Process) اور واقعات کا جائزہ لیتا اور اندازہ لگاتا ہے جن کی بنا پر ہی کوئی کہہ سکتا ہے کہ آیا معاشری عمل اور واقعات کا رُخ ترقی اور خوشحالی کی طرف ہے۔ یا تنزل اور بدحالی کی جانب یعنی معاشرہ ترقی پذیر ہے، یا انحطاط پذیر ہم بھی اس مطالعے میں سب سے

پہلے ایک ایسے ہی پیمانے کا تعین کریں گے تاکہ ہم سے وہ غلطیاں مرتکب نہ ہوں جو ہمارے قیاسیت پرست علماء اور نظریات کے مقید مفکرین سے سرزد ہوتی ہیں

ترقی اور تکمیل، اُن کے معنی اور مفہوم

معاشرے کی ترقی اور اس کا پیمانہ ترقی کیا ہے اور اس کے معلوم کرنے کا کیا پیمانہ ہے؟

ترقی انسانی زندگی اور معاشرے میں ایسے تغیّر و تبدل کا نام ہے جو انسان نے کسی مقصد اور نصب العین کی تکمیل میں اپنی انفرادی یا اجتماعی کوشش اور سعی سے پیدا کئے ہوں۔ جس سے انسانی زندگی اور معاشرہ، انفرادی اور اجتماعی طور پر، پہلے کی نسبت بہتر زیادہ خوشحال وافر متمول اور حیات پرور یعنی وائی ایبل بن جائیں۔ یہ ایسا پروسس ہے جس کے نتیجہ میں انسان اپنے مقصد یا ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اور خاطر خواہ حالات اور ماحول پیدا کر لیتا ہے۔ بس ترقی اُن بامقصد کوششوں اور سعیوں کا سلسلہ ہے۔ اُن کارروائیوں، سرگرمیوں اور کارناموں کا ثمرہ ہے۔ جو لوگوں نے اپنی زندگی اور یا معاشرے کے کسی شعبے میں حاصل کی ہوں، یا کم از کم تکمیل کرنے کی

کوشش کی ہو۔ ان بامقصد یا باضرورت کوششوں، کاموں اور مہموں کو پورا کرنے کو ہم تکمیل (Achievement)[۱] کہتے ہیں۔ تکمیلات ترقی اور پیش رفتگی کی جزویات اور

---

[۱] اس نئی اصطلاح کی اختراع کچھ وضاحت چاہتی ہے۔ معاشری محقق کو الفاظ اور اصطلاحات کے استعمال میں وہ آزادی میسر نہیں ہوتی جو شاعروں اور ادیبوں کو حاصل ہے۔ سائنس اور تحقیق کے اصول اور تقاضے اس آزادی کی اجازت نہیں دیتے ۔ علاوہ ازیں پاکستانی محقق کو اردو زبان کی معنوی اور اصطلاحی کم مائیگی کا بھی سامنا ہوتا ہے۔ ہر زبان اپنے معاشرے کی تاریخ کی عکاسی کرتی ہے۔ اردو اور مسلمان اقوام اور ممالک کی دوسری زبانیں "عمل" اور "تکمیل" ایسی اصطلاحات اور مشتقات سے خالی ہیں۔ اس کے برعکس مغربی ممالک کی زبانیں ایسے الفاظ اور اصطلاحات سے بھری ہوئی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا معاشرہ گذشتہ کئی صدیوں سے "عمل" اور "تکمیل" کی ضرورتوں، امنگوں اور خوبیوں سے خالی اور عاری رہا ہے لہٰذا ایسے حالات میں ایسے لفظوں، محاوروں اور مشتقات کی کیا حاجت تھی ؟ تاہم جدید زندگی اور حالات کا تقاضا ہے کہ اردو زبان کے دامن کو بھی جدید اصطلاحات اور مستعملات سے بھرا جائے۔ ایسی ہی جسارت کرتے ہوئے ہم نے متعدد نئی اصطلاحات وغیرہ اختراع کی ہیں۔ ممکن ہے کہ ہماری کوشش ماہرین زبان کے معیار پر پوری نہ اترے۔ لیکن اگر وہ کوئی بہتر اصطلاح تجویز کریں تو اردو زبان کی کم مائیگی کا گلہ بھی دور ہو جائے گا۔

انگریزی زبان میں ( ) کا لفظ اور اس کے مشتقات کو سائنسی اصطلاحات کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہم نے ان کا مندرجہ ذیل الفاظ میں ترجمہ کر کے اس کتاب میں بطور اصطلاح کے استعمال کیا ہے ۔

To achieve	کا ترجمہ	تکمیل کرنا۔ تکمیلنا
Achievement	" "	تکمیل
Achieving	" "	تکمیلی
Non-achieving	" "	غیر تکمیلی
Non-achievement	" "	غیر تکمیل
Anti-achieving	" "	خلاف تکمیل
Achiever	" "	تکمیل گر
Non-achiever	" "	غیر تکمیل گر

اکائیاں ہوتی ہیں۔ ہر ایک تکمیل ایسا پیمانہ ہوتی ہے جو ترقی کا رخ اور رفتار متعین کرتی ہے۔
تکمیلات کی بنا پر ہی ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی قوم، لوگ یا معاشرہ ترقی پذیر ہے یا نہیں۔

تکمیل کیا ہے؟[1]

تکمیل کے لغوی معنے کسی کام یا چیز کو پورا کرنا یا کمال کو پہنچانا ہے۔ مگر سائنسی اصطلاح میں تکمیل ایسے عمل کا نام ہے جس کے ذریعے کوئی شخص مسلسل کام اور محنت و مشقت، کوشش اور کاوش سے اپنے مقصد یا نصب العین کو حاصل کر لیتا ہے۔ ایسے بامقصد عمل کی پانچ خصوصیات یا مرحلے ہوتے ہیں۔ اوّل نفسیاتی اور شعوری، دوم، کرداری اور اخلاقی، سوم معاشری، چہارم، قدرتی یا طبعی (نیچرل) اور پنجم وقت اور مدت۔

Achieving Society	تکمیلی معاشرہ
Achieving individual	تکمیلی فرد
Need for achievement	ضرورت تکمیل۔ احتیاج تکمیل
Non-existence of achievement	عدم تکمیل۔ عدم تکمیلیت
Achievement motive	جذبۂ تکمیل۔ احساس تکمیل۔ شوق تکمیل
To urge towards achievement	جذبہ یا احساس یا شوق تکمیل کی تحریک
Achievement urge or impulse.	ترغیب تکمیل
Achievement capability	صلاحیت تکمیل
Inclination for achievement	رجحان تکمیل
To motivate towards achievement	جذبہ یا احساس یا شوق تکمیل پیدا کرنا
Orientation	سمت بندی
To orientate towards achievement	تکمیل کی ترغیب دینا۔ راغب تکمیل کرنا۔ تکمیل کی
To orientate towards achievement	جانب سمت بندی کرنا۔
To urge towards achievement	تکمیل پر اصرار یا تاکید کرنا
Achievement urge or impulse	تکمیل کی لگن یا شوق۔

---

[1] تکمیل کی ضرورت ازلی اور ابدی ہے۔ تمام قدیم و جدید تہذیبیں اور تمدن، ان کے مظاہرات اور پیداوار تھے اور ہیں

تکمیل کا آغاز فرد انسانی کی نفسیات سے ہوتا ہے۔ ابتداً تکمیل کسی کام، چیز، فرض یا مہم کا ایسا خیال، احساس، مقصد یا نصب العین ہے جس کے تحت کوئی شخص، اشخاص یا گروہ اُسے پورا کرنے یا حاصل کرنے کا عمل شروع کرتے ہیں اور جب تک یہ کام، چیز، فرض یا مہم وغیرہ پوری نہ ہو جائے اس کا خیال اور مقصد اس کو یا ان کو تکمیل کے حصول کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ تکمیل کے محرکات لاشعوری بھی ہوتے ہیں مگر تکمیل بذات خود اول تا آخر ایک شعوری فعل ہے۔ یہ فرد یا گروہ کے ذہن و فکر کی مخصوص نوعیت اور اس کے کردار اور عادات کی مخصوص تشکیل پر موقوف ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیال، فرض، مقصد یا نصب العین کو پائے تکمیل تک پہنچاتا ہے یا نہیں۔ اس لئے جتنی مدت یا وقت میں کسی کام، چیز، فرض، مقصد یا نصب العین نے تکمیل پانا ہے۔ اتنی مدت اور وقت تک فرد اور گروہ کے ذہن و شعور میں ضروری اور مخصوص خیالات، تصورات، عادات، رویے صلاحیتیں اور استطاعت بروئے کار رہنی چاہئیں۔ یعنی اُس کے کردار اور شخصیت میں اتنی مضبوطی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی ہو کہ وہ اپنے کام، چیز، ضرورت، مقصد، فرض یا نصب العین کو تکمیل کر سکے پس تکمیل کا بنیادی عنصر ایسا علم و شعور ہے جو حرکت، عمل اور عادت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسا کردار اور ایسی عادات تکمیل کا دوسرا عنصر ہیں۔

تکمیل کا تیسرا پہلو یا مرحلہ اس کی خارجی اور معاشرتی نوعیت، اہمیت اور ضرورت ہے جو تکمیلی فرد یا گروہ اور دوسرے افراد اور گروہوں میں ایسے تعلقات اور رابطے پیدا کریں جو وہ اپنے لئے مفید یا ضروری تصور کرتے ہیں۔ یا ان تعلقات اور روابط کو تسلیم کرتے ہوں یا تسلیم کرنے پر مجبور کیا جا سکے لہٰذا تکمیل فرد کا مقصد ایسا تعلق قائم کرنا بھی ہو سکتا ہے جو دوسرے افراد یا گروہ کے ساتھ مشترکہ مفاد کا حامل ہو یا ایسا جو مخالف اور متضاد

تاہم اسکے تصور اور ضرورت کا سائنٹفک تجزیہ ایک جدید چیز ہے۔ ہم ذیل میں تین کتابوں کے نام درج کرتے ہیں ان میں پہلی کتاب فرد کی تکمیل نفسیات کا تجرباتی تجزیہ بیان کرتی ہے، دوسری کتاب تکمیل کا اقتصادی ترقی میں رول بیان کرتی ہے تیسری کتاب تکمیل یعنی فرد کے کارناموں کی تاریخی نوعیت بیان کرتی ہے جو تاریخ انسانی کو بناتے ہیں ان کتابوں کے مطالعہ سے قارئین ہمارے نظریۂ تکمیل پر بھی تنقید کر سکیں گے

Atkinson and N.T. Feather, *A Theory of Achievement Motivation*

David C. McClelland. *The Achieveing Sect.ty.* London, 1961.

Alfred Stern. *Philosophy of History and the Prohlem of Values*

مفاد کا حامل ہو۔ پہلی صورت میں تکمیل کا مقصد اشتراک عمل، تعاون، باہمی عمل اور مفاہمت ہوتا ہے دوسری صورت میں تکمیل کا مقصد زور و جبر، تنازعہ اور کش مکش، تشدد اور غلبے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس صورت میں مخالف فرد یا گروہ رد تکمیل کے لئے خواہاں یا کوشاں ہو۔ تو جبری تعلق کی نوعیت کو بدل سکتا ہے، جس کے نتیجے میں دونوں فریق مل کر مشترکہ اور باہمی مقاصد اور مفاد کی تکمیل اور تعلقات قائم کرسکتے ہیں اور اس طرح ایک نیا گروہ بن جائیں گے۔ اگر مشترکہ مفاد یا مفاہمت مقصود نہ ہو تو مخالفانہ جد و جہد اور کش مکش سے کوئی نئے جبری تعلقات اور روابط قائم کرسکتے ہیں۔ یہ بھی معاشرتی گروہ ہوگا مگر زور و جبر، تضاد اور تنازعہ اور مخالفانہ مفادات کی تکمیل کا حامل رہے گا۔ مشترکہ گروہ بھی کسی اور فرد یا گروہ سے مخالفانہ زور و زبردستی کے تعلق پر مبنی ہوتا ہے پس معاشرہ افراد اور گروہوں کی تکمیلات کے موافقانہ اور مخالفانہ، مشترکہ اور متضاد مفادات مقاصد تعلقات اور روابط کا تانا بانا ہوتا ہے، جو ہر وقت اور ہر لمحہ متحرک اور متغیر ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا ہر ایک تکمیل اپنے عوامل اور نتائج میں معاشرتی گروہوں کو بنانے اور بگاڑنے توڑنے اور جوڑنے کا عمل ہے۔ علاوہ ازیں کسی تکمیل کی کسی فرد، گروہ یا معاشرے کو جتنی زیادہ افادیت، سود مندی اور ضرورت ہوگی۔ اس کا حصول اتنا ہی اہم اور لازمی ہوگا اور وہ جتنی زیادہ محنت طلب، دشوار اور مخالفت انگیز ہوگی اتنی ہی اس کی عظمت اور افادیت اہمیت اور شان و شوکت بڑھ جائے گی اور اس کے حصول کے لئے اتنا ہی زیادہ مضبوط ثابت قدم اور عظیم کردار اور شخصیت کی ضرورت ہوگی۔ یہ امر عام اور عظیم تکمیلوں میں امتیاز بھی پیدا کرتا ہے۔

تکمیل کا چوتھا مرحلہ قدرت یا فطرت کے طبعی نظام کی تسخیر ہے جو انسانی زندگی اور معاشرے کی بنیاد ہے، ہر تکمیل کی افادیت، ضرورت، حقیقت اور صداقت کا معیار ہے۔ قدرت کا نظام جس میں انسانی فطرت اور جسم بھی شامل ہیں، اُن طبعی قوتوں، عوامل، مظاہرات اور قوانین فطرت پر قائم ہے جو خارجی اور واقعی حقائق کی دنیا بناتے ہیں۔ لہٰذا ہر تکمیل انسان کی قدرت پر فتح ہے۔ جو اس نے فطری اور طبعی عوامل اور قوتوں کو معلوم اور دریافت کرکے اُن پر قابو حاصل کرلیا ہے۔ اس تسخیر قدرت یا تسخیر عالم سے وہ قدرتی وسائل اور ذرائع کو اپنی ضروریات

اور مقاصد کے کام لاتا ہے، اور اپنی زندگی یا اپنے گروہ یا معاشرے کی زندگی کو خوشحال بہتر اور حیات آفرین بناتا ہے۔ لہٰذا ہر نئی تکمیل نہ صرف انسانی علم و دانش، عقل و شعور کو قدرت کے حقائق اور عوامل سے روشناس کرتی ہے۔ بلکہ قدرت کی قوتوں اور عوامل پر نئی فتح اور اس کے وسائل اور ذرائع پر نیا قابو اور نیا تصرف ہوتی ہے۔ مگر چونکہ قدرت پر ہر ایک فتح دوسرے افراد اور گروہوں کے مفادات، خیالات، نظریات اور مقاصد پر اثر انداز ہوتی ہے اس لئے موافقانہ یا مخالفانہ رد عمل اور تعلقات، کشمکش اور جد و جہد کا باعث بھی ہوتی ہے، جس کا حل بھی نئے معاشرے تعلقات اور گروہ بندی کی تکمیل یا تکمیلات سے حاصل ہوتا ہے جو تعاون اور اشتراک مفاد اور عمل یا مخالفت اور زور اور جبر پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس طرح ہر نئی تکمیل فرد یا گروہ یا معاشرے کی زندگی کو زیادہ بہتر، خوشحال و افراد وسیع تر اور زیادہ حیات انگیز بناتی ہے یا بنانے کا رجحان رکھتی ہے۔ مگر جن افراد یا گروہوں کی زندگی یا مفادات یا حقوق کو نئی تکمیلات سے زک یا نقصان پہنچے وہ جوابی تکمیلات حاصل کر سکتے ہیں تاکہ اپنی زندگی اور مفادات کو فروغ دیں یا فریق ثانی کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں مگر ان سب طرح کی تکمیلات کامیاب اور کارگر بھی ہونگی۔ جب وہ ان کا علم اور طریق کار اور پیداوار قدرت کے حقائق سے مطابقت رکھتے ہوں اور اس لئے قدرت کے وسائل اور ذرائع کو بہتر اور وافر طور پر مسخر کرتے ہوں۔ ایسی تکمیلات ہی مؤثر اور مستقل کامیابی کی حامل ہوں گی اور ان کو حاصل کرنے والے افراد اور گروہ غالب تکمیل گر ہوں گے ایسے غالب تکمیل گر افراد اور گروہ پسماندہ افراد اور گروہوں پر ایسی معاشری پابندیاں بھی عائد کر سکتے ہیں کہ وہ علمی اور تحقیقی تکمیلات نہ کر سکیں یا ان کو ایسے تکمیلی مواقع، آزادیوں اور حقوق سے محروم کر سکتے ہیں جو اُن کے تضاد اور مخالفت کو معاشرہ منع اور بے اثر بنا دے یا کوئی فرد یا گروہ خود ہی اپنے علم اور نظریات کو ایسے سچے، صحیح اور ناقابل تردید تصور کرنے لگے کہ مزید علم و تحقیق، کوشش اور جد و جہد کی ضرورت پر یقین ہی نہ رکھے اور ایسے معاشری تعلقات اور نظریات (آئیڈیولوجی) پر اپنی ساری زندگی اور معاشرہ استوار اور منجمد کرے۔ جب کہ کوئی دوسرے افراد یا گروہ کے ذہن و شعور، طرز زندگی یا طرز فکر پر اس طرح کی علمی یا نظریاتی

معاشری یا تعلیمی خود ساختہ ممانعتوں اور مناہیوں نہ ہونے کی وجہ سے وہ نئی سے نئی معاشری اور علمی، قدرتی اور تحقیقاتی تکمیلات حاصل کرتے رہیں اور اس طرح انفرادی، اجتماعی اور معاشری لحاظ سے غالب قوت بن کر مذکورہ بالا منجمد شدہ معاشرے کو چیلنج کریں۔ کیونکہ حقیقی اور سچی قوت اس تکمیل گر کے ساتھ ہوتی ہے جو قدرت کی قوتوں، عوامل، قوانین اور حقائق کا ساتھ دیتا ہے جو اس نے تسخیرِ قدرت یعنی تسخیر کائنات سے حاصل کی ہے۔ بس تکمیل انسان کی قدرت پر "قدرت حاصل کرنے کا نام ہے۔ دوسرے الفاظ میں "قدرت کو اپنے قبضۂ" قدرت میں لانے کا نام ہے مگر ایسی تکمیل کا کوئی شخص یا گروہ تبھی خواہاں اور کوشاں ہوتا ہے۔ جب اس کے معاشرے کے حاصل شدہ اور وابستہ مفادات اور تعلقات اس کے حصول میں شعوری اور کرداری، اداریاتی اور نظریاتی طور پر مانع نہ ہوں۔ یہ اُسے اپنی انسانی فطرت پر فتح سے حاصل ہوتی ہے۔

وقت تکمیل کا پانچواں اور حتمی مرحلہ اور تاریخی پہلو ہے۔ وقت سے مراد تکمیل کی تخلیق اور عملیات میں قدرت اور فطرتِ انسانی کے عوامل، اور محرکات، وسائل، قوتوں اور مظاہرات کا واقعاتی تسلسل اور تواتر ہے جس کے انسانی ذہن و فکر، علم و ارادے، عقل و فراست تابع ہیں اس سے مطابقت ہی سے انسانی خواہشات، تمنائیں، خیالات، احتیاجات، ضروریات، ارادے اور منصوبے تکمیل پاتے ہیں۔ اس کے لئے انسانی ذہن و فکر، کردار اور اخلاق کی تمام تکمیلی قوتوں صلاحیتوں اور محرکات کو بڑی محنت و مشقت، کوشش اور کاوش سے بروئے کار لانا پڑتا ہے تخلیق اور ظہور پذیر ہونے کے بعد تکمیل کا اثر و نفوذ شروع ہو جاتا ہے۔ جس کی نوعیت انسانی زندگی اور معاشرے میں حاصل شدہ تکمیلات کی ضرورت اور اہمیت اور افادیت پر ہے۔ وہ تکمیلات جن کی انسانی زندگی اور معاشرے کی فلاح و بہبود، خوشحالی، ترقی اور بہتری کیلئے بار بار تخلیق یا پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، متواتر اور مستقل محنت و مشقت، کوشش اور توجہ، کشمکش اور جدوجہد کی مقتضی ہوتی ہیں۔ یہ پیداواری تکمیلات ہیں۔ جن کے پیداواری عمل کی اپنی ضروری مدت یا معیاد ہوتی ہے۔ ضروری پیداواری وقت کو تکمیل گر اپنے علمی، فنی، تکنیکی اور سائنسی آگاہی اور شعور، عقل و فراست اور کوشش اور کاوش سے کم کر سکتے ہیں جسے اُن کی کارکردگی کہتے ہیں، جو فرد اور گروہ اور معاشرے کی زندگی اور معاشری نظام کو بہتر

زیادہ خوشحال اور وسعت پذیر بناتی ہے۔ تمام حاصل شدہ اور ظہور شدہ تکمیلات، خواہ معمولی ہوں یا عظیم، تخلیقی ہوں یا پیداواری، ایسے اثرات اور عواقب، نتائج اور عوامل برآمد کرتی ہیں اور نئے مسائل، نئے خیالات، نئی خواہشات اور ضروریات نئے رویوں اور قدروں نئے ارادوں اور منصوبوں اور نئے مفادات اور تعلقات کو جنم دیتے ہیں اور اس طرح مختلف اور مخالف افراد اور گروہوں کو نئی تکمیلات کی تخلیق اور پیداوار کی ترغیب اور تحریک دیتے ہیں۔ جب اس کش مکش اور تضاد سے کوئی نئی تکمیل گر، انسانی صلاحیتوں اور قدرتی وسائل اور ذرائع کو بہتر اور زیادہ مؤثر اور کارگر طریقوں اور تکنیک سے استفادہ کر کے کوئی نئی تخلیق اور تکمیل حاصل کر لیتا ہے۔ تو نئی اور پرانی تکمیلات میں تضاد اور مسابقت شروع ہو جاتی ہے جو پرانی اور ناقص تکمیل کو معاشرۂ غیر مفید اور غیر ضروری قرار دیکر غیر تکمیل میں بدل دیتی ہے اب معاشرے کی تکمیلاتی ترقی کی تاریخ نے اس کا وقت ختم کر دیا۔ مگر معاشرے میں ایسے افراد اور گروہ یا طبقے ضرور موجود ہوتے ہیں جن کے مفادات، خیالات، نظریات اور تعلقات ابھی بھی اس غیر تکمیل سے وابستہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا نئے اور پرانے تکمیلی افراد اور گروہوں میں تضاد اور تصادم، مخالفت اور جدوجہد شروع ہو جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ نئی تکمیلی قوتوں کے حق میں ہوتا ہے کیوں کہ انہوں نے انسانی اور قدرتی قوتوں اور وسائل و ذرائع کا زیادہ مؤثر، بہتر، زیادہ کارگر اور وسیع تر تخلیقی اور پیداواری استفادہ کیا ہوتا ہے جو ان بالآخر پرانی تکمیلی افراد اور گروہوں پر غلبہ اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ تب نئی تکمیلی قوتیں معاشرے کو زیادہ بہتر اور کارگر تشکیل دیکر نئی اور بہتر تکمیلی قوتوں اور رجحانات کی راہ ہموار کر دیتی ہیں اس طرح ہر نئی تکمیل پرانی تکمیل یا تکمیلات کی مدت متعین کرتی ہے اور ان کو غیر تکمیل بنا کر معاشری اور تاریخی جدلیاتی عمل کو فروغ دیتی ہے جس کے دوران غیر تکمیل۔ خلاف تکمیل بلکہ عدم تکمیل بن کر معدوم ہو جاتی ہے تاہم اس جدلیاتی عمل میں مختلف طرح کی تکمیلات کی اپنی نوعیت کی بنا پر غیر تکمیل بننے اور معدوم ہونے میں تاریخی وقت چند لمحوں سے لیکر کئی صدیاں ہو سکتا ہے، جو اس معاشرے کی تاریخ بناتا ہے۔

تکمیل کا اصول تکمیل کا اصول مسابقت کے اصول پر مبنی ہے کہ بہتر اچھے کا دشمن ہے۔ جب کوئی نئی تکمیل معاشرہ ضروری ثابت ہو جاتی ہے، تو سابقہ تکمیل یا تکمیلات غیر ضروری بن جاتی ہیں اب لوگوں اور معاشرے کو لازم ہو جاتا ہے کہ یا تو نئی تکمیل کو اختیار کریں یا اس سے بہتر تکمیل کے لئے کوشاں ہوں۔ یہ عمل معاشرے کو ترقی پذیر بناتا ہے اور لوگوں کو تکمیلی کردار اور شخصیت عطا کرتا ہے۔

تکمیل کی قسمیں اگر انسانی زندگی اور معاشرہ ترقی پسند ہوں، تو تکمیلات کی مثالیں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ البتہ جب وہ زوال پذیر اور غیر تکمیلی بن جائیں تو ان میں تکمیلات کی تقلیل یا کمی ہوتی جاتی ہے اور اگر معاشرہ جمود زدہ اور خلاف تکمیلی بن جائے تو تکمیلات کا فقدان شروع ہو جاتا ہے۔ بہر حال، ترقی پذیر اور تکمیلی معاشرے کے ہر میدان اور شعبے میں تکمیلات کا عمل جاری رہتا ہے، خواہ وہ اقتصادی اور معاشی شعبے ہوں، تمدنی اور معاشرتی زندگی ہو، علمی و ادبی تحقیقات اور تصنفات ہوں۔ فنی، سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ایجادات اور انکشافات ہوں، کوئی سیاسی تحریک اور حکومتی تنظیم یا سیاسی اور معاشری تبدیلی اور انقلابات ہوں، یا کوئی انسانی مہم اور کمال ہو۔ ان تمام قسم کی تکمیلات میں اپنی اپنی نوعیت ہوتی ہے جو انسانی ذہن و کردار، معاشری طریقوں اور قدرتی وسائل کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوتی ہے مگر ان سب میں ایک عنصر مشترک ہے۔ وہ محنت و کاوش، مشقت اور کوشش کا عنصر ہے جس کے بغیر کوئی کام یا کمال، مہم یا تحریک، ایجاد یا انکشاف، کوئی مقصد، خیال اور منصوبہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اگر تکمیل کی ضرورت انسانی زندگی اور معاشرے کے قیام اور بقا کے لئے لازمی ہے تو محنت و مشقت سعی اور کوشش تکمیل کی صورت کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ مگر محنت و مشقت کوشش اور سعی پیہم انسانی ذہن و کردار کے محتاج ہیں ہر تکمیل انسانی کردار اور ذہن کی پیداوار ہوتی ہے اور اس کی عکاسی کرتی ہے مگر تکمیلی کردار اور ذہن معاشرے کے نتیجے ہوتے ہیں اور تکمیلی معاشرہ تکمیلاتی ترقی اور تاریخ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تکمیلات کو ہم دو قسموں میں بانٹ سکتے ہیں۔ اوّل پیداواری تکمیلات اور دوم تخلیقی تکمیلات پیداواری تکمیلات ایسے کاموں، مقاصد، طور و طریقوں، ہنرمندیوں، مہموں اور کمالات

پر مشتمل ہوتی ہیں جو انسانی زندگی اور معاشرے کے موجودہ حالات، تعلقات اور ترقیات کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ درحقیقت وہ پرانی یا سابقہ تکمیلات ہیں جن کی معاشرے کو ابھی ضرورت ہے۔ ہر تکمیل کا عمل اپنے معاشرے کی تاریخ کے لحاظ سے معین ہوتا ہے مگر اس کے اپنے عمل سے ایسے حالات، تعلقات اور ضروریات پیدا ہو جاتی ہیں جو نئی تکمیلات کی متقاضی ہوتی ہیں۔ تب تخلیقی تکمیلات کا وقت آ پہنچتا ہے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اور تکمیل کے عمل نے، جو اپنے معاشرے یا کسی دوسرے معاشرے میں ہو رہا ہو۔ مروجہ تکمیل کا وقت ختم کر دیا ہو۔ اس صورت میں بھی معاشری حالات اور ترقیات نئی تکمیل یا تکمیلات کی مقتضی ہو جاتی ہیں۔

تخلیقی تکمیلات ایسے کام، مہمات، مقاصد، ارادے، منصوبے اور کمالات پر مشتمل ہوتی ہیں جن کی ضرورت انسانی زندگی اور معاشرے کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے حالات، تعلقات اور ترقیات پیدا کرتے ہیں۔ درحقیقت یہی اصلی تکمیلات ہوتی ہیں جو نئی زندگی اور نیا معاشرہ پیدا کرتی ہیں۔ جب ایسی نئی تکمیل معاشری حقیقت بن جاتی ہے، تو یہ نئی انسانی صلاحیتوں اور نئے قدرتی وسائل، عوامل اور قوتوں کو دریافت اور منظم کر کے انہیں بروئے کار لاتی ہے اور اُن کو نئی تشکیل اور نیا عملی نظام عطا کرتی ہے اور اس طرح افراد اور معاشرے کی پیداواری صلاحیتوں اور قوتوں کو بڑھاتی ہے اس کے بعد اس کا پیداواری دور شروع ہوتا ہے، جو معاشرے کی اقتصادی صنعتی اور تکنیکی پیداوار میں ترقی اور اس کی علمی سائنسی، فنی، تمدنی اور روحانی قوتوں اور مسرتوں میں اضافہ کرتا ہے اور عوام کی خوشحالی کو بڑھاتا ہے۔ یہ دور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اس سے بہتر تکمیل وجود میں نہ آجائے، جیسا کہ ترقی پسند اور تکمیلی معاشرے میں جلد یا بدیر ضرور ہو کر رہتا ہے۔

تکمیلات کی مثالیں: اگر کوئی مزدور یا کاریگر اپنے کارخانے یا کارگاہ میں، کوئی استاد اپنے سکول، کالج یا یونیورسٹی میں، کوئی ڈاکٹر اپنے ہسپتال یا کلینک میں، کوئی حکیم اپنے مطب میں، کوئی انجنیئر اپنے کارخانے یا کام کی سائٹ یا جگہ پر، یا کوئی ملازم ہمیشہ اپنے دفتر میں باقاعدگی دیانتداری، تندہی اور لگن سے سالہا سال تک اپنے فرائض منصبی سرانجام دیتا ہے۔ تو

ایسے کام اور محنت کو تکمیل کہا جائیگا اگرچہ یہ تکمیل روزمرہ کے لاتعداد کاموں اور فرائض کا سلسلہ ہے جو بذات خود بھی تکمیلات ہوتی ہیں مگر فرد اور معاشرے کی ضروریات کے لحاظ سے یہ سب ایک ہی عمل کی کڑیاں ہیں اسلئے یہ سب مل کر بھی ایک تکمیل بناتی ہیں۔

تاریخ ساز تکمیلات

اگرچہ ہر نئی تکمیل تاریخی نتائج کی حامل ہوتی ہے، مگر بعض تکمیلات مقابلتاً اتنی زیادہ اہم، عظیم وسیع اور دور رس نتائج پیدا کرتی ہیں کہ تاریخ انسانی کا رخ موڑ دیتی ہیں۔ انکو ہم ابتدائی تاریخ ساز تکمیلات شمار کرتے ہیں، کیونکہ انہیں تاریخ انسانی میں کسی شخص، قوم یا معاشرے نے پہلی بار تخلیق یا حاصل کیا ہے۔ یہ تکمیلات ایسے کارنامے کمالات، ایجادات، انکشافات، دریافتیں، مہمیں اور انقلابات ہیں جو بڑے بڑے سائنسدان، موجد صنعتکار، فلسفی، مفکر، ادیب اور شاعر سیاستدان اور عظیم لیڈر سائنس اور ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت، زراعت و تجارت، علم و فن، ادب و فلسفہ، سیاست و ریاست یا زندگی کے کسی محاذ، میدان یا شعبے یا میدان جنگ میں پہلی بار تخلیق یا تکمیل کرتے ہیں یہ اولیت یا سبقت بذات خود ایک تاریخ ساز واقعہ ہوتی ہے۔ خاص طور پر زمانہ جدید کی مقابلانہ اور مسابقانہ دنیا میں ایسی تکمیلات معاشرے کی ترقی، بقاء و سلامتی کی بنیاد، ملک و قوم کی عظمت اور طاقت کی ضامن ہوتی ہیں اور انکی قسمت کا فیصلہ کرتی ہیں، بڑے معاشرے کو جنم دیتی ہیں، انسانی زندگی کو فروغ بخشتی ہیں، قوموں، ملکوں حتی کہ انسانیت کی تاریخ بدل دیتی ہیں اور وقت اور زمانے کا دھارا موڑ دیتی ہیں مگر یہ سب کچھ انسان کے ذہن و کردار کے کرشمے ہوتے ہیں۔

تکمیل کے ارتقائی اور تقلیلی عمل

ہر تکمیل، خواہ نئی ہو یا پرانی عظیم ہو یا معمولی، مشہور و معروف ہو یا غیر معروف معاشرتی عمل ہوتی ہے

انسانی معاشرے اور تاریخ میں ہر وقت تکمیلات وقوع پذیر ہوتی اور سرانجام دی جاتی ہیں، بدلتی اور متغیر ہوتی رہتی ہیں، پرانی تکمیلات کم ہوتی یا معدوم ہوتی رہتی ہیں اور نئی تکمیلات وجود پذیر یا وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ پرانی تکمیلات کا دائرہ اثر محدود ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ اور نئی تکمیلات کا دائرہ اثر پھیلتا جاتا ہے حتیٰ کہ اُن کی جگہ بہتر تکمیلات وجود پذیر یا وقوع پذیر ہو کر اُن کو غیر ضروری تکمیلات بنادیں اور وہ معدوم ہو جائیں۔ یہ تکمیلات کا ارتقائی عمل ہے جو ترقی پسند تکمیلی معاشرے میں بروئے کار رہتا ہے مگر جس معاشرے میں نئی تکمیلات وقوع پذیر نہ ہوں اور موجودہ تکمیلات میں کمی یا تقلیل شروع ہو جائے۔ یعنی تکمیلی افراد کی کمی شروع ہو جائے، تو یہ تکمیلات کا تقلیلی عمل ہے جو غیر تکمیلی تنزل پذیر معاشرے میں بروئے عمل آتا ہے۔

ہر نئی تکمیل دو محاذ پر جدوجہد کا آغاز کرتی ہے، اول موجودہ تکمیلات کے خلاف اور دوم، نئے مسائل کے لئے جدوجہد جو اس نے پیدا کئے ہیں، جن کو حل کرنے کے لئے اور نئی تکمیلات کی ضرورت پیدا ہوتی ہے چونکہ اس نے اُن پرانے مسائل کا حل پیش کر دیا ہوتا ہے جو سابقہ تکمیلات نے پیدا کئے ہیں۔ اس لئے زیادہ لوگوں کے کام، مقاصد اور مفادات اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اس کا دائرۂ اثر وسیع تر ہو جاتا ہے جو معاشرے میں نئی صلاحیتوں، نئی استطاعتوں، نئی اہلیتوں، نئے تصورات، نظریات، نئے طریق کار، نئی طرز معاشرت نیا طرز فکر و استدلال اور نئے تعلقات اور نئی تنظیم پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا ہر نئی تکمیل معاشرے میں زیادہ علم و فکر، زیادہ عمل اور تجربہ، زیادہ فہم و ادراک، زیادہ ذہنی اور عملی ڈسپلن (تنظیم و انضباط) کی راہیں کھولتی ہے۔ جو معاشرے کو نئی سے نئی تکمیلات کی طرف سمت بند کر دیتی ہیں۔

مگر غیر ترقی پسند معاشرے میں تکمیل کا عمل تقلیل یا کمی کی جانب ہوتا ہے نئی تکمیلات کی تردید اور مخالفت کو عمل، تجربہ اور حقائق کی روشنی میں جانچنے کی بجائے تصورات، نظریات اور عقائد اور اُن سے وابستہ معاشری تعلقات اور مفادات کی قربان گاہ پہ بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس طرح نئی تکمیلات کا نقدان شروع ہو جاتا ہے۔ سابقہ تکمیلات غیر حقیقی اور غیر ضروری ہو جاتی ہیں اور اُن کو کورانہ تقلید کے انداز میں دہرایا جاتا ہے جس سے اُن کا معاشری مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ غیر تکمیلات بن جاتی ہیں۔ ان بدلتے ہوئے حالات اور ماحول میں ضروری تکمیلات میں کمی یا تقلیل بھی شروع ہو جاتی ہے۔ نئی تکملات کا نقدان ضروری تکمیلات کی کمی اور غیر ضروری تکمیلات کی زیادتی سارے معاشرے کو تنزل پذیر اور انحطاط پذیر معاشرہ بنا دیتی ہیں۔ جس میں تکمیلات کے تقلیلی عمل پر غور و فکر نہیں کیا جاتا۔ حقائق کی تلاش نہیں کی جاتی، علم و ہنر میں ترقی نہیں ہوتی، دلیل اور منطق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، اندھی تقلید اور توہم پرستی کا زور ہو جاتا ہے اور پرانے عقائد اور نظریات اور عقائد کا غلبہ ہو جاتا ہے جو علمی و عقلی صداقت اور معاشری حقیقت اور ضرورت سے عاری ہو جاتے ہیں اور سارا معاشرہ وابستہ مفادات، تعلقات اور تنظیموں میں ٹھٹھر کر منجمد ہو جاتا ہے۔

ہر نئی تکمیل اپنے تکمیل گر کے لئے باعث فخر و افتخار ہوتی ہے۔ اپنے ملک و معاشرہ، قوم و ملت کی فلاح و بہبود اور بقا و سلامتی کی ضامن ہوتی ہے۔ اُن کی ترقی اور تاریخ کی جزو لاینفک بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس، ہر غیر تکمیل افراد اور معاشرے، ملک و ملت کی زندگی اور تاریخ میں ایسا خلا اور کمی پیدا کرتی ہے جو اُن کی ترقی کو روکتی، اُن کی فلاح و بہبود، خوشحالی اور آسودگی کو کم کرتی اور اُن کی بقا و سلامتی، بلکہ اُن کے وجود کو بھی معرض خطر میں ڈالتی ہے۔

ہر تکمیل کا تاریخی وقت مقرر ہے۔ اگر اپنے وقت کے بعد اُسے حاصل کیا جائے تو اس خلا اور تقلیل کی کما حقہ تلافی نہیں ہوتی۔ جو تکمیل کی تاخیر سے پیدا ہوئی، کیونکہ فرد یا افراد کی اپنی زندگیوں پر اور ملک و معاشرہ اور قوم و ملت کی تاریخ پر اس تاخیر سے ایسے اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ جن کو مٹایا نہیں جاسکتا، گو اُن کی نوعیت ویسی نہیں رہتی جیسی مستقل غیر تکمیل کے اثرات و نتائج کی ہوتی ہے۔

اپنی اجزائے ترکیبی یا عناصر کی بنا پر تکمیلوں کی پانچ قسمیں ہوتی ہیں۔ علمی، عملی، معاشری قدرتی اور تاریخی۔ یہ فرق ان عناصر کی اپنی اپنی نوعیت اور حصّے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً علمی تکمیلات میں بظاہر عمل کا کوئی حصّہ معلوم نہیں دیتا مگر یہ خیال غلط ہے۔ ہر علمی تکمیل مثلاً فلسفانی نظریہ یا تھیوری، فکری تصنیف یا سائنسی دریافت یا فنی یا ٹیکنیکل ایجاد بغیر عمل یعنی انسانی حرکت اور کام کے ناممکن ہوتی ہے۔ علاوہ بریں ہر علمی تکمیل انسانی ذہن کی حرکات کا نتیجہ ہوتی ہے جسے دماغی کام کہا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ خیال بھی غلط ہے کہ عملی کام مثلاً اقتصادی پیداواری کام یا پیشہ یا کوئی جسمانی افعال مثلاً ورزش وغیرہ میں علم و فکر کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ کوئی انسانی فعل خواہ کتنا ہی میکانکی یا جسمانی حرکات پر مشتمل کیوں نہ ہو، خیال اور مقصدیت سے خالی نہیں ہوتے، جو دماغی اور علمی کام ہیں۔ بلکہ عملی تکمیل جتنی زیادہ عظیم ہوگی اتنی ہی زیادہ علم و فکر کی محتاج ہوگی۔ جیسا کہ ٹیکنالوجیکل، صنعتی اور انجنیئرنگ کی ایجادات اور تکمیلات سے ظاہر ہے۔ یہی کیفیت قیادت کی تکمیلات کی ہے۔ مثلاً سیاسی اور فوجی قائدین کو جنہیں عموماً "مردانِ عمل" (men of action) کہا جاتا ہے۔ تبھی عظیم تکمیلات حاصل کر سکتے ہیں جب اُن کی تکمیلات علم و فکر پر مبنی ہوں۔ یہی کیفیت معاشری، تمدنی اور قدرتی یا سائنسی تکمیلات

کی ہے۔ ہر ایک میں علم، عمل، معاشرہ اور قدرت کا حصہ ہوتا ہے۔

تاہم ان پانچ عناصر میں ایک بنیادی فرق ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔ تین عنصر یعنی علم یا شعور، عمل اور معاشرہ خالصتاً انسان کے پیدا کردہ عناصر ہیں، مگر چوتھا عنصر، قدرت، غیر انسانی عنصر ہے اور پانچواں عنصر یعنی وقت، "تاریخ اور تغیر" کا تابع ہے جو انسان کے تابع بھی ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ انسانی عناصر مقصدیت کے حامل ہوتے ہیں یعنی ان کو انسان کسی خواہش، مقصد یا ضرورت کے تحت بروئے کار لاتا ہے۔ وہ انہیں اپنے کام کی تکمیل اور اپنے گروہ یا معاشرے کے لئے مفید یا ضروری یا اچھا یا بُرا تصور کرتا ہے۔ مگر قدرت کا عنصر، یعنی قدرت کے قوانین، عوامل، مظاہرات، وسائل اور ذرائع جنہیں انسان اپنی خواہش، مقصد، یا ضرورت کے تابع کر کے اور اُن پر قابو اور عبور حاصل کر کے اپنے کام، خواہش یا مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے، خود انسانی مقصدیت سے خالی اور بالاتر ہوتے ہیں۔ قدرت غیر جانبدار قوت ہے۔ اس کی نظر میں انسانی خواہشات اور مقاصد، انسانی بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی، خوشحالی اور بدحالی، صحت اور بیماری، خوشی یا رنج، ترقی اور تنزل، موت اور زندگی سب یکساں چیزیں ہیں۔ یہ انسانی زندگی، ذہن و شعور اور معاشرہ فیصلہ کرتے ہیں کہ قدرت کی قوتوں عوامل، قوانین، وسائل اور ذرائع کو کن اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کرنا ہے۔ آیا انہیں اچھے یا بُرے، نیک یا بد، مفید یا غیر مفید، ضروری یا غیر ضروری، حیات پرور یا حیات کش اور خوشحالی اور آسودگی بڑھانے یا خوشی یا دکھ یا تباہی اور بربادی پھیلانے والے کاموں اور اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرنا ہے یا نہیں۔ چونکہ ہر ایک تکمیل قدرت پر عبور اور قابو حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے وہ تکمیلی فرد، گروہ یا طبقوں کے اغراض و مقاصد حاصل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ مگر قدرت کی ہر ایک تکمیلی تسخیر اور عبور معاشری تعلقات اور نظریات قائم کرتا ہے۔ جو معاشرے میں دوسرے افراد، گروہوں اور طبقوں کے اغراض و مقاصد سے تضاد اور مخالفت پیدا کرتے ہیں۔ جس سے افراد، گروہوں اور طبقوں میں مخالفت، کشمکش اور جدوجہد اور جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جس میں وہ فرد گروہ اور طبقہ جیتتا ہے جو قدرت کے نئے عوامل، حقائق اور قوانین کا سہارا لیتا ہے۔ جو

دوسرے افراد، گروہوں اور طبقوں کی نسبت حقیقت، صداقت اور معاشری ضرورت پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک تکمیل اول سے آخر تک علمی صداقت، نظریاتی حقیقت اور معاشری ضرورت کی جد و جہد کی بنا پر شروع ہو کر غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی صورتوں پر ختم ہو جاتی ہے اور ان تغیرات کے دوران اپنی علمی صداقت، نظریاتی حقیقت اور معاشری ضرورت کھو دیتی ہے۔

اس بنیادی اور اٹل فرق کے باعث تکمیل کا پانچواں پہلو یعنی وقت کا عنصر ہمارے سامنے آتا ہے اور قابل غور بن جاتا ہے۔ اس کی صداقت، حقیقت اور ضرورت کا مسئلہ ہے۔ ہر انسانی کام خواہش، مقصد، سکیم اور پلان کی تکمیل ابھی وقت تک صحیح، سچی، حقیقی اور ضروری ہوتی ہے۔ جب تک وہ قدرت کے قوانین، عوامل، مظاہر اور حقائق کے مطابق ہو، مگر یہاں ایک تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ ہر انسانی فعل اور تکمیل انسانی علم و عقل و شعور، انسانی زندگی، عمل اور معاشرے کے اپنے اغراض و مقاصد، ترغیب اور محرکات کے تابع ہوتی ہے جو کبھی بھی قدرت کے حقائق اور قوانین وغیرہ کے کاملاً مطابق نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انسانی علم و شعور، عقل و استدلال اور معاشرہ اپنے زمانے اور اپنے دور کے موجودہ مؤثر تکمیلات کے تابع ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں اور قدرت کے عوامل، قوانین اور حقائق میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو اس امر کا مقتضی ہوتا ہے کہ ہر ایک تکمیل کو پورا کرنے کے لئے انسانی علم و عقل، عمل اور معاشرہ قدرت کے ایسے نئے حقائق، قوانین، عوامل، مظاہرات، وسائل اور ذرائع کی تلاش اور سعی کی جائے جو انہیں زیادہ سے زیادہ صداقت، حقیقت اور ضرورت کی حامل بنا دیں۔ بالفاظ دیگر انسان اور قدرت کا یہ تضاد انسانی علم و عقل کو بڑھا کر یعنی انسانی علم و عقل، عمل اور معاشرے کو قدرت کے حقائق، عوامل اور قوانین کے مطابق بنا کر، نئے قدرتی قوانین، عوامل، مظاہر، وسائل اور ذرائع دریافت اور ایجاد کر کے اور انسانی طور و طریقوں، طرز فکر اور استدلال، معاشری تنظیموں اور تشکیلوں کو قدرتی ضروریات اور قوانین کے مطابق بنا کر اور بدل کر ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ فرق نئی تکمیلات حاصل کر کے اور جو تکمیلات غیر تکمیلات، خلاف تکمیلات اور عدم تکمیلات بن گئی ہوں اُن کو بدل کر یا ترک کر کے ہی مٹایا جا سکتا ہے مگر چونکہ یہ تضاد کلیتاً مٹ نہیں سکتا بلکہ

صرف اضافی طور پہ سابقہ تکمیلات سے مقابلتاً کم ہو جاتا ہے۔ اس لئے حتمی طور پر ان مٹ ہوتا ہے۔
انسانی علم و عقل، عمل اور معاشرے کیلئے لامتناہی چیلنج کی صورت میں مسلسل اور مستقل طور پر نئی تکمیلات کا متقضی۔ دراصل اس چیلنج اور اس تقاضے ہی سے انسانی علم اور عقل و شعور معاشرہ اور تاریخ ترقی کرتی ہیں وہ جتنا زیادہ اس چیلنج کا مقابلہ اور اس تقاضے کو پورا کریں گی اتنا ہی زیادہ انسانی زندگی معاشرہ اور تاریخ صداقت حقیقت اور ضرورت کے "صاف اور قوت سے مالا مال ہوں گی۔

پس ہر نئی تکمیل کی ابتداء سابقہ تکمیلات سے حاصل شدہ علم اور عقل و شعور کی کمی اور ناقصیت سے شروع ہوتی ہے اور علم و عقل، عمل اور معاشرے کی نئی صداقت، حقیقت اور ضرورت پر ختم ہوتی ہے جو انسانی زندگی اور معاشرے کی بقا اور سلامتی، فروغ اور خوشحالی، کامیابی اور قوت کی ضامن ہوتی ہیں اور فرد کی کامیابی اور حصول مقصد کا باعث بھی بنتی ہیں۔ اس عمل (پروسس) میں بعض دوسرے افراد اور گروہ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح نئی تکمیل تعاون اور اشتراک عمل کو بھی بڑھاتی ہے مگر اس سے نئی اور پرانی تکمیلات کا تضاد اور بھی شدید تر ہو جاتا ہے۔ جب کوئی نئی تکمیل وقوع پذیر یا وجود پذیر ہوتی ہے تو اس سے متعلق سابقہ تکمیلات کی صداقت، حقیقت اور ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ مگر معاشرے میں بعض ایسے افراد، گروہ اور طبقے موجود ہوتے ہیں جو اپنے وابستہ مفادات، تعلقات، نظریات، عقائد اور اداروں کے باعث اس حقیقت اور ضرورت اور نئے حالات اور تبدیلی کو تسلیم نہیں کرتے، بلکہ نئی تکمیل کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں یہ مخالفت ایسا تضاد ہے جو نئی تکمیل کی ترقی اور تطہیر کے لئے بہت ضروری ہے، نئے اور پرانے تکملی، افراد، گروہوں اور طبقوں کی جدوجہد، مخالفت اور مخاصمت سے نئی تکمیل زیادہ سے زیادہ صورت میں صداقت، حقیقت اور ضرورت کی حامل ہو گی۔ اور نئے نئے خیالات، نظریات فلسفے اور تصوریاں نئی نئی ایجادات، اختراعات اور انکشافات ہوں گے، جدید انداز نئے طور اور طریقے اور نئے طرز فکر و عمل رائج ہوں گے۔ اور پرانی تکمیلات فرسودہ، غیر حقیقی، باطل اور غیر ضروری قرار دے دی جائیں گی۔

یہ تکمیل کا ارتقائی عمل ہے جو بذریعہ جدل و تضاد ہمیشہ نئی تکمیلات کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔ یہ تکمیلات سابقہ تکمیلات سے زیادہ معقول صحیح اور حقیقی ہوتی ہیں اور انسانی زندگی

معاشرہ اور قدرت کے حقائق کی حامل اور ان پر زیادہ حاوی ہوتی ہیں، زیادہ سچی اور زیادہ منطقی ہوتی ہیں۔ اس لئے زیادہ ذہنی اور عقلی عملی اور فکری صلاحیتوں اور اہلیتوں کی مقتضی ہوتی ہیں، اُن سے عمل زیادہ حقیقت پسندانہ زیادہ غور و فکر، زیادہ کارگر ( ) عادات اور استعداد کا حامل ہو جاتا ہے جو کم وقت میں زیادہ نتائج برآمد کرنے اور کم وقت میں جلد تر مقصد حاصل کرنے کا اہل ہو جاتا ہے۔ ایسے عمل والے افراد اور لوگ زیادہ اہل، زیادہ ثابت قدم اور زیادہ دوربین، زیادہ باشعور اور زیادہ مستقل مزاج کردار کے مالک ہو جاتے ہیں۔ یہ ارتقائی عمل یک طرفہ (uni-dimensional) عمل ہوتا ہے یعنی ہر ایک تکمیل اپنے اجزائے ترکیبی کی تشکیل اور تاثیر میں بڑھنے اور وسعت پذیر ہونے کا رجحان رکھتی ہے، اس لئے نئی تکمیلوں کے راستے کھولتی ہے۔ جسے ترقی کہتے ہیں۔

مگر ہر تکمیل ایسی مخالفت بھی پیدا کرسکتی ہے جو نئی تکمیلات کے راستے مسدود کرنے
ہر نئی تکمیل دو طرح کے تضاد پیدا کرتی ہے۔ اول سابقہ تکمیلات کے خلاف جنہیں وہ فرسودہ بے فائدہ اور غیر ضروری قرار دے دیتی ہے، دوم قدرت کے قوانین، عوامل اور حقائق میں فرق
پہلا تضاد معاشرتی تضاد ہے جو معاشرے کو تبدیل کرنے اور نیا معاشرتی نظام تشکیل کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ دوسرا تضاد علمی اور فکری ہے جو نئے تصورات، نئے افکار اور نئے نظریات وغیرہ کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن اگر معاشرے میں ایسے گروہوں اور طبقوں کو غلبہ اور تسلط حاصل ہو جائے جو اپنے وابستہ مفادات، تعلقات، نظریات وغیرہ کی وجہ سے ان تقاضوں کو پورا کرنے کے اہل نہ ہوں، تو ان کی مخالفت نئی تکمیلات کے راستے بند کردے گی، مگر قدرت اُن کی تمام تکمیلات کو جن پر اُن کی زندگی اور معاشرہ قائم ہیں، غیر تکمیلات، خلاف تکمیلات اور عدم تکمیلات میں تبدیل کردے گی، کیونکہ وہ قدرت کے قوانین، عوامل اور حقائق سے بتدریج خالی ہو جائیں گے۔ ہر ایک تکمیل صرف اپنے وقت اور حالات میں ہی ضروری، حقیقی ناگزیر اور سچی ہوتی ہے، مگر وہ جونہی وجود پذیر ہوتی ہے۔ حالات بدلنے شروع ہو جاتے ہیں جو اسے غیر ضروری، غیر حقیقی اور غیر سچی بنانا شروع کردیتے ہیں اس لئے نئی تکمیل کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اگر اس ضرورت کو پورا نہ کیا جائے تو پرانی تکمیل غیر تکمیل بن جاتی ہے اور اگر پھر بھی اس کی حمایت کی جائے تو یہ

خلاف تکمیل بن جاتی ہے۔ اور اگر کوئی اور معاشرہ یا قوم یہ نئی تکمیل حاصل کر کے غیر تکمیلی معاشرے سے متصادم ہو۔ تو اس کی غیر تکمیل اور خلاف تکمیل، عدم تکمیل بن جائے گی۔ یہ نتائج تقلیل تکمیل کے عمل کے نتائج میں جو نئی تکمیلات کی مخالفت سے شروع ہوتا ہے اور عدم تکمیلات پر ختم ہوتا ہے یہ عمل بھی ایک طرفہ سمت بندی کا حامل ہے، یعنی اس کے اثرات اور نتائج بھی بڑھنے اور وسیع تر ہونے کا رجحان رکھتے ہیں، جن سے معاشرے میں انحطاط، تنزل اور زوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ عمل معاشرے میں غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی افراد، گروہوں اور طبقوں کے اثر و نفوذ میں اضافہ کرتا ہے اور معاشری سپکٹرم میں اُن کی تعداد اور غلبے کو بڑھاتا ہے اسلئے تکمیلی افراد، گروہوں اور طبقوں کا خاتمہ کرتا ہے۔

کسی خاص معاشرے میں تکمیل کا ارتقائی عمل کب اور کیوں رُوک جاتا اور تقلیلی عمل کب اور کیوں شروع ہو جاتا ہے؟ اس سوال کا حل معاشرے کی حیاتیاتی قوتوں میں ملتا ہے۔ جو دو طرح کی ہوتی ہیں، یعنی پیداواری اور جنسی۔ پہلی قوتیں ضروریات زندگی کو پیدا کرتی اور بڑھاتی ہیں اور دوسری قوتیں آبادی کو جاری رکھتی اور بڑھاتی ہیں۔ ان میں ایک بنیادی فرق ہے جو انہیں قابل حیات یا غیر قابل حیات بنا سکتا ہے۔ پیداواری قوتیں براہ راست تکمیلی قوتوں کی محتاج اور منحصر ہوتی ہیں۔ کیونکہ محنت و مشقت، جستجو، تلاش اور کوشش و کاوش کے بغیر ضروریات زندگی کی پیداوار اور اضافہ اور فروغ ناممکن ہوتے ہیں، مگر جنسی قوتیں براہ راست تکمیلی قوتوں کی محتاج نہیں ہوتیں، کیونکہ ہر شخص خواہ وہ کتنا ہی غیر تکمیلی کیوں نہ ہو، بچے کا باپ یا ماں بن سکتا یا سکتی ہے البتہ معاشرے کی وجہ سے یعنی بالواسطہ طور پر جنسی قوتیں بھی تکمیلات کی محتاج ہوتی ہیں لہٰذا انسانی معاشرے میں انہیں ربط و ضبط میں لانے کی ضرورت ہوتی ہے یہ انضباط شادی بیاہ کے رسم و رواج اور قوانین، خاندانی تنظیم اور نظام، ضبط اولاد یا کثرت اولاد کے اصولوں کے ذریعے قائم کیا جاتا ہے۔ جو مختلف معاشری اداروں، طور طریقوں، طرز معاشرت اور تکمیلی نظریات اور فلسفہ کی صورتوں میں قائم اور مروج ہوتے ہیں۔ یہ جنسی ادارے، طرز معاشرت اور فکر و نظر تکمیلی ہوتے ہیں۔ اگر وہ پیداواری قوتوں کو تکمیلی بنائیں۔ یعنی تخلیقی اور پیداواری قوتوں میں کوئی ایسا خلل یا کمی نہ پیدا کریں جو ضروریات زندگی کی پیداوار کو جاری رکھنے اور بڑھانے میں مانع

یا خارج ہوں، مگر یہ جنسی ادارے اور طور طریقے وغیرہ غیر تکمیلی، خلاف تکمیل یا عدم تکمیلی بن جاتے ہیں جب وہ تخلیق اور پیداوار کے ذرائع اور وسائل کی تکمیلات میں کمی یا تقلیل کا باعث ہوں اور اسطرح تخلیقی و پیداواری قوتوں کو کم کریں جو ہر حال اور ہر دور میں ترقی پذیر رہنی چاہئیں۔

تکمیل کے تغیرات کی مثالیں

انسانی معاشرہ اور تاریخ تکمیل کی تغیرات سے بھری ہوئی ہیں درحقیقت انسانی زندگی، معاشرہ اور تاریخ ان تغیرات کے باعث وجود پذیر ہوتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ ان کی مثالیں لاتعداد ہیں۔ حصول علم ہر انسان کی زندگی کا تقاضہ ضرورت اور فریضہ ہے۔ مگر بہت سے لوگ غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور اس طرح علم و دانش کے دروازے اپنے لئے بند رکھتے ہیں۔ یہ اُن کی غیر تکمیلی حالت ہے جو اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ انہوں نے تعلیم حاصل کرنے کے مواقع کھو دیئے یا کوشش اور محنت نہیں کی یا وہ غیر تکمیلی معاشرے میں رہتے تھے جس کا معاشرتی، تمدنی، اقتصادی یا سیاسی ماحول اور ڈھانچہ حصول علم کے ضروری اور مساویانہ مواقع فراہم کرنے کے مانع تھا۔ اگر کوئی شخص اپنی غیر تعلیم یافتہ حالت کے باعث یا تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ایسے عقائد اور نظریات یا رویوں کا حامل ہو جو اسے تعلیم کا مخالف بنا دیں تو اس کی مخالفت ایسا فعل ہے جو خلاف تکمیل ہوگا۔ مثلاً جیسا کہ پردہ سوسائٹی میں اکثر ہوتا ہے وہ تعلیم نسواں کی اور خاص طور پر اپنی لڑکیوں کی تعلیم کا مخالف ہو تو اس کے یہ نظریات اور خیالات اور مخالفت خلاف تکمیلی ہوں گے۔ ایک اور مثال یہ ہوتی ہے کہ کوئی شخص علم کے تو خلاف نہیں مگر کسی خاص قسم کے علم یا فن، سائنس یا فلسفے کے خلاف ہے۔ یہ مخالفت بھی خلاف تکمیلی نوعیت کی ہے اور ایسے مخالفانہ فعل خلاف تکمیلات ہیں۔

اقتصادی زندگی میں بھی ایسی مثالیں بے شمار ملتی ہیں۔ ایک کاشت کار خاص قسم کے زرعی آلات، تخموں اور طریقوں کے ذریعے اپنے ہمسایوں سے زیادہ اجناس پیدا کرتا ہے مگر اس کا کوئی ہمسایہ بہتر آلات، تخم یا طریقے استعمال کر کے اس سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس صورت حال میں لازم ہے کہ پہلا کاشت کار بھی نئے اور بہتر آلات، بیج اور طریقے استعمال کر کے اپنی زرعی پیداوار کو بڑھائے۔ مگر اپنی غفلت، کاہلی جہالت، قدامت پسندی، نظریات، عقائد یا اپنی خاص طرز زندگی وغیرہ کے باعث وہ

ایسا نہیں کرتا اور پرانے اور فرسودہ طریقوں، آلات وغیرہ کو استعمال کئے جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ بھی غیر تکمیلی بن جائے گا۔ اگر وہ نئے طریقوں، آلات اور بیجوں وغیرہ کی کسی وجہ سے مخالفت کرتا ہے۔ تو اس کے پرانے طریقے، وغیرہ خلاف تکمیلی بن جائیں گے۔ ایک کاریگر مثلاً جولاہا اپنے مروجہ آلات اور طور وطریقوں سے دن میں ایک خاص تعداد گز کپڑا بن لیتا ہے۔ مگر اس کے کسی ہمسایہ نے کوئی نئی ایجاد، آلات اور طریقوں کو استعمال کر کے اس سے زیادہ گز کپڑا بننے لگا۔ اب اگر پہلا جولاہا کسی وجہ سے نئے آلات اور طریقے نہیں اپناتا۔ تو اس کا یہ طرز عمل غیر تکمیلی ہوگا۔ اور اگر وہ کسی وجہ سے اُن کی مخالفت بھی کرتا ہے تو اس کا یہ فعل خلاف تکمیلی فعل کہلائے گا۔

ایسی تغیرات انسانی زندگی اور معاشرے کے ہر شعبے اور میدان میں پائی جاتی ہیں، خواہ وہ علمی اور فنی ہوں، یا زرعی، صنعتی، حرفتی اور تجارتی ہوں، سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے ہوں، یا ریاست، حکومت، سیاست اور نظم ونسق کے مسائل معاملات اور پالیسیاں ہوں۔ جنگ اور دفاع کے معاملات اور مسائل ہوں یا علم وہنر کی ترقیات کے معاملات اور مسائل ہوں۔

سامراجیت اور نوآبادیت کے موجودہ دور میں عدم تکمیلات کی لاتعداد مثالیں ملتی ہیں۔ مغل سلطنت میں ڈھاکے کی ململ بانی عالمی حیثیت کی تکمیل ہوتی تھی۔ مگر اٹھارویں صدی کے اواخر میں انگلستان میں کپڑا سازی کی صنعت میں کئی ایسی تکمیلات یعنی ایجادات، دریافتیں، ترقیاں، اور تبدیلیاں واقع ہوئیں جن کے نتیجے میں دستکاری طریق پیداوار کی بجائے مشینی طریق پیداوار مروج ہو گئے۔ اگر اس وقت مغل کپڑا ساز، کاریگر، نورباف، صنعت کار اور مغل حکومت ان نئی ایجادات وغیرہ کا تکمیلی مقابلہ کرتے تو وہ اپنی سابقہ حیثیت کو برقرار رکھ سکتے تھے۔ مگر ان کی غیر تکمیلی طرز زندگی، طرز فکر وعمل معاشرت، اُن کی غفلت شعاری اور لاپرواہی اور فرسودہ طریق پیداوار اور تعلقات اور طرز حکومت نے ان کی تکمیل کو نہ صرف غیر تکمیل میں بدل دیا۔ بلکہ برطانوی مقابلے نے اُسے عدم تکمیل میں بھی بدل دیا۔ اس طرح مغلوں اور بنگال کے نوابوں کا سارا نظام حکومت اور معیشت، عدم تکمیلیت کا شکار ہو گیا۔ عدم تکمیلات کی مثالیں سترھویں اور اٹھارویں صدی سے لیکر جب مغربی سامراجیت کا آغاز ہوا۔ آج تک مشرقی ممالک میں عموماً اور مسلم ممالک میں خصوصاً پائی جاتی ہیں۔ بلکہ اُن کی تعداد ہر روز اور ہر لحہ بڑھتی جا رہی ہے جو ایک طرف تو اُن ممالک میں پسماندگی، انحطاط اور

جمود پیدا کر رہی ہے اور دوسری طرف ترقی یافتہ ممالک میں سامراجیت اور نوآبادیت کو جنم دے رہی ہے۔ مثلاً جب امریکہ اور روس نے ایٹمی اور نیوکلیر بموں کی ایجاد کر لی، تو ان سامراجی ملکوں نے یکایک ساری دنیائے انسانی کے سامنے عدم تکمیل کی ایک وسیع خلیج پیدا کر دی، جو پسماندہ ممالک کی بقا اور سلامتی کے لئے خطرناک نتائج کی حامل ہے۔ یہ عدم تکمیلی حالت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک دنیا کے تمام پسماندہ یا کم ترقی یافتہ ممالک کے سائنسدان انجنیئر، موجد، ماہرین ٹیکنالوجی، پروفیسر اور سیاست دان وغیرہ بھی نیوکلیر ہتھیار بنا کر اس عدم تکمیل کو ختم نہیں کر دیتے جو در حقیقت ان کے غیر تکمیلی اذہان، کردار، عادات و خیالات، نظریات اور طرزِ معاشرت و معیشت اور آئیڈیالوجی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، یا امریکی اور روسی سامراجی طاقتیں اور ایسی دوسری سامراجی طاقتیں جو ایٹمی اور نیوکلیر ہتھیاروں سے لیس ہیں، پسماندہ ممالک اور اقوام کو ختم نہیں کر دیتیں۔ یہ طاقتیں اپنی نئی نئی تکمیلات سے ہمیشہ پسماندہ اور انحطاط پذیر قوموں کی قبریں کھودتی رہتی ہیں۔

معاشرہ اور تکمیل گری

معاشرہ اور اسکے بنیادی عوامل، معاشرت اور معیشت

انسانی معاشرے کی ابتدا اور ارتقا کے دو بنیادی عوامل معاشرت اور معیشت ہیں۔ انسان معاشرت پسند ہستی ہے۔ وہ دوسرے انسانوں سے میل جول ارتباط و اختلاط کے تعلقات کا خواہاں ہے۔ ان خواہشات اور میلانات میں جنسی خواہشات معاشی خواہشات اور غلبہ اور جارحیت کے جذبات انسان کو معاشری تعلقات اور ارتباط و اختلاط اور مخالفت اور مخاصمت پر سب سے زیادہ متحرک کرتے ہیں۔ جن سے معاشری میل جول کے گروہ اور اجتماعات وجود میں آتے اور بدلتے رہتے ہیں ان میں بعض وقتی اور عارضی ہوتے ہیں مثلاً دوستوں کی محفلیں اور بعض زیادہ پائیدار اور مستقل نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بعض کے محرکات اور مقاصد جنسی اور تناسلی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس لئے حیاتیاتی گروہ کہلاتے ہیں۔ مثلاً کنبہ اور خاندان، خیل اور قبیلہ، ذات پات اور برادریاں وغیرہ۔ دوسرے گروہ معاشی، اقتصادی تمدنی، علمی، فنی، سیاسی اور دوسرے مقاصد اور مفادات کی خاطر قائم کئے جاتے ہیں

مثلاً طبقے، سیاسی جماعتیں، تمدنی، فنی اور علمی انجمنیں اور ادارے سوسائٹیاں اور کلب، قانون، حکومت اور انتظامیہ کے ادارے اور محکمے بعض گروہ جغرافیائی محل وقوع سے متشکل ہوتے ہیں۔ مثلاً گاؤں قصبے، شہر، صوبے، ملک اور ریاست بعض سیاسی اور معاشری اور تمدنی نظریات اور مقاصد کی بنا بناپر قائم ہوتے ہیں، مثلاً وطن، قوم، لوگ، عوام اور بعض بین الاقوامی نوعیت کے ہوتے ہیں ان تمام تعلقات اور مخالفتوں، گروہوں اور گروہ بندیوں کی تشکیل اور تغیر کا مقصد صرف انسانی زندگی کی بقا، سلامتی اور تحفظ، فروغ اور وسعت ہے تاکہ معاشرہ قوم و ملک نسل در نسل جاری وساری ہیں

تکمیل گری کی سمت بندی اور معاشرے کی تشکیل و ترقی

میل جول، ارتباط و اختلاط، عمل اور ردِّ عمل، باہمی عمل اور تعاون تضاد، مخالفت اور مخاصمت ایسے عوامل ہیں جو انسان کی زندگی اور معاشرے کو ہر وقت بنانے، بدلتے، بگاڑتے اور سنوارتے رہتے ہیں۔ ہر فرد ہر وقت کسی نہ کسی طرح کے تعلقات اور گروہ میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ بلکہ وہ ایک گروہ سے نکلتا ہے تو دوسرے گروہ میں شریک ہو جاتا ہے بسا اوقات وہ ایک تعلق اس لئے توڑتا ہے کہ دوسرا تعلق جوڑنا چاہتا ہے۔ اور یہ چکر ساری عمر جاری رہتا ہے۔ اس معاشری عمل کی بنیاد فرد کے ذہن و کردار، عادات اور خیالات، نظریات اور رویوں اور شوق و شغف پر ہوتی ہے جو اسے کام اور کوشش، محنت و مشقت، عمل اور تکمیل پر راغب اور مصروف رکھتے ہیں۔ اس طرح لاکھوں کروڑوں مردوں اور عورتوں، بڑوں اور چھوٹوں، نوجوانوں اور بزرگوں کی حرکات و سکنات، اعمال اور تکمیلات سے معاشرہ متشکل اور متبدل ہوتا رہتا ہے۔ معاشرہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ مگر ایسے تغیرات جو انسان اپنی بامقصد کوشش اور تکمیل سے لائے ترقی کہلاتے ہیں۔

معاشرے میں ہر ایک کام اور کوشش، عمل اور تکمیل تضاد اور تصادم پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ ذرہ بھر حرکت بھی مخالفت اور مخاصمت کا باعث ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر فرد و بشر کی حیاتی صورت حال، جائے وقوع، مشاہدات اور تجربات اس کے ذہن و فکر، عادات اور کردار پر دوسروں کی نسبت مختلف اور متضاد اثرات اور رجحانات مرتب کرتے ہیں۔ اس اختلاف اور تضاد سے مختلف افراد اور گروہوں میں مخالفت اور مخاصمت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر کوئی اختلاف

اور تضاد ایسا نہیں جو مزید یعنی نئے علم شعور اور نئے فکر و استدلال اور تنقید و تبصرے سے اشتراک عمل اور تعاون میں بدلا نہ جا سکے' جو نئے کام اور نئی کوشش' نئے عمل اور نئی تکمیل سے مخالفت اور مخاصمت کو باہمی عمل اور تعاون میں بدل کر معاشرتی ارتباط و اختلاط کو بڑھائے گا پس ہر نیا تضاد اور تصادم' خواہ وہ مفاد کا ہو یا مقاصد کا' خیالات اور نظریات کا ہو یا طریق کار کا' نئے خیالات اور نظریات' نئے کام اور نئے طریق کار' نئی محنت و مشقت' نئی کوشش اور نئی جد و جہد اور نئی تکمیلات سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر نئی تکمیل نیا تضاد پیدا کرتی ہے اور ہر نیا تضاد نئی تکمیل کا تقاضا کرتا ہے۔ جو صرف نئے علم و فکر' نئے عقل و استدلال اور نئے عمل اور کام ہی سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہ معاشرے کا جدلیاتی عمل (پروسس) ہے جو اس کے ارتقاء اور ترقی' فروغ اور وسعت کے لئے ضروری اور ناگزیر ہے۔ مگر معاشرے کی تہذیب و تمدن مذہب و عقائد' نظریات اور آئیڈیلوجی' رسم و رواج اور اخلاقیات' قانون اور انتظامیہ سیاسی نظام اور طرز حکومت کی تاحال تکمیل شدہ تشکیل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ یہ جدلیاتی عمل رو بہ تکمیل تو ہے کہ نہیں۔ اگر معاشرے کی تشکیل اور صورتحال ایسی ہے کہ وہ فرد کے ذہن' عقل فکر و عمل کو تکمیلات کی جانب سمت بندی کرتی ہو' تو معاشرہ ترقی پسند اور وسعت پذیر ہو گا اس کے برعکس اگر یہ اس جدلیاتی عمل کو روکے یا کمزور کرے تو فرد اور لوگوں میں غیر تکمیلی ذہن و فکر' عادات و کردار پیدا ہوں گے۔

اس سے قبل کہ ہم معاشرے کی تکمیلی اور غیر تکمیلی تشکیل کا تجزیہ کریں' ہم تکمیلی اور غیر تکمیلی ذہن و کردار کا مختصر خاکہ بیان کرتے ہیں۔

تکمیلی ذہن و کردار

تکمیل کا نکتہ آغاز فرد کا ذہن شعور اور کردار ہوتے ہیں۔ ایسے ذہن شعور اور کردار جو نئی اور معاشرتاً ضروری تکمیلات حاصل کرتے ہیں' مخصوص تشکیل اور صورت کے حامل ہوتے ہیں۔ دراصل تکمیلی اور غیر تکمیلی فرد اور معاشرے کا فرق بالآخر ذہن و فکر' عادات' رویوں' صلاحیتوں اور کردار کا فرق ہی ہوتا ہے۔ یہ فرق نہ صرف بنیادی طور پر دو مختلف قسموں (Types) کے افراد پیدا کرتا ہے' بلکہ معاشرے' ملک و قوم کی تکمیلی یا غیر تکمیلی تشکیل اور ارتقا کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ہم کسی قوم' ملک اور

معاشرے کے کل افراد اور آبادی کے تکمیلی اور غیر تکمیلی کرداروں یا شخصیتوں کا سپکٹرم (
تیار کریں تو ہم یہ پیش بینی کر سکتے ہیں کہ وہ قوم، ملک یا معاشرہ ترقی اور خوشحالی کی جانب قدم اٹھا رہے ہیں یا انحطاط اور تنزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس معاشری سپکٹرم کے اندر رنگارنگ کے کرداروں سیرتوں اور شخصیتوں کی بوقلمونیوں میں انفرادی ذہن و کردار کی وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم میں ایک سل ( ) کی ہوتی ہے یعنی وہ قوم، ملک اور معاشرے کی صحت، سلامتی اور بقا کی ایک کڑی ہے یہ کڑی جتنی زیادہ مضبوط ہوگی، اتنی ہی قوم اور معاشرے میں ترقی، مضبوطی اور استحکام پیدا ہوں گے لہٰذا فرد کے تکمیلی یا غیر تکمیلی ذہن و شعور اور کردار کی نشو و نما اور تشکیل ملک، قوم اور معاشرے کی تقدیر اور تاریخ کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔[1] تکمیل کی ترغیب اور رجحان، شوق اور شغف ہر فرد کو اپنے معاشری مشاہدوں، تجربوں اور اثرات سے ملتے ہیں۔ اسی طرح غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی رجحانات، محرکات اور عادات بھی معاشری اثرات، ترغیبات اور عوامل کی ماحصل ہوتے ہیں۔ ہم یہاں ان عادات، رویوں اور صلاحیتوں کا ہلکا سا خاکہ پیش کرتے ہیں، جو تکمیلی اور غیر تکمیلی کردار اور ذہن کے فرق کو بھی واضح کرے گا۔

---

[1] یہاں اس امر کی وضاحت مفید ہوگی کہ جدید علوم میں "تکمیل" کی اصطلاح کو کیا اہمیت حاصل ہے، معاشری علوم میں اس کے علاوہ دو اور اصطلاح میں یعنی ترقی اور ترقیات بھی مستعمل ( ) ہیں مگر ان اصطلاحات سے وہ معنی اور مطالب اخذ نہیں کئے جا سکتے۔ جو اس نئی اصطلاح سے ہوتے ہیں۔ ترقی ( ) اور اس کے مختلف مشتقات، مثلاً ترقی پسند (progressive) یا ترقی پسندی (progressivism) سے پیش رفتگی اور نئے حالات کا رونما ہونا تو ظاہر ہوتا ہے مگر اس انفرادی عامل یا خالق کا پتہ نہیں چلتا۔ جو یہ تبدیلیاں پیدا کر رہا ہے۔ ترقی بامقصد تغیرات کا نام ہے، مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان تغیرات کو برپا کرنے والا یا والے کون ہیں ترقیات (Development) کی اصطلاح اور بھی زیادہ ناموزوں اور مبہم ہے۔ یہ صرف اُن خارجی تبدیلیوں کی طرف تو اشارہ کرتی ہے جو رونما ہوئی یا ہو رہی ہیں، مگر ان انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کی نشاندہی نہیں کرتی جو یہ تبدیلیاں پیدا کر رہی ہیں۔ تکمیل کی اصطلاح اس ابہام اور اشتباہ سے پاک ہے۔ اس سے مراد وہ بامقصد عمل ہے جسے کوئی فرد اپنی ذہنی یا نفسیاتی اور اخلاقی اور کرداری قوتوں، صلاحیتوں اور خوبیوں سے پایۂ تکمیل

تکمیلی ذہن و کردار کا خاکہ

تکمیل گر کے ذہن و کردار لازماً مندرجہ ذیل خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔

کو پہنچاتا ہے' ان عادات' خیالات' رویوں' صلاحیتوں اور خوبیوں کا فقدان یا کمی کسی کام اور مقصد کے حصول میں مانع ہوتی ہے۔ پس تکمیل اس عمل (ریگریس) کا آغاز ہے۔ جو زندگی اور معاشرے کے کسی شعبے یا شعبوں میں بالآخر ترقی (progress اور ترقیات (Development) کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

ان اصطلاحات کے فرق کو پاکستان کی مختصر تاریخ کے بعض واقعات سے بھی واضح کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم ایک اگلے باب میں بیان کریں گے ہمارے ملک میں سابق صدر ایوب خان کے دور حکومت کو "ترقیات" کا دور (Decade of Development) کہا گیا تھا اور جسے ترقیاتی اقتصادیات اور فلسفے کا موڈل یا مثال قرار دیا گیا تھا۔ مگر یہ "ترقیات" اس سانحہ عظیم کو نہ روک سکیں جس نے نہ صرف ان کو خاک میں ملا دیا' بلکہ ملک کو بھی ایک المیے سے دوچار کیا۔ ان نتائج کی وجہ ترقیات کا فلسفہ ہے جو محض خارجی ظہورات یعنی نئے کارخانے کھولنا' بند (ڈیم) بنانے کو ہی ترقی کا راز تصور کرتا ہے اس کی بجائے اگر ان تبدیلیوں اور حالات کی طرف توجہ مرکوز کی جاتی جو تکمیلی افراد اور گروہ پیدا کرتے ہیں تو نہ صرف صحیح اور پائیدار اور محکم ترقیات حاصل ہوتیں' بلکہ ملک و قوم بھی کسی سانحہ اور المیہ کا شکار نہ ہوتے' جو ایوبی "ترقیات" کا ناگزیر نتیجہ تھے محض کارخانے کھولنا اور بند (ڈیم) تعمیر کرنا قوم کو غیر ملکی سامراجی طاقتوں کے قرضوں کے بوجھ نیچے دبانے کے مترادف ہے۔ ترقیات تبھی قوم و ملک کیلئے مفید اور سود مند ہوتی ہیں۔ جب انہیں قوم کا ہر فرد نے اپنی کرداری صلاحیتوں اور تکمیلی قوتوں سے حاصل کرتا ہے۔ تکمیلی صلاحیتوں اور قوتوں کی سمت بندی معاشرے کو غیر تکمیلی' خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی نظریات اور اثرات سے پاک کرنے سے شروع ہوتی ہے۔ یہ کام ایوبی دور کی حکومت' معاشرے اور آئیڈیلوجی کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ اس دور کا سارا معاشرتی سیٹ اپ اوپر سے نیچے تک غیر تکمیلی' خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی افراد اور ایلیت (Elites) سے بھرا ہوا تھا۔

ترقی (پروگریس) کا فلسفہ مقابلتاً زیادہ معقول' بہتر اور انقلابی فلسفہ ہے۔ ترقیات کا فلسفہ خواص (Elites) کو متحرک کرتا ہے جبکہ ترقی کا فلسفہ عوام کی تکمیلی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ مگر اس فلسفے میں دھوکے کی بھی ایک گنجائش ہے جس کے باعث یہ فلسفہ بعض اوقات نئی سامراجی اور مہا سامراجی طاقتوں کا آلہ کار بن کر ترقی اور انقلاب کے در پردہ دوسری قوموں اور معاشروں کو آبادیاتی (Demographical) گرداب میں پھنسا دیتا ہے اور اس طرح نئی سامراجیت اور مہا سامراجیت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ تکمیل کا فلسفہ نہ صرف ایسی دھوکہ دہی اور فریب کاری سے پاک ہے بلکہ یہ ایسی عوامی محرکات

اوّل۔ کام و محنت کی عادات اور رویّے:- ان میں کارکردگی، محنت و مشقت، جانفشانی، مستعدی، قوت برداشت، جفاکشی، باقاعدگی، سلیقہ مندی، پابندی وقت، وقت کی قدر، تکمیل کار کی استطاعت، مہم پسندی، مہم جوئی، خود اعتمادی، تجربہ بازی، ثابت قدمی، پرجوش، سرگرم عمل اور فعال عادات اور رویئے قابل ذکر ہیں۔

دوم۔ اخلاقی اور ذہنی عادات:- ان میں کام اور وقت کی قدر، مقصد کی لگن اور دیانتداری، فرض شناسی، احساس ذمہ داری، استقلال، پہل قدمی، اُپج، مقصدیّت، خود اعتمادی، ہوشمندی، راتے اور فیصلہ کی خودمختاری۔ خود مددگاری، خود انحصاری تجسس، جستجو یا تحقیق پسندی، تجربہ بازی میں مستعدی اور نئے خیالات اور طور و طریقوں کو آزمانے میں مستعدی کا رجحان، حق گوئی، غیر جانبداری واقعیّت پسندی یا خارجی صداقت پسندی، تنقید کا احترام، حقائق کی تلاش یا جذبہ تحقیق اور معلومات، اعلیٰ مقاصد کی لگن، اصول پرستی، خود رائی۔ اور قوت فیصلہ، مہم جوئی، ضبط و تحمل اور بردباری، مکمل پسندی، ایثار و صبر اور انکساری، ڈسپلن یا خود ضبطگی، خود تنقیدی اور تزکیہ نفس قابل ذکر ہیں۔

سوم، معاشرتی عادات اور رویئے:- ان میں تعاون پسندی، مفاہمت، دوسروں کی رائے، شخصیت کام، محنت اور وقت کی قدر اور احترام، ایمپاتھی یا empathy یعنی دوسروں کو سمجھنے کی اہلیّت اور ان کے خیالات، کردار، شخصیت اور مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے میں مدد دینے کی طبیعت اور مستعدی، اُن کے معاملات اور مشکلات کو باہمی امداد اور ہمدردی سے سلجھانے میں مدد دینے کی عادات اور اُن کی فلاح و بہبود، خوشی اور آسودگی اور خوشی کا خیال اور کوشش، بے باکانہ مگر منصفانہ تنقید اور راتے دہی، قیادت اور تنظیم کے اوصاف اور اہلیت، مثلاً جرأت اور ہمت، حوصلہ مندی، پہل قدمی، ہوشیاری، مستعدی، مردم شناسی،

اور قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے جو ہر کس و ناکس کو تکمیلی بناتے ہیں کیونکہ اس کا بنیادی مقصد ہر فرد میں، خواہ عورت ہو یا مرد، نوجوان ہو یا بزرگ، چھوٹا ہو یا بڑا۔ خود محنت اور کوشش کے علاوہ خود اعتمادی، خود اعتباری اور خود انحصاری کی عادات اور خصائل پیدا کرنا ہے۔

معاملہ فہمی، دور اندیشی، نئے خیالات اور افکار کی جدت پسندی، نئے طریقے اور نئی طرز زندگی آزمانے کی صلاحیت، صداقت پسندی، حق گوئی، واقعیت پسندی کی لگن اور عقیدت، دنیاوی واقعات اور معاملات میں ہوشمندی اور باشعوری، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

غیر تکمیلی ذہن و کردار کا خاکہ:- جب معاشرہ اپنے اراکین اور افراد کے اذہان اور کردار کو مخرب اور مفلوج کر دیتا ہے تو وہ نہ صرف متذکرہ بالا تکمیلی اوصاف اور عادات سے عاری ہوتے ہیں، بلکہ اُن میں غیر تکمیلی عادات اور رجحانات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان میں خاص طور پہ۔ قابل ذکر ایسی عادات، رویے اور خامیاں ہیں: تن آسانی، کاہلی اور سستی، کام اور محنت سے فرار اور بہانہ سازی، فرض سے روگردانی اور حیلہ بازی غیر ذمہ دارانہ رویے، لاپرواہی، بے غوری، غیر سنجیدگی، پھوہڑپن یا بدسلیقگی، شیخی اور تفاخر، ہٹ دھرمی اور اپنی رائے کی ضد، پہل قدمی اور خود اعتمادی کا فقدان، دست نگری اور محتاجی، دوسروں پر سہارا لینا، فرار اور گریز کی عادات، تشویش اور خوف، اجنبی اور غیر مانوس اشخاص اشیاء اور حالات سے گریز اور بیزاری، نئے خیالات سے نفرت، اپنی رائے اور فیصلہ میں خود مختاری میں تذبذب اور تامل، خوش اعتقادی اور سریع الاعتقادی اور بے اصول پن، تنقید اور نکتہ چینی سے خفگی اور کشیدہ خاطری، سرتابی، تعاون اور اشتراک عمل سے تامل اور بیزاری، دنیا کے حالات اور واقعات سے بےخبری اور بیزاری، کنارہ کشی، گوشہ نشینی، عزلت گزینی، قیادت کے اوصاف کی کمی یا فقدان مثلاً جرأت مندی، حوصلہ مندی، مہم جوئی، تنظیم کی صلاحیت کی کمی یا فقدان، خیالات اور عقائد میں سختی، نئے خیالات، نظریات اور مسائل سے لاپرواہی اور اجتناب، بادی النظر خوش فہمی، حقائق سے روپوشی، حق گوئی سے اجتناب اور چشم پوشی اور تملق، اقربا پروری، دوست نوازی، اور پشت پناہی، قانون اور قواعد سے سرتابی اور خودسری، بے قاعدگی، دوسروں کے کام، وقت اور شخصیت کی بےحرمتی اور دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا، خود بینی، خودستائش وغیرہ۔ ان عادات اور کمزوریوں کے باعث فرد اپنے معاشرے ملک اور قوم کے کسی شعبے میں تکمیلی رول (Role) ادا نہیں کر سکتا، بلکہ اس پہ بوجھ اور مفت خور یا پیراسائٹ (Parasite) بن جاتا ہے اور اپنے ملک و معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کی راہوں اور عوامل میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔

تکمیل گری کا بیش پذیر اثر

اردو زبان کی مثل ہے کہ "خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے"۔ یہ مثل تکمیل گری پر بہت صادق آتی ہے۔ ایک تکمیل گر کی مثال دیکھ کر کئی اور افراد کو بھی تکمیل گری کی ترغیب اور شوق پیدا ہوتا ہے اور یہ عمل بیش پذیر (cumulative) ہوتا ہے۔ ہر تکمیل کے حاصل کرنے سے تکمیل گر زیادہ فعال اور بہتر کردار کا مالک بن جاتا ہے اور وہ جتنا زیادہ تکمیلی ہو گا اتنا ہی زیادہ معاشرہ تکمیلی بنے گا یعنی وہ ایسے اثرات اور مثالیں پیش کرے گا، جو دوسروں کو تکمیل کی ترغیب اور تحریک دیں گے۔ انسان فطرتاً تکمیل گر ہے، مگر معاشری حالات اور ماحول اس کو غیر تکمیلی بنا دیتے ہیں۔ جب معاشرے میں ایک تکمیل گر بھی پیدا ہو جائے تو اس کی فضا بدلنی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی ہر تکمیل کے ساتھ کئی اور تکمیل گر پیدا ہو جاتے ہیں اور جلد ہی تکمیل گری کی لہروں کا ایسا ابھار (ground swell) اٹھتا ہے کہ سارے معاشرے کو بدل دیتا ہے۔ مگر اس کی ابتدا ایسے افراد سے ہوتی ہے جو تکمیل عادات اور نظریات سے متحرک ہوتے ہیں یہ محرکات معاشرے کے اندر ہر وقت موجود ہوتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی غیر تکمیلی معاشرہ کیوں نہ ہو۔

تکمیل گری کا بیش پذیرانہ عمل اور قومی کردار کی تشکیل

تکمیلی معاشرے میں تکمیل گروں کا بیش پذیرانہ عمل دو قسم کے اثرات مرتب کرتے ہیں، اول ہمعصروں پر اور دوم نئی اور نوخیز نسلوں پر۔ ایک تکمیل گر اپنے عمل اور مثال سے اپنے ارد گرد کے افراد کو روبہ تکمیلیت کر دیتا ہے اور پھر یہ افراد اُن لوگوں کو اسی طرح تکمیل کی طرف راغب کرتے جاتے ہیں جو اُن کے دائرے اثر میں آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکمیل گری کا نئی نسلوں پر اثرات بھی مرتب ہونے لگتے ہیں۔ یہ اثرات اُن ماں باپ اور افراد کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں جو اپنی تکمیل گری کے مثال اور عمل سے اپنی اولاد اور نوجوان نسلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں ان دو قسموں کے اثرات کا ایک دو نسلوں میں ایسا ہمہ گیر اثر ہوتا ہے کہ ملک و قوم کا ذہن و فکر، عادات و کردار روبہ تکمیل ہو جاتے ہیں اور غیر تکمیلی خیالات، عادات اور نظریات نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اس طرح قومی کردار تشکیل پاتا ہے۔

غیر تکمیلی افراد کا اثر بھی بیش پذیرانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں سارے معاشرے کے کردار اور اذہان غیر تکمیلی بن جاتے ہیں۔ مگر غیر تکمیلی معاشرہ اپنی قبر اپنے ہاتھوں خود کھودتا ہے' کیونکہ ایک دو نسلوں کے بعد وہ اپنے افراد کی انحطاط زدہ کردار اور عادات اور منفعل خیالات اور طرزِ عمل کے باعث اور اپنے اندرونی اور بیرونی تکمیلی مخالفوں اور دشمنوں کی قوتِ عمل و تکمیل کی تاب نہ لاکر تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ پس انسانی زندگی اور معاشرے میں صرف تکمیل گری ہی کو دائمی اور ابدی فروغ اور ترقی نصیب ہوتی ہے اور وہی قومی کردار کی تشکیل کرتی ہے۔ اسی طرح تکمیل گری ہی قوم و ملک کی تہذیب و تمدّن کو جنم دیتی ہے اور غیر تکمیلیت ان کو تباہ اور برباد کرتی ہے۔

تکمیلات اور تہذیب و تمدّن

ہر تکمیل اپنے وقت اور عہد میں انسانی زندگی کی حقیقت بن جاتی ہے اور اس طرح دوسری نئی اور پرانی تکمیلات کے ساتھ منظم ہو کر اپنے عہد کی تہذیب و تمدّن بناتی ہیں۔ تہذیب تکمیلات کی مادی تنظیم ہوتی ہے جو کسی وقت یا عہد میں کسی خاص لوگوں اور ملک میں حاصل ہو چکی ہوں اور ہو رہی ہوں۔ اور تمدّن کسی ملک یا لوگوں کی تکمیلاتی ترقی کی روحانی یا نفسیاتی صورت ہے۔ اور معاشرہ اس کی متحرک یا ڈائنمک صورت ہے' جو تہذیب و تمدّن کی بنیاد پر ترقی کرتا ہے۔ اگر تکمیلات کے تسلسل اور ترقی میں کسی وجہ سے خلا یا کمی آجائے' تو وہ انحطاط پذیر ہو جاتا ہے' جو بالآخر تہذیب و تمدّن کو متأثر کرتے ہیں اور اگر یہ خلا یا کمی جاری رہے تو تہذیب و تمدّن کو بھی ختم کر دیتے ہیں۔ مگر کوئی خاص تہذیب و تمدّن تکمیلاتی ترقی سے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں نئی اور زیادہ ہمہ گیر تہذیب و تمدّن وجود میں آتے ہیں اور معاشرہ ہمیشہ متحرک اور روبہ ترقی رہتا ہے' مگر سابقہ محدود معاشرہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ زیادہ متحرک اور زیادہ ہمہ گیر اور جامع معاشرہ وجود میں آجاتا ہے۔ اس عمل کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ تاریخ انسانی کا ازلی اور ابدی عمل ہے۔

تکمیل گری اور معاشرے کا ارتقا و تاریخ

ہر معاشرے کی تکوین و تشکیل اس کے تکمیلی افراد' گروہوں اور طبقوں کی سابقہ اور موجودہ تکمیلات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب کوئی تکمیل گر کسی ایسے نئے خیال اور کام کو تکمیل شروع کرتا ہے جو معاشرتی اور فطری حقائق کا حامل ہو' تو اس کے طرزِ فکر و عمل میں اور معاشرے کے کسی اور فرد

گروہ یا طبقے کے حاصل شدہ مفادات اور طرز فکر وعمل ہیں، جو انہیں اپنے معاشرے کے مروجہ اور تشکیل شدہ نظام کے تحت حاصل ہیں، فرق پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ فرق اُن نئی اور پرانی تکمیلی قوتوں میں تضاد اور تصادم کی صورت پیدا کرتا ہے، جس سے نئے تکمیلی افراد، گروہوں اور طبقوں کی بڑھتی ہوئی پیداواری اور تخلیقی صلاحیتوں اور قوتوں کی وجہ سے نئے اور پرانے طرز کے افراد، گروہوں اور طبقوں میں جدوجہد شروع ہو جاتی ہے۔ یہ جدوجہد بحث ومباحثہ، تنقید وتبصرہ، افہام وتفہیم مفاہمت وتعاون، یا باہمی مخاصمت اور تنازعوں سے لیکر خانہ جنگی، جنگ وجدل اور انقلاب کی مختلف صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ مگر ان سب کا فیصلہ وہ نئی تکمیلی قوتیں کرتی ہیں جو معاشری اور قدرتی ضروریات اور حقائق کی بنا پر نئے تکمیلی تصورات اور مقاصد کو متواتر عملی صورت دیتے ہیں۔ یہ جدوجہد ابتدائی تصورات، خیالات اور مقاصد کو نئے معاشری اور فطری حقائق سے مالا مال کرتی رہتی ہے۔ جس کے باعث ابتدائی تکمیل گروں کی تعداد اور طاقت بیش پذیری طور سے بڑھتی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تکمیلی خیالات، مقاصد، نصب العین اور طرز عمل وفکر کی بھی تنقید وتبصرے سے تطہیر اور تصدیق ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح یہ معاشری اور قدرتی حقیقتوں سے زیادہ سے زیادہ مطابقت حاصل کرتے رہتے ہیں۔ بالآخر یہ جدوجہد نئی تکمیلی قوتوں کی کامیابی، فتح اور غلبہ پر منتج ہوتی ہے جو معاشرے کو نئی تشکیل اور نیا طرز فکر وعمل عطا کر دیتے ہیں۔ تاہم اس نئی تشکیل میں نئی اور پرانی متصادم قوتوں کے عناصر کا مختلف طور وطریقوں، صورتوں اور حالتوں میں عمل دخل رہتا ہے، جو معاشرے کے مزید تاریخی ارتقا اور تسلسل کا باعث بنتا ہے۔ بہرحال تاریخی ارتقا اور تسلسل کے اس مرحلے پر نئی تکمیلی قوتیں معاشرے میں نئے خیالات، نظریات، نئے اقدار، طرز فکر وغور، معاشری تعاون وتعلقات اور ارتباط واختلاط کے نئے طور وطریقے، نئی تنظیمیں اور گروہ بندیاں نئے قوانین اور رسم ورواج، نئی عادات ورجحانات، نئے کردار اور شخصیتیں، نئے ادارے اور انجمنیں اور نئے لوگ اور طبقے پیدا کرتی یا صف آرا کر دیتی ہیں اور معرض وجود میں لاتی ہیں۔ اس سے معاشرے میں نئے مفادات اور نظریات، نئی قوتیں اور نئے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ جو پھر اور نئے تکمیلی افراد، گروہوں اور طبقوں کو جنم دیتے ہیں جو اپنی نئی پیداواری اور

تخلیقی قوتوں کے سہارے معاشرے کی تاریخ میں نئے ابواب کا اضافہ کرتے ہیں۔

مگر یہ صرف تکمیلی معاشری کی کہانی ہے۔ تاریخ انسانی ہمیں بتاتی ہے کہ بعض معاشروں میں تاریخی ارتقا کے اس تکمیلی عمل (پروسس) کو روکا (arrested) یا محدود (embedded) کیا جا سکتا ہے، تاکہ ان کی روایتی تشکیل اور نظام حیات میں خلل نہ پڑے، جس سے روایتی افراد، گروہوں اور طبقوں کے تعلقات اور مفادات وغیرہ کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسانی تاریخ میں دو قسم (Types) کے معاشرے پائے جاتے ہیں، یعنی لامحدود تکمیلی معاشرے اور محدود تکمیلی معاشرے جو اپنی محدودیت کے باعث غیر تکمیلی بن جاتے ہیں۔ ہم ان کی اندرونی نظام تشکیل اور وسعت پذیری کی صلاحیتوں یا عدم صلاحیتوں کی بنا پر علی الترتیب وسعت پذیر یا ماکرو سوشل (macro-social) اور تصغیر شدہ یا مائیکرو سوشل (micro-social) معاشرے بھی کہیں گے۔[1]

---

[1] جدید مغربی عالم اور مورخ ان دو قسموں کے معاشروں کو مختلف اصطلاحات سے موسوم کرتے ہیں، جن میں عجیب طور سے جغرافیائی تشخص بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً امریکی عالم عموماً ان معاشروں کو جدید (Modern) اور روایتی (Traditional) معاشروں کے نام دیتے ہیں۔ انگریز مصنفین انہیں (corporate اور communal) معاشرے کہتے ہیں۔ جرمن مفکرین انہیں علی الترتیب (Gesellschaft اور Gemeinschaft) کہتے ہیں۔ دور حاضرہ کے روسی مصنفین انہیں uni-structural اور (multi-structural) معاشروں کے نام دینے لگے ہیں۔ مگر ان اصطلاحات کا بڑا نقص یہ ہے کہ یہ سائنٹفک حقیقت اور صداقت سے کم و بیش عاری ہیں۔ ان عالموں اور مصنفین نے انہیں اپنی سیاسی اور آئیڈیولوجیکل مضمرات اور اغراض کے تحت اختراع کیا ہے۔ یہ طریقہ سائنٹفک غیر جانبداری اور صداقت پسندی کے اصولوں کے منافی ہے جو اس امر کے مقتضی ہیں کہ ان معاشروں کو ان کی معاشریاتی (Sociological) اور تاریخی خصوصیات کی بنا پر ہی موسوم کیا جائے۔

ماکروسوسائٹی کی تکمیلی تکوین و تشکیل

ہر ایک معاشرے کے ارتقا، بقا، خوشحالی اور سلامتی کا فیصلہ اس کی نئی تکمیلی قوتیں کرتی ہیں۔ روایتی اور رجعت پسند لوگوں، گروہوں اور طبقوں میں اتنی صلاحیت، استعداد اور طاقت نہیں ہوتی کہ اپنی حیاتیاتی قوتوں سے پیدا شدہ بڑھتی ہوئی آبادی اور ضروریات زندگی کو اپنی پرانی اور غیر تکمیلی پیداواری قوتوں اور طریقوں سے پوری کرسکیں۔ اس کے برعکس، تکمیلی افراد، گروہ اور طبقے اپنی بڑھتی ہوئی پیداواری اور تخلیقی تکمیلات کے ذریعے نہ صرف روایتی اور رجعت پسند عناصر پر کامیابی اور غلبہ حاصل کر لیتے ہیں، بلکہ اپنے معاشرے کو نئی تشکیل اور تنظیم دیکر اس کی تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہیں۔ اس غرض سے وہ اپنے معاشرے کو فرسودہ اور غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی خیالات، عقائد، نظریات، اقدار، رسم ورواج، تعلقات، قوانین، اداروں، تنظیموں، طرز معاشرت و حکومت وغیرہ سے پاک کردیتے ہیں اور ان کی بجائے اپنے بہتر اور زیادہ پیداواری اور تخلیقی طریقوں، خیالات، نظریات، عقائد، اقدار، تعلقات، رسم ورواج، قوانین، تنظیموں، اداروں، طرز معاشرت و حکومت کو مروج کر کے اپنے معاشرے کی تکمیلی صلاحیتوں اور طاقتوں کو پوری طرح بروئے عمل آنے کے مواقع، ماحول اور حالات پیدا کردیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ملک و معاشرے کی بڑھتی ہوئی آبادی اور معیار زندگی کے لئے مادی، تمدنی اور روحانی پیداوار اور تخلیقات کو بڑھا دیتے ہیں، اور اپنی تہذیب و تمدن، طرز معاشرت اور آئیڈیلوجی، طرز حکومت و ریاست کو وسیع تر اور زیادہ مستحکم اور مضبوط بنا دیتے ہیں۔ یہ وسعت پذیر معاشرہ یا ماکرو سوسائٹی (Macrosociety) تعداد اور تنظیم، کمیت و کیفیت (Quantity and Quality) کے لحاظ سے زیادہ وسیع اور جامع ہوتا ہے کیونکہ اس میں مختلف گروہوں اور طبقوں کے باہمی تضاد، تصادم اور مخاصمت کی حالت علم و عقل کے جدلیاتی عمل و تکمیل کے ذریعے مفاہمت، تعاون اور اشتراک عمل اور معاشری ارتباط و اختلاط کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اس طرح جب نئی تکمیلات معاشری حقیقت بن جاتی ہیں تو وہ معاشرے کی پیداواری اور تخلیقی قوتوں میں اضافہ کر کے حیاتیاتی یعنی بائیوسوشل (Bio-social) طاقت بن جاتی ہیں، جو اس کی وسعت پذیری اور ڈائنمیزم (Dynamism) یعنی اثر آفرینی کا بین ثبوت

اور مظاہرہ ہوتی ہے۔ جدید دور میں قومی معاشرہ اس کی بہترین مثال ہے۔ قوم لوگوں کا ایسا ماکروسوشل گروہ ہے جس میں روایتی اور غیر تکمیلی گروہ بندیاں ختم کر کے معاشرے کے تمام اراکین اگروہوں اور طبقوں کی تکمیلی مفاہمت، تعاون، اشتراکِ عمل اور ارتباط و اختلاط کی جانب سمت بندی کر دی گئی ہے۔

مائیکروسوسائٹی کی غیر تکمیلی تشکیل (Microsociety)

انسانی تاریخ کا دوسرا معاشرتی نظام ایسی چھوٹی چھوٹی گروہ بندیوں کا مجموعہ ہوتا ہے جن میں معاشرتی ارتباط و اختلاط، تعاون و شرکت کے تمام عوامل اور مواقعوں کو ان کی تصغیر شدہ حدود میں روک دیا اور محدود کر دیا جاتا ہے، اس معاشرے میں تمام معاشرتی اور سیاسی قوتیں ان مائیکروسوشل مفادات، تعلقات اور تنظیموں کو ختم کرنے کی بجائے ان کو قائم و دائم رکھنے پر صرف ہوتی ہیں۔ تاریخی لحاظ سے اس کی دو صورتیں ہیں۔ اول، قبائلی معاشرہ جو قبائلی قرابتداری گروہوں پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرا جاگیردارانہ معاشرہ جو ذات پات کی علیحدگیوں اور گروہ بندیوں پر قائم ہوتا ہے۔ ان تصغیر شدہ معاشروں میں نئی تکمیلات کے راستے بند کر دیئے جاتے ہیں تاکہ ان مائیکروسوشل تنظیموں اور گروہوں کے مفادات اور تعلقات کو زک نہ پہنچے۔ صرف سابقہ روایتی تکمیلی طریقوں سے زندگی اور معاشرے کی تمام ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ مائیکروسوشل نظام حیات و معاشرت نئی تکمیلات کے بغیر نسل بعدًا نسل جاری رہتا ہے۔ اور معاشرہ نسل در نسل روایتی تعلقات اور تنظیموں میں بندھا رہتا ہے جس سے اس پر جمود اور سکون کا ماحول طاری رہتا ہے۔ چونکہ ان گروہوں کی آبادی بڑھتی ہے جبکہ ان کی پیداواری اور تخلیقی قوتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، اس لئے ان گروہوں میں تضاد و تصادم پیدا ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے روایتی طریقوں سے حاصل شدہ دولت اور پیداوار کو گروہی جنگ و جدال، لوٹ مار، استحصال اور غارتگری سے نئی گروہی تشکیل دیگر دوبارہ روایتی طریقوں سے بانٹ لی جاتی ہے۔ اس گروہی جنگ و جدال اور غارتگری میں وہ مائیکروسوشل گروہ باقی رہتے ہیں جن کی اندرونی تصغیری تنظیم اور قیادت، نظریات اور عقائد، اقدار اور طریقے مضبوط اور مستحکم ہیں جبکہ انحطاط زدہ اور کمزور قیادت اور مخرب اور مضمحل کرنے والے نظریات اور اقدار اور طور و طریقے والے گروہ مٹ جاتے ہیں اور ان کے روایتی ذرائع

پیداوار پر نئے گروہ قابض ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس معاشرے کا نظام روایتی استحصالی انداز میں پھر قائم ہو جاتا ہے حتیٰ کہ آبادی بڑھنے کے باعث ان مائیکرو سوشل گروہوں کے مابین دولت کی دوبارہ لوٹ مار اور تقسیم کا دور شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا اس معاشرے کی ہزاروں سال کی تاریخ ان مائیکرو سوشل گروہوں کی لامتناہی استحصال اور غارتگری کی تاریخ ہے، جو ازمنہ قدیم سے لیکر زمانۂ جدید تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس تاریخ میں جو تکمیلی ترقی ہوئی ہے وہ صرف اس استحصال اور غارتگری کے لئے ہوئی ہے۔ اگرچہ مائیکرو سوسائٹی کی تاریخ میں اس استحصال اور غارتگری کے تدارک کے لئے عظیم تحریکیں اور مذاہب نے بہت کوششیں کیں، مگر بالآخر وہ بھی اس کی استحصالی قوتوں کے اور غارتگری کی یلغار کے سامنے زچ ہو گئیں۔ اس ناکامیابی کی ایک مثال مسلمانوں کا قرون وسطائی معاشرہ ہے جو تاریخِ اسلامی کی ابتدائی صدیوں کی ماکرو سوشل کوششوں کے بعد مائیکرو سوشل قوتوں اور یلغار کا شکار ہو گیا اور اس افراتفری میں مذہبی گروہ اور طبقے مثلاً علماء نے ان مائیکرو سوشل استحصالی قوتوں کی نظریاتی اور معاشری ہمنوائی اور اعانت کی، جس کے باعث مسلمانوں کے معاشرے میں ماکرو سوشل قوتوں کو بروئے عمل آنے کے مواقع ہی نصیب نہیں ہوئے، بہر حال دنیائے انسانی کے مغربی گوشے میں قرون وسطی کے اواخر میں قومی ماکرو سوشل معاشرہ وجود میں آیا جس کی وسعت پذیر اور توسیع پسندی قوتوں نے بالآخر تمام کرۂ ارض کی مائیکرو سوسائٹیوں کو اپنی تکمیلی قوتوں کے استحصالی شکنجہ میں جکڑ دیا۔ چونکہ اس وقت مسلمانوں کا مائیکرو سوشل معاشرہ تقریباً تین براعظموں یعنی ایشیا، افریقیہ اور یورپ پر پھیلا ہوا تھا اس لئے یورپی ماکرو سوسائٹی کے سامراجی یلغار اور استحصال نے مسلم معاشرے اور ممالک کی سب سے زیادہ تباہی کی۔ مسلم مائیکرو سوسائٹی کے اس تاریخی المیہ کے اسباب کا تجزیہ ہم آئندہ ابواب میں کریں گے۔

مائیکرو سوسائٹی اور عدم تکمیلات

عدم تکمیلات سے مراد ایسی تکمیلات ہیں جو کسی غیر تکمیلی یا کم تکمیلی معاشرے میں تو اب تک حاصل نہیں ہوئیں مگر کسی اور معاشرے میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہیں اور پسماندہ معاشروں پر اندازہو رہی ہیں جو تکمیلی معاشرے کی توسیع پسندی کے باعث اس کے دائرہ اثر اور استحصال میں آگئے ہیں

یہ کیفیت اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک پسماندہ معاشرہ خود بھی ایسی "تکمیلات" یا ان سے بہتر تکمیلات حاصل کر کے برتر معاشرے سے برابری یا سبقت نہیں لے جاتا۔ ظاہر ہے کہ عدم تکمیلیت بین الاقوامی اور بین المعاشری کیفیت کا نام ہے جس سے پسماندہ معاشرے میں غیر ملکی غلبہ، تسلط، استحصال اور لوٹ مار کے واقعات اور حالات پیدا ہوتے ہیں جو ماکرو سوسائٹی کی سامراجی اور نوآبادیاتی قوتوں کے توسیع پسند عزائم نے برپا کیے ہیں۔ مگر اس کی اصلی بنیاد محکوم اور مغلوب معاشرے کے اپنے غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی افراد، گروہوں اور طبقوں میں ملتی ہے، جن کے ختم ہونے سے ہی ایسے ملک اور لوگوں کو غیر ملکی غلبہ اور تسلّط سے نجات ملے گی۔ لہٰذا کسی ملک یا قوم کی صحیح اور حقیقی آزادی، خوشحالی اور ترقی کا زمانہ تب شروع ہوتا ہے جب اس میں ماکرو سوشل تبدیلیاں اور تنظیمیں بروئے کار آجاتی ہیں جو نظریاتی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تمدّنی، علمی اور فنی، نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اگر ان تکمیلات میں کہیں بھی اور کسی طرح کی بھی کمی یا خامی رہ جائے، تو عدم تکمیلیت کی کیفیت ختم نہیں ہوتی۔ جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے ہر معاشرے کی حدود اس کی سابقہ اور موجودہ تکمیلات متعیّن کرتی ہیں، مگر عدم تکمیلات ان حدود کی شکست و ریخت اس طرح سے کرتی ہیں کہ متصادم اور متحارب معاشرے، لوگ اور قومیں غلبہ اور تسلط، محکومی اور استحصال کے رشتوں میں تو جکڑے جاتے ہیں مگر ان تعلقات اور رشتوں سے ایسا وسیع تر یا ماکرو سوشل معاشرہ وجود میں نہیں آتا جس میں عدل و انصاف، مساوات اور آزادی کے اصولوں کی بنا پر ان میں تکمیلی تعاون اور اشتراک عمل ممکن ہو سکے۔ قومی آزادی اور خود مختاری کا یہی تاریخی اور معاشری جواز ہے جو فرسودہ اور غیر تکمیلی کاموں، طریقوں اور تعلقات کو قائم رکھنے سے نہیں بلکہ ہر قوم کی نئی اور حیات انگیز تکمیلات سے ہی ثابت ہو سکتا ہے۔ خواہ ان فرسودہ اور ناقابل حیات تکمیلات کے لئے مذہب، زبان، تہذیب و تمدّن، نسل و نسب یا ماضی کے تکمیل گروں کے کمالات اور دعوے کیوں نہ پیش کئے جائیں۔ اسی طرح قومی بقا و سلامتی کا جواز ایسی زندہ تکمیلات میں ملتا ہے جن سے عدم تکمیلیت کی کیفیت ختم ہو جائے، بین الاقوامی قوانین، قاعدوں، امداد اور انجمنوں اور کانگرسوں وغیرہ سے نہیں، جو درحقیقت برتر تکمیلی

معاشروں اور قوموں کی تکمیلی برتری کو قائم و دائم رکھنے اور پسماندہ اقوام کی عدم تکمیلیت کی کیفیت کو برقرار رکھنے کی تکنیک اور طریقے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اول الذکر کی برتر تکمیلات ان کی بائیو سوشل یا حیاتیاتی و معاشری تاریخ کا حصہ بن گئی ہیں اور سامراجیت اور جارحیت کی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ مگر پسماندہ معاشرہ ان سے نجات صرف نئی اور بہتر تکمیلات ہی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اس راہ نجات میں معاشرے کی نئی تشکیل و تنظیم کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے، جس میں عورت کے مقام اور رول کا سوال بنیادی اور اہم حیثیت رکھتا ہے۔

تکمیل کا تاریخی عمل: عورت اور معاشرہ

Socio-Historical Process of Achievement: Woman and Society

معاشرہ: تین زندہ نسلوں کا سائیکل

حیاتیاتی یعنی بائیو سوشل (Bio-social) لحاظ سے انسانی معاشرہ محض تین زندہ نسلوں کا سائیکل (Generation Cycle) ہوتا ہے۔ یہ نسلیں معمر، بالغ اور نوخیز نسلیں ہوتی ہیں۔ نسل سے مراد ایسے ہمعصر افراد کی جمعیت ہوتی ہے جن کے معاشرے میں مقام اور رول (Role) نہ صرف اُن کے وقت پیدائش کے بعد کے واقعات، حالات اور سابقہ اور موجودہ لوگوں کے تکمیلات اور غیر تکمیلات کے اثرات سے (جن میں ان کی اپنی تکمیلات اور غیر تکمیلات کے اثرات بھی شامل ہیں)، بلکہ ان کی اولاد کے وقت پیدائش اور اُن کی اولاد کی اولاد کے وقت پیدائش کے بعد کے واقعات، حالات اور اثرات سے متعین ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر ایک نسل اپنے معاشرے، ملک اور قوم کی زندہ اور رواں (current) تاریخ ہوتی ہے جسے وہ اپنے دور کے مخصوص حالات اور واقعات کے ذریعے اپنے مخصوص ذہن و فکر، عادات و کردار کے مطابق بناتی، بگاڑتی اور بدلتی ہے اور پھر اس بدلتے ہوئے معاشرے کو آنے والی نسلوں کے حوالے کر دیتی ہے۔ تاہم اس معاشری تسلسل میں ہر زندہ نسل کا مقام اور رول نہ صرف فرداً بلکہ نسلاً بھی مختلف ہوتا ہے۔

معمر اور عمر رسیدہ بزرگوں کی نسل سہ نسلی سائیکل کے آخری دور اور اپنے تکمیلی، غیر تکمیلی یا خلاف تکمیلی رول کے اختتام پر ہوتی ہے۔ تاہم ان بزرگوں کو اپنے معاشرے میں اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے جس کی نوعیت قرابتداری اور غیر قرابتداری معاشروں میں مختلف ہوتی ہے۔ جدید غیر قرابتداری معاشرے میں اُن کو اثر و رسوخ صرف تکمیلات کی صورت میں ہی حاصل ہوتا ہے جبکہ اُن کی غیر تکمیلات اور خلاف تکمیلات کو عقل و دلیل اور محاسبہ او تنقید سے رد کر دیا جاتا ہے۔ مگر قرابتداری معاشرے میں بزرگوں کو اپنی غیر تکمیلات اور خلاف تکمیلات کے باوجود اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اس معاشرے میں عقل و دلیل اور محاسبہ اور تنقید کی کمی یا فقدان ہوتا ہے، جبکہ خاندانی زندگی میں اُن کے اثر و رسوخ کا کوئی محاسبہ، تنقید اور تردید تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر اُن کی تکمیلات، غیر تکمیلات اور خلاف تکمیلات کا اثر اُن کی موت کے بعد بھی دو زندہ نسلوں کے دل و دماغ پر تقلید اور روایات کی صورت میں باقی رہتا ہے اور جواں فکر کو ابھرنے نہیں دیتا ہے۔ اور اس طرح وہ آنے والی نسلوں کے عقائد، نظریات، اقدار اور افعال پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ مگر ان اثرات کا حشر، "مردہ بادست زندہ" کے مصداق ہوتا ہے۔ یعنی اُن کی تکمیلات، غیر تکمیلات اور خلاف تکمیلات کے وہی معنی، مطالب اور مصارف ہوتے ہیں جو زندہ نسلیں اُن کو اپنے حالات، واقعات، نظریات اور ضروریات کے مطابق دیتی ہیں۔ اس وجہ سے بزرگوں کی بعض تکمیلات، غیر تکمیلات اور خلاف تکمیلات روایات، داستانیں (legend) مسلک و طریقت اور پرستش (cult) یا شخصیت پرستی (personality cult) بن جاتی ہیں۔ جو تنقید اور محاسبہ عقل و دلیل سے بالا تصور کی جاتی ہیں۔

جب گزرے ہوئے بزرگوں اور اہل کمال کی تکمیلات اپنی معاشری ضرورت اور افادیت کھو دیں اور غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی بن جائیں، مگر ان تغیرات کے باوجود آنے والی نسلوں پر اُن کی کورانہ عقیدت مندی اور غیر معقول شخصیت اور روایات پرستی کے باعث اپنا غلبہ اور مقبولیت قائم رکھیں، تو ان نسلوں کا ایسا طرز عمل "زندہ در دست مردہ" کے مصداق ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بزرگوں اور متقدمین کی فرسودہ تکمیلات معاشرے میں دوسری غیر تکمیلات

مسائل اور معاملات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں اور راہنمائی کرتے ہیں۔ اس طرح قوم و معاشرے کی ترقی، فلاح و بہبود، خوشحالی، بقا و سلامتی کی نئی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اور اپنے زمانے کے حالات، واقعات اور خطرات کا حقیقی، سائنٹفک اور تکمیلی حل تلاش کرتے ہیں اور ضروری اور مفید علم و ہنر، ادب و فن، سائنس و فلسفہ، ٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت و زراعت کی پیداواری ترقی کے آلات، ذرائع اور وسائل تخلیق کرتے ہیں۔ طرز حکومت و ریاست کے نئے فلسفے اور نظریات پیش کرتے ہیں، فضول اور فرسودہ رسم و رواج اور معاشری اداروں کا جائزہ لیتے ہیں۔ دراصل کسی قوم اور معاشرہ کے انحطاط اور زوال اس وقت شروع ہوتا ہے جب اس کے اہل علم و ہنر ان تکمیلات سے عاری ہونا شروع ہوتے ہیں اور غفلت شعاری، روایت پرستی، لاپروائی، تساہل انگاری، اور اس قسم کے دوسرے غیر تکمیلی خیالات، رویوں اور نظریات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ قومی اور معاشری تنزل کا نقطہ آغاز ثابت ہوتا ہے۔

نئی نسلیں

نوخیز نسلیں سہ نسلی سائیکل کی نئی نسلیں ہوتی ہیں جو بالغ نسلوں کے ہاں پیدا ہوتی ہیں، پرورش پاتی اور تعلیم و تربیت حاصل کرتی ہیں۔ مگر ان کا اپنے ماں باپ اور خاندان سے اتنا گہرا تعلق ہوتا ہے کہ اُن کا ذکر ہم خاندان کی زندگی اور ماحول کے تحت کریں گے۔ تاہم اس حقیقت کا ذکر یہاں ضروری ہے کہ ہر قوم، ملک اور معاشرے کی تاریخ اور تقدیر کا فیصلہ یہ سوال کرتا ہے کہ بالغ اور بزرگ نسلوں نے اپنی نوخیز نسلوں کو کس طرح اور کیسی تکمیلی یا غیر تکمیلی یا خلاف تکمیلی یا عدم تکمیلی کاموں اور زندگیوں کے لئے تیار کیا؟ اس سوال کا جواب ہر معاشرے اور قوم کی خاندانی زندگی اور اُن معاشرتی گروہوں اور اداروں میں ملتا ہے جن میں نئی نسلیں پرورش پاتی اور تعلیم و تربیت حاصل کرتی ہیں۔

خاندان اور معاشرہ

خاندان ایسا گروہ ہے جس میں تینوں زندہ نسلیں ایک جگہ پر موجود ہوتی ہیں۔ بعض اوقات تو وہ ایک ہی چھت کے نیچے رہتی ہیں اس لحاظ سے خاندان یا کنبہ معاشرتی ارتباط اور تعلقات کا نہایت اہم اور ممتاز دارہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اسے کئی اور لحاظ سے بھی معاشرے کے باقی دوسرے تعلیم و تربیت کے اداروں پر تقدم اور فوقیت حاصل ہے۔ اس میں نئی نسلوں کے اذہان و کردار اور شخصیتوں

کی تکمیلی یا غیر تکمیلی تدوین و تشکیل ایسی صورت کی ہوتی ہے کہ اس کے اثرات اور نقوش تاعمر قائم رہتے ہیں۔ یہ اثرات اور رجحانات بچپن کے ابتدائی سالوں سے شروع ہو جاتے ہیں جبکہ ابھی بچہ اپنی ماں کی گود میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اسکول اور دوسری درسگاہوں کی تعلیم و تربیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب بچے کے ذہن و فکر، عادات و کردار، اقدار، رویے اور رجحانات بہت حد تک بن چکتے ہیں جدید علم نفسیات، خاص طور پر معاشری نفسیات (Social Psychology) اور طفلی نفسیات (Child Psychology) نے ثابت کر دیا ہے کہ جہاں تک فرد انسانی کے ذہن، کردار اور شخصیت کی تکمیلی سمت بندی، ترغیب، شوق اور لگن کا سوال ہے اس کے لیے ہر انسان کی عمر کے پہلے دس بارہ سال فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ابتدائی سالوں میں خاندانی زندگی اور ماحول کے ذریعے اس کا معاشرہ اس کے ذہن و فکر، کردار اور شخصیت میں وہ رجحانات، رویے، شوق، ترغیبات اخلاقی کردار، خیالات، نظریات، عادات، دلچسپیاں، صلاحیتیں اور ہنرمندیاں منقش کر دیتے ہیں جو اُسے تاعمر تکمیلی یا غیر تکمیلی زندگی کی جانب راغب کرتے رہتے ہیں۔

اگرچہ تہذیب و تمدن کی بین النسلی ترسیل اور ذہن و کردار کی تشکیل کے عمل خاندان کی روزمرہ کی زندگی سے شروع ہوتے ہیں۔ مگر ان عوامل کی صورت اور اثر خاندانی زندگی بھی اس ماحول اور فضا پر منحصر ہوتے ہیں جو معاشرے کے مروجہ اقدار، عقائد، نظریات، خیالات، رویوں اور تعلقات وغیرہ نے بالغ اور بزرگ نسلوں کے ذہن و فکر، عادات اور کردار، چال چلن اور خصائل میں پیدا کر دیئے ہیں، جن کا مظاہرہ وہ اپنی روزمرہ کی خاندانی زندگی، چال ڈھال، میل جول اور شعوری اور غیر شعوری تعلیم و تربیت، اثر و رسوخ اور مثال اور انتباہ سے ہر وقت نئی نسلوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان میں خاندانی زندگی کے تمام معاملات، مشاغل، باہمی مروت اور نفرت، محبت اور مخالفت، غم و غصہ، تضاد اور تناؤ، کشمش اور منافرت، مار پیٹ، شکر رنجیاں اور لڑائی جھگڑے وغیرہ اس زندگی کی روزمرہ کی فضا اور ماحول بناتے ہیں، جو شعوری بلکہ اکثر غیر شعوری طور پر بچوں اور نوجوان نسلوں کو متاثر کرتے ہیں۔ اور اس طرح اُن کے ذہن و کردار کی تشکیل و تدوین کرتے ہیں۔ بچے کے ذہن و کردار کے نقطۂ نظر سے ان اثرات میں خاندانی نظامِ حیات کے مندرجہ ذیل حالات اور تعلقات خاص طور پر قابل غور ہوتے ہیں:۔

۱۔ معاشرے میں شادی کا نظام (Marriage System) قانوناً کثرت ازدواج یا یک زوجگی پر قائم ہے۔

۲۔ خاندانی نظام قرابتدار یا غیر قرابتی گروہوں اور نظام معاشرت سے منسلک ہے۔

۳۔ خاندانی زندگی میں ماں باپ کے تعلقات کی نوعیت، جو ان کے بطور میاں بیوی کے تعلقات پر مبنی ہوتی ہے اور جو بالآخر معاشرے کے شادی یا ازدواجی نظام پر منحصر ہوتی ہے۔

۴۔ خاندان کے ممبروں کی تعداد کتنی ہے۔ اس میں باپ، ماں (اگر باپ کئی بیویوں کا خاوند ہے تو) باپ کی دوسری بیویوں کی تعداد اور رتبے، دوسرے مرد اور عورت رشتہ دار، اُن میں ماں اور باپ کا مقام اور حیثیت، ماں کا خاندان میں مقام اور حیثیت، کنبے کے دوسرے بزرگ نوکر اور بچے، اُن کے باہمی تعلقات اور حیثیت، اُن کی عمریں، جنس اور بچے سے تعلقات، خاندان میں عورتوں کی حیثیت، مقام آزادی اور پابندی، مثلاً پردہ اور دوسرے رسم و رواج کا اُن کی زندگیوں پر اثر، خاندان میں لڑکوں اور لڑکیوں کی حیثیت اور مقام، قدر و منزلت وغیرہ بچے کے اپنے بھائی اور بہنوں سے تعلقات، عمر اور جنس اور قدر و منزلت، اور خاندان میں اخلاقی اور تمدنی اقدار اور نصب العین، علمی اور فنی اقدار اور مشاغل، ذوق و شوق اور دیگر تکمیلی یا غیر تکمیلی حالات، مواقع اور رجحانات و میلانات۔

۵۔ خاندان کی آمدنی اور ذریعہ معاش اکتسابی ہے یا انتسابی۔ یعنی یہ روزی اور دولت کمانے والوں کی جسمانی اور دماغی محنت و مشقت سے یا غیر محنتی ذرائع مثلاً رشوت، لوٹ کھسوٹ لوٹ مار اور دوسرے استحصالی ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔

۶۔ خاندان کا اپنے محلے اور ہمسائیگی میں مقام، تعلقات اور اثر و رسوخ

۷۔ خاندان کا اپنے گاؤں، قصبے یا شہر میں کیسے مقام اور ماحول میں سکونت ہے اور اس کے گاؤں، قصبے یا شہر کی ملک، قوم اور معاشرے میں کیا طبقاتی حیثیت اور مقام ہے اور اس کا تہذیب و تمدن، علم و فن، زراعت، صنعت اور تجارت میں کیا رول (Role) اور مقام ہے۔

بچہ اور ماں: معلم اوّل تکمیلی یا غیر تکمیلی معاشرے کا آغاز نوزائیدہ بچے کے ذہن و کردار کی تکوین

و تشکیل سے شروع ہوتا ہے اور بچے کے ذہن و کردار کی تکوین و تشکیل اس کے ماں باپ اور خاندانی زندگی سے شروع ہوتی ہے۔

بچے کی ابتدائی زندگی میں اس کی ماں کا رول اور مقام مرکزی اور مقدم حیثیت رکھتا ہے کیونکہ بچے کی چھوٹی سی دنیا ماں کے ارد گرد گھومتی ہے۔ مگر ماں اس کو وہی کچھ بتا اور سکھا سکتی ہے جو اس نے اپنی زندگی میں دیکھا، سنا اور سیکھا ہے جس کا اظہار وہ اپنے چال ڈھال، قول و فعل، عادات اور رویوں سے اپنے چلن، برتاؤ اور سلوک سے کرتی ہے اور اس طرح وہ اپنے محبت اور پیار یا خوف اور اندیشے بھرے الفاظ اور حرکات و سکنات سے اور پرورش اور تربیت کے ان طور و طریقوں اور اصولوں سے جو وہ بروئے کار لاتی ہے، اپنے بچے کے ذہن و کردار کو شعوری یا لاشعوری طور پر متاثر اور متشکل کرتی ہے۔ مگر اس کا کردار سازی کا سارا عمل خاندانی رشتوں اور ماحول، معاشرتی رسم و رواج اقدار اور اداروں اور بندشوں میں بندھا ہوا ہوتا ہے۔ ان میں اس کا اپنے خاوند سے رشتہ بہت فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ اور قرابتداری معاشرے میں خاوند کی برتری اور آزادیاں اور اس کی اپنی مجبوریاں اور پابندیاں حتمی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں تعدد ازواج اور شادی اور طلاق کے قوانین اور رسم و رواج، مرد کی برتری اور معاشی غلبہ، عورت کی محتاجی اور محکومی وغیرہ سب اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر خاوند کی دوسری بیوی یا بیویاں، کنیزیں اور داشتائیں ہوں تو ماں کے رول اور رشتے میں تناؤ، تنازعے، تلخی اور محرومی کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے بچے کے ذہن و کردار کو متاثر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ خاوند کے ماں باپ، بھائی بہنوں کی موجودگی بھی ماں کی پوزیشن کو بہت متاثر کرتی ہے، جس میں ناچاقی، تنازعہ اور رعب داب کے عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں، جو ماں کی خاندانی حیثیت، آزادی اور خود مختاری کو، جو قرابتداری معاشرے میں پہلے ہی کم ہوتی ہیں، بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ اگر خاندان میں قریبی رشتہ داروں کے علاوہ دور پار کے رشتہ دار بھی موجود ہوں، جیسا کہ قرابتداری معاشرے میں اکثر ہوتا ہے، تو ماں کی حیثیت صفر کے برابر رہ جاتی ہے، جو بچے کے ذہن و فکر، عادات اور کردار کے نشو و نما کو بہت متاثر کرتی ہے۔ ان صورتوں میں ماں شعوری اور لاشعوری طور پر بچے کے دل میں خوف، گھبراہٹ، مجبوری، لاچاری، بے اعتمادی اور بے حوصلگی کے تاثرات

اور اثرات پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس، اگر ماں کی حیثیت اچھی اور اس کی قدر و منزلت بھی ہوتی ہو تو بھی قرابتداری معاشرے میں بچے کے معاملے میں ماں کو کوئی آزادی اور خود مختاری حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ بچہ دوسروں کے لاڈ چاؤ کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے۔ اور لاڈلا بچہ بن جاتا ہے جو دوسروں کے سہارے کا طالب رہتا ہے۔ کیونکہ قرابتداری معاشرے میں ماں کو خاندان کے اندر ایسی خود مختاری ہرگز حاصل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے بچے کو پوری آزادی کے ساتھ پرورش اور تربیت دے سکے۔

تاہم ماں کی حیثیت کا اثر اس کی ساری اولاد پر یکساں طور پر نہیں پڑتا کیونکہ عمر کے ساتھ خاندان میں اس کا مقام اور حیثیت بدلتے رہتے ہیں۔ پہلا بچہ (اگر بیٹا ہو) ماں باپ کی شادی کے بعد ایسے زمانہ میں پیدا ہوتا ہے۔ جب میاں بیوی میں پیار و محبت پورے زوروں پہ ہوتی ہے اس لئے یہ بچہ بھی بڑے لاڈ چاؤ میں پلتا ہے۔ اس میں باپ سے خوف، اجنبیت اور خفگی کے عنصر بھی کم پائے جاتے ہیں۔ مگر اس لاڈ چاؤ سے اس میں خود غرضی اور خود پسندی کی خو پیدا ہو جاتی ہے اور منفیت (یعنی بڑوں کی باتوں اور نصیحت کی مخالفت) کی عادت بھی پڑ جاتی ہے، جو بڑے ہو کر اس میں دوسروں کے حق غصب کرنے کا رجحان پیدا کرتی ہے۔ قرابتداری معاشرے میں یہ رجحان بہت مفید ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس معاشرے کا سارا نظام لوٹ کھسوٹ کے طریقوں پر قائم ہے۔ اس لئے غاصبانہ رجحان سے وہ اپنی ذاتی اور خاندانی پوزیشن کو دوسروں کے مال اور حقوق کو غصب کر کے برقرار رکھ سکتا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنی معاشری پوزیشن اور اثر و رسوخ کو بڑھا سکتا ہے۔ اگر پہلا بچہ لڑکی ہو، تو وہ اتنے لاڈ چاؤ کا مرکز نہیں بنتی، بلکہ اپنی ماں کی حیثیت گھٹانے کا سبب بنتی ہے۔ جس کا اثر بچی پہ احساس کمتری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جو ماں نے خود بھی اپنے بچپن کے زمانے میں محسوس کیا اور اب اسے اپنی بچی میں منتقل کر دیتی ہے اور اس طرح عورت کی کمتری اور محکومی کے احساسات اور جذبات کو دوسری نسل میں سرایت کر دیتی ہے بہر حال دوسرے یا تیسرے بچے کے پیدا ہونے تک ماں باپ کے باہمی تعلقات بہت بدل جاتے ہیں۔ ماں اب نئی نویلی دلہن نہیں رہتی۔ اکثر جلدی جلدی مائیں بننے

کے باعث اس کی جوانی بھی قبل از وقت ڈھلنے لگتی ہے۔ اُدھر خاوند میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ اس میں تعدد ازدواجی رجحانات پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں۔ گھر میں روزمرہ کے ساس بہو اور دوسری عورتوں کے جھگڑے بڑھنے لگتے ہیں۔ ان حالات میں بسا اوقات میاں کے ہاتھوں بیوی کی پٹائی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اب وہ اکثر دوسرے نکاح کے فکر میں بھی رہتا ہے۔ اور طلاق کی دھمکی بھی دینا شروع کر دیتا ہے۔ بہرحال اگر ماں کو سوکن کا غم بھی نہ ہو، تو میاں کی مار پیٹ، بے رخی اور طلاق کی دھمکیوں کا سامنا شروع ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں اس کی خاندانی حیثیت اور مقام اور بھی زیادہ کم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی چھوٹی اولاد باپ کے بڑے خوف اور رعب میں پلتی ہے۔ ان حالات میں اکثر ماں ہی اُن کا سہارا ہوتی ہے اور وہ ماں کے سہارے پلتے ہیں۔ مگر ان حالات میں اُن میں بے اعتمادی، خوف، لاچارگی، فرار اور سہارا لینے کی عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ تاہم بچوں کے کردار و عادات کا ایسا نشوونما، قرابتداری معاشرے کے استحکام کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں خاوند اپنی بیوی یا بیویوں کو جتنا زیادہ زدوکوب اور رعب و داب میں رکھے گا اتنی ہی اولاد اس کے خوف اور رعب میں پلے گی اور بڑے ہو کر باپ اور بزرگوں کی اتنی ہی زیادہ فرمانبردار اور اطاعت گزار ہو گی۔ اس طرح خاندان اور دوسرے قرابتدار گروہوں کو استحکام حاصل ہو جاتا ہے اور معاشرے کا پدر سرداری (Patriarchal) نظام نسل در نسل قائم و دائم رہتا ہے۔

بچہ اور باپ: معلم ثانی

ماں کے بعد بچے کے ذہن و کردار کی نشوونما پر باپ کا اثر پڑتا ہے۔ اس اثر کو بھی معاشرتی رسم و رواج، قانون اور آئیڈیالوجی اور خاندانی نظام و ماحول متعین کرتے ہیں۔ تاہم بچے کی کردار سازی میں باپ کا رول ماں کے رول سے مختلف ہوتا ہے، جس میں معاشرتی نظام زندگی اور تہذیب و تمدّن کے علاوہ بچے کی نفسیات کو بھی بہت عمل دخل ہے۔ ماں اور بچے کے تعلقات براہ راست ہوتے ہیں، مگر باپ اور بچے کے تعلقات ایسے نہیں ہو سکتے کیونکہ ماں ان کے درمیان میں آجاتی ہے۔ بہرصورت بچے کے ذہن و کردار کی نشوونما میں باپ کا حصہ ماں کے بعد آتا ہے مگر کس قدر اور کتنے بعد، اس کا اندازہ اور صورت معاشرے کی مجموعی تنظیم اور حالات

پر موقوف ہے۔ قبل ابتداری معاشرے میں لڑکوں کی معاملے میں شروع کے کئی برسوں تک باپ اور بچے میں براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لڑکی کی صورت میں یہ لاتعلقی تقریباً تمام عمر ہی رہتی ہے۔ بہر صورت یہ لاتعلقی بھی بچے کے ذہن و کردار کے نشوونما پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ ماں اپنے خاوند کے خوف اور رعب داب میں ہوتی ہے، جس کا اظہار وہ ہر ایسے موقع پر کرتی ہے جب خاوند پاس ہوتا ہے۔ اُدھر بچہ باپ کو کم و بیش اجنبی تصور کرتا ہے اور اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ یہ اجنبی اس کے اور ماں کے درمیان میں آئے۔ لہٰذا اپنی بے بسی کے باعث باپ کو خوف اور مجبوری کے ملے جلے جذبات سے دیکھتا ہے، جس میں ناراضگی اور خفگی کے جذبات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اگر باپ اس سے پیار اور محبت سے پیش آئے، تو ان جذبات اور ردعمل کی شدت کم ہو جاتی ہے، ورنہ یہ بڑھ کر دہشت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بہر حال یہ تعلقات بچے میں بے اعتمادی اور بے حوصلگی کے رجحانات اور عادات پیدا کرتے ہیں۔ قبل ابتداری معاشرے میں بچوں کے ذہن و کردار کی ایسی نشوونما بہت ضروری ہے، کیونکہ اس معاشرے کا سارا نظام بزرگوں کے خوف[1] اور رعب داب پر مبنی ہے۔ اس طرح نئی نسلیں بچپن ہی

---

[1] خوف کا لفظ وضاحت طلب ہے۔ خوف انسانی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ مگر بچپن اور بالغ عمر کے خوف کی نفسیات میں فرق ہے۔ بڑی عمر میں خوف سے ایسا ردعمل پیدا ہوتا ہے جو نارمل شخص کے دل و دماغ میں مشکل کام، خطرے یا مہم کے وقت اس کے خطرات، خدشات اور مشکلات کا جائزہ لیکر اور غور و فکر کرکے ایسی تدابیر اور طریقے اختیار کراتا ہے، جو کم و بیش کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ بالغ شخص کے لئے عمل کے دوران بھی خطرات، خوف اور خدشوں کا تجربہ اور تجزیہ ان کی نوعیت اور دفاعی تدابیر تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے عمل اور تکمیل کو زیادہ موثر اور کارگر بنا لیتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے کام مشکل یا مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے پس بالغ عمر میں خوف کے اثرات نارمل آدمی کو خطرے، خدشے یا خوف کے وقت زیادہ سے زیادہ باعمل اور باتکمیل بنا دینے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اور اس میں خوداعتمادی تجسس جستجو، پیش قدمی اور پہل کرنے کی صلاحیت اور عادات پیدا کرتے ہیں۔ مگر یہ ردعمل تبھی ممکن ہوتے ہیں۔ اگر اس کے ذہن و کردار میں ایسے تکمیلی رجحانات، عادات اور طرز غور و فکر پہلے ہی، یعنی نوعمری ہی سے موجود ہوں۔ بچپن میں خوف

سے اپنے مرد بزرگوں کے رعب داب اور دہشت میں پرورش پاتی ہیں جو اُن کے ذہن و کردار کو بنیادی طور پر غیر تکمیلی بنا دیتے ہیں۔ اور اس طرح قرابتداری معاشرے کو بھی غیر تکمیلی بناتے ہیں۔ دراصل تکمیلی ذہن اور کردار کی تکوین و تشکیل بذاتِ خود اس روایتی معاشرے کے لئے باعث تخریب و انتشار ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی خاندانی تنظیم اور غیر تکمیلی ماحول اور زندگی اس معاشرے کی بقا اور سلامتی کے لئے ضروری ہے، بشرطیکہ کوئی تکمیلی ترقی پسند اور ڈائنمک معاشرہ اس سے متصادم اور متحارب نہ ہو۔

غیر قرابتداری معاشرے میں بچے کی کردار سازی

قرابتداری معاشرے کے برعکس، غیر قرابتداری معاشرے میں بچے کے ذہن و کردار کی نشوونما بالکل مختلف انداز میں ہوتی ہے۔ اس معاشرے کا سارا نظام اور خاندانی زندگی اور تنظیم روبہ تکمیل ہوتی ہے۔ چونکہ یک زوجگی قانوناً رائج ہوتی ہے جس کے باعث کم از کم خاندانی کی نوعیت قطعی مختلف ہوتی ہے۔ اس عمر میں بچے میں ابھی غور و فکر کی صلاحیتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس اس کا ذہن جذبات اور احساسات سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر اور مغلوب ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے ماحول میں اور خاص طور پر اپنی ماں میں کسی طرح کا بھی خوف و ہراس گھبراہٹ اور بے اعتمادی پاتا ہے تو اپنی ناسمجھ مگر حساس طبیعت کے باعث اُن سے عموماً غیر شعوری طور پر بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے۔ اس کی خوفزدگی ایسی صورتیں اختیار کر لیتی ہیں جن سے اس میں خود اعتمادی اطمینان، حوصلہ، پہل اور پیشقدمی کے رجحانات کی بجائے بے اعتمادی، بے اطمینانی، بزدلی، پس قدمی، غیر مستقل مزاجی، کام اور مشکل کے وقت فرار، تشویش اور گھبراہٹ کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں جو بالآخر عادت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح بچپن کی عمر کے خوف و ہراس انسانی ذہن و کردار کو ماؤف اور مفلوج کرنے کا رجحان رکھتے ہیں لیکن ایسے موقعوں پہ اگر ماں اور باپ ہمت اور حوصلہ، اطمینان اور اعتماد، جرأت مندی اور عقلمندی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں گے، تو اُن کے کم سن اور نوجوان بچوں کی نفسیات اور کردار میں بھی وہی خوبیاں اور خصائل پیدا ہو جائیں گے۔ دراصل انسانی بچے کے ذہن و شعور اور عادات و کردار کی نشوونما اٹھارہ بیس سال تک اس کے ماں باپ کے نفسیاتی اور شخصیاتی "گود" میں ہوتی ہے اسکے بعد ہی وہ یونانی گاڈیس منروا کی طرح ایک مکمل اور خود مختار اور خود انحصارانہ شخصیت بن کر دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اس وجہ سے خاندانی اور معاشری نظام حیات میں ماں کا مقام اور اولین بچے کے ذہن و کردار کی نشوونما میں اولین حیثیت کا حامل ہوتے ہیں لیکن معاشرہ خود اپنی تشکیل، تنظیم اور ادارت سے اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ اسے کس طرح کی ماں درکار ہے۔ تکمیلی معاشرے کو روبہ تکمیل مائیں اور غیر تکمیلی معاشرے کو ایسی مائیں ملتی ہیں جنہیں تکمیلی زندگی، کاموں اور کارناموں کی کوئی واقفیت اور شعور نہیں ہوتا۔

زندگی میں میاں بیوی کے حقوق و فرائض کم و بیش یکساں ہوتے ہیں عورت کو آزادی اور خود مختاری حاصل ہوتی ہے۔ خاندان کے ممبروں کی تعداد کم ہوتی ہے، بلکہ اکثر و بیشتر خاندان میاں بیوی اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بچوں کی پرورش اور تربیت والدین کے سپرد ہوتی ہے، دوسرے رشتہ داروں کو، مثلاً باپ کے باپ یا ماں، بھائی یا چچا کو خاندان کے معاملات میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے بیوی/ماں کو گھر کے معاملات میں خاوند/باپ سے برابری اور مساوات حاصل ہوتی ہے۔ اور اُسے آزادی اور خود مختاری حاصل ہوتی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اپنی رائے اور عقل سے فیصلہ کرتی ہے۔ بلکہ ایسے معاشرے میں عورت کو گھر کے باہر بھی آزادی اور خود مختاری حاصل ہوتی ہے۔ وہ خاوند بھی خود ہی تلاش کرتی ہے۔ اس کے ماں باپ کو رائے اور مشورہ دینے کا تو حق ہوتا ہے، مگر وہ خاوند کے انتخاب میں اس پر اپنا فیصلہ اور مرضی نہیں ٹھونس سکتے، جبکہ قرابتداری معاشرے میں عورت ان تمام معاملات میں بے بس اور لاچار ہوتی ہے۔ بہر حال ان خصوصیات کے باعث غیر قرابتداری معاشرے کے وحدانی خاندان میں جو قرابتداری معاشرے کے مشترکہ خاندان کے مقابلے میں صرف ماں باپ اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے، میاں بیوں کے تعلقات محبت، احساس ذمہ داری، فرض شناسی اور تعاون پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس لئے بیوی/ماں اپنے خاوند/باپ سے کوئی خوف، اندیشہ تشویش اور گھبراہٹ ایسے ردعمل نہیں محسوس کرتی، بلکہ اس کے روزمرہ کی چال ڈھال، گفتار و کردار میں، خود اعتمادی، فرض شناسی، حوصلہ، تعاون اور الفت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بچے میں بھی ایسا ہی تاثر اور ردعمل پیدا کرتی ہے۔ چونکہ وہ ایسا ماحول شیر خواری کی عمر سے اپنے اردگرد پاتا ہے، اس لئے شروع عمر ہی سے اس میں خود اعتمادی، اعتبار، اطمینان اور تعاون کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں، جو اُسے وہ ناراضگی اور خفگی کو دبانے میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں جو باپ کی موجودگی سے لازماً ہر بچہ کا ابتدائی ردعمل ہوتا ہے۔ یک زوجگی کے قانون کی وجہ سے ایسے کنبے کی بنیاد ہی پیار و محبت، ذمہ دارانہ آزادی، خود مختاری اور فرض شناسی پر قائم ہوتی ہے، چنانچہ بیوی/ماں کو یہ اندیشہ بھی نہیں ہوتا کہ مرد آسانی سے دوسری بیوی یعنی سوکن لا کر اس پر مسلط کر دے گا۔ دوسرے رشتے داروں کا بھی گھر کے معاملات میں عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے ماں باپ پوری آزادی، خود مختاری، فرض شناسی اور تعاون

سے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ اور اپنے عمل اور مثال سے ان میں ذمہ داری، فرض شناسی اور خود مختاری کی عادات اور صلاحیتیں پہلے ہی دن سے ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُن میں تعاون اور خود مدد اور خود عمل کی عادت بھی پڑ جاتی ہیں۔ اس طرح ایسی خاندانی زندگی بچے کو شروع ہی سے تکمیل گری کی راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔

بچہ اور معاشرہ، معلم ثالث

جب بچہ چار پانچ سال کا ہوتا ہے تو وہ اپنے خاندان کی محدود دنیا سے نکل کر باہر کی دنیا میں خود گھومنے پھرنے لگتا ہے یہ اس کی ننھی سی عمر کا پہلا بڑا واقعہ ہوتا ہے جو اس کو پہلی مرتبہ ایک تضاد سے دو چار کراتا ہے۔ تاہم چونکہ گھر سے باہر کی دنیا بھی گھر کی دنیا کی طرح قرابتداری اور غیر قرابتداری معاشروں میں بالکل مختلف نوعیت کی ہوتی ہے، اس لئے اس تضاد کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔

قرابتداری معاشرے میں ہر ایک خاندان، محلے، گاؤں، قصبے، شہر اور علاقے میں یکساں قرابتداری رسم و رواج اور ماحول پائے جاتے ہیں اور کم و بیش یکساں قسم کے "قرابتی گھریلو تنازعے اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم سارا معاشرہ ذات پات، قبیلہ، خیل اور برادری جیسے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس میں شادی، بیاہ، رشتہ داری، پیشہ اور گروہی مفادات کے فرق اور میل ملاپ کی پابندیاں، تقسیم اور علیحدگی کا ماحول پایا جاتا ہے ان کے باعث ان گروہوں اور قرابتداریوں میں بھی باہمی اور بین الگروہی (inter-group جھگڑے، تنازعے، دشمنی اور دشمنداری کی فضا طاری رہتی ہے، اور وہ باہمی لفرتوں، علیحدگیوں پابندیوں، تقسیموں اور تنازعوں سے دو چار ہوتا ہے، جن کا ذکر وہ اپنے گھر میں بھی سنتا بلکہ دیکھتا رہتا ہے۔ آس پڑوس میں بھی اُسے وہی بزرگوں کا رعب داب، غصے اور طمانچے کا سامنا رہتا ہے۔ بلکہ اس معاشرے میں بزرگ اکثر اپنے مردانے حصے میں بچوں کا آنا جانا بھی پسند نہیں کرتے۔ اگر بچوں کا جمگھٹا ہو جائے تو ڈانٹ پیٹ کر بھگا دیتے ہیں۔ لہٰذا پڑوس اور محلے کا ماحول بچے کے ذہن و کردار کی نشو و نما پر وہی اثر کرتا ہے جو گھر کے اندر کا ماحول، اور اُن عادات اور رجحانات کو راسخ کر دیتا ہے جو اس نے شیر خواری کی عمر میں حاصل کرنے شروع کئے تھے۔ وہ بڑوں اور بزرگوں کی صحبت سے گھبراتا ہے۔ اُن کے سامنے

باادب اور خاموش رہنا سیکھتا ہے، مگر اُن کی غیر موجودگی میں بے ادبی اور بدتمیزی میں مشغول رہتا ہے۔ یہ وطیرہ اس میں فریب دہی، جھوٹ، مکر اور حیلہ سازی کی عادات ڈال دیتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے گھر اور محلے کے جھگڑوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیتا ہے اور اُن کی دشمنیوں اور دشمنداریوں میں پڑ کر جھگڑالو بن جاتا ہے۔ اور باہمی منافرتوں اور مناقشوں کا عادی ہو جاتا ہے اس طرح سن بلوغ پہنچنے تک باہمی نفرت، جانبداری اور گٹھ جوڑ کا عادی ہو جاتا ہے۔ اب وہ دوسروں کے ساتھ تعاون اور اشتراک سے گھبراتا ہے، کیونکہ وہ ہر دوسرے شخص کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ وہ دوسروں کے مال اور حقوق کو غصب کرنے کو تیار رہتا ہے۔ وہ اپنے رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں کی محدود دنیا سے باہر غیر مانوس لوگوں سے ملنے سے بھی احتراز کرتا ہے۔ اس میں نئے لوگوں سے ملنے، نئے تجربات اور معلومات حاصل کرنے اور نئی میل ملاقات پیدا کرنے سے دلچسپی اور شوق بھی نہیں رہتا۔ لہٰذا غریب طبقوں کے علاوہ جو کام اور محنت کرتے ہیں قرابتداری معاشرے میں متوسط اور آسودہ حال طبقوں کے نوجوان اپنا سارا وقت قرابتداری کے جھگڑوں، تنازعوں کے معاملات میں گزارتے ہیں۔ اُن میں قرابتدارانہ جانبداری، اقربا پروری، غیروں سے احتراز، بلکہ نفرت، نکما پن، مفت خوری اور شماتت ہمسایہ ایسی عادات پڑ جاتی ہیں، ان کے باعث وہ دوسروں سے کام اور تکمیل میں تعاون اور اشتراک عمل کی عادات اور خصائل سے بھی عاری ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کا معاشری شعور نہایت ابتدائی اور سطحی نفرتوں اور علیحدگی پسندیوں پر آ کر رک جاتا ہے۔ اس لئے وہ وسیع تر معاشری شعور جو قومی شعور کی بنیاد ہے۔ سے بھی بے بہرہ رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں، عنفوان شباب میں اس معاشرے کے لڑکے اور لڑکیاں اس تضاد سے بھی دوچار ہوتے ہیں جو اس معاشرے میں عورت کی محکومی، محتاجی اور مظلومی نے پیدا کیا ہے۔ اس وجہ سے لڑکوں کو گھر کے باہر آزادی اور لڑکیوں کو گھر میں پابندی، پردہ اور دوسری بندشوں میں رکھا جاتا ہے، جن سے لڑکوں میں برتری کا احساس اور بے راہ روی کے طور طریقے پیدا ہو جاتے ہیں اور لڑکیوں میں کمتری اور بے بسی کے احساسات اور رجحانات شروع ہو جاتے ہیں۔ جو دونوں کی دنیاؤں کو الگ اور متضاد بنا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ، اپنی قرابتداری زندگی کے باعث لڑکوں

اور نوجوانوں میں خاندانی اور ذات پات اور قبیلہ اور برادری کے باعث خاندانی تفاخر اور ذات یا قبائلی تکبر اور تفریق کی عادات اور رویے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے بزرگوں کی طرح ساری عمر ذات پات اور قبیلوں کے جھگڑوں، دشمنوں اور منافرتوں میں گزار دیتے ہیں۔

اداس نسلیں

پس قرابتداری معاشرے میں نئی نسلیں جب جوان ہو کر دنیا میں قدم رکھتی ہیں تو وہ اپنے بزرگوں کی طرح قرابتداری معاشرت اور معیشت کی حدود میں ساری عمر گزار دیتی ہیں۔ روایتی کاروبار اور پیشوں کے علاوہ انہیں نئے کاموں، پیشوں، علم و ہنر اور دیگر تکمیلات کا کوئی شوق اور سروکار نہیں ہوتا۔ باہمی تنازعوں کے علاوہ اُن کو کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے خاندان، گاؤں اور شہر سے پرے کی دنیا کے حالات اور واقعات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ اُن کی زندگی اکثر و بیشتر کاہلی، لاپروائی اور غیر تکمیلی مشاغل میں گزرتی ہے۔ اس طرح یہ نسلیں معاشری طفیلی پن (social parasitism) کی زندگی گزارتی ہیں۔ جب جوانی ڈھلنے لگتی ہے اور بڑھاپا شروع ہوتا ہے تو ان طفیلی، مفت خور اور غیر تکمیلی نسلوں پر قنوطیت اور دنیا سے بیزاری کے احساسات کا غلبہ شروع ہو جاتا ہے۔ وہ گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اداسی اور بے بسی کے عالم میں باقی عمر گزار دیتے ہیں۔ ملک و قوم کے لئے یہ اداس اہلیت نسلیں کیسی ثابت ہوتی ہیں؟ اس سوال کا حل ہم اگلے ابواب میں بیان کریں گے

غیر قرابتداری معاشرے کی بالغ نسلیں

غیر قرابتداری معاشرے میں بچہ گھر کی دنیا سے باہر نکلتا ہے تو اس کو قطعی مختلف حالات اور تضاد سے واسطہ پڑتا ہے۔ اول تو اس معاشرے میں قرابتداری کی تقسیمیں، علیحدگیاں اور بندشیں نہیں ہوتیں۔ رشتہ داریاں ہوتی ہیں، مگر اُن کو خاندانی اور معاشری زندگی اور نظام میں کوئی وقعت اور اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ سارا معاشرہ اور ملک یکساں قسم کی وحدانی خاندانی زندگی گزارتا ہے۔ جس میں ہر شخص اپنا ذاتی کام، پیشہ، فرائض اور تکمیلات پر سہارا لیتا اور فخر کرتا ہے۔ اُسے خاندانی یا قرابتداری (یعنی ذات پات یا قبائلی) مفادات اور شان و شوکت کا خیال و گمان بھی نہیں آتا، کیونکہ اس معاشرے میں ذات پات، برادری، قبیلہ، خیل جیسے گروہوں اور اداروں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اس معاشرے کی خاندانی تنظیم بھی اس نوعیت کی ہوتی ہے۔ کہ

قرابتداری رشتے اور گروہ بندی ممکن بھی نہیں ہو سکتی۔ قرابتداری خاندان کے برعکس، جس میں مشترکہ خاندان کے باعث ممبروں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، غیر قرابتداری خاندان وحدانی تنظیم کا ہوتا ہے۔ یہ خاندان عارضی نوعیت کا ہوتا ہے۔ جب بچے جوان ہو جاتے ہیں تو وہ شادی کر کے ماں باپ سے الگ ہو کر اپنا اپنا وحدانی خاندان بنا لیتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ خاندان صرف ایک نسل تک باقی رہتا ہے اور مشترکہ اور وسیع خاندان کی طرح نسل در نسل جاری نہیں رہتا۔ ایسے خاندان میں والدین کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اپنے بچوں کے لئے مال و دولت کا ورثہ چھوڑنا اتنا ضروری نہیں جتنا تکمیل گری کی عادات اور کردار پیدا کرنا' تاکہ وہ بڑے ہو کر اپنی روزی خود کمانے اور اپنے سہارے کھڑے ہونے کی صلاحیتوں اور قوتوں کے حامل ہو جائیں۔ لہٰذا ماں باپ اپنی مثال اور تربیت سے ایسی کردار سازی کی کوشش کرتے ہیں اور گھر اور باہر دنیا میں ایسے حالات اور ماحول پیدا کرتے ہیں جن سے اُن کے بچوں کے ذہن کردار کی سمت بندی تکمیلی زندگی، عادات اور نظریات کی جانب ہو۔ وہ بچوں میں مثبت اور فعال عادات پیدا کرتے ہیں جو ان میں خود انحصاری، خود اعتمادی، پہل، پیش قدمی، قوت ایجاد و اختراع، تجربہ، تجسس، جستجو اور مہم جوئی کی عادات پیدا کرتے ہیں۔ اس معاشرے میں سکولوں اور درسگاہوں کا نظام بھی تکمیلی سمت بندی کے اصولوں پر قائم ہوتا ہے' اس لئے وہاں بھی بچوں اور نوجوان نسلوں کو تکمیلی زندگی کی طرف راغب کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح ان کی خاندانی زندگی کا تربیتی اور تکمیلی سمت بندی کا سلسلہ گھر سے باہر کی دنیا میں بھی جاری رہتا ہے۔ لہٰذا اس معاشرے میں بچے اور نوجوان اپنے پڑوس، محلے، گاؤں اور قصبے یا شہر کی زندگی میں بھی ایسے خاندانوں، ہمسایوں، دوستوں اور ملاقاتیوں سے ملتے ہیں۔ جو اپنے اپنے کاموں، پیشوں، مشاغل وغیرہ میں اسی طرح تکمیلی انداز میں مصروف عمل ہوتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے گھروں میں اپنے ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں اور بزرگوں کو دیکھتے ہیں۔ در اصل وہ اپنے سارے معاشرے کو راغب بہ تکمیل پاتے ہیں۔ اس وجہ سے ایسے تکمیلی معاشرے میں یک طرفہ رخ بندی (uni-dimensionalism) کی فضا پائی جاتی ہے جو ساری قوم کے ہر فرد کو، خواہ بڑا ہو یا چھوٹا مرد ہو یا عورت، لڑکا ہو یا لڑکی، باعمل، فعال اور باتکمیل رجحانات اور صلاحیتوں کا حامل بنا دیتی

ہے۔ لہٰذا جب اس معاشرے میں لڑکے اور لڑکیاں سن بلوغت کو پہنچتی ہیں تو اُن میں تکمیل گری کی عادات وخصائل اوصاف اور صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور وہ تکمیلی زندگی شروع کر دیتے ہیں جس کے لئے نہ تو اُن کی راہ میں کوئی قرابتداری بندشیں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ اور نہ ہی جنسی فرق ان کی تکمیلی کوششوں اور جستجو میں مانع آتے ہیں۔ غرضیکہ اس معاشرے میں ہر فرد کے ذہن وکردار کی تکوین وتشکیل ایسی ہوتی ہے جو اُسے نہایت۔ فعال اور ڈائنمک تکمیل گر بنا دیتے ہیں، جس سے تمام معاشرے، ملک اور قوم میں زبردست ترقی، فروغ اور پھیلاؤ کی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسی وسعت پذیر قوموں اور ملکوں میں ایک تبدیلی اور بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ غیر تکمیلی ملکوں اور معاشروں پر اپنا غلبہ اور تسلط قائم کرنے کا سامراجی رجحان بھی رکھتی ہیں، مگر اس کا تدارک صرف یہ ہے کہ دوسری قوموں اور ملکوں کو بھی انہی پیمانوں پر تکمیل ہونا چاہیئے، ورنہ ان کا وجود اور بقا وسلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے مگر یہ مسابقانہ ترقی صرف غیر تکمیلی معاشرے میں تکمیلی قوتیں پیدا کر کے ہی ممکن ہو گی جو اس کی معاشری ساخت میں عورت کا مقام بدل کر ممکن ہو سکتی ہے۔

ایک اور فرق بھی قابل ذکر ہے جس کی تشریح جدید مغربی ماہرین علم معاشرہ وتاریخ اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ قرابتداری معاشرہ ایسے قرابتی گروہوں پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں بند شدہ گروہ کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی رکنیت ایسے افراد کو حاصل ہوتی ہے جو ان میں پیدا ہوئے ہوں۔ لہٰذا شادی اور خاندان ایسے گروہوں کے بنیادی ادارے ہوتے ہیں۔ "غیر شخص" کو ایسے گروہوں کی رکنیت نہیں حاصل ہو سکتی، ماسوا ایک صورت کے، یعنی کوئی رکن کسی "غیر شخص" کو اپنا حلیف بنالے۔ عرب قبائلی معاشرے میں حلیف اور موالی بنانے کا طریقہ رائج تھا، مگر یہ طریقہ بھی اتنا غیر مسنون ہے۔ کہ بعض قرابتداری معاشروں میں یہ رائج نہیں۔ اس کی مثال ہند و ذات پات کا معاشرہ ہے جو اپنی نوعیت کی کلاسیکی مثال ہے۔ یہ معاشرہ خالصتاً "بند" (closed) معاشرہ ہے۔ اس کی رکنیت صرف پیدائش کے حیاتیاتی عمل ہی سے ملتی ہے جو ذات اور گوت کی بنیاد ہے۔ اس کے برعکس، غیر قرابتداری معاشرے میں پیدائش، خاندان اور خون کے رشتے وغیرہ کی بنا پر کوئی گروہ بندی نہیں ہوتی۔ تمام معاشرہ کھلا معاشرہ (open society،) ہوتا ہے۔ جس میں ہر وہ شخص اس کا رکن ہے۔ جو

ملک کا باشندہ ہے۔ کیونکہ ایسے معاشرہ کی رکنیت، ریاست کے قوانین کے تابع ہے۔ اس وجہ سے "غیر شخص" بھی اس کا شہری یا رکن بن سکتا ہے۔ دراصل کسی معاشرے کا "بند" یا کھلا ہونا معاشرت اور معیشت کی بنیادی عوامل پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر معاشرت اور معیشت ایسے ہوں کہ ہر شخص کو ارتباط و اختلاط کے مواقع اور سہولت حاصل ہیں تو معاشرہ "کھلا" معاشرہ ہوگا۔ لیکن اگر ان پر خون، نسل پیدائش وغیرہ کی وجہ سے پابندیاں عائد ہوں تو معاشرہ "بند شدہ" ہوگا۔ بہر حال لوگوں کے ایسے گروہ کو جس میں پیدائش، خاندان اور قرابتی رشتوں کی بنا پر گروہ بندیاں نہ ہوں، "قوم"[۱] کہتے ہیں۔

---

[۱] "قوم" کے لفظ کے استعمال کے ساتھ ہم دورِ جدید کی ہنگامہ خیز نظریاتی (آئیڈیالوجیکل) پروپیگنڈے کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تاہم اس لفظ کے بدلتے ہوئے معنوں میں تاریخ انسانی کے دو بڑے معاشری ادوار کی تاریخ سمٹ گئی ہے۔ گذشتہ زمانوں میں عربوں کے ہاں "قوم" سے مراد ایسے مائیکرو سوشل گروہوں سی ہوتی تھی جو پیدائش اور قرابتداری کے رشتوں کی وجہ سے ایکدوسرے کے مرنے جینے کے ساتھی ہوتے تھے، جنہیں عام طور پر قبیلہ بنی خیل (clan) وغیرہ کے ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے بعد میں مسلمانوں کے بعض ممالک میں، خصوصاً ہند و پاکستان کے برصغیر میں "قوم" سے مراد ذاتیں اور جاتیاں وغیرہ بھی ہو گئیں۔ یہ گروہ بھی قبائلی قرابتداری گروہوں کی طرح لوگوں کے ایسے مائیکرو سوشل گروہ ہوتے ہیں جو پیدائش اور قرابتداری کی بنا پر ان کے رکن ہوتے ہیں اور اپنی زندگی اور معاشرت کے تمام تر تعلقات اور مفادات ان تک محدود رکھتے ہیں مگر قرون وسطیٰ کے آخر میں یورپ کے بعض ممالک میں قوم (Nation) ایسا مائکرو سوشل گروہ بن گیا جو قرابتداریت کی گروہ بندیوں اور علیحدگیوں اور حسب و نسب کے امتیازات اور مخصوصات سے بالاتر ریاستی وفاداریوں، تعلقات اور مفادات کے تابع ہو گیا۔ ان وفاداریوں، تعلقات اور مفادات کی بنیاد کہیں زبان و مذہب، کہیں تمدن و معاشرت کی ہم آہنگی یا کہیں جغرافیائی اور نظریاتی حدبندیوں سے متعین ہوتی ہے۔ مگر اس کی اصلی اور حقیقی بنیاد ریاست کی ایسی حاکمیت اور وفاداریوں پر منحصر ہوتی ہے جو قرابتداری کے تمام تعلقات، مفادات اور رجحانات اور ہر قسم کے مائیکرو سوشل گروہ بندیوں اور علیحدگیوں سے پاک ہوتی ہے۔ جب تک کسی "قوم" میں ایسی تبدیلی اور تشکیل پیدا نہیں ہوتی وہ صحیح اور حقیقی معنوں میں "قوم" نہیں بنتی۔ گو نظریاتی پروپیگنڈے اور سیاسی اغراض یا آئینی مصلحتوں کی بنا پر اُسے "قوم" کہا جاتا ہو۔ اس لئے زمانہ جدید میں "قوم" سے مراد لوگوں کی ایسی گروہ بندی ہے جو اپنی ریاستی حدود میں کسی دوسری تصغیر پسند علیحدگیوں، رکنیت اور مفادات کو آزادی نہیں دے سکتی۔ اگر ایسے ہو تو یہ تصغیر پسند

لہٰذا کھلا معاشرہ ہمیشہ قومی معاشرہ ہوتا ہے۔ قرابتداری معاشرے میں لوگوں کے گروہ کو قوم نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اس میں قرابتداری گروہ بندیاں ہوتی ہیں، جن میں معاشرت اور معیشت نے ایسی حدبندی اور علیحدگیاں پیدا کر دی ہوتی ہیں کہ مختلف قرابتی گروہوں میں معاشری ارتباط و اختلاط بہت محدود بلکہ معدوم ہوتے ہیں۔ ایسے معاشرے میں ریاست پر بھی کسی ایک غالب گروہ

یا مائیکرو سوشل عناصر اس کے ماکرو سوشل تعاون، ارتباط و اختلاط کے نظام کی آزادی اور تکمیلی اثر آفرینی کو کمزور اور اس کے معاشری اتحاد اور معاونت کی قوتوں کو منتشر کر دیں گے۔ تب تاریخی واقعات اور حوادث زمانہ کے ہلکے سے جھونکے اس کی سیاسی تنظیم اور ملکی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیں گے۔ وہی لوگ قوم کہلاتے ہیں جو اپنے بیرونی اور اندرونی واقعات اور حادثات کے باوجود اپنی گروہی تنظیم اور اتحاد کو برقرار رکھتے ہیں یا برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر یہ صورت تکمیلات کے لامتناہی عمل اور تسلسل سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

قوم کی دوسری خصوصیت اس کی ماکرو سوشل وسعت پذیری اور اثر آفرینی ہے جو بیک وقت اس کی تکمیلی صلاحیتوں اور قوتوں کا نتیجہ اور وجہ ہوتی ہیں۔ اس خصوصیت کے باعث قوم میں کوئی محدود اور مائیکرو سوشل علیحدگیوں، حدبندیوں اور گروہ بندیوں کی گنجائش نہیں ہوتی خواہ وہ حیاتیاتی یا تکمیلی قوتوں اور اثرات کی پیدا کردہ ہوں۔ بلکہ تمام گروہوں کی بنیاد کام اور تکمیل کی مدت تک قائم رہتی ہے۔ جب یہ مقاصد اور مفادات پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں تو گروہ پھر قوم کی ماکرو سوشل جمعیت ( ) میں مدغم ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر گروہ کی رکنیت کام اور تکمیل کی اہلیت کی بنا پر مقرر ہوتی ہے، پیدائشی یا قرابتدارانہ تعلقات وغیرہ پر نہیں۔ لہٰذا تمام قرابتداری گروہوں کو معاشرتاً اور قانوناً کوئی اثر و رسوخ حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح قومی معاشرے کے اندر ہر فرد کے لئے خواہ مرد ہو یا عورت تعاون و اشتراک عمل، شرکت اور ارتباط و اختلاط کی پوری آزادی اور مواقع فراہم ہوتے ہیں، تاکہ وہ اپنے تکمیلی اغراض و مقاصد، ارادے اور منصوبے وغیرہ جس طرح چاہے اور جہاں چاہے تکمیل کر سکے۔ مزید براں، اس ماکرو سوشل وسعت پذیر خصوصیت کے باعث قوم میں ایسی قوتیں اور رجحانات بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو اس کی ریاستی حدود سے پرے بین الاقوامی اور بین المعاشری اثرات پیدا کرتے ہیں۔ جو اس میں توسیع پسندانہ قوتوں، گروہوں اور طبقوں کی غمازی کرتے ہیں مگر دوسری طرف جن قوموں اور معاشروں میں انہیں توسیع پسندانہ اثر حاصل ہو جاتا ہے ان میں عدم تکمیلات کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

یعنی قبیلہ یا ذات کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ جسے غالب گروہ نے اپنی فوجی فتح اور سیاسی اقتدار اور حاکمیت سے قائم کی ہے۔ ایسی غیر قومی معاشرے اور ریاست کی مثالیں قرون وسطیٰ کی مسلمان حکومتیں اور سلطنتیں تھیں، جن کا تجزیہ ہم اگلے ابواب میں کریں گے۔ علاوہ ازیں قرابتداری معاشرے میں معاشری طبقات (social classes) تو ہوتے ہیں، مگر طبقاتی تقسیم اور کش مکش نہیں ہوتی جیسی کہ جدید غیر قرابتداری معاشرے میں ہر ایک قرابتی گروہ میں اپنے اپنے امیر اور غریب طبقے ہوتے ہیں۔ ہر ایک طبقہ اپنے گروہی مفادات کو اپنے طبقاتی مفادات پر فوقیت دیتا ہے۔ اس لئے ایسا معاشرہ کئی قرابتی گروہوں کی متوازی تقسیم میں بٹا ہوتا ہے جن میں طبقاتی میل ملاپ نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرابتداری معاشرے کو "متوازی معاشرہ" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے باعث ایسے معاشرے میں طبقاتی تضاد نہیں ہوتا، اس لئے طبقاتی کش مکش بھی نہیں ہوتی۔ تاہم قرابتی گروہوں میں باہمی جنگ و جدال ضرور ہوتا ہے اس کی مثال موجودہ بھارت کی ریاست ہے جس میں ہندو ذات پات کے معاشرے نے جمہوریت کا لبادہ پہن کر غالب قرابتی گروہوں کی حکومت قائم کرلی ہے جو اب قدیم قرابتی جنگ و جدال کو طبقاتی کش مکش کی صورت دے رہی ہے۔ بہرحال معاشرت اور معیشت کی قرابتداری پابندیوں کے باعث قرابتداری معاشرہ لازماً مائیکرو سوشل معاشرہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس "کھلا" معاشرے میں ایسی پابندیاں اور حد بندیاں نہیں ہوتیں، اس لئے وہ لازماً ماکرو سوشل یا وسعت پذیر معاشرہ ہوتا ہے۔

قرابتداری اور غیر قرابتداری معاشروں کے فرق

انسانی زندگی اور معاشرے کے قیام و دوام، وجود، بقا، سلامتی فروغ اور تسلسل کی دو بنیادی ضرورتیں ہیں۔

اول ضرورتِ تکمیل اس کے محرکات اور عوامل ہیں: (۱) انفرادی، گروہی اور اجتماعی کام، محنت و مشقت، کوشش و کاوش جدوجہد اور عمل پیہم (۲) اقتصادی، معاشری، تمدنی، سیاسی اور آئیڈیالوجیکل مفادات، نظریات تعلقات ادارے تنظیمیں اور گروہ بندیاں (۳) پیداواری اور تخلیقی کاموں، سرگرمیوں، منصوبوں

اور پلانوں کے ذرائع اور وسائل اور اُن کے علمی، سائنسی، ذہنی، فکری، اخلاقی اور کرداری محرکات، ترغیبات، توقعات، عزم اور ارادے، اجتماعات اور ادارے اور (۱۷) اُن کے علمی، فکری، شعوری اور کرداری، تکنیکی اور فنی مقاصد اور منصوبوں کی لگن، شوق، ترغیبات، وابستگیاں اور ہنر مندیاں۔

دوم: ضرورتِ تناسل: اس کے محرکات اور عوامل ہیں: (۱) مرد اور عورت کے جنسی ارتباط و اختلاط کے میلانات، جذبات، ترغیبات تحریصات اور خواہشات، (۱۱) شادی بیاہ کے رسم و رواج، طور و طریقے اور قوانین (۱۱۱) خاندانی، عائلی اور قرابتی تعلقات، جذبات، توقعات، مفادات، رسم و رواج ادارے اور گروہ بندیاں (۱۷) عورت کی آزادی یا محکومی اور مرد و زن کی مساوات یا غیر مساوات کے نظریات، تصورات اور تحریکیں اور ادارے اور (۷) بچوں اور نوجوانوں کی پرورش اور تعلیم و تربیّت کے طور و طریقے، توقعات، مقاصد، نصب العین، ادارے اور اجتماعات، اور انکے تکمیلی محرکات، عوامل اور ضروریات۔

تمام انسانی معاشروں میں فرق اس امر پہ موقوف ہیں کہ ان دو ضرورتوں میں کون سی ضرورت کو دوسری پر اولیّت، فوقیت اور اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ معاشرے جن میں پہلی ضرورت کو اولیّت، فوقیت اور اہمیت حاصل ہوتی ہے اور جن میں ضرورتِ تناسل کے تمام عوامل کو ضرورتِ تکمیل کے عوامل کے تابع بنا دیا جاتا ہے، لازماً اور مستقلاً تکمیلی معاشرے ہوتے ہیں اور غیر قرابتداری بن جاتے ہیں۔ مگر وہ معاشرے جن میں ضرورتِ تناسل کو اولیّت، فوقیت اور اہمیت حاصل ہوتی ہے اور تکمیلی عوامل کو تناسلی عوامل اور ضروریات کے تابع بنا دیا جاتا ہے لازماً قرابتداری معاشرے ہوتے ہیں اور غیر تکمیلی بن جاتے ہیں۔ لہٰذا ان دو قسموں کے فرق اور اختلافات کے باعث ان دو طرح کے معاشروں کی معاشرتی تنظیم اور تاریخی ارتقا بھی لازماً مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔

قرابتداری معاشرے میں خاندانی اور پیدائشی رشتوں اور تعلقات کو معاشرتاً فیصلہ کن اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے سارا معاشرہ چھوٹے چھوٹے گروہوں اور حد بندیوں

میں بٹا ہوا ہوتا ہے جو لوگوں اور ملک کے تمام معاشرتی اور معاشی، تمدنی اور سیاسی، مذہبی اور اخلاقی تعلقات اور تنظیموں کو متعین کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے گروہ اور گروہ بندیاں، قبیلے خیل، ذات پات، برادری اور خاندان جیسی قرابتداری تنظیمیں اور تعلقات قائم کرتے ہیں۔ اس لئے ایسے معاشرے کو ہم قرابتداری یا مائیکرو سوشل معاشرہ کہتے ہیں۔

دوسری قسم کے معاشرے میں تمام معاشرتی تعلقات، رشتوں اور تنظیموں میں قرابتداریت اور رشتہ داری کو کوئی عمل دخل نہیں ہوتا، بلکہ معاشرتی زندگی کا سارا نظام اور کاروبار فرد اور اس کے کام صلاحیت، اہلیت، اور قابلیت پر مبنی ہوتا ہے۔ انہی سے اس کا معاشرتی مقام اور رول متعین ہوتے ہیں اور انہی سے اس کی معاشرتی قدر و منزلت ہوتی ہے۔ اس معاشرے میں خاندان وحدانی تنظیم پر قائم ہوتا ہے، اس لئے وہ ماں باپ کی زندگی، بلکہ بچوں کے سن بلوغت پہنچنے تک باقی رہتا ہے، اور پھر بچوں کے وہ وحدانی خاندانوں میں تقسیم ہو کر قوم اور معاشرے میں مدغم ہو جاتا ہے اس لئے اس طرز کے خاندان کا قیام عارضی ہوتا ہے، جس کا مقصد بچوں کی تکمیلی تعلیم و تربیت اور سمت بندی کے ساتھ پورا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس میں شادی نکاح کا نظام بھی قانوناً یک زوجگی پر قائم ہوتا ہے تاکہ مرد اور عورت میں ذمہ دارانہ تعلقات پیدا ہوں، جن سے عورت کو آزادی خود مختاری حاصل ہو اور اس کے حیاتیاتی فرائض میں مساوات قائم ہو، جو کہ کثرت ازدواجی نظام میں ممکن نہیں ہوتی، علاوہ ازیں، اس معاشرے میں تمام گروہ، تنظیمیں اور گروہ بندیاں مقصدیت اور مفادات کی بناء پر قائم ہوتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا یہ بھی مقصد کی تکمیل تک قائم رہتی ہیں قرابتداری گروہوں کی طرح نسل در نسل قائم نہیں رہتی ہیں۔ اس وجہ سے اس معاشرے میں کوئی مستقل گروہ بندی اور علیحدگی نہیں پائی جاتی، بلکہ ساری قوم ایک عظیم گروہ ہوتی ہے۔ ایسا قومی گروہ نہ صرف تعداد اور آبادی میں، بلکہ معاشرتی ارتباط و اختلاط میں قبائلی اور ذات پات کے گروہوں سے عظیم تر اور زیادہ منظم اور مستحکم ہوتا ہے جس میں باہمی تضاد اور مخاصمت کی بجائے میل جول، تعاون اور اشتراک عمل کے رجحانات اور تعلقات پائے جاتے ہیں لہٰذا ایسے عظیم اور کثیر التعداد معاشرے میں آپ کا اتحاد اور اتفاق پائے جاتے ہیں جو اسے وسیع تر یا ماکرو سوشل معاشرہ بناتے ہیں۔

عورت اور معاشرہ

قرابتداری اور غیر قرابتداری معاشروں کا بنیادی فرق عورت کی معاشری پوزیشن اور رول سے متعین ہوتا ہے جو باقی تمام اختلافات کی توضیح اور تفریق بھی کرتا ہے۔ ہر شخص کی معاشری پوزیشن اور رول کام اور تکمیل کی آزادی اور مواقع پر مبنی ہوتے ہیں جو اُسے معاشرے اور معیشت میں حاصل ہوں۔ چونکہ عورت کو کام اور تکمیل کے مواقع اور آزادی مرد کے مساوی میسر نہیں ہوتی اس لئے انسانی معاشرے میں عورت اور مرد میں ہمیشہ فرق رہا ہے۔ اس فرق کے باعث تاریخ انسانی میں تین قسم کے معاشرے پائے جاتے ہیں۔

اوّل ۔ مادر سری قرابتداری معاشرہ (Matriarchal Society.

اس معاشرے میں عورت کو معاشری برتری حاصل تھی۔ یہ معاشرہ انسان کی ماقبل تاریخ (Prehistory) میں پایا جاتا تھا جب انسان جنگلوں اور کھلے میدانوں میں رہنے والا بن مانس ہوتا تھا۔ اس دور اولیٰ میں تکمیل کی صورت بالکل ابتدائی فطری حرکات پر مبنی ہوتی تھی، مرد اور عورت دونوں بالکل یکساں اور مساویانہ طور پر جنگلوں، میدانوں، جھیلوں، ندی نالوں اور دریاؤں کے کنارے قدرتی خودرو خوراک تلاش کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ لہٰذا ایسی فطری حرکات وسکنات کی تکمیلات کے لئے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دراصل ایسی تکمیل سب حیوان اور جاندار بھی حاصل کرتے ہیں، مثلاً پرندہ بھی رات کو اپنے گھونسلے میں بسیرا کر کے صبح دانہ دنکا چگنے کے لئے جنگل اور کھیت میں اُڑ کر جائے گا۔ خوراک کی تلاش میں اس کی ساری پرواز اور حرکات بامقصد کوشش ہوتی ہیں یہ بالکل ابتدائی فطری نوعیت کی تکمیلی کوشش ہے جو ہر نوع کے حیوان کے لئے ضروری ہے اور اس کے لئے نر اور مادہ میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ تاہم ماقبل تاریخی زمانوں میں حیوان اور انسان میں ایک فرق ضرور پیدا ہو گیا تھا جس نے انسان کو معاشرت پسند حیوان بنا دیا، جبکہ باقی تمام حیوانوں میں ایسے ارتقاء کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی تھی۔ انسان معاشرت پسند حیوان صرف عورت یعنی ماں کی وجہ سے بنا۔ ماقبل تاریخی انسان کا معاشرہ جنسی گروہوں کی مائیکرو سوسائٹی تھا جن کی تشکیل ماں کی حیثیت اور تعلق کی بناء پر قائم ہوتی تھی۔ شادی بیاہ کا کوئی تصور نہ تھا۔ یہ جنسی

گروہ ایک ہی ماں کی اولاد ہوتے تھے، مگر اُن کے مردوں اور عورتوں میں کوئی جنسی تعلق نہیں ہوتا تھا، تاہم سال میں جب دو مختلف گروہ ایک دوسرے کے قریب سکونت پذیر ہو جاتے تھے تو ایک گروہ کی عورتیں دوسرے گروہ کے مردوں سے عارضی جنسی تعلق پیدا کر لیتی تھیں کچھ مدت کے بعد گروہ پھر الگ الگ راہوں پر چلے جاتے تھے۔ جو بچے جس گروہ کی عورتوں کے بطن سے پیدا ہوتے تھے وہ اسی گروہ کے رکن تصور ہوتے تھے[1] ہزاروں بلکہ کئی لاکھ سال کے بعد بتدریج اس ماقبل تاریخی معاشرے میں تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں شکار کے لئے پتھر کے آلات ایجاد ہوئے، جنگلی جانوروں کو پالتو بنایا گیا، نہایت ابتدائی کھیتی باڑی شروع ہوئی، مٹی کے برتن اختراع ہوئے۔ تن ڈھانپنے کی چیزیں استعمال ہونی شروع ہوئیں اور بالآخر مستقل سکونت کا طریقہ بھی شروع ہوا۔ یہ تمام آلات، اوزار ایجادیں اور طریقے انسان کی ایجاد کردہ پیداواری تکمیلات تھیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تکمیلات بیشتر عورت نے حاصل کی تھیں، مثلاً شکار کے پتھر کے آلات، ابتدائی کھیتی باڑی کے آلات اور طریقے، جانوروں کو پالتو بنانا، تن ڈھانکنے کی چیزیں، مٹی کے برتن وغیرہ سب عورت نے ایجاد اور دریافت کئے تھے۔ لیکن جب مرد نے ان پیداواری تکمیلات کو اختیار کیا تو تاریخ انسانی کا پہلا عظیم انقلاب برپا ہوا۔ کیونکہ اس نے عورت کی ایجاد کردہ تکمیلات کی نوعیت کو اپنی جسمانی طاقت اور قوت کے بل پر یکسر بدل دیا۔ اس نے بڑے بڑے جانوروں کو قابو میں کر کے پیداواری کاموں میں جوت دیا، زراعت کے بھاری بھاری اور مشقت طلب آلات کو کام میں لانا شروع کیا۔ دھاتوں کا پیداواری استعمال شروع کیا اور ہتھیار ایجاد کئے تاکہ دشمن گروہوں کی لوٹ مار کی جائے۔ اور گھر اور گاؤں بنانے شروع کئے۔ ان تمام تبدیلیوں کا راز مرد کی جسمانی قوت اور طاقت تھی جس کے باعث وہ عورت کی نسبت متواتر سخت محنت اور زور آور کاموں کو سرانجام دے سکتا تھا۔ مرد کی جسمانی محنت و مشقت کی صلاحیتوں اور عورت کی جسمانی کمزوری اور جنسی مجبوریوں نے پہلی مرتبہ انسانی

---

1. R. Briffault, *The Mothers*, p. 23, 66. Macmillan New Y

تاریخ میں ایسی معاشری صورت حال پیدا کر دی جس نے ایک طرف تو مرد کی بالا دستی اور برتری اور دوسری طرف عورت کی محکومی غلامی اور مظلومی کی بنیادیں رکھ دیں۔ اس طرح انسانی تاریخ کے ازمنہ قدیم میں پدر سرداری قرابتداری مائیکرو سوسائٹی وجود میں آئی جو کم و بیش آج تک قائم ہے۔

دوم۔ پدر سرداری قرابتدارانہ مائیکرو سوسائٹی

جب مرد کی تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں کی اجارہ داری اور برتری سے مادر سری معاشرے کا خاتمہ ہو گیا تو پدر سرداری معاشرہ وجود میں آیا' اس میں عورت مرد کی محکوم اور غلام بن گئی' جسے اپنے پیدائشی گروہ سے جنگ یا شبخون کے ذریعے پکڑ کر یا اغوا کر کے یا خرید کر کوئی مرد اپنے قبضے میں کر لیتا تھا اور اس کا مالک یا خاوند بن جاتا تھا اس طرح زور و جبر اور ظلم و زیادتی سے شادی کی رسم کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں' جب زراعت اور زمین کو بنیادی اہمیت حاصل ہوئی تو دو قرابتداری گروہ' عورتوں کا تبادلہ کرنے لگے جس میں شادی کی رسم فریقین میں گفت و شنید' جہیز کے لین دین' بیوی کی قیمت وغیرہ سے طے پانے لگی۔ زمانہ جدید کے آغاز میں ماکرو سوشل تکمیلات' مثلاً یک زوجگی کا قانونی نفاذ کے باعث جب غیر قرابتدارانہ خاندانی اور معاشری نظام وجود میں آنے لگا' جس میں مرد کے غلبے اور بالا دستی کی صورت بدلنے لگی اور عورت کی آزادانہ اور خود مختارانہ حیثیت اور شخصیت کا تصور فروغ پانے لگا' تو شادی کا تصور دونوں فریقین کی باہمی رضامندی اور رغبت اور پیار و محبت پر مبنی قرار پانا شروع ہوا۔ یہ تصور جدید ماکرو سوسائٹی کا نقطۂ آغاز ہے۔ بہر کیف' تاریخ انسانی میں پدر سرداری معاشرے نے دو شکلیں اختیار کیں۔ پہلی صورت قبائلی معاشرے کی تھی' جو زمانہ قدیم سے قرون وسطیٰ کے آغاز تک تکمیلی قوتوں کا حامل رہا مگر اس کے بعد دنیا کے صحرائی اور نیم صحرائی خطوں میں عدم تکمیلی صورت میں آج تک باقی رہا۔ قرون وسطیٰ کے شروع میں دنیا کی زرخیز وادیوں اور میدانوں میں قبائلی معاشرہ بدل کر جاگیردارانہ قرابتداری ذات پات کا تکمیلی معاشرہ بن گیا' جو ابھی بھی دنیا کے متعدد علاقوں اور ملکوں میں عدم تکمیلی حالت میں پایا جاتا ہے۔ اس کی یہ حالت اس وجہ سے ہوئی کہ قرون وسطیٰ... کے اواخر میں مغربی یورپ میں جاگیرداری نظام ختم ہو گیا اور نیا تکمیلی مگر غیر قرابتداری معاشرہ وجود میں آیا' مگر ایشیا اور افریقہ کے ممالک اور علاقوں میں قبائلی اور جاگیردارانہ پدر سرداری

مائیکرو سوسائٹی آج تک قائم رہیں۔

سوم۔ جدید غیر قرابتداری ماکرو سوسائٹی

جدید غیر قرابتداری یورپی معاشرے میں قرابتدارانہ مائیکرو سوسائٹی ختم ہوئی اور اس کی جگہ نئی تکنیکی، غیر قرابتی قومی ماکرو سوسائٹی نے جنم لیا۔ موجودہ صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی نئی تکنیکات کی وجہ سے اس ماکرو سوسائٹی میں پدرسرداری نظام بھی ختم ہو رہا ہے کیونکہ ان تکنیکی قوتوں اور طریقوں نے عورت کے لئے آزادی اور مساوات کے مواقع پیدا کر دیئے ہیں۔ جس کے باعث اسے اب مرد کی تکنیکی اجارہ داری اور بالادستی سے آزاد ہو کر بتدریج یکساں اور مساویانہ سہولتیں اور مواقع میسر آرہے ہیں۔ یہ زمانہ جدید کا عظیم انقلاب ہے جو مستقبل قریب میں انسانی معاشرے کو مرد اور عورت کی مساوات اور معاونت پر قائم کرے گا۔

قرابتداری معاشرے: اول، قبائلی معاشرہ

پدرسرداری قرابتدارانہ معاشروں میں پہلی قسم قبائلی معاشرے کی ہے یہ معاشرہ خانہ بدوش، نیم خانہ بدوش اور سکونت پذیر قبائل پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو گلہ بانی، ابتدائی زراعت اور تجارت پر گزارہ کرتے ہیں۔ مگر اس معاشرے کی بڑی خصوصیت قبائلی جنگ اور لوٹ مار ہے۔ کیونکہ حیاتیاتی عوامل کے باعث طاقتور قبیلہ کی آبادی بڑھتی رہتی ہے جو اسے اپنے ہمسایہ قبیلوں کی لوٹ مار پر مجبور کرتی ہے۔ جب بعض قبائل میں زراعت اور تجارت کے باعث دولت کا ارتکاز ہو جائے تو گرد و نواح کے مقابلتاً غریب مگر جنگجو قبیلے لازماً دولتمند قبیلے یا آبادی کو تاخت و تاراج کرنے یا لوٹنے پر مائل رہتے ہیں۔ لہٰذا قبائلی معاشرے میں ہر ایک قبیلہ ایسی متحدا کائی ہوتا ہے جس میں اشتراک عمل اور باہمی اتحاد عصبیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ سردار کی اطاعت، مشترکہ مفادات کی حفاظت اور رسم و روایات کی پابندی اس معاشرے کی روح ہوتی ہے۔ بہرحال اس معاشرے کا اساسی جزو قبیلہ ہوتا ہے۔ جو ایسے خیلوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کا جد امجد ایک تھا جس کی وہ سب اولاد ہیں۔ ہر خیل کئی خاندانوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر خاندان ایک مرد، اس کی بیویوں اور بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مرد کو میاں یا مالک کی حیثیت سے بیوی یا خریدی یا جنگ

میں پکڑی ہوئی داشتاؤں پر اور باپ کی حیثیت سے اپنی اولاد پر پورے اختیارات اور برتری حاصل ہوتی ہے، جو اس کی خاندانی پدر سرداری کی بنیاد ہے۔ گھر کے باہر مرد کو معاشی برتری اور فوقیت حاصل ہے جو اس کی معاشری فوقیت اور حاکمیت کی بنیاد رہے ہے اس کے ذریعے قبیلے میں مرد بزرگوں کی حکومت قائم ہوئی ہے، جو قبیلے کے سردار کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جسے اکثر و بیشتر خاندانوں اور خیلوں کے سربراہ مرد بزرگ منتخب کرتے ہیں یا روایتاً مقرر کرتے ہیں۔ اس طرح خاندان کے اندر اور باہر مرد کا حکم اور اختیار حتمی اور غالب مقام رکھتا ہے۔ یہ نظام حیات ماں اور بچوں کے تعلقات پر خاص اثرات اور نوعیت مترشح کرتا ہے۔ عورت خواہ کسی صورت میں ہو، یعنی ماں ہو یا بیٹی، بہن ہو یا رشتہ دار، نہایت محتاج، مجبور اور لاچار حیثیت رکھتی ہے۔ ماں اور بچوں کے تعلقات معاشراً کمزور ہوتے ہیں کیونکہ باپ کے حکم اور اختیارات کے آگے اُن کو کوئی وقعت اور حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ تعلقات قدرتی لگاؤ اور جذبات تک محدود رہتے ہیں۔ ماں اور بیٹی کے قدرتی لگاؤ اور تعلقات کا تو کیا سوال، ماں اور بیٹے کے تعلقات بھی باپ کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں، لڑکوں کو نوعمری ہی سے اپنے خاندان اور قبیلے کے معاملات مثلاً جنگ و جدال اور لوٹ مار اور شبخون میں شامل ہونا پڑتا ہے، اس لئے وہ جلد ہی ماں اور عورتوں کے دائرہ حیات سے نکل جاتے ہیں اور قبائلی معاشرے کے ماحول میں رنگے جاتے ہیں۔ اس لئے وہ پدر سرداری برتری اور فوقیت کی وضع قطع اختیار کر لیتے ہیں۔ جن کی مثالیں اُن کے باپ، باپ کے بھائی اور دوسرے مرد بزرگ اپنی گفتار و کردار سے اور جنگ و جدال سے ہر وقت پیش کرتے رہتے ہیں۔ بہر حال قبائلی معاشرے میں دو عوامل ایسے ہیں جو اس میں وسعت پذیری کے حالات پیدا کرتے ہیں۔ ان میں پہلا عمل حیاتیاتی ہے یعنی تعدد ازدواج، جس کے باعث طاقتور قبائل میں آبادی بڑی تیزی سے بڑھتی ہے۔ اس کی وجہ سے جنگ و جدال میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ اور قبائل میں جنگجویانہ صلاحیتیں اور رجحانات بڑھ جاتے ہیں۔ جنگ و جدال تکمیلی عمل ہے جو اس معاشرے میں وسعت پذیری کے حالات پیدا کرنے والا دوسرا

عمل ہے۔ لہٰذا ایک وقت ایسا آتا ہے جب خانہ بدوش اور سکونت پذیر قبائل آس پاس کی لوٹ مار کی بجائے دور دراز کے زرخیز میدانوں اور وادیوں اور متمول شہروں اور قصبوں پر لشکر کشی کر دیتے ہیں اور ان کو فتح کر کے صحرا نوردی کی بجائے زمینداری اور جاگیرداری کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح قرابتداری معاشرے کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

۲۔ جاگیرداری معاشرہ

جاگیرداری یا فیوڈل معاشرہ مختلف طرح کا قرابتداری معاشرہ ہے۔ اوّل تو اس کے قرابتی گروہوں میں اشتراکی ملکیت کا نظام جو قبائلی معاشرے کی بنیاد ہوتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی بجائے خاندانی ملکیت کا تصور پیدا ہو جاتا ہے یعنی ہر ایک خاندان کی اپنی زمینیں اور جاگیریں ہوتی ہیں یا کوئی پیشہ اور تجارتی کاروبار ہوتا ہے اس وجہ سے سارا معاشرہ نئے قرابتی گروہوں میں بٹ جاتا ہے جو قبیلوں اور خیلوں کی بجائے ذاتیں، گوتیں اور برادریوں جیسے گروہ کہلاتے ہیں۔ ہر ایک گروہ خاندانوں پر مشتمل ہوتا ہے جس کے سربراہ اپنے گاؤں یا علاقے میں مقامی برتری اور اثر و رسوخ کے لئے جدوجہد کرتے ہیں تاکہ اپنے خاندانی زمینوں اور جاگیروں یا تجارتی کاروبار کا تحفظ کر سکیں۔ تاہم خاندانی زندگی کی تشکیل قبائلی خاندان سے بہت مختلف ہوتی ہے ہر خاندان اور قرابتی گروہ ایک ہی گاؤں یا مقام پر اپنے اپنے مکانوں اور محلوں میں رہتے ہیں۔ جہاں اُن کی سکونت مستقل ہوتی ہے۔ قبائلی خاندانوں کی طرح وہ عارضی طور پر خیمہ زن نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے ہر ایک خاندان علیحدہ اور مختص گروپ بن جاتا ہے جس کی معاشری حیثیت اور مقام دوسروں سے مختلف اور مخصوص ہوتے ہیں جن کی بنا پر اس کے ہم ذات خاندانوں سے ذات پات کے رشتے اور تعلقات متعین ہوتے ہیں۔ مگر ان تعلقات پر اس کی آمدنی اور دولت اور ذرائع معاش اور دوسرے تکمیلی کام اور کمالات بھی اثر انداز ہوتے ہیں، جیساکہ قبائلی معاشرے میں ممکن نہیں تھا۔ اس لئے جاگیرداری معاشرے میں طبقاتی تقسیم بھی پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔ امیر اور غریب کا فرق ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے۔ رنگ اور نسل کی تمیز کی جاتی ہے۔ ذات

پات، برادری اور اسی قسم کی دوسری فرا بتدارانہ علیحدگیاں اور امتیازات شروع ہو جاتے ہیں جو قبائلی معاشرے میں نہیں ہوتے۔ کام اور پیشوں کی تقسیم سے نئی نئی ذاتیں اور گوتیں وجود میں آجاتی ہیں۔ بہرحال ان حالات کا اثر مردوں، عورتوں اور بچوں کی بودوباش پر پڑتا ہے عورتیں گھر کی چاردیواری میں بند کردی جاتی ہیں۔ اور اُن پر پردہ جیسی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں، جو قبائلی زندگی میں ناممکن تھیں۔ چونکہ بعض خاندان ذات اور گروہ جاگیرداری زمینداری یا تجارت اور حرفت کے باعث زیادہ متمول ہو جاتے ہیں، تو اُن میں شادی بیاہ کے رسم ورواج میں بھی فرق آجاتا ہے۔ تعدد ازدواج کی رسم عام ہو جاتی ہے۔ غلامی کا رواج شروع ہو جاتا ہے، جس سے زرخرید لونڈیوں، باندیوں اور کنیزوں کی کثرت ہو جاتی ہے جو خاندانی زندگی کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ پردہ۔ کثرت ازدواج اور غلام اور کنیزوں کے بہتات سے عورت کی حیثیت اور مقام کی تذلیل شروع ہو جاتی ہے۔ اور اگر مذہب اور آئیڈیالوجی، قانون اور حکومت نے مرد کی برتری اور فوقیت پر کوئی پابندی عائد نہیں کی، تو مرد کی خاندان میں سربراہی اور سرداری عیش و عشرت اور شہوت رانی کی سب حدود پار کر جاتی ہے۔ جاگیرداری نظام میں بچوں کی زندگی بھی مختلف طور سے شروع ہوتی ہے۔ بچپن میں بچے اپنا تمام وقت ماں اور گھر کی دوسری عورتوں کے پاس گزارتے ہیں، جہاں وہ اپنے معاشرے اور تہذیب و تمدن کے تمام رسوم ورواج، اقدار اور طور و طریقے عورتوں سے حاصل کرتے ہیں، جبکہ باپ اور دوسرے مرد بزرگ گھر کے باہر کے معاملات میں مشغول ہوتے ہیں، اس لئے بچوں بلکہ نوجوان لڑکوں سے بہت کم تعلق میں آتے ہیں یہ اُن کی زندگی کا پہلا تضاد ہے جو قبائلی معاشرے کی اشتراکیت میں ممکن نہ تھا۔ بہرحال، جب لڑکے بڑے ہو کر باپ اور دوسرے بزرگوں کے معاملات میں شامل ہوتے ہیں تو ان دو نسلوں کے رویوں، خیالات اور عادات میں فرق ہوتا ہے۔ اگر باپ کئی بیویوں اور کنیزوں وغیرہ کا خاوند اور مالک ہو۔ تو یہ تضاد اور اختلاف زیادہ سنگین صورت اختیار کرلیتا ہے۔ مگر پدرسرداری برتری اور اختیارات کے باعث یہ دو نسلی تضاد اور خلا کم و بیش دبے رہتے ہیں اور نوخیز نسلیں اپنے معاشرے کی روایتی شکنجے میں جکڑی رہتی ہیں۔ تاہم باپ کے بڑھاپے یا موت

کے بعد زمین اور ترکہ ماؤں کی طبیعت اور ترغیب کے باعث خاندانی تنازعے شروع ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے خاندان کی جاگیر یا جائداد تباہ ہو جاتی ہے۔ جو اس معاشرے کی تکمیلات اور ترقی کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوتی ہے اور اس میں تنزل اور جمود کا باعث بنتی ہے۔

قرابتداری معاشرے میں عورت کی محکومی اور مظلومی

پدر سرداری قرابتداری معاشرے میں عورتوں کی کوئی اپنی مرضی اور رائے نہیں ہوتی اور انہیں کوئی آزادی اور خود مختاری حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی انہیں اپنی مرضی اور رائے کے اظہار کا مواقع دیئے جاتے ہیں بلکہ تمام معاشری نظام آئیڈیالوجی اور کلچر کا ڈھانچہ اس طرح استوار کیا جاتا ہے کہ انہیں ایسے مواقع اور آزادی کا خیال بھی نہ آئے۔ عورت کو اپنے قرابتی گروہ یا خاندان کا مال یا مقبوضہ تصوّر کیا جاتا ہے جسے دوسرے گروہ کے پاس فروخت کیا جاتا ہے یا کسی طور سے رقم یا معاوضہ حاصل کر کے شادی کر دی جاتی ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے پیدائشی گروہ سے اپنے خاوند یا مالک کے گروہ کو منتقل کر دی جاتی ہے تاکہ اس گروہ کے لئے بچے جننے اور اپنے خاوند یا مالک کی گھریلو ضروریات کو پورا کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے میں صرف مرد کو ہی تکمیل گر تصوّر کیا جاتا ہے، جبکہ عورت کو تکمیل گری کی تمام صلاحیتوں اور اہلیتوں سے قطعی عاری تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہ پدر سرداری معاشرے کی آئیڈیالوجیکل بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر عورت کو بھی مرد کے برابر تکمیل گری کے مواقع اور آزادی حاصل ہو جائیں تو اس معاشرے کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتے گا۔ اس صورت میں معاشرے کو ایسی مساویانہ بنیادوں پر تشکیل کرنا پڑیگا جن میں قرابتداری گروہوں اور مفادات اور تعلقات کا نظام ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا جب تک قرابتداری اور پدر سرداری معاشرہ قائم ہے، اس میں عورت کے حصّے میں محکومی محتاجی اور لاچارگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ روز اول سے اُسے ہر طرح کی تکمیلی رغبتوں شوق اور رجحانات سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے۔ اس کو صرف امور خانہ داری کی تربیت کے علاوہ کوئی اور صلاحیت اور اہلیّت نہیں سکھائی جاتی۔ اُسے گھر کی چار دیواری میں بند رکھا جاتا ہے اور شادی کے بعد ایک چار دیواری سے دوسری

چار دیواری کو منتقل کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ نہایت بھولی بھالی، بے خبر اور بے شعور زندگی گزارتی ہے۔ میاں کی خدمت، بچوں کی دیکھ بھال اور روزی کمانے کے ایسے کام جو گھر کے اندر یا قریب ہی سرانجام دیئے جا سکیں، اس کی زندگی کے فرائض تصور ہوتے ہیں وہ گھر کے باہر کی دنیا کے معاملات اور تکمیلات کو نہ تو سمجھتی ہے اور نہ اُسے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے جب وہ خانگی فرائض کو پورا نہ کر سکے تو دوسری بیوی لائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا قرابتداری معاشرے میں عورت اپنی حیثیت اور عادات کے لحاظ سے حقیقتاً "اللہ میاں کی گائے" ہوتی ہے۔

قرابتداری معاشرے کا جمود پدرسراری قرابتی معاشرے میں تکمیل گری کے موافول کے باوجود، مردوں کا تکمیلی میدان بھی زیادہ وسیع نہیں ہوتا۔ وہ بھی اپنے معاشرے کے روایتی کاموں اور پیشوں کو ہی اختیار کر سکتے ہیں، جن سے تجاوز کرنا ان کے لئے بھی ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ اگر وہ نئے نئے کام اور مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہو جائیں، تو قرابتداری معاشرے کا نظام، انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہے مثلاً اگر لوگ زرعی نظام میں رہتے ہیں تو وہ تجارتی نظام نہیں اختیار کرتے۔ اگر کوئی خانہ بدوش لوگ ہیں تو وہ سکونت پذیر زندگی اختیار کرنے پر مائل نہیں ہوتے۔ پس کام اور تکمیل کے لحاظ سے قرابتداری معاشرے میں عورت اپنی حیاتیاتی اور معاشری محکومی کے باعث اور مرد اپنی قرابتدارانہ رسم و رواج اور روایات کے باعث محدود اور مسدود زندگی گزارتے ہیں اس وجہ سے قرابتداری معاشرہ روایات اور رسم و رواج میں جماد(embedded) رہتا ہے اور اس میں تکمیلی قوتوں کا فقدان ہوتا ہے جو اس کے قرابتدارانہ نظام کو قائم و دائم رکھتا ہے۔

تاہم یہ تنزل اور جمود لازمی نہیں۔ "تاریخاً جاگیردارانہ قرابتداری معاشرہ ایک عبوری معاشرہ ہے جس میں قرابتدارانہ نظام معاشرت کو غیر قرابتدارانہ نظام میں بدلا جا سکتا ہے یعنی معاشرے کو مائیکرو سوشل تعلقات اور نظام زندگی سے ماکرو سوشل تعلقات اور نظام زندگی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ تبدیلی صرف ایک طرح لائی جا سکتی ہے۔ وہ ہے عورت کو قرابتداری شکنجے سے نجات، جو صرف خاندان اور شادی کے نظام کو قانوناً اور معاشرتاً تبدیل کرنے سے ممکن ہوتی ہے تاکہ عورت کو بھی مرد کے مساویانہ تکمیل گری

کے مواقع اور آزادی میسّر ہو۔ ایسے معاشرے کی تشکیل تاریخی طور پر سب سے پہلے قرون وسطائی مغربی یورپ میں وقوع پذیر ہوئی، جس نے بالآخر جدید غیر قرابتداری معاشرے کو جنم دیا۔

غیر قرابتداری معاشرہ

غیر قرابتداری معاشرے کی تنظیم بالکل مختلف طور سے ہوتی ہے اس میں قرابتداری گروہ ناپید ہوتے ہیں۔ اور خاندان یا کنبہ وحدانی تنظیم کا ہوتا ہے، یعنی صرف میاں بیوی اور ان کے بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ شادی کا نظام قانوناً یک زوجگی پر قائم ہوتا ہے، دو یا دو سے زیادہ بیویاں رکھنا سنگین قانونی جرم ہوتا ہے۔ اس طرح عورت کو اس کے بنیادی حیاتیاتی اور معاشری فرائض میں مرد سے مساوات حاصل ہوتی ہے جو اس کی آزادی اور حقوق کی ضامن ہے طلاق میں بھی مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہوتے ہیں۔ ان وجوہ کے باعث عورت (اور مرد بھی) اپنے قرابتی گروہ کے قبضہ سے آزاد ہو جاتی ہے خواہ وہ اس کا پیدائشی گروہ ہو یا خاوند کا گروہ ہو۔ اصل عورت کی آزادی قرابتداری معاشرے کا سارا شیرازہ بکھیر دیتی ہے، کیونکہ اب وہ ان گروہوں کی مالِ خرید و فروخت نہیں رہتی۔ اس وجہ سے یہ معاشرہ قرابتی گروہوں کی بجائے عارضی گروہوں پر مشتمل ہوتا ہے جو صرف کام اور مقاصد کی تکمیل تک قائم رہتے ہیں، قرابتی گروہوں کی طرح نسل اور خاندان پر مبنی نہیں ہوتے۔ ملک کے سارے لوگ کام اور تکمیل کی معاشرت اور معیشت میں منسلک ہوتے ہیں، جن میں ارتباط و اختلاط کی کوئی قید اور پابندی نہیں ہوتی۔ ایسے ملکی گروہ کو قوم کہا جاتا ہے، جو ذات پات اور قبیلہ وغیرہ کی حدبندیوں اور علیحدگیوں سے بالاتر ایک قومی معاشرہ بناتے ہیں اور حکومت اور قانون کی حکمرانی کے تحت اپنے تمام معاشری تعلقات اور تنظیمیں قائم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا معاشرہ قبائلی یا ذات پات کے معاشرے کی نسبت زیادہ وسیع اور جامع ہوتا ہے۔ لہٰذا ماکروسوشل تہذیب و تمدن کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں قانون اور حکومت کے ذریعے سارے معاشری نظام کے تعلقات، مفادات، حقوق آزادی، رسم و رواج، خیالات اور نظریات اور تہذیب و تمدن میں ہم آہنگی اور ربط و

ضبط قائم کیا جاتا ہے اور کسی مائیکرو سوشل گروہ کو اپنے علیحدہ پسندانہ حقوق اور مفادات کی ترویج اور فروغ کی اجازت نہیں ہوتی جو اس کے قومی اتحاد اور ہم آہنگی کو کمزور یا منتشر کردے۔ اس معاشرے میں ہر فرد کو، خواہ مرد ہو یا عورت، تکمیل خیال اور تکمیل کار کی پوری اور مساویانہ آزادی حاصل ہوتی ہے کیونکہ ہر شخص کی معاشری حیثیت اور مقام اس کی پیدائشی حیثیت اور قرابتداری تعلقات کی بجائے اس کے کام اور تکمیل کی صلاحیتوں اور قوتوں سے متعین ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر، ہر فرد کی حیثیت اور مقام اکتسابی ہوتا ہے، انتسابی نہیں۔ اس لئے فرد کی شخصیت، آزادی اور کارکردگی کا احترام اس معاشرے کی بنیادی قدریں ہوتی ہیں۔ ہر فرد کی معاشری حیثیت اور مقام اس کی خاندانی اور قرابتی رشتوں اور روایات کی بجائے اس کی پیداواری اور تخلیقی صلاحیتوں اور تکمیلات پر منحصر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس معاشرے میں تقسیم کار اور تکمیلی مقابلہ اور مسابقت کا ماحول ہوتا ہے جو قانون اور اصول کی پابندیوں اور حد بندیوں کے تحت ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اس لئے ہر خاندان میں ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت اس طرح سے کرتے ہیں کہ وہ بڑے ہو کر تکمیلی مقابلہ اور مسابقت میں خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں، اس لئے اُن کے کردار اور خودی کی تشکیل لازماً خود مختاری اور ذمہ داری کی بنیادوں پر ہوتی ہے تاکہ ہر شخص کسی دوسرے شخص یا گروہ کے سہارے کی بجائے خود اپنی تکمیلی صلاحیتوں اور قابلیت اور اہلیتوں پر سہارا لے۔ اس وجہ سے ایسے معاشرے اور قوم میں متواتر ترقی اور فروغ کے رجحانات پائے جاتے ہیں جو اُن کو وسعت پذیر اور ڈائینمک بنا دیتے ہیں۔ یہ معاشرہ بالآخر ایسے معاشروں اور ملکوں پر حملہ آور ہوتا ہے جن میں قرابتداری نظام کے باعث تنزل، انحطاط اور جمود پائے جائیں۔ اس تصادم کا نتیجہ طاقتور معاشرے کی کمزور معاشرے پر فتح، غلبہ اور تسلط میں نکلتا ہے۔ تاریخ انسانی ابھی ایسی منزل پر نہیں پہنچی جہاں بین الاقوامی اور بین المعاشری تصادم، غلبہ اور تسلط استحصال اور غارتگری کے قدیم طریقے ختم ہو جائیں۔ یہ کیفیت تبھی قائم ہو گی جب سارے کرۂ ارض پر تمام ملک، قومیں اور معاشرے کاملاً، کلیتاً اور قطعاً تکمیلی بن جائیں گے۔

جدید معاشرہ اور عورت

جدید معاشرہ غیر قرابتدار اور ماکروسوشل معاشرہ ہے، جس کی بنیاد عورت کی آزادی اور دونوں جنسوں کی مساوات کے نظریوں اور اصولوں پر قائم ہے۔ جو عورت کے سارے عمری سائیکل (Life Cycle) پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت اپنی حیاتی صورت حال (Life Situation) کے باعث انسانی زندگی اور دنیا کو مرد کی نسبت قدرے مختلف زاویئے سے دیکھتی ہے مگر مرد کے غلبے اور برتری اور قرابتداری نظام کی بندشوں اور ممانعتوں کے باعث اس کی آواز اور نقطۂ نظر کو دبا دیا جاتا ہے اور اُن کو کوئی معاشری اہمیت، وقعت اور حقیقت نہیں دی جاتی، بلکہ نسوانی کمزوری اور ناقص العقل جیسے ناموں سے تعبیر کر کے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مگر آزادی اور مساوات کے ماحول میں، جو تکمیلاتی ترقی کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے، عورت کو اپنے خیالات، رائے اور ضروریات کے اظہار کا معاشرا موقع میسر آتا ہے جو جلد یا بدیر سارے معاشری نظام کو نئی بنیادوں پر منتشکل کرتا ہے۔ عورت کی آزادی کے معنے مرد کے غلبے اور محکومی سے رہائی اور نجات ہے۔ جو عورت کو کام اور تکمیل کے نااہل یا ناقابل بنا دیتے ہیں۔ تاہم اس آزادی سے کئی قسم کے نتائج پیدا ہوتے ہیں:

اوّل۔ اس سے معاشرتی انضباط واختلاط میں زبردست اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہر عورت کسی مرد سے کسی وقت اور کسی جگہ ہر قسم کا تعلق پیدا کر سکتی ہے۔ اس لئے اس سے جنسی انارکی کا رجحان بڑھ جاتا ہے جس کا تدارک شادی اور طلاق کے نظام کو نئی اور معقول بنیادوں پر استوار کرنے سے کیا جاتا ہے۔

دوم:۔ مرد کے غلبے اور برتری کے سارے نظام کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ہزاروں برس پرانا پدرسرداری نظام ختم ہو جاتا ہے:

سوم۔ قرابتداری معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ذات پات، قبیلہ برادری، رنگ و نسل وغیرہ کی تمیز مٹ جاتی ہے یا ختم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے معاشرے اور خاندان کی تشکیل غیر قرابتداری بنیادوں پر کرنی پڑتی ہے۔

چہارم:۔ وراثت اور معیشت کا نظام متزلزل ہو جاتا ہے اور اسے نئی بنیادوں

پر استوار کرنا پڑتا ہے۔

پنجم۔ تکمیلی اور غیر تکمیلی ہر دو قسم کے رجحانات بڑھ جاتے ہیں۔ لہٰذا غیر تکمیلی رجحانات کی روک تھام کا بندوبست کرنا پڑتا ہے تاکہ تکمیلی رجحانات کے اضافے میں خلل نہ پڑے۔

ششم۔ مرد اور عورت میں مساوات، ہمسری اور یکسانیت کے رجحان پیدا ہو جاتے ہیں، جو عورت میں خودداری، خود اعتمادی اور خود انحصاری کے عادات اور رجحانات پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے معاشرے میں عورت ایک خود مختار اور خود انحصار شخصیت بن جاتی ہے جو کسی طرح غالب مرد کے رحم و کرم پر نہیں ہوتی۔

ہفتم۔ مرد کی طرح عورت بھی زیادہ سے زیادہ تکمیل گری کی طرف راغب ہو جاتی ہے، جس سے نہ صرف سارا معاشرہ نسلی سائیکل کی وجہ سے تکمیل گری کی جانب سمت بند ہو جاتا ہے، بلکہ مرد کی معاشری برتری، غلبے اور اقتصادی اجارہ داری کا صحیح معنوں میں خاتمہ بھی ہو جاتا ہے، جو سارے معاشرے میں عدل و انصاف اور مساوات کی فضا پیدا کرتا ہے اور عورت کا بطور ایک آزاد اور خود مختار شخصیت کے احترام اور مقام بلند کرتا ہے۔

آزادیٔ نسواں، یک زوجگی اور ترقی

ان نتائج کے پیش نظر عورت کی آزادی صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہوتی ہے اور وہ خاندان اور شادی کے نظام کو قانوناً یک زوجگی کے اصولوں پر "قائم" کرنا ہے جس سے کوئی مرد اور عورت کسی صورت اور کسی حالت میں بھی مستثنا نہیں ہو سکتے، خواہ وہ بیماری، بانجھ پن یا کوئی اور ذہنی، جسمانی، کرداری یا معاشری وجہ ہو۔ مگر اس بلا استثنا شرط کی بنا پر مرد اور عورت دونوں کیلئے طلاق کی مساویانہ آسانی کی ضرورت پیش آتی ہے، تاکہ مزاج اور طبیعت میں غیر موافقت اور بُعد اور جسمانی، ذہنی، کرداری یا معاشری کمزوری یا نقص کے باعث شادی کے جنسی اور تناسلی مقاصد پورے نہ ہونے کی صورت میں قانوناً علیحدگی اختیار کی جا سکے۔ الغرض، جدید معاشرہ اپنی تکمیلاتی ترقی اور تقاضوں کے باعث لازماً عورت کی آزادی اور جنسی مساوات کے اصولوں پر استوار ہوتا ہے۔

اس معاشرے میں ماں باپ اپنے بچوں اور بچیوں کو خود مختار اور آزاد زندگی کیلئے تیار کرتے ہیں۔ جوان ہو کر لڑکی کو اپنا خاوند خود تلاش کرنا پڑتا ہے۔ گو ماں باپ کی رائے اور

مشورہ ہوسکتا ہے، مگر انتخاب شوہر اور شادی کا فیصلہ اُسے خود کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس تلاش اور انتخاب میں اُسے اپنی ساری انسانی اور نسوانی صلاحیتوں، خوبیوں اور خاصیتوں سے کام لینا اور خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس تگ و دو میں اس کا دوسری لڑکیوں اور عورتوں سے خواہ شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہوں، مسابقہ اور مقابلہ ہوتا ہے، کیونکہ اس تلاش اور انتخاب کی آزادی ہر ایک کو مساویانہ طور پر حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح ہر ایک لڑکی لاتعداد لڑکوں اور مردوں سے ملتی ہے۔ اس لئے اُسے مرد کی عادات، خیالات مزاج اور خصائل سے خوب واقف ہونا پڑتا ہے۔ ادھر لڑکا یا مرد بھی بہت سی لڑکیوں اور عورتوں سے ملتا ہے۔ اور اپنے مزاج اور پسند کی بیوی تلاش کرتا ہے۔ اس آزاد میل جول میں لڑکی اور عورت کو مرد کی خصلت سمجھنے اور پرکھنے کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے تاکہ پیار و محبت، عشق اور معاشقے کے مختلف مدارج اور صورتیں کے بعد اس کو خاوند مل جائے۔ چونکہ قانون اور رائے عامہ اس کی مدد صرف قانونی اور رواجی حدود تک ہی دیتی ہے، لہٰذا آزاد معاشرے میں لڑکی اور عورت کو بہت ہوشیار اور ہوشمند رہنے کی ضرورت رہتی ہے۔ اور اپنے حقوق و فرائض سے باخبر رہنا پڑتا ہے۔ شادی کے بعد دونوں میاں بیوی کے لئے نئی آزمائشوں کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ شادی کے بعد بھی میاں کیلئے دوسری لڑکیاں اور عورتیں اور بیوی کے لئے دوسرے لڑکے اور مرد سے حسب سابق میل جول جاری رہتا ہے۔ اس لئے میاں بیوی میں کوئی کسی وقت بھی کسی اور مرد یا عورت کی طرف راغب ہوسکتا ہے لہٰذا دونوں اپنے شادی کے رشتے کو اسی پیار و محبت، توجہ اور جاذبیت تعاون اور بھروسے سے برقرار رکھ سکتے ہیں جس سے شروع کیا تھا اب بیوی کو اپنے میاں کے کام، پیشے، مشاغل، دلچسپیوں اور دیگر تکمیلات سے آگاہی اور اعانت کرنے گھر کی دیکھ بھال اور امور خانہ داری میں کارکردگی، بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں وہی ہوشیاری، ہوشمندی، باشعوری، سمجھداری، فرض شناسی اور مستعدی کی ضرورت ہے جیسی اسنے اپنے ماں باپ کو سرانجام دیتے دیکھا تھا اور معاشرے بھی اس سے اس کا متقضی ہوتا ہے۔ دوسری طرف خاوند بھی بیوی کو تب تک ہی خوش رکھ سکتا ہے اور اس کی رعنا

ورغبت حاصل کئے رکھتا ہے جب تک وہ خود بھی تکمیلی رہے، دولت کمانے یا کوئی اور کمال حاصل کرے۔ اگر وہ غیر تکمیلی ہوگا یعنی کچھ نہیں کمائے گا تو اس کو بیوی ملنا اور رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ کیونکہ آزاد معاشرے میں عورت کو اس کی رضا و رغبت کے بغیر بیوی بنانا اور رکھنا آسان نہیں، مرد بھی ایسی عورت کو ہی بیوی بناتا ہے جو اس کی جنسی اور گھریلو تسکینات اور آرام فراہم کر سکتی ہے۔ اس لئے بیوی کو بھی اپنے مرد کی دلچسپیاں، کام اور تکمیلاتی کام اور شوق سے تعاون کرنا اور توجہ دینی ہوتی ہے۔ ان وجوہات کے باعث آزاد معاشرے میں خاندانی زندگی روبہ تکمیل رہتی ہے۔ اس معاشرے میں میاں بیوی کو اپنے اپنے فرائض سرانجام دینے میں سمجھداری، ہوشمندی اور فرض شناسی سے کام لینا پڑتا ہے۔ مرد کو روزی کمانے اور دولت اور آسودگی حاصل کرنے کے لئے اپنی تمام تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا ہے اور اپنے فرائض کو پوری تندہی، محنت و مشقت سے انجام دینا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ اس طرح ہی نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنی بیوی اور بچوں کو خوش اور آسودہ حال رکھ سکتا ہے۔ اس لئے مرد کو لازماً تکمیلی زندگی گزارنی پڑتی ہے اور وہ کام اور کمالات حاصل کرنے پڑتے ہیں جن کے وہ اہل ہے اور جو اس کا معاشرے اور ماحول اس سے مقتضی ہیں۔ اور جس کے لئے اس کے ماں باپ اور معاشرے نے اُسے بچپن ہی سے تیار کیا تھا۔ اُدھر بیوی بھی اپنی آزاد زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں سے اگر خود تکمیل گر نہ بھی ہو، مگر تکمیل گری کو خوب سمجھتی اور جانتی ہے۔ اس لئے خاوند کے ساتھ نہ صرف گھریلو زندگی میں پورا پورا تعاون کرتی ہے بلکہ گھر کے باہر بھی اس کی تکمیلاتی تگ و دو اور کوششوں میں اس کا سہارا اور مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح اپنے میاں کی تمام پیداواری اور تخلیقی کاموں میں مددگار اور معاون ثابت ہوتی ہے۔ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں دونوں مساویانہ مدد اور تعاون کرتے ہیں اور دونوں اپنی اپنی تکمیلی زندگی اور مثال سے روزِ اوّل ہی سے اپنے بچوں کے ذہن و کردار میں تکمیلی عادات اور صلاحیتیں پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ امور خانہ داری میں بھی بیوی کو پوری مہارت اور دسترس حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنے کنبے کے لئے سب سہولتیں اور آسائش مہیا کر سکے جو اس کے تکمیلی فرائض اور کاموں کے لئے ضروری فضا اور بنیاد فراہم کرتے ہیں

علاوہ ازیں اس معاشرے میں بیوی کو بسا اوقات خود بھی روزی کمانی پڑتی ہے۔ اس طرح وہ بھی عملاً تکمیل گر بن جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس معاشرے میں عورت کو ہر طرح سے فرض شناس، ہوشمند، ہوشیار، چوکس، باخبر اور مستعد زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ ساری خاندانی زندگی مشین کی طرح باقاعدگی اور کارکردگی سے چلتی ہے۔ اس طرح خاندان اور ہر مرد و عورت تکمیلاتی طور پر اپنے معاشرے کی ترقی، خوشحالی، بقا اور سلامتی کے ضامن بن جاتے ہیں

مسلم معاشرہ اور عورت کا مسئلہ

گذشتہ کئی صدیوں سے مسلم معاشرہ سخت بحران سے دوچار ہے۔ جو بیسویں صدی کے بحرانی دور میں خطرناک شدت اختیار کر گیا ہے۔ اس معاشرے کو تقریباً ساری دنیائے اسلامی میں پردہ اور تعدد ازواج نے ابھی تک زیادہ تر قرا انبداری نظام میں منجمد کر رکھا ہے اور اسے غیر تکمیلی بنا دیا ہے۔ اس حالت کو برقرار رکھنے کے لئے علماء اور دیگر اہل علم و فکر بھی نظریاتی (آئیڈیالوجیکل) اور معاشرتی جواز پیش کرتے ہیں ان حالات میں مسلمان عورت کے مقام اور رول کے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جن کا تجزیہ اور مطالعہ ہم موجودہ دور کی "تکمیلاتی ماحول اور تقاضوں کی روشنی میں کریں گے: تاکہ مسلمان قوموں، ملکوں اور معاشروں کے لئے ترقی و خوشحالی کی راہیں تلاش کرنے میں علم و فکر سائنس اور حقیقت کی روشنی حاصل ہو۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مسائل غور طلب ہیں۔

اوّل: پردہ سسٹم کیا ہے؟ اور اس کے حامی اس کے جواز میں کیا دلائل اور نظریات پیش کرتے ہیں، تاکہ ان کا سائنٹفک تجزیہ کیا جا سکے۔

دوم: کیا پردہ اسلامی تاریخ کے قرون اولیٰ سے بھی مروج تھا؟ اس سوال کا حل ہم قرآن اور حدیث اور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور کے حالات کی روشنی میں تلاش کریں گے۔ علاوہ ازیں قرآن اور حدیث اور قرون اولے کی تاریخ کی روشنی میں ہمیں تعدد ازواج اور یک زوجگی پر غور کرنا ہوگا۔

سوم: جب مسلم معاشرے میں پردہ سسٹم قائم ہو گیا تو مسلمانوں کے معاشرے پر کیا گزری؟ یہ مسلم معاشرے کی قرون وسطیٰ کی عروج و زوال کی تاریخ ہے جس کا تجزیہ بھی تاریخی حقائق کی روشنی

میں کرنا پڑے گا۔ قیاس آرائی اور روایات پرستی سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

چہارم۔ موجودہ زمانے میں پردہ اور تعددازدواج کے مطالعے اور تجزیئے کے لئے ضروری ہے کہ عورتوں اور لڑکیوں کی گھر کے اندر کی زندگی اور حالات کا جائزہ لیا جائے تاکہ اُنکے کردار و ذہن کی نشوونما کا حقیقی تجزیہ ہو سکے۔ ان حقائق کی روشنی میں ہی اس امر کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ پردہ اور تعددازدواجگی کس قسم کی لڑکیاں اور عورتیں پیدا کرتے ہیں۔

پنجم: موجودہ زمانے میں پردہ اور تعددازدواج کے تحت گھر اور خاندانی زندگی میں لڑکوں اور نوجوانوں کے ذہن و کردار کی نشوونما اور تعلیم و تربیت کس نوعیت کی ہوتی ہے؟

ششم: موجودہ زمانے میں پردے اور تعددازدواج سے مردوں کے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

ہفتم: پردہ آئیڈیالوجی کیا ہے؟ کیا عورت ناقص العقل ہے؟ کیا عورت کا ذہن و فکر اور کرداری اوصاف مرد سے کمتر ہیں؟ کیا عورت میں تکمیلی صلاحیتوں اور قوتوں کا فقدان یا کمی ہے؟ ان سوالات کے حل کی روشنی میں ہی ہمیں پردے اور تعددازدواج کا جواز یا تردید مل سکتی ہے۔

باب اوّل

پردہ سسٹم اور اس کی تھیوری

جنس (sex) انسان کے لئے ہمیشہ ایک مسئلہ بنا رہا ہے۔ یہ بیک وقت متضاد رجحانات اور قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ اور مرد و زن کے تعلقات کی لاتعداد پیچیدگیوں کا حامل ہے۔ ایسے معاشرے میں جس میں مرد کو آزادی، برتری اور غلبہ حاصل ہو، عورت مرد کی محکومی میں رہتی ہے اور تمام معاشری تعلقات، خاندان اور معاشرت سے لیکر ملکیت، وراثت اور معیشت تک اور زندگی اور معاشرے کے تمام شعبوں، کاروبار، تہذیب، تمدن اور تفریح سیاست اور حکومت سب میں مرد کو فوقیت اور اولیت دی جاتی ہے اور عورت کو معاشری زندگی میں شرکت سے محروم کر کے صرف گھریلو زندگی تک محدود رکھا جاتا ہے اور اسے تمام غیر خانگی امور، معاملات اور کاموں اور تکمیلات سے باہر رکھا جاتا ہے۔ یہ پدرسری معاشرے اور تمدن کا خاصہ ہے۔ مگر مسلم معاشرے میں ان پابندیوں، محرومیوں اور علیحدگیوں کو انتہا تک پہنچا دیا تاکہ گھر کے علاوہ معاشرے اور قوم کی زندگی کے کسی اور شعبے میں عورت اور مرد میں کسی طرح کا میل ملاپ اور ساتھ نہ ہو۔ معاشری زندگی میں مرد اور عورت کی مکمل علیحدگی کو پردہ یا عربی میں حجاب کہتے ہیں۔

پردہ دراصل مرد اور عورت کی علیحدگی اور تقسیم کا ایسا نظام ہے جو سارے معاشرے اور قوم کے مرد و زن کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہے۔ اس میں عورت کو گھر کے اندر کی زندگی تک محدود کر دیا جاتا ہے اور گھر کے باہر کی دنیا کے تمام کام کاج اور دھندے مردوں کے قرار دے دیئے جاتے ہیں۔ ایسے گھر یا گھر کے حصے کو جہاں عورتیں عمر بھر بند رہتی ہیں زنانہ حصہ یا زنان خانہ کہا جاتا ہے۔[1] اس کے علاوہ پردہ سسٹم کی کئی اور بھی پابندیاں ہیں جن کا

---

[1] یہ گھر کے زنانے حصے کو مسلمان ممالک میں مختلف نام دیئے گئے ہیں۔ عرب ممالک میں اسے "حرم" کہتے ہیں، جس کی تشریح

مقصد دونوں جنسوں میں میل ملاقات کو کافی حد تک منع کرنا اور ناممکن بنانا ہے لہٰذا جب عورت گھر سے باہر نکلے تو مردوں سے علیحدگی اور غیر شرکت قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے سارے جسم کو ان کی نظروں سے چھپائے رکھے۔ اس غرض سے وہ باہر نکلتے وقت اپنے آپ کو سر تا پا برقع یا چادر میں لپیٹ کر نکلتی ہے' تاکہ غیر مردوں اور محرموں کی نظر نہ پڑے۔ بعض مقامات میں مثلاً گاؤں اور دیہات میں جہاں ہندو تمدّن کا اثر پایا جاتا ہے گھونگھٹ سے چہرہ چھپانا پردے کی نشانی ہے۔ مگر پردے سے مراد صرف یہ مکانی اور معاشرتی تقسیم اور علیحدگی ہی نہیں۔ بلکہ وہ عقائد' رویے' رسوم و رواج' توہمات اور تعصبات بھی ہیں جو اس تقسیم' علیحدگی اور گوشہ نشینی کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ وہ اس کے نظریاتی یا آئیڈیالوجیکل سہارا کرلے۔ اس لحاظ سے پردہ سسٹم کا اثر و رسوخ مسلمان معاشرے کے ہر طبقے اور ہر گاؤں' قصبے اور شہر میں پایا جاتا ہے خواہ پردہ نشین اور برقعہ پوش عورتوں کی تعداد کل آبادی کی دس یا پندرہ فی صد سے زیادہ نہ ہو۔ ان اداروں' عقائد اور رسم و رواج کا مقصد یہ ہے کہ دونوں جنسوں میں سوائے کنبے اور گھر کے علاوہ کسی طرح کا باہمی میل جول اور ارتباط و اختلاط نہ ہو' جسے معاشرتی اور اخلاقی لحاظ سے بہت معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ مرد اور عورت کی لاارتباطیت پر وہ سوسائٹی اور کلچر کی بنیاد ہے جو مسلم معاشرے میں ہر ادارے اور انجمن' اجتماع اور جگہ میں پائی جاتی ہے۔

پردہ سسٹم مسلمان اقوام اور ممالک میں تقریباً ایک ہزار سال سے رائج ہے۔ اسلامی تاریخ کی پہلی صدیوں میں بتدریج قائم ہو کر قرونِ وسطیٰ (یعنی ۱۰۰۰ سے ۸۰۰ اسال عیسوی) میں مسلم معاشرے کا اتنا اہم ادارہ (institution) بن گیا کہ اب تک اس کا جزو لاینفک تصوّر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم عورت پردے یا برقعہ میں ہوتی ہے تو اُسے مسلمان تصوّر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۷۱ء میں جب ایک اطالوی اخبار کی نامہ نگار خاتون اوریانہ فالاسی نے

ہم اگلے باب میں کریں گے۔ ایران میں "اندرون" کہلاتا ہے۔ عثمانی ترک اسے "حرملک" کہتے تھے۔ مغلیہ عہد کے ہندوستان میں "حرم سرا" "محل سرا" "زنان خانہ" وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اسی طرح "پردہ" کو بھی عربی میں حجاب اور "ستر" ترکی زبان میں "چادر" وغیرہ مختلف نام دیئے جاتے ہیں مگر اردو اور اس کے طفیل سے انگریزی میں "پردہ" ہے

ہندوستان میں ہندو راجپوت رانیوں کو پردہ کرتے دیکھا تو انہیں مسلمان قرار دے دیا۔[2]

مسلمان ذہن و فکر کی اپاہجی اور لاچارگی کا اس سے بڑھ کر کیا مظاہرہ ہوگا کہ تقریباً ایک ہزار سال کے دوران کسی مسلم مفکر یا عالم نے پردے اور تعددِ ازدواج کے بارے میں کوئی غور و فکر نہیں کیا ان کے عوامل و عواقب کا کبھی تجزیہ نہیں کیا اور عورت کا معاشرے میں مقام اور رول کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سوچا اور روایت پرست علماء کے رجعت پسند نظریات اور تاویلات کو کبھی چیلنج نہیں کیا صرف عالم اسلامی پر یورپی غلبے اور تسلط کے بعد اور مغربی تہذیب کی حیرت انگیز برتری اور پھیلاؤ نے مسلمان عورت پردہ اور تعدد ازدواج کے مسائل کو اٹھایا۔ اس یلغار کے بعد سے مسلمان ممالک میں ان مسائل پر غور و خوض شروع ہوا اور آزادی اور مساوات نسواں کی تحریکیں شروع ہوئیں، مصر میں قاسم امین بک اور اس کے ساتھیوں نے پردے کے خلاف لٹریچر تحریر کیا، سلطنت عثمانیہ میں ضیا کلپ نے عورتوں کے حقوق اور مساوات کے حق میں آواز بلند کی اور برطانوی ہند میں بھی آزادی نسواں کی تحریک کی کچھ ابتدا ہوئی۔ ان میں صرف ایک تحریک نے فیصلہ کن صورت اختیار کی، وہ کمال اتاترک کی انقلابی تحریک تھی جس نے جمہوریہ ترکیہ کے قیام کے فوراً بعد تعدد ازدواج کو ختم کر کے یک زوجگی کا قانون نافذ کیا، پردے کو ملک سے ختم کیا اور ترکی کی عورتوں کو قومی زندگی میں برابر کا شریکِ کار بنایا۔ اس قسم کی تبدیلیاں کم و بیش دیگر اسلامی ممالک، مثلاً مصر، شام، ایران وغیرہ میں بتدریج واقع ہوئیں یا ہو رہی ہیں[3] مگر ہمارے برصغیر جنوبی ایشیا کے ممالک میں پردہ اور تعدد ازدواج کم و بیش قرونِ وسطائی سختی کے ساتھ مروج ہیں۔ ان ممالک میں جن میں ہمارا ملک پاکستان سرفہرست ہے، مسلمان عورت کو قومی زندگی اور پبلک امور و فرائض سے کم و بیش بے دخل رکھا گیا ہے جیسا کہ وہ صدیوں سے محروم تھی۔

پردہ سسٹم کے جواز میں دلائل

مسلمان عورت کا معاشرتی اخراج اور بے دخلی کی

۲۔ اوریانہ مالاسی "جنس بے فائدہ" (The Useless Sex) صفحہ ۵۴۔ مائیکل جوزف۔ لنڈن۔ ۱۹۶۴ء۔

۳۔ دیکھیے دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۷ ص ۸۹۴۔ طبع اول۔ دانش گاہ پنجاب لاہور۔ ۱۹۷۱ء۔

بنیادی وجہ ہمارے علمائے دین اور دوسرے روایت پرست حامیانِ پردہ اور تعدد ازدواج کی یہ رائے ہے کہ یہ اسلامی احکام کے مطابق ہیں۔ پردے کے جواز میں وہ کئی دلائل پیش کرتے ہیں۔

اوّل۔ یہ جنسی انارکی یا آوارگی کا سدباب ہے اور شہوانیت اور بے حیائی کی وبا کو روکتا ہے، جو نکاح اور تاسیسِ خاندان کو درہم برہم کرتے ہیں۔[1]

دوم۔ پردے کی حکمت یہ ہے کہ اسلام ایک صاف ستھرا اور پاکیزہ معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ جنسی آوارگی کو روک کر معاشرے میں پاکیزہ ماحول اور طہارت نسب کے بنیادی مقاصد حاصل ہوں۔ جو صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ بھٹک جانے کے مواقع کم سے کم پیدا ہوں۔[2]

سوم۔ "اسلامی معاشرہ میں کسب معاش عورتوں کے ذمہ داری ہی نہیں ہے کسب رزق مردوں کا کام ہے"[3]

ایلیٹ طبقوں کے ادارے (elite)

پردے کے جواز میں متذکرہ بالا دلائل پر ہم اگلے ابواب میں غور و فکر کریں گے۔ فی الوقت تو اس بات کو واضح کرنا ضروری ہے۔ کہ پردہ اور تعدد ازدواج ایسے ادارے ہیں جو اپنی مخصوص نوعیت کے باعث سارے مسلم معاشرے میں مروج نہیں ہو سکتے۔ دراصل وہ زیادہ تر یا کلیتًا ایسے طبقوں اور گروہوں میں رائج ہوتے ہیں جو اپنی معاشی تمول اور معاشری حیثیت اور اثر و رسوخ کی بنا پر متمول اور متوسط طبقے ہوتے ہیں معاشرے اور ملک میں ایسے طبقے ایلیٹ (elite) یا اونچے طبقے کہلاتے ہیں۔ پردہ اور تعدد ازدواج ان طبقوں کی معاشری حیثیت اور اثر و رسوخ کے اظہار اور نمائش کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ غریب اور ادنیٰ طبقے اور گروہ اپنی معاشری اور معاشی حالت اور حیثیت کی وجہ سے پردہ سسٹم کی پابندیوں اور تعدد ازدواج کی آزادیوں کو اختیار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اُن کی عورتوں اور لڑکیوں کو روزی کمانے کے لئے لامحالہ گھر سے

۱۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی "پردہ" ص ۱۵۴۔ چودھویں ایڈیشن۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور۔ ڈھاکہ ۱۹۷۲۔

۲۔ دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۷۔ دانش گاہ پنجاب۔ لاہور۔ ۱۹۷۳۔

۳۔ مظہر علی ادیب "پردے میں رہنے دو" ص ۱۹ مکتبۃ الخیر۔ ۴۰ اردو بازار۔ لاہور ۱۹۷۴۔

باہر نکلنا پڑتا ہے، جہاں وہ اکثر وبیشتر برقعہ یا چادر وغیرہ کے تکلف بھی نہیں کر سکتیں۔ اس صورتحال کے مدنظر پردہ وغیرہ کے احکام پر مسلمانوں کی بیشتر آبادی عمل پیرا نہیں ہو سکتی ہے[۴]۔ تاہم ایلیٹ طبقوں کی طرز زندگی اور معاشرت کے اثرات باقی تمام طبقوں اور گروہوں پر ضرور پڑتے ہیں۔ لہٰذا اگرچہ غریب طبقے پردہ سسٹم کی مرد وزن کی علیحدگیوں کو تو نہیں اختیار کر سکتے، مگر وہ پردہ آئیڈیالوجی کے رویوں اور نظریات کو ضرور اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے سارا مسلم معاشرہ پردہ دار معاشرہ بن جاتا ہے۔ پردہ اور تعدد ازدواج کا تجزیہ کرتے وقت ان اداروں کی اس دوتہی نوعیت کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں مسلم پردہ دار معاشرے کا صحیح اور سائنٹفک مطالعہ ہو سکتا ہے۔

پردہ سسٹم کی تھیوریاں

مسلمانوں میں آزادی نسواں کی تحریکوں اور پردہ اور تعدد ازدواج کے رسوم ورواج کو قانوناً ختم کرنے کی تجاویز اور تحریکوں کی مخالفت کے لئے ان اداروں کے حامیوں نے، جن میں بیشتر تعداد علمائ کی ہے، ان کی توجیح اور تائید میں کئی تھیوریاں یا نظریات پیش کی ہیں۔ ان تھیوریوں کا مقصد نہ صرف پردہ اور تعدد ازدواج کے حق میں دلائل اور شواہد کو پیش کرنا ہے، بلکہ اُن نتائج کو بھی روشن کرنا ہوتا ہے جو "بے پردگی" سے مرتب ہوں گے۔ تاکہ اُن کے جواز بھی ملے اور ان کی ضرورت اور افادیت بھی واضح ہو جائے کہ عورتوں کے لئے پردہ کیوں لازمی ہوتا ہے۔

ان تھیوریوں میں بعض تو نہایت سطحی اور مضحکہ خیز ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا جلال الدین

۴۔ "مولانا مودودی، جو جماعت اسلامی کے امیر ہیں، کہتے ہیں کہ پاکستان میں پردہ رائج ہے اور رہنا چاہیئے مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ پاکستان کی اسی فیصد آبادی گاؤں میں رہتی ہے جو پردے کی پابندی نہیں کر سکتی کیونکہ ان کی عورتوں کو کھیتوں میں کام کے لئے باہر نکلنا پڑتا ہے۔" عارف حسین، "پاکستان: اس کی آیڈیالوجی اور خارجہ پالیسی" ص ۳۹ (انگریزی میں) فرانک کیس اینڈ کمپنی۔ لنڈن۔ ۱۹۶۶۔

انصر عمری لکھتے ہیں کہ مرد اور عورت آگ اور روئی کی طرح ہیں، جن کے ملنے سے تباہی برپا ہو گی۔[1] اس نظرئیے میں نہ تو عقل سے کام لیا گیا ہے نہ دلیل سے کہ اس پر مزید غور کیا جائے فقط اتنا کہنا ہی کافی ہو گا کہ اپنے ظاہری اور باطنی اختلافات کے باوجود مرد اور عورت ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یعنی ایک انسانیت کی دو جنسی صورتیں ہیں۔

یورپین یا مغربی تہذیب و تمدن کا ہوّا

موجودہ صدی کے شروع میں جب مصر اور دوسرے مسلم ممالک میں آزادئ نسواں کی تحریکیں زور پکڑنے لگیں، تو روایات پرست علماء نے برانگیختہ ہو کر اُن کے خلاف مغربی تہذیب و تمدن کا ہوّا بنانے کا حربہ چلا۔ اس کی بڑی وجہ اُن علماء اور اُن جیسے دوسرے اہل علم و دانش کا ذہنی اور فکری خلو اور خوف کی نفسیات ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں یورپین یا مغربی تہذیب و تمدن کے خلاف خوف اور نفرت پیدا کرنے کے لئے اُن کو اہل مغرب کی خوبیوں، صلاحیتوں اور تکمیلات پر غور و خوض کرنے اور مغرب کی آزاد دنیا کے ہر مرد اور عورت کے اخلاقی اوصاف، مثلاً ان کی دیانتداری، فرض شناسی، حق گوئی، محنت و مشقت کا شوق، لگن اور لگن، حق و صداقت کی تلاش اور جستجو میں بیباکی، علم و حقیقت کی تلاش میں تجسس اور تجربے کی عادات، احساس ذمہ داری، مہم جوئی، اولوالعزمی، خود انضباط خود ڈسپلین، خود تنقید، احساس دیگران یعنی دوسروں کی شخصیت، آزادی اور حقوق کا احترام بے لاگ آزادی تنقید کی عادات، انسان دوستی اور حب الوطنی وقت کی قدر جیسے اوصاف اور ترقی پسندانہ صلاحیتوں اور رجحانات کے بارے میں مثبت اور حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے اور سمجھنے کے رجحان کو روکنے کے لئے اس تہذیب و تمدن کو ہوّا یا بوگی بنا کر پیش کیا، تاکہ مسلمانوں کے ذہن و فکر، اور ملک و معاشرے اور قوموں اور افراد پر بدستور قرون وسطائیت کی جہالت، پس ماندگی اور انحطاط کی فضا طاری رہے اس طرح ہمارے علماء، مغربی سامراجیوں کی نوآبادیت کے آلہ کار بن گئے، جو مسلمان اقوام

---

[1] "عورت اسلامی معاشرہ میں" از مولانا جلال الدین انصر عمری صفحہ ۲۲۸۔ اسلامک پبلیکیشنز۔ لاہور۔ ۱۹۶۷

اور لوگوں کو قرونِ وسطائیت کی پسماندگی اور انحطاط میں ڈبو کر جدیدیت اور ترقی پسندی کی راہوں سے پرے رکھنا چاہتی ہیں۔ علماء کی اس خود ساختہ ہوّگی کا سب سے بڑا حربہ مغرب کی عورت اور اس کی آزادی ہے۔ مثال کے طور پر، مصری عالم، علامہ فرید وجدی کی تصنیف "مسلمان عورت" کا اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے[2] مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے مقدمے میں مغربی عورت کی آزادی کے خطرناک نتائج سے مسلمانوں کو متنبہ کرنے کی غرض سے اس ہوّگی کا یوں استدلال کیا:۔

"عورتوں کی آزادی کا مسئلہ درحقیقت ایک معرکتہ الآرا مسئلہ ہے یورپ کا طرزِ عمل اگرچہ اس کی تائید میں ہے لیکن جمہور کی آواز نہایت سختی سے اس کی مخالف ہے، ایک بڑی باریک بین جماعت موجود ہے جو اس آزادی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کے خطرناک زمانہ کی یقین کے ساتھ منتظر ہے جب اس آزادی کا لازمی نتیجہ تمدّن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل کر دے گا۔ ہمارے یہاں کے مخالفین پردہ یورپ کے طرزِ عمل کو تو شوق کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ نظریں کوتاہ اور معلومات محدود ہیں اس لئے مخالف جماعت کی راؤں سے واقفیّت نہیں رکھتے۔ پردہ کے مؤیدین یورپ کی زبانوں اور حالات سے محض بے خبر ہیں اس لئے ان کی رائے بھی اس میدان میں سبقت نہیں لے جاسکتی فرید وجدی چونکہ یورپ کے اقوال و حالات پر وسیع نظر رکھتا ہے اس لئے اس نے اوّل ان تمام لوگوں کی رائیں ڈھونڈ کر جمع کی ہیں اور دکھلایا ہے کہ جس ملک کے طرزِ عمل پر فریفتہ ہو کر مصلحت اور تمدّنی فوائد سے چشم پوشی کرتے ہو خود اس ملک کے اہل الرائے اور موجودہ

---

[2] علامہ فرید وجدی "امرأۃ المسلمۃ" کی عربی تصنیف کا اردو ترجمہ مولانا ابوالکلام نے کیا۔ بعد ازاں اس کا نیا ایڈیشن "مسلمان عورت" کے نئے نام سے نکلا۔ اس کو بارِ سوم ۱۹۷۶ میں کتب خانہ ایم ثناء اللہ خان ۲۶ ریلوے روڈ، لاہور سے شائع کیا گیا۔

مدنیت کے مجدّد اس طرز عمل کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں، پھر مشاہیر علمائے یورپ کے خیالات پیش کر کے ہمدردانہ لہجہ میں نصیحت کی ہے کہ محض ظاہری آزادی کے کرشمہ پر بے خود نہ ہو جایئے۔ کیونکہ جن نتائج کی بنا پر آزادی کا شور مچاتے ہو وہ خیر سے یورپ میں بھی مفقود ہیں[۳۱]

علامہ فرید وجدی کی تحریر کے بہت بعد برطانوی ہند کے مسلمانوں میں بھی جب آزادئ نسواں کے حق میں اور پردے اور تعدد ازواج کے خلاف تحریکیں زور پکڑنے لگیں تو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۴۰ء میں انہی دلائل اور شواہد کے دہرانے کے ساتھ انہی نظریے کو اپنی کتاب "پردہ" میں دوبارہ پیش کیا[۳۲]۔ علامہ فرید وجدی کا تو مقابلہ مصری عالم اور تحریک آزادی نسواں کے مؤید قاسم امین بک سے تھا، مگر مولانا مودودی کو کسی ایسے مؤید کا سامنا نہ تھا۔ اُن کو تو صرف ایک خدشہ لاحق تھا کہ جدید تعلیم و تہذیب کے اثرات بالآخر برطانوی ہند کے مسلمانوں کو بھی بیدار کر دیں گے۔ لہٰذا انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اُن کو خواب غفلت میں پڑے رکھنے کے لئے اپنی قلم کا زور دکھایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس کوشش میں بہت کامیاب رہے۔ برطانوی ہند کے غلام مسلمانوں کا تو کیا ذکر، پاکستان کی آزاد مملکت میں بھی مؤیدین پردہ نے عورتوں کی آزادی اور حقوق کی تمام تحریکوں اور کوششوں کو اپنی قلم کی قوّت سے دبائے رکھا اور ہمارے ملک کے عوام الناس کو یقین دلایا کہ عورت میں کام اور تکمیل کی کوئی صلاحیت اور استطاعت موجود نہیں۔ اس طرز استدلال کے لئے علامہ فرید وجدی اور مولانا مودودی نے مغرب کے سائنس اور معاشری علوم کے جدید نظریات، تجربات اور

---

[۳۱] دیکھئے "مسلمان عورت" صفحہ ۱۲-۱۳۔ علامہ اقبال بھی، جو مغربی تہذیب و تمدّن کو مولانا ابوالکلام آزاد کی نسبت بہت بہتر طور پر سمجھتے تھے، ساری عمر اس کی "شاخِ نازک" کے ٹوٹنے کے انتظار میں بیٹھے رہے۔

[۳۲] "پردہ" کے علاوہ مولانا مودودی نے متعدد اور تصانیف اور مضامین وغیرہ عورت کے مسائل اور حقوق کے خلاف لکھیں ان میں "رسائل و مسائل" چار جلدوں میں "حقوق الزوجین" "اسلام اور ضبط ولادت" اور "فیملی لاز ان اسلام" (انگریزی میں) قابل ذکر ہیں انکی تصانیف کے علاوہ جماعت اسلامی کے لاتعداد اخبارات اور رسالے بھی انکے نظریات اور مخطوطات کی موقع اور محل کے مطابق تشہیر کرتے ہیں۔

شواہد کو پیش کیا اور اس طرح اپنے نظریئے کو "سائنٹفک" قرار دیا۔

ان مویدین پردہ کا یہ "سائنٹفک" دعویٰ کہاں تک درست ہے؟ اس سوال کا حل تو ہم آئندہ ابواب میں بیان کریں گے۔ مگر یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان کی جدت پسندی علمائ میں کسی اور مصنف کو نہیں سوجھی۔ قدامت پرست علمائ کو جو اکثر و بیشتر لکیر کے فقیر ہوتے ہیں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ جدید مغربی سائنس کے تجربات اور نتائج بعض اوقات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو کٹر ترین روایت پرست خیالات اور نظریات کی تائید بھی کر سکتے ہیں۔ اس لئے اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو اپنے کام کی بہت باتیں ہاتھ لگ جاتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ سائنس ہمیشہ حقیقت اور صداقت کی تلاش کرتا ہے اور تجربے اور مشاہدے سے جو نتائج اور معلومات حاصل ہوں انہیں بلا تامل اور بلا کم و کاست بیان کر دیتا ہے اب اگر کوئی چاہے تو وہ ان کو اپنے نظریات اور مفروضات کے مطابق رنگ دیکر تاویل و تشریح کر سکتا ہے۔ اس لئے سائنس کو رجعت پسندانہ اور خلاف تکمیلی نظریات اور تاویلات کے کام بھی میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ نکتہ علمائ کی روایت پرست اکثریت کی نظروں سے اوجھل رہا۔ مگر ان دو مصنفین نے اس کا خوب فائدہ اٹھایا۔

جنسی انارکی کا مسئلہ

پردہ کے حامیوں نے عموماً اور علامہ فرید وجدی اور مولانا مودودی نے خصوصاً اس کے حق میں ایک دلیل پر بہت زور دیا ہے اور اس کے لئے انہوں نے اپنی کتابوں کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے ان کا دعویٰ ہے کہ بے پردہ معاشرے میں جنسی انارکی یعنی آوارگی اور بے حیائی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ فواحش کی کثرت ہوتی ہے۔ زنا عام ہوتا ہے اور حرامی بچوں کی بہتات ہوتی ہے۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے بہت سے اعداد و شمار بھی درج کئے ہیں۔ مگر یہاں چند باتیں یاد رکھنا ضروری ہے۔ اوّل تو مغرب کی آزاد دنیا میں جہاں اور آزادیاں حاصل ہیں وہاں علمی اور سائنسی تحقیق و تحریر اور صحافتی نشر و اشاعت کی آزادی بھی ہے۔ اس لئے اُن ممالک میں جنسی بے راہ روی کی واردات اور واقعات کی پوری صحافتی نشر و اشاعت اور علمی و سائنسی آزادی

کے ساتھ تلاش و تحقیق کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے مشرقی ممالک میں ایسی علمی، سائنسی اور صحافتی تحقیق و تلاش کا فقدان ہے۔ اگر ان ممالک میں بھی "در پردہ" جنسی واردات، واقعات اور حالات کے بارے میں اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو صحیح تصویر ہمارے سامنے آئے گی جس کی روشنی میں دونوں تہذیبوں کا تقابل کیا جا سکتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ آیا پردے کی پابندیاں ہمارے ممالک اور معاشرے میں اخلاق کی پاکیزگی اور بلندی کا باعث ہوئیں یا نہیں؟ اس تحقیق و تلاش سے جنسی خرابیوں فواحش اور گمراہیوں کا تدارک اور اصلاح بھی ہو سکے گی اور فرد کو تکمیلی بنانے میں بھی مدد ملے گی۔ غیر اخلاقی اطوار وہ ہیں جو غیر تکمیلی ہوتے ہیں یعنی فرد کے تکمیلی صلاحیتوں اور قوتوں کو کمزور یا مخرب کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے پردہ اور کثرت ازدواج جیسے ادارے اور قوانین اور رسم و رواج بھی غیر اخلاقی ہیں۔ لہٰذا ہمیں نہ صرف جنسی بے راہ روی اور آوارگی کی تدارک اور درستی کرنی چاہیئے بلکہ ایسے عائلی قوانین اور رسم و رواج کا بھی خاتمہ کرنا چاہیئے جو غیر تکمیلی نتائج اور اثرات پھیلاتے ہوں۔ اخلاقی اصول اور ادارے وہ ہیں جو فرد کو تکمیلی بنائیں۔ بد قسمتی سے ہمارے علمائے دین اخلاقیت اور رواجیت میں تمیز نہیں کر پاتے۔ انہیں ہر وہ اصول اخلاقی نظر آتا ہے جو اپنی عادات یا روایات کی بنا پر انہیں پسند ہو۔

خالص سائنٹفک "پردہ" تھیوری

اب ہم علامہ وجدی اور مولانا مودودی کے بقول اُن کے "خالص علمی تحقیق اور سائنٹفک مشاہدات و تجربات"[1] پر مبنی پردے کی تھیوری یا فلسفے کا مختصر سا خاکہ بیان کرتے ہیں۔

عورت کا "حیاتیاتی المیہ"

اس تھیوری کی ابتدا عورت کے جسم اور جنس کے تجزیئے سے ہوتی ہے۔ ان دونوں مصنفین کے نظریئے کے مطابق حیاتیات (بائیولوجی) کے علم کی رو سے قدرت نے عورت کو ایک المیہ زدہ ہستی

---

[1] "پردہ" صفحہ ۱۹۴۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ چودھویں ایڈیشن ۱۹۷۲

بنایا ہے۔ اس کے جسم کے جنسی افعال مثلاً حیض، حمل، زچگی اور رضاعت وغیرہ اسے جسمانی اور ذہنی طور پر کام اور محنت سے معذور کر دیتے ہیں اور اُسے لازماً صرف ایک کام یعنی بچے جننے اور انہیں پالنے پوسنے اور گھر کے معمولی کام کاج کے علاوہ کسی اور کام اور ذمہ داری کے قابل نہیں چھوڑتے۔ عورت کی اس حالت کو مولانا مودودی نے ایک سویٹ مصنف انتوف نیامیلوف سے ماخوذ اصطلاح "حیاتیاتی المیہ" (Biological Tragedy) سے موسوم کیا ہے جس نے اس نام سے ایک کتاب ۱۹۲۲ میں لکھی تھی۔ عورت کے مقابلے میں مرد قطعی کوئی ایسی حیاتیاتی کمزوری، مجبوری یا بوجھ سے لاچار نہیں ہوتا۔ بلکہ تناسل اور پیدائش کے حیاتیاتی عوامل میں اس کا وظیفہ بہت مختصر اور تمامتر ذمہ داریوں سے قطعی آزاد ہے [1]

قدرت کی دوشاخی تقسیم اور پردہ کا جواز

اس جنسی تفریق نے مرد کو فاعل اور غالب اور عورت کو منفعل اور مغلوب جوڑا بنا دیا ہے۔ لہٰذا عقل و انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں جوڑیداروں کو اُن قدرتی وظائف تک محدود رکھا جائے۔ جن کے لئے اُن کو جسمانی اور دماغی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ اسی طرح سارا انسانی معاشرہ بھی اس "قدرتی" فرائض کی دوشاخی تقسیم کی بنیاد پر منظم کیا جانا چاہیئے۔ اس قدرتی تقسیم کے مطابق بہترین معاشری نظام پردہ سسٹم کی صورت میں قائم ہوتا ہے [2]

پردہ کی قید، تہذیب و تمدّن کی بنیاد

اپنے دلائل کی مزید وضاحت کرتے ہوئے علامہ فرید وجدی عورت کے لئے پردے کی قید کو انسانی تہذیب و تمدّن کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور تنبیہہ کرتے ہیں کہ اگر اس معاشرتی تقسیم کو کسی طرح کم کیا گیا یا ہٹایا گیا تو تہذیب و تمدّن کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرے گی وہ لکھتے ہیں:-

---

[1] پردہ صفحہ ۱۸۹ "مسلمان عورت" از فرید وجدی، ص ۲۰-۲۶

[2] "پردہ" ص ۱۹۰

عورتوں کے طبعی فرائض پر نظر کرتے ہوئے کیا اس امر کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر ہو سکتا ہے کہ مردوں کی نسبت عورتوں کو ایک خاص حد تک تقید میں رہنا چاہیئے۔ قدرت نے ہر گروہ کے فرائض مقرر کر دیئے ہیں اور اقتضائے فرائض کے لحاظ سے ایک خاص حد تک مقید بھی کر دیا ہے۔ مذہب اور تمدن کا دنیا میں یہی کام ہے اس بنا پر اگر عورتوں کی آزادی کو کسی معتدل حد تک مقید نہ کیا جائے تو طبعی فرائض کی انجام دہی میں سخت خرابیاں پیدا ہو جائیں۔ عورتیں اور مرد دو مختلف گروہ ہیں۔ اس لئے ان دونوں کے میدان عمل کو الگ الگ کر کے پردہ کو بیچ میں حد فاصل قرار دیا گیا۔ تاکہ ہر گروہ اپنے میدان عمل میں محدود رہے۔ اس حد فاصل کے اٹھانے کی جب کوشش کی جاتی ہے تو تمدن و معاشرت کی بنیادوں میں حرکت پیدا ہو کر دنیا کو خبردار کر دیتی ہے کہ عنقریب عمارت گرنے والی ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لئے دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ یورپ کی موجودہ حالت کافی ہے [1]

پردہ: صالح تمدن کی بنیاد

مولانا مودودی ایسے تمدن اور معاشرت کو جو پردہ کی اس "فطری" دو شاخہ جنسی تقسیم کار کی بنیاد پر استوار کیا جائے "صالح تمدن" قرار دیتے ہیں اور جس کے جواز میں زمانہ جدید کے حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے "تمام علوم" پیش کر کے فرماتے ہیں:۔

یہ وہ تقسیم عمل ہے جو خود فطرت نے انسان کی دونوں صنفوں کے درمیان کردی ہے۔ حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے تمام علوم اس تقسیم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بچہ جننے اور پالنے کی خدمت کا عورت کے سپرد ہونا ایک ایسی فیصلہ کن حقیقت

---

[1] "مسلمان عورت" صفحہ ۳۱

ہے جو خود بخود انسانی تمدّن میں اس کے لئے ایک دائرہ عمل مخصوص کر دیتی ہے، اور کسی مصنوعی تدبیر میں یہ طاقت نہیں ہے کہ فطرت کے اس فیصلہ کو بدل سکے۔ ایک صالح تمدّن وہی ہو سکتا ہے جو اوّلاً اس فیصلہ کو جوں کا توں قبول کرے۔ پھر عورت کو اس کے صحیح مقام پر رکھ کر اسے معاشرت میں عزت کا مرتبہ دے، اس کے جائز تمدّنی و معاشی حقوق تسلیم کرے، اس پر صرف گھر کی ذمہ داریوں کا بار ڈالے، اور بیرون خانہ کی ذمہ داریاں اور خاندان کی قوامیت مرد کے سپرد کر دے [ٖ۲]

اس فطری اور تمدنی تقسیم کو بیان کرنے کے بعد مولانا صاحب متنبہ کرتے ہیں کہ اس کو مٹانے سے تمدّنِ انسانی پارہ پارہ ہو جاتے گا کیونکہ عورت گھر سے باہر کے کاموں اور ذمہ داریوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ وہ لکھتے ہیں:

جو تمدّن اس تقسیم کو مٹانے کی کوشش کرے گا وہ عارضی طور پر مادی حیثیّت سے ترقی اور شان و شوکت کے کچھ مظاہر پیش کر سکتا ہے، لیکن بالآخر ایسے تمدّن کی بربادی یقینی ہے کیونکہ جب عورت پر مرد کے برابر معاشی و تمدنی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا جائے گا تو وہ اپنے اوپر سے فطری ذمہ داریوں کا بوجھ اتار پھینکے گی اور اس کا نتیجہ نہ صرف تمدّن بلکہ خود انسانیت کی بربادی ہو گا [۱]

پردہ آئیڈیالوجی اور مسلمانوں کی زندگی

یہ ہے پردہ آئیڈیالوجی جس کی بنا پر مرد کی برتری اور فوقیت اور عورت کی کمتری اور محکومیت کا "سائنٹفک" جواز پیش کیا گیا ہے، اور معاشرے اور خاندان کی ایسی تنظیم بیان کی گئی ہے جس میں عورت کو تمام معاشرتی، تمدنی اور دیگر کاموں، ذمہ داریوں اور

---

[۲] "پردہ" صفحہ ۱۹۴

[۱] "پردہ" صفحہ ۱۹۴

فرائض سے خارج کر دیا گیا ہے کیونکہ اس کے جسمانی اور نفسیاتی کمزوریاں اور مجبوریاں اُسے معاشری کاموں اور فرائض میں شمولیت کے نااہل بنا دیتی ہیں۔ لہٰذا مرد اور عورت کے دائرہ حیات کو دو مختلف حدود میں تقسیم کر دیا ہے اور عورت کے لئے علم و فن محنت اور ہنر اور تکمیل اور تفریح کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں، اسے زنانخانے کی چار دیواری میں قدرت کے قانون کی بنا پر بند کرنے کا فرمان جاری کر دیا گیا ہے اور اس تقسیم پر تہذیب و تمدن کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔

مسلمانوں کی زندگی اور معاشرے میں یہ سب کچھ صدیوں سے ہو رہا ہے مگر سوال محض نظریئے اور آئیڈیالوجی کی بنا پر جواز تلاش کرنا نہیں بلکہ مسلمانوں کے معاشرے اور تاریخ پر اسکے اثرات کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ سوالات اور مسائل ہیں جن کا آئندہ ابواب میں حل تلاش کیا جائے گا۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا پردہ اور تعدد ازواج اسلامی شعار ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو ان کا مسلم معاشرہ میں کب اور کیوں رواج شروع ہوا اور اس رواج نے مسلمانوں کی تاریخ اور معاشرے پر کیا اثر ڈالا؟ ان ابتدائی سوالات کا مطالعہ ہم اگلے دو ابواب میں کریں گے۔

باب دوم

اسلام اولیٰ کا تکمیلی معاشرہ اور پردہ سسٹم کا آغاز

(تاریخ اسلام کے پہلے تین سو سال)

مسلمانوں میں پردہ کے رواج کے آغاز کے بارے میں کافی اختلافِ رائے ہے علماء کا خیال ہے کہ پردہ کا نفاذ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے زمانے سے ہو گیا تھا۔ لہٰذا یہ ادارہ اسلام کے ابتدائی ایام سے مسلم معاشرہ کا ایک اہم جزو اور رکن ہے۔ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

"پردے" کا لفظ جن احکام کے مجموعہ پر بطور عنوان استعمال کیا جاتا ہے وہ دراصل اسلامی ضابطۂ معاشرت کا نہایت اہم اجزا پر مشتمل ہے"[1]

لیکن یہ رائے نہ تو قرآن مجید کی آیات کریمہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور نہ ہی آپؐ کے عہد مبارک کے تاریخی شواہد پر مبنی ہے۔ ورنہ پردے کے نفاذ اور آغاز کے بارے میں اہل علم و فضل میں اتنی کدو کاوش کیوں پیدا ہوتی۔

جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں بیان کیا، پردہ سسٹم کے بنیادی آئیڈیالوجیکل نظریات جنس نسواں کی کمتری، مرد و زن کی نامساوات اور عورت کی معاشری کاموں اور کھیلوں سے بیدخلی اور عدم شرکت ہیں، مزید برآں گھروں اور خاندانی زندگی کو مردانہ اور زنانہ حصوں میں تقسیم اور برقع وغیرہ کا نظام پردہ سسٹم کا معاشرتی نظام ہے، جس سے عورت کی مردوں سے معاشری علیحدگی کا عملی نفاذ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا پردے کے یہ تمام نظریات، ادارے اور طرز معاشرت تاریخ اسلام کے قرون اولیٰ میں

---

[1] "پردہ" صفحہ ۳۵

پائے جاتے تھے یا بعد میں مسلمانوں کی تاریخ اور معاشرہ میں رائج ہوئے اور پھر علماءؒ نے
انہیں اپنی تاویلات اور تشریحات کے ذریعے جواز تلاش کر کے اسلامی قرار دیدیا۔

قرآن مجید اور پردہ

علماء دین پردہ کا جواز قرآن مجید کی آیات، خاص طور پر سورۃ النور
کی آیات سے ۳۰-۳۱ اور سورۃ الاحزاب کی آیات ۳۲۔۳۳
کے حوالے سے دیتے ہیں۔[۱] بنو عباس کی خلافت کے زمانے سے آج تک وہ ان آیات کی تفسیر
کرتے ہوئے ان سے پردے کے احکام اور زنان خانہ و برقعہ کی رسوم کی دلالت کرتے ہیں
لیکن اگر ان آیات پر غور کیا جائے تو ان سے پردہ سسٹم کسی صورت میں بھی متصور نہیں کیا جا
سکتا۔ ان سے نہ تو زنان خانے کی چار دیواری اور نہ برقع جیسی چیز کے میکانکی معنی تصوّر
کئے جا سکتے ہیں، اس میکانکی اخلاقیت کے برعکس یہ آیات ایسی فعال اخلاقیت کا
درس دیتی ہیں جو انسانی زندگی اور معاشرے کو مساواتی اصولوں پر استوار کر کے مرد
اور عورت دونوں کو کام اور تکمیل کے لئے سرگرم عمل رکھیں گے۔ لہٰذا ان میں مسلمان
مرد اور عورت پر مساویانہ طور پر ایسی پابندیاں عائد کی گئی ہیں جو میکانکی نہیں بلکہ اخلاقی
اور ڈائینمک (   ) ہیں۔ دونوں کے لئے اپنے وضع قطع گفتار و کردار
اور اقوال اور اعمال میں اخلاقی ہدایات نافذ کرتی ہیں۔ مسلمان مرد اور عورت دونوں کو
مساویانہ طور پر اپنی نگاہوں کو قابو میں رکھنے اور فواحش سے اجتناب کرنے کی ہدایت
دیتی ہیں، چونکہ لباس کے معاملے میں مرد اور عورت میں فرق ہے، اس لئے یہ آیات
عورت کو اپنے پبلک چال چلن میں اپنے لباس کو اس طرح پہننے کی ہدایت دیتی ہیں۔
کہ اس سے غیر اخلاقی رجحانات نہ پیدا ہوں جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا۔ دراصل
یہ احکام پبلک اخلاقیت اور فعال معاشرہ کی روح ہیں۔ اگر قرون وسطیٰ کے علماءؒ ان آیات
کی اس روح کو سمجھ جاتے تو وہ اپنے عہد کے مسلمان عوام اور معاشروں کے لئے ایسے
معاشرتی اور اخلاقی اصولوں اور طرز معاشرت وضع کرتے جن سے مسلم معاشرہ اور

۱؎ دیکھئے مولانا مودودی "پردہ" صفحات ۲۹۴ تا ۲۹۶

تاریخ منصفانہ اور فعال یا ڈائنمک راہوں پر ترقی کرتے، مگر انہوں نے قرآنی آیات کی تفسیر میکانکی طریقوں سے کر کے مسلم معاشرے کو ہر قسم کی سماجی بندشوں اور ممانعتوں میں جکڑ دیا۔ اور صنفِ نسواں کو معاشری لحاظ سے بے دست و پا بنا دیا۔ اس کی مثال فقہ اور شریعت کے شادی اور طلاق کے احکام میں بھی ملتی ہے جو قرآنی آیات کی ایسی تاویل پر مبنی ہیں جن سے قرآن کا اخلاقی مقصد بالکل فوت ہو گیا۔ اللہ تعالےٰ سورۃ النسآء میں کہتا ہے :

"جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو تین تین یا چار چار سے نکاح کرلو اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت کافی ہے" [۳۲]

قدیم و جدید علمأ اس آیت کی تاویل ذاتیاتی اور انفرادیاتی معنوں میں کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ احکامِ الٰہی کوئی سوشل اخلاقیت اور اجتماعیت کا سبق نہیں دیتے بلکہ مسلمانوں کو صرف انفرادی زندگی گزارنے کی ہدایات دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر، حدیث کی تدوین اور فقہ کا علم اس دور میں شروع ہوا جب مسلم معاشرہ اور ریاست پر قبائلی اور جاگیرداری نظام کا تسلط قائم ہو گیا تھا اس لئے علمأ نے اپنی میلانِ طبع اور اپنے عباسی آقاؤں کی خوشنودی کے لئے قرآن و حدیث کی ایسی تاویلیں کیں جو ان کے اپنے اور ان کے آقاؤں کے قبائلی اور جاگیرداری قرابتی گروہوں کے مفادات کے عین مطابق ہوں نہ علمأ اور نہ اُن کے آقا اپنی چھوٹی سی مائیکرو سوشل دنیا سے پرے دیکھتے تھے۔ ان کو تو اپنے عربی، ایرانی، ترکی یا بربری قرابتداری گروہوں کا تسلط اور کامیابی منظور تھی جس کیلئے تعدد ازدواج اور پردے جیسے رسم و رواج بہت مفید تھے۔ لہٰذا قرآنی احکام کے عدل و انصاف کے درس سے وہ بے خبر اور بے نیاز تھے جو ان کے کثرت ازدواج اور کنیزوں سے بھرے ہوئے حرموں کو ختم کر دیتا۔ علامہ عبداللہ یوسف علی قرآن کی عدل و مساوات کی روح کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان آیات کی تفسیر یوں کرتے ہیں :-

---

[۳۲] دیکھئے قرآن حکیم سورۃ النسأ۔ آیت ۳۔ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور۔ صفحہ ۱۵۲

"زمانہ جاہلیت کی تعدد ازدواج کو کم کر کے قرآن زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کی اجازت دیتا ہے، مگر وہ بھی اس شرط پر کہ تم نہ صرف ضروری چیزوں میں بلکہ پیار و محبت اور روحانی سکون میں سب سے کاملاً انصاف کرو۔ چونکہ یہ شرط پوری کرنا نہایت دشوار ہے' اس لئے میرے خیال میں قرآن صرف یک زوجگی کی سفارش کرتا ہے" [۱]

علاوہ ازیں قرآن عورت اور مرد کی مساوات پر زور دیتا ہے۔ اللہ کہتا ہے "اور عورتوں کے مردوں پر وہی حقوق ہیں جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہیں" (۲: ۲۲۸)

قرونِ اُولیٰ کی مُسلمان عورتیں

یہ تو قرآن کی باتیں ہوئیں۔ اب ذرا قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی پر نظر ڈالئے' تو صاف پتہ چلے گا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد اور خلافت راشدہ کے دور میں مسلمان عورتیں کسی طور سے بھی کسی معاشری کام کاج اور گھر سے باہر کی دنیا کے کاروبار سے الگ تھلگ اور علیحدہ نہیں رکھی جاتی تھیں۔ بلکہ وہ تمام پبلک معاملات اور ہر قسم کی تکمیلات میں آزادانہ طور پر شامل ہوتیں اور حاصل کرتی تھیں۔ وہ بازار میں خرید و فروخت کرتی تھیں، مسجدِ نبوی میں نماز میں شرکت کرتی اور مجلس شوریٰ میں جب ضرورت پڑے شریک ہوتیں تھیں' جنگ کے میدان میں جاتی تھیں اور اگر ضرورت ہوتی تو جنگ میں لڑتی بھی تھیں، جو عموماً خالص مردانہ کام تصور کیا جاتا ہے [۲] اس کے علاوہ وہ ہر طرح کی سماجی اور سیاسی اجتماعات میں شریک ہوتی تھیں [۳] ایسی احادیث ہمارے تک کیسے پہنچیں جو ان سے مروی ہیں۔

---

[۱] دیکھئے علامہ عبداللہ یوسف علی کا قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۷۹، ایس شیخ محمد اشرف۔ لاہور۔ علاوہ ازیں دیکھئے سید امیر علی "دی سپرٹ آف اسلام" (انگریزی میں) صفحہ ۲۳۰۔ لنڈن۔ ۱۹۲۲

[۲] مولانا بشیر احمد غازی آبادی نے بجا فرمایا "ہماری خواتین نے جنگی خدمات برقعہ اوڑھ کر گھوڑوں کے پیچھے کھڑے ہو کر نہیں سرانجام دی تھیں" دیکھئے "اخبار جہاں" کراچی مورخہ ۱۹ اپریل ۱۹۶۷ء۔

[۳] دیکھئے "اسلامی پردہ" از شمس الدین صفحہ ۲ تا ۸ اور دیکھئے مصنف کی دوسری تصنیف "مسلم خواتین درِ احادیث رسول امین" جس میں مسلم خواتین کے علم حاصل کرنے کے بارے میں احادیث صفحہ ۱ تا ۲۲، مسلم خواتین کا نماز پڑھنے کے لئے مسجدوں میں

علاوہ ازیں، قرونِ اولیٰ کی مسلمان عورتیں برقعہ یا چادر نہیں پہنتی تھیں کیونکہ اسلام اولیٰ میں اس کا کوئی وجود نہ تھا مگر وہ باہر نکلتے وقت جلباب ضرور اوڑھ لیتی تھیں جو ایک قسم کا اوور کوٹ ہوتا تھا، جس سے وہ بوقت ضرورت منہ بھی چھپا سکتی تھیں تاکہ اوباش افراد کی نگاہیں اُن پہ نہ پڑیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے علماء میں اس امر پہ اتفاق رائے نہیں کہ جلباب کہاں تک عورت کا جسم ڈھانکتا تھا تاہم ان کی بحث سے یہ واضح ہے کہ کہ جلباب گھونگھٹ قسم کی چیز نہیں تھی کیونکہ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے چہرہ، ہاتھ اور پاؤں چھپانے کا حکم نہیں ہے، بلکہ صرف سینہ اور زینت چھپانے کی ضرورت ہے جیسا کہ قرآن کا حکم ہے۔ ایک جدید عالم محمد مظہر الدّین صدیقی لکھتے ہیں:

"رسول اکرمؐ کے عہد میں دراصل یہ دستور تھا، جس کا ثبوت تاریخ اور حدیث سے بھی ملتا ہے کہ مسلمان عورتیں اپنی معاشی، علمی اور مذہبی ضروریات کے لئے بغیر برقعہ وغیرہ کے مگر جلباب پہن کر جو اُن کی جسمانی خدوخال اور زینت چھپا لیتا تھا گھر سے باہر نکلتی تھیں[1]"

اس سے ظاہر ہوا کہ عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں عورتیں ہر قسم کی معاشرتی سرگرمیوں میں حصّہ لیتی تھیں اور آزادانہ طور پر پبلک میں کام کاج کرتی تھیں۔ اس امر کا ثبوت ایک اور واقعہ سے بھی ملتا ہے جس کا ذکر حضرت ابن عباسؓ نے کیا، جو قرآن کے پہلے مفسّر بھی تھے اور حضور سرورِ کائناتؐ کے چچیرے بھائی بھی تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حجتہ الوداع کے موقع پر ایک عورت جو بنو خشم سے تعلق رکھتی تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آئی جبکہ آپؐ اونٹ پر سوار تھے اور آپؐ کے پیچھے حضرت ابن عباسؓ کے بھائی

جانے کی احادیث صفحہ ۲۵ تا ۳۰، مسلم خواتین کا جنگوں میں حصہ لینے کے متعلق احادیث صفحہ ۷۳ تا ۸۰، بیوی کا کھیتی باڑی کے کام کرنے کے متعلق احادیث صفحہ ۱۱۵ تا ۱۱۷، بیوی کا تجارت کرنے کی احادیث صفحہ ۱۱۷ تا ۱۱۸، بیوی کا کھیلوں میں حصّہ لینے کی احادیث صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۲۔ شمس بک ڈپو، مصری شاہ۔ لاہور، ۱۹۴۰ء۔

[1] محمد مظہر الدین صدیقی، "ومن ان اسلام" (انگریزی) صفحہ ۱۲۹۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر۔ لاہور۔ ۱۹۶۶ء۔

فضل بیٹھے تھے۔ عورت نے حضورؐ سے اپنے باپ کے عوض حج بدل کی اجازت چاہی جو آپؐ اجازت دیدی۔ عورت خوبصورت تھی۔ فضل اُسے دیکھنے لگ گئے۔ اس پر حضورؐ نے ان کے چہرے کو پرے موڑ دیا۔ یہاں یہ سوال کئے جا سکتے ہیں کہ اگر آپؐ کے عہد میں پردہ ہوتا تو وہ عورت کیسے بغیر برقعہ پھر سکتی تھی؟ علاوہ ازیں، حضرت ابن عباسؓ کو کیسے معلوم ہوتا کہ عورت خوبصورت تھی؟ [۱]

ابن سعد جو حضور نبی اکرم صلعم کے پہلے سیرت نگار ہیں، ایک حدیث بیان کرتے ہیں جس میں حضورؐ نے پردے کے لئے دیوار بنانا پسند نہیں فرمایا۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ۔

"عبداللہ بن یزید بیان کرتا ہے کہ اس نے وہ گھر دیکھے جن میں امہاتؓ مطاہرہ رہتی تھیں اور جنہیں بعد میں خلیفہ عمر و بن عبدالعزیز نے مدینہ کی اپنی گورنری کے زمانے میں گروا دیا تھا جب انہوں نے حضرت ام سلمہؓ کا گھر دیکھا تو ان کے نواسے سے دریافت کیا، جنہوں نے بتایا کہ جب حضورؐ غزوہ تبوک پر گئے ہوئے تھے تو حضرت ام سلمہؓ نے اپنے گھر کے اردگرد کچی اینٹوں کی دیوار بنائی تھی۔ جب آپؐ واپس آئے تو اُن سے دیوار کے متعلق پوچھا۔ حضرت ام سلمہؓ نے کہا کہ "اے رسول اللہ میں چاہتی ہوں کہ اس سے مردوں کی نگاہیں رک دوں" آپؐ نے فرمایا: "اے ام سلمہؓ بلاشبہ وہ بے فائدہ چیزیں جو مومن کا روپیہ کھا جاتی ہیں عمارتیں ہیں"۔ [۲]

ان احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں پردہ، برقعہ اور زنانخانہ قسم کی چیزیں نہیں تھیں، اس کے برعکس مسلمان عورتیں آزادانہ طور پر گھر سے باہر کے کاموں اور کھیلات میں حصہ لیتی تھیں۔ تاہم یہ حالات خلافت بنوامیہ کے آخری ایام تک قائم رہے۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہونے لگے جن سے مسلمانوں میں پردے کا رواج شروع ہو گیا۔ ان حالات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے اس انقلاب عظیم کا ذکر کریں

---

[۱] فی ہذا۔ صفحہ ۱۶۳

[۲] سر ولیم میور "لائف آف محمدؐ" (انگریزی میں) صفحہ ۵۳۴۔ ایڈنبرا۔ ۱۹۲۳۔

جس سے حضور سرور کائنات نے عربوں کے ذہن و کردار میں تکمیلی تغیر پیدا کر کے اُن کی عادات، طرز فکر اور طرز معاشرت کو بدل دیا تھا۔

اسلام اولیٰ کا تکمیلی انقلاب

اسلام کے ظہور سے پہلے عرب نہایت سرکش، بے لگام باغی اور حریص لوگ تھے، جو بقول ولندیزی مورخ اسلام دوزی کے "دنیاوی معاملات مثلاً جنگ و جدال، ناچ کھیل، شراب اور عشق بازی میں مستغرق رہتے تھے؛ مگر ان کی نگاہیں، وفاداریاں اور دلچسپیاں اپنے قبیلے اور خیل کی مائیکرو سوشل دنیا سے پرے نہیں جاتی تھیں۔ دراصل ہر ایک عرب کا دعویٰ ہوتا تھا کہ:۔

"دنیا میں بہترین قوم عرب قبائل ہیں، عرب قبائل میں بہترین قبیلہ اس کا اپنا قبیلہ ہے۔ اس کے قبیلے میں اعلیٰ ترین خیل اس کا اپنا خیل ہے۔ اس کے خیل میں اعلیٰ ترین خاندان اس کا اپنا خاندان ہے اور اپنے خاندان میں سب سے بہترین شخص بلاشبہ وہ خود ہے۔ اور چونکہ وہ اعلیٰ ترین شخص ہے اس لئے دنیا کی ہر اچھی چیز جس تک اس کا ہاتھ پہنچ سکتا ہے اس کی ہے"۔

ظاہر ہے کہ ماقبل اسلام عربوں کا ایسا خود غرض، خود بین اور خود پسند کردار ان میں بے شمار جھگڑے فساد کا شاخسانہ ثابت ہوا۔ ان عادات و خصائل نے عربوں میں اپنے قرابتداری گروہوں مثلاً قبیلوں، خیلوں اور خاندانوں سے نہایت گہری وفاداری اور وابستگی پیدا کی۔ اور ایسے رجحانات کو ہوا دی جن سے وہ ایک طرف تو اپنے قرابتداری گروہوں، قبیلوں اور خاندانوں سے وابستہ رہتے تھے اور دوسری طرف قبائلی اور ذاتی مفادات اور ناموری کے لئے جنگ و جدال کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس لئے ان میں بدلہ اور انتقام کی جذبات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ ان میں قبائلی جنگ و جدال کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا تھا جس نے ظہور اسلام سے پہلے عرب معاشرے میں قتل و غارت اور انتشار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

لیکن یہ سب کچھ نبی اکرم صلعم نے اپنی لاثانی ہدایت اور مثال کی روشنی میں چند سالوں میں بدل دیا۔ آپؐ نے قبائلی تفرقے مٹا دیئے، خیل و خاندان کا تفاخر اور تکبر ختم کر دیا اور

مسلمانوں کو خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی، مساوات کا سبق پڑھایا، خاندان اور قبیلے، حسب و نسب کی بجائے کردار کی نیکی اور اچھائی کو افضل بتایا۔ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "تم میں اشرف وہ ہے جس کا کردار سب سے اچھا ہو۔" لیاقت اور فضیلت ورثہ میں نہیں ملتی بلکہ دیانتداری سے حاصل ہوتی ہے، یعنی محنت، کوشش اور نیک عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔

"جو مسلمان ایک درخت لگاتا ہے یا کھیت جوتتا ہے جس سے کسی محتاج کا پیٹ بھرے، صدقہ کا کام کرتا ہے (صحیح بخاری)

آپؐ نے مفت خوری، کاہلی اور فقیری کی مذمت کی۔ کیونکہ یہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ قرآن نے مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ

"اللہ نے جو کچھ آسمان اور زمین میں پیدا کیا وہ سب تمہاری تسخیر میں ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دیں" (۲۰: ۳۱)

ان تعلیمات اور انقلاب سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلعم اور اسلام کا بنیادی مقصد مسلم معاشرے کو قبائلیت سے پاک کرنا اور ماکروشوشل معاشرہ بنانا تھا جس میں مساوات، عدل و انصاف اور تکمیلی ذہن و کردار کی بنا پر ایک نئی انسانی زندگی اور جمعیت کی بنیاد رکھنی تھی اور آپؐ کے اور خلافت راشدہ کے عہد میں ایسا اسلامی معاشرہ وجود میں آگیا تھا جس میں قبائلی اور رنگ و نسل کی تمام عصبیتیں ختم ہو گئی تھیں اور ایک ماکروشوشل اور مساویانہ معاشرہ تعمیر ہو گیا تھا۔

غیر تکمیلی معاشرے کا آغاز

تاہم اموی خلافت کے اواخر میں حالات بدلنے لگے قبائلی عصبیت، نسلی تفاخر اور محدود وفاداریوں اور مفادات نے، جنہیں اسلام نے مذموم قرار دیا تھا، دوبارہ مسلم معاشرے میں پیدا ہونے لگے۔ ان رجحانات کا سبب مسلمانوں میں غلام اور کنیزیں رکھنے اور کثرت ازدواج کا عام ہونا تھا۔ دراصل اس نازک مرحلے پر ضرورت یہ تھی کہ علمائے دین اور مقتدر لوگ آگے بڑھتے، ان غیر اسلامی رجحانات کی ملامت کرتے اور مسلمانوں کو اسلامی مساوات

حق و انصاف، انسانی برادری اور ہمدردی کا اوّلین درس دیتے۔ مگر سب کچھ اس کے برعکس ہوا۔ جب دولت و ثروت اور جاہ و حشم کی ہوس میں مقتدر طبقوں اور گروہوں نے کمزور اور لاچار طبقوں، مثلاً عورت، غلام وغیرہ کے حقوق اور آزادیوں کو پامال کر کے ان پر ظلم و تشدد کے دروازے کھول دیئے، تو اہلِ علم و فضل نے اُن کے حق میں کوئی آواز بلند نہیں کی، بلکہ ظالموں کی ہمنوائی شروع کر دی۔ پس وہ احترام اور مقام جو عورتوں کو رسول اکرم صلعم اور خلفائے راشدین کے عہد میں بلکہ اموی خلافت کے اوائل میں بھی میسّر تھا اب مفقود ہونے لگا۔ اب اُن کی آزادی اور مراعات ختم ہونے لگیں۔ ایک جدید مصنف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو مسلمان عورتوں کے خلاف مردوں کی بدلتی ہوئی رائے اور رویے پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ابن عمرؓ کے صاحبزادے بلال بن عبداللہ بیٹھے ہوئے تھے اسی مجلس میں ابن عمرؓ نے یہ کہتے ہوئے کہ آنحضرت صلعم نے وضو کیا اور اس کے بعد فرمانے لگے" لَا تَمْنَعُوا النِّسَاءَ حُظُوظَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ: مسجد میں عورتوں کا جو حصّہ ہے اس سے ان کو نہ روکو۔"

جس کا مطلب یہ تھا کہ جماعت کی نماز میں شریک ہونے کے لئے عورتیں اگر مسجد آنا چاہیں تو ان کو ثواب سے محروم نہ کرو اور مسجد آنے سے نہ روکو۔ بلال ابھی جوان تھے اور ان کے عہد تک حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے جن کی وجہ سے اُن کی رائے اس کے خلاف تھی۔ یہ ممکن تھا کہ اپنی رائے کو کسی اور طریقے سے پیش کرتے لیکن رسول اللہ صلعم کی حدیث سن لینے کے بعد کہنے لگے کہ

"مگر میں تو اپنی بیوی کو مسجد آنے سے روکوں گا، پھر جس کا جی چاہے اپنی بیوی کو آزاد چھوڑ دے۔"

ابن عمرؓ کا یہ سننا تھا کہ خود بلال راوی ہیں، میری طرف متوجہ ہوئے اور تین دفعہ لعنک اللہ (خدا کی تجھ پر لعنت ہو) کہتے ہوئے فرمانے لگے

"مجھ سے تو سن رہا ہے کہ میں کہہ رہا ہوں رسول اللہ صلعم نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو مسجد میں آنے سے نہ روکا جائے اور تو کہتا ہے کہ میں ان کو روکوں گا۔"

بلال کا بیان ہے کہ یہ فرما کر ابن عمرؓ رونے لگے اور غصّہ میں اٹھ کر چلے گئے (معرفتہ علوم الحدیث للحاکم ص ۱۸۳)

بعض روایتوں میں ہے کہ جب تک بلال زندہ رہے ابن عمرؓ نے ان سے گفتگو نہ کی (دیکھو فتح الباری ج ۲)[1]

بہر کیف بنی اُمیہ کی خلافت کے دور تک مسلمان عورت کی حیثیت اور مقام بہت بلند اور باعزت رہے جرمن مورخ فون کریمر لکھتا ہے۔

"یہ واضح ہے کہ اموی خلفا کے دربار میں عورت کی پوزیشن اس مذلت سے بہت مختلف تھی جو بعد ازاں مسلمان عورت کے حصّے میں آئی۔ اموی حکومت کے معاملات میں بھی عورتوں کو اکثر آخری فیصلہ دینے کا اختیار حاصل تھا اور خلیفۂ وقت کی بیوی تو بسا اوقات خود حکمرانی کرتی تھی"[2]

مگر اموی خلافت کے آخری حکمرانوں کے عہد میں مسلمان عورت کی پوزیشن بدلنے لگی۔ پردہ جس کا مقصد عورت کو تمام پبلک سرگرمیوں اور کاموں سے بیدخل کرنا ہے، اموی اشرافیہ میں پھیلانا شروع ہوا۔ اس کی وجہ ان مقتدر اور متمول افراد اور خاندان میں بڑھتی ہوئی عیاشی، غیر محدود کثرت ازدواج اور کنیز داشتگی تھی جن سے مردوں میں بدظنی اور بیجا جنسی محتاط پن جیسے رجحانات تقویّت پکڑ گئے اور جن سے لامحالہ پردہ داری کا میلان پیدا ہوا، تاکہ وہ اپنی عورتوں اور کنیزوں وغیرہ کو دوسرے مردوں کی نظروں سے چھپا سکیں۔ اس طرح "حرم" کا وہ ادارہ وجود میں آیا جو قرون وسطیٰ کے پردہ سسٹم کا مرکزی ادارہ ہے۔

حرم سسٹم کی ابتدا حرم کا رواج اموی خلیفہ ولید دوم کے عہد (۷۴۳ء - ۷۴۴ء) میں شروع ہوا۔ اموی حکمرانوں اور اشرافیہ نے بازنطینی محلوں کی طرح مخنث غلاموں کو اپنی بیویوں اور کنیزوں کی محلوں اور مکانوں میں پہرہ داری اور

---

[1] مولانا سید مناظر احسن گیلانی "تدوین حدیث" ص ۱۰۲-۱۰۳ مکتبۂ اسحاقیہ۔ کراچی۔ دوسری ایڈیشن تاریخ ندارد

۲۵

نگرانی کے کام پر مامور کر دیا تاکہ کوئی غیر مرد ان کے محلوں اور مکانوں کے اس ممنوعہ جگہ نہ جائے جہاں یہ عورتیں اور کنیزیں وغیرہ رہتی تھیں۔ ایسا محل یا مکان یا اس کا ممنوعہ حصہ "حرم" کہلاتا تھا۔

درحقیقت لفظ "حرم" مسلمانوں کی معاشرتی تاریخ کی خوب عکاسی کرتا ہے۔ قبل از اسلام کی عربی میں "حرم" سے مراد ایسی متبرک چیز جسے احترام کے باعث چھونا تک منع ہو ان معنوں میں مکہ کی مرکزی عبادت گاہ "حرم" کہلاتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ اس لفظ کے معنوں میں احترام کی بجائے ممانعت کا مفہوم نمایاں ہونے لگا۔ تب اس لفظ کے معنی منع کی گئی چیزیں مراد ہوئیں جو لفظ حرام سے آج تک واضح ہیں۔ اس لفظ کے دو معنی ہو گئے اوّل، عزت اور احترام والی چیزیں، جیسا کہ خود لفظ "احترام" سے بھی ظاہر ہے۔ دوسرے معنی منع کیا ہوا۔ ممنوعہ، ناروا، ناجائز ہو گئے۔ اس منفی معنوں میں "حرم" یا "حریم" کا لفظ قرون وسطیٰ کے پردہ سسٹم کا مرکزی ادارہ بن گیا۔ مگر اس منفی اصطلاح کے بھی دو معنے ہو گئے۔ اول وہ جگہ یعنی محل یا مکان یا اس کا حصہ جہاں غیر مردوں کا داخلہ ممنوع ہو۔ اس لحاظ سے "حرم" کے معنی جگہ، مکان یا محل یا رہائش گاہ کا وہ حصہ جہاں عورتیں رہتی ہوں۔ مگر جلد ہی اس لفظ کے معنی وہ عورتیں یعنی بیویاں اور کنیزیں بھی ہو گئے جو اس ممنوعہ جگہ، مکان یا محل میں رہتی تھیں جن کے باعث غیر مردوں کا داخلہ وہاں ممنوع تھا۔ اب اس لفظ کے معنی ہی بیوی یا کنیز وغیرہ ہو گئے جو کسی مرد نے شادی کر کے یا خرید کر باقی تمام مردوں پر "حرام" کر دی ہو اس طرح لفظ "حرم" متبرک سے ممنوعہ اور ممنوعہ مکان سے بیوی اور کنیز کے معنوں میں مستعمل ہو گیا[1]

---

[1] معنوں کی یہ سیمانٹک تبدیلی پردہ سوسائٹی کے کئی اور الفاظ میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً مغلوں کے عہد میں "محل سرا" سے مراد "حرم" تھی۔ رفتہ رفتہ "محل" استعمال ہونے لگا پھر "محل" سے ملکہ معنی بن گئے جس کا موجودہ ثبوت "تاج محل" کے لفظ میں پایا جاتا ہے جو دراصل شاہنشاہ شاہجہان کی چہیتی ملکہ ارجمند بانو کا لقب تھا وفات کے بعد اس کے مقبرے کو بھی "تاج محل" کہا جانے لگا۔ "گھر" کا سیدھا سادہ لفظ بھی حیدرآباد

خلافت عباسیہ کے قیام (۷۵۰ عیسوی) کے بعد حرم کا رواج اشرافیہ سے پھیل کر متوسط بلکہ غریب طبقوں تک پہنچ گیا اور خلافت کے دور افتادہ قصبوں اور گاؤں تک پھیل گیا۔ جب ۹۴۰ عیسوی کے قریب خلافت عباسیہ کا انحطاط شروع ہوا اور مملکت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو پردہ سسٹم کا رواج اور زیادہ پھیل گیا۔ دراصل جیسا کہ ہم اگلے باب میں وضاحت کریں گے "پردے اور قومی انحطاط و انتشار میں گہرا تعلق ہے۔ پردہ قوم میں انحطاط اور انتشار پیدا کرتا ہے اور یہ انحطاط اور انتشار پردے کو مزید پھیلاتا ہے حتیٰ کہ قوم ختم ہو جاتی ہے۔ بعینہٖ ایسے جس طرح بیمار شخص کا مرض کمزوری پیدا کرتا ہے اور پھر کمزوری سے مرض بڑھتا ہے اور اس طرح یہ "خرابی کا چکر" چلتا رہتا ہے حتیٰ کہ مریض ختم ہو جاتا ہے۔

پردہ سسٹم کا اسلامی قرار دیا جانا

خلافت عباسیہ کے دور انحطاط میں تقریباً ۹۴۰ عیسوی کے بعد کئی عباسی خلفا نے پردہ سسٹم کو رفتہ رفتہ باقاعدہ اسلامی ادارے کی حیثیت دے دی۔ المتوکل (۸۴۷ تا ۸۶۱ء) پہلا عباسی خلیفہ تھا جس نے ایک فرمان کے ذریعے مردوں اور عورتوں کا ضیافتوں جشنوں اور دوسری پبلک رسومات پہ ایک جگہ جمع ہونا منع کر دیا[2] اسکے بعد عباسی خلیفہ قادر باللہ (۹۹۱ تا ۱۰۳۰ عیسوی) نے فرمان شاہی کے ذریعے عورتوں کی پردہ نشینی کو اسلامی ادارہ قرار دے دیا[3]

دکن کی اردو میں "بیوی" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک انگریز عورت نظام دکن کے حیدرآباد کا ایک لطیفہ یوں بیان کرتی ہے "ایک آدمی چلا جا رہا تھا۔ راستے میں حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی کہنے لگا "حکیم صاحب ذرا ہمارے ہاں آئیے گا میرے "گھر" کی گردن پر پھوڑا نکلا ہوا ہے" پشتو زبان میں گھر کو "کور" کہتے ہیں جو بیوی یا گھر والی کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ پنجاب کے دیہات میں "ڈولی" کے معنے دلہن بھی ہے کیونکہ اُسے ڈولی میں بٹھا کر اپنے نئے گھر لایا جاتا ہے۔ یوپی (ہندوستان) میں لفظ "سواریاں" جو یکے میں آتی ہیں "عورتوں" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

2. Von Kremer, *The Orient under the Caliphs*, p. 170. Trans. by S. Khuda Bakhsh.

2. *Syed Ameer Ali : His Life and Work*, ed. by K.K Aziz. p. 162-3 Lahore. 1968.

اس طرح گیارہویں صدی میں پردے کا نفاذ مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد تیرہویں صدی تک، جب خلافت عباسیہ کا زوال ہوا، پردہ اتنا سخت اور ہمہ گیر ادارہ بن گیا تھا کہ عورت کا برقعہ یا چادر سے باہر منہ باہر نکالنا تو درکنار، ہاتھ اور پاؤں باہر نکلنا بھی غیر شرعی فعل قرار دے دیا گیا۔ اب علماءِ دین میں اس بات پر گرما گرم بحثیں ہونے لگیں کہ آیا جلباب سے مراد عورت کے سارے جسم کو ڈھانپنا ہے یا ہاتھ اور پاؤں چادر سے باہر دکھانا جائز اور درست ہے سید امیر علی لکھتے ہیں:-

"تیرہویں صدی کے وسط میں جب مسلم معاشرہ منگولوں کے حملے کے باعث انتشار و انحطاط میں مبتلا تھا اور سیاسی حالت دگرگوں تھی تو ہم پہلی مرتبہ ایسی اجتہادانہ موشگافیوں کا پڑھتے ہیں کہ آیا عورتوں کے لئے پاؤں یا ہاتھ باہر دکھانا زیادہ نازیبا ہے[1]

مسلمان عورت کی تذلیل

پردہ یا حرم سسٹم کے نتائج صاف تھے۔ اس نے عباسی دور کی مسلمان عورت کو معذور اور مجبور ہستی بنا دیا۔ اس کی سابقہ آزادی اور احترام ختم ہو گئے اب وہ مردوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی جس کی خرید فروخت سرعام ہونے لگی سید امیر علی لکھتے ہیں:

"بتدریج ایک آزاد، حوصلہ مند، خود مختار، پُر وقار اور قابلِ احترام خاتون کی شریف النفس تصویر مسلم معاشرے سے غائب ہو گئی اور اس کی جگہ پردے میں محبوس عورتوں نے لے لی جو اپنے رہن سہن میں قدیم ایرانی اور بازنطینی محلوں کی اُن مکینوں کی نقل دکھائی دیتی تھیں جن کی زندگیاں عیش و عشرت، بے مغزی اور وقار کے فقدان کا مظاہرہ کرتی تھیں[2]

---

[1] Ibid, p. 161-68. See also Ameer Ali, *A Short History of the* ... p. 455. See also Von Kremer, *The Orient under the Caliphs*, 170-2.

[2] کتاب ہذا ص ۱۴۷ - ۱۴۸

حرم سسٹم کے آثار قدیمہ

حرم سسٹم کے بتدریج ارتقا کا ثبوت علم آثار قدیمہ (آرکیالوجی) کی دریافتوں سے بھی ملتا ہے جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ کس طرح یہ سسٹم دوسری اور تیسری صدی ہجری میں امویوں کے اشرافیہ طبقوں میں فروغ پانے کے بعد عباسیوں کے عام وخاص طبقوں میں پھیل گیا۔

قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے گھروں میں مردانے اور زنانے کی تقسیم نہیں ہوتی تھی سارا گھر ایسا واحد اور مربوط خاندانی یونٹ ہوتا تھا جو قرابتداروں کے گھروں سے ملحق ہوتا تھا اور اس طرح عزیز و اقارب کے خاندانوں پر مشتمل ایک گاؤں یا محلہ بن جاتا تھا یہ صورت سکونت پذیر قبائل کی تھی۔ صحرا نشین خانہ بدوش قبائل کے خیموں میں بھی کسی قسم کی مردانہ اور زنانہ تقسیم ناممکن اور ناقابل عمل تھی۔ ایسے خانہ بدوش قبائل میں مرد اور عورت کی تقسیم صرف ان کاموں اور معاملات میں تھی جن میں پدر سرداری برتری اور فوقیت کی ضرورت پیش آتی تھی، مثلاً جنگ و جدال کے لئے مگران قبائل کی مجلسی زندگی میں یہ تقسیم اور تشخیص نہیں پائی جاتی تھی۔ جب کوئی خانہ بدوش قبیلہ یا خیل کسی معاملے یا خطرے پر میٹنگ کرتا تھا تو مردوں کی طرح اس کی عورتیں بھی آزادانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتی تھیں۔ یہی صورت حال تقسیم قبائل کے محلوں اور گاؤں میں پائی جاتی تھی۔ چونکہ ہر خیل یا قبیلہ ایک ہی محلے یا گاؤں میں رہتا تھا' لہٰذا اپنے اجتماعی کاموں اور میٹنگوں کے لئے محلے میں ایک کمرہ یا کھلا میدان ان باتوں کے لئے مخصوص کر لیا کرتا تھا جس میں "قوم" یعنی قبیلے یا خیل کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ ان میں عورتیں بھی شرکت کرتی تھیں اور اپنی رائے اور مشورہ دیتی تھیں۔ ایسی اجتماعات سے عربوں میں قبائلی مجالس اور شوریٰ کا رواج ہوا۔ یہ حالات ظہور اسلام سے لیکر خلافت راشدہ کے عہد میں بھی جاری رہے۔ یعنی مکان اور مشوروں میں مرد اور عورتیں دونوں شرکت کرتے تھے۔ اموی خلافت کے ابتدائی دور میں بھی یہ صورتحال جاری رہی جس کی مثالیں ہم نے اوپر دی ہیں۔ یہ صورتحال اموی خلفا کے محلوں کی تعمیر میں بھی پائی جاتی تھی جو انہوں نے ملک شام اور اردن کے صحراؤں میں تعمیر کرائے، مثلاً قصر امراء یا حمام السرخ کے محل جو خلیفہ ولید اوّل (۷۰۵ - ۷۱۵ء) نے تعمیر کئے تھے' ان کے آثار الباقیہ

سے ظاہر ہے کہ ان میں زنانہ اور مردانہ حصوں کی تقسیم نہیں تھی۔ ان میں ایک دربار ہال ہوتا تھا جہاں خلیفہ اپنا دربار منعقد کرتا تھا اور اس سے ملحقہ دو بیت ہوتے تھے[1]

آخری امویوں کے دورِ حکومت میں حالات بدلنے شروع ہوئے۔ یہ صورت حال خاص طور پر عیاش خلیفہ ولید دوم (۷۴۳-۴۴ء) کے عہد میں پیدا ہوئی۔ وہ بھی صحرا میں محل بنوانے کا مشتاق تھا۔ اس کے محل مشطہ اور قصر الطوبہ جن کے آثار اردن میں پائے جاتے ہیں، کا وہی نقشہ تھا جو ابتدائی اموی محلوں کا، مگر ان میں دو بیت کی بجائے چار بیت یا گھر ہوتے تھے، جو حرم کی ابتدائی صورت تھی، مگر یہ بیت اب بھی مرکزی جگہ یعنی دربار ہال سے ملحق تھے نہ کہ محل کے عقب میں جیسا کہ حرم کی صحیح صورت میں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اموی عورتیں ابھی کم و بیش آزاد اور مساوی حیثیت رکھتی تھیں[1]۔ مگر عباسیوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد یہ صورتحال تیزی سے بدلنے لگی۔ آثار قدیمہ میں اس کا پہلا ثبوت اس محل سے ملتا ہے جو عیسٰے بن موسٰی نے عراق میں عوخیدر کے مقام پر ۷۷۸ء میں بنوایا۔ عیسٰے بن موسٰی پہلے عباسی خلیفہ السفاح کا بھتیجا، اس کا ولی عہد اور عراق کا گورنر تھا۔ اس محل میں بھی آخری اموی محلوں کی طرح چار بیت کا ڈیزائن تھا، مگر بقول کریسول، وہ بیت "الگ تھلگ" اور گھرے ہوئے" تھے[2] یہ حرم کی صحیح صورت ہے، یعنی گھر میں عورتوں والے حصّے کو مردانہ حصّے سے الگ اور علیٰحدہ حیثیت دے دی تھی۔ پروفیسر کریسول ان چار بیت کے فن تعمیر پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عوخیدر کے اوائلی عباسی محل میں ہمیں چار بیت جو دربار عزّت اور دربار حضوری کے دائیں بائیں جانب ملتے ہیں اپنے طور پر پورے کنبوں کے لئے بنائے گئے تھے جو مسلم شہزادے کی چار قانونی بیویوں کے لئے

R.A.B. Cresswell, *A Short Account of the Early Muslim Architecture*. The Works of Al-Walid, pp. 82-107. Penguin Books. 1958. See als[o] *Encyclopedia of Islam* Vol I., p. 618. London. 1960. (New Edition)

[2] فی ہذا۔ صفحہ ۱۴۷-۱۴۸ [1] فی ہذا۔ صفحہ ۱۹۷۔

تھے۔ بیشک مشطہ کے دربار ہال کے ارد گرد اور قصر الطوبر کے چار بیت ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب محل مسلمانوں نے تعمیر کئے تھے۔[۳]

نصف صدی کے بعد جب عباسی خلیفہ المعتصم نے ۸۳۶ عیسوی میں سمرا کا نیا دارالخلافہ بغداد کے شمال میں دجلہ کے کنارے تعمیر کرایا تو قرون وسطیٰ کا حرم سسٹم، جہاں تک محلوں کی فن تعمیر کا تعلق ہے، پوری طرح مروج ہو چکا تھا۔ اس کی مثال المعتصم کے محل "جوسق الخاقانی" کے کھنڈرات سے ملتی ہے۔ اس محل میں حرم یا زنان خانہ اموی محلوں کے برعکس چار بیت والے ڈیزائن پر نہیں، بلکہ متعدد گھروں پر مشتمل تھا، جو محل کے مردانہ یا پبلک حصے سے پرے اور الگ بنائے گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اموی محلوں کے برعکس جن میں بیت اور دربار ملحقہ ہوتے تھے، عباسی محلوں میں حرم خالص پردے کے مقاصد کے تحت تعمیر کئے گئے تھے تاکہ اُن میں خلیفۂ وقت کی کثیر التعداد بیویوں، کنیزوں اور لونڈیوں وغیرہ کو الگ تھلگ رکھا جائے۔ ایسے حرم کے مکینوں کو صحیح معنوں میں "حرم" یعنی بیویاں اور کنیزیں کہا جانے لگا۔

مگر عباسی دور میں "حرم" صرف خلیفہ کے محلوں میں ہی نہیں ہوتا تھا، بلکہ امرا کے حویلیوں اور عام آدمیوں کے گھروں میں بھی بنائے جاتے تھے۔ دراصل اس زمانے سے لیکر موجودہ زمانے تک مسلمانوں کے گھروں کا نقشہ ہی مردانہ اور زنانہ حصوں کی تقسیم پر مبنی ہے۔ جو ہماری گھریلو فن تعمیر کا لازمی جزو بن گیا ہے۔ اس طرح پردہ سسٹم کی معاشری اور تعمیراتی تقسیم مسلم معاشرے کی جزو لاینفک بن گئی۔ دراصل جیسے جیسے پردہ کے عقائد اور رویوں میں اسلام اولیٰ کی تعلیمات اور اصولوں سے انحراف ہوتا گیا، ویسے ویسے ہی ان تین ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں کے گھروں اور محلوں کا نقشہ بدلتا رہا، حتیٰ کہ حرم یا زنانخانہ وجود میں آگیا۔ پھر ایک ہزار سال تک یہ نقشہ قائم رہا۔ اس عرصہ میں مسلمان عورت اور معاشرے پر کیا گزری اس کا تجزیہ ہم اگلے باب میں کریں گے۔

---

[۳] فی ہذا صفحہ ۱۴۳

باب سوم

قرونِ وسطیٰ میں پردہ سوسائٹی کے عروج و زوال

(تقریباً ۱۰۰۰ء سے تقریباً ۱۹۲۵ء تک)

ہم نے باب اوّل میں کہا تھا کہ پردہ سسٹم ایک ایلیٹی ادارہ ہے۔ اس کا ثبوت خلافت عباسیہ کے دور سے ملتا ہے۔ وہ مسلمانوں جن میں پردہ اور تعدّد ازواج کے طریقے پہلی مرتبہ رائج ہوتے تھے اپنے وقت اور معاشرے کے تکمیلی خاندان، گروہ اور طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ مختلف میدانِ عمل میں کسی قسم کی تکمیل اور کمال حاصل کرتے تھے۔ اس طرح جنگ و جدال میں فتوحات اقتدار اور حکمرانی اور نظم و نسق اُن کے ہاتھوں میں آجاتے تھے۔ یہ حکمران طبقے بن جاتے تھے۔ جلد ہی دوسرے تکمیلی طبقے بھی ان سے وابستہ ہوجاتے تھے، جن میں اہل علم و ہُنر صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت شامل ہوتے تھے۔ یہ گروہ اور طبقے حکومت و اقتدار، زمینوں اور جاگیروں اور دولت و ثروت کے مالک ہوتے تھے۔ وہ اپنے قرابتداری گروہوں کے سربراہ، سردار اور سرخیل ہوتے تھے۔ ان مقتدر اور متمول افراد، گروہوں اور طبقوں میں پردہ اور حرم کا رواج پایا جاتا تھا۔ اُن کے عالیشان محل اور مکان، گھر اور حویلیاں مردانہ اور زنانہ حصوں میں بٹے ہوتے تھے اور اُن کی عورتیں حرم کی قید اور پردے کی بندشوں میں بندھی ہوتی تھیں۔

حرم اور علماء مولانا ابوالاعلیٰ مودودی حرم کی تمدّنی ضرورت اور تاریخی اہمیّت کو یوں بیان کرتے ہیں:-

"کم از کم اسلامی تہذیب کی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ "حرم" وہ آخری جائے پناہ ہے جہاں اسلام اپنے تمدّن اور اپنی تہذیب کی حفاظت کرتا ہے۔ عورت کو جن مصلحتوں کی بنا پر اسلام نے حجاب شرعی میں رکھا ہے

اُن میں سے ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ کم ازکم وہ سینہ تو نورِ ایمان سے منوّر رہے جس سے ایک مسلمان بچہ دودھ پیتا ہے، کم ازکم وہ گود تو کفر و ضلالت اور فسادِ اخلاق و اعمال سے محفوظ رہے، جس میں ایک مسلمان بچہ پرورش پاتا ہے، کم ازکم اس گہوارے کے ارد گرد تو خالص اسلامی فضا چھائی رہے جس میں مسلمان کی نسل اپنی زندگی کی ابتدائی منزلوں سے گزرتی ہے۔ کم ازکم وہ چار دیواری تو بیرونی اثرات سے محفوظ رہے جس میں مسلمان بچّے کے سادہ دل و دماغ پر تعلیم و تربیت اور مشاہدات کے اوّلین نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ پس "حرم" دراصل اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ مستحکم قلعہ ہے جس کو اسلئے تعمیر کیا گیا تھا کہ یہ تہذیب اگر کبھی شکست کھا کر پسپا بھی ہو تو یہاں پناہ لے سکے"۔[1]

یہ تو حرم کے بارے میں علمائے دین کا خیال ہے۔ مگر مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہی کہانی سناتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں، علاقہ ممنوعہ ہونے کے باوجود، حرم کے اندر جھانکنا پڑے گا تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس میں جو مسلمان اور غیر مسلم عورتیں بند ہوتی تھیں وہ کس طرح کی زندگی گزارتی تھیں اور کس طرح اور کس ماحول میں اپنے بچوں اور نئی نسلوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کرتی تھیں۔

قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں کی خاندانی زندگی

حرم کی مکانی صورت حرم قسم قسم کے ہوتے تھے، بعض محل اور بعض معمولی گھر، بعض بڑے اور بعض چھوٹے، بعض الگ محل سرا کی صورت میں اور بعض محل اور حویلی سے ملحق اور منسلک، بعض مال و منال سے بھرے ہوئے اور بعض مقابلتاً مفلوک الحال۔ دراصل

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی: تنقیحات: "اسلام اور مغربی تہذیب کا تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تبصرہ"۔ باب: بغاوت کا ظہور، صفحہ ۱۴۹، دفتر "ترجمان القرآن" لاہور۔ تاریخ ندارد۔

ان کا رقبہ سائز اور شان و شوکت پردہ دار مرد اور خاندان کی معاشی اور معاشرتی حیثیت، آمدنی اور اس کی نوعیت، سیاسی اور معاشی اثر و رسوخ قرابتداری تعلقات، رشتوں مفادات اور گروہوں کے مطابق ہوتی تھی۔ حکمرانوں یعنی بادشاہوں اور سلطانوں کے حرم صحیح معنوں میں "کنگ سائز" حرم ہوتے تھے، یعنی وہ نہایت وسیع و عریض ہوتے تھے جن میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں عورتیں بالفاظ دیگر بیویاں، کنیزیں، غلام عورتیں اور ہر قسم کی پکڑی دھکڑی ہوئی عورتیں اور لواحقین وغیرہ رہتی تھیں[1] ان سے کم درجے کے لوگوں کے حرم "حصہ بقدر جثہ" کے مصداق مقابلتاً واجبی سائز کے ہوتے تھے کیونکہ ان کے ذرائع کم اور اثر و رسوخ اور استحصالی قوتیں محدود ہوتی تھیں۔ تاہم متقدر طبقوں کے عام و خاص حرموں میں بیویوں اور کنیزوں کا جم غفیر ہوتا تھا۔ درحقیقت جس شخص کی جس قدر زیادہ اثر و رسوخ اور دولت و ثروت ہوتی تھی اس کا حرم اسی قدر وسیع اور مختلف النوع کی عورتوں سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ بادشاہوں اور امراء و رؤسا کے حرم تو الگ مکان

---

[1] ایسے شاہی حرموں کی مثالیں لاتعداد ہیں: "ایک روایت ہے کہ خلیفہ المتوکل کے محل میں چار ہزار خواصیں تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ان خواصوں کو رجا ہے آپ مانیں یا نہ مانیں) خلیفہ کا بستر عیش نصیب ہو چکا تھا" پروفیسر فلپ کے حتی "عرب اور اسلام" مترجمہ پروفیسر سید مبارز الدین و محمد معین خان صفحہ ۱۲۵ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۳

مسلم ہسپانیہ کے مشہور حکمران "عبدالرحمٰن سوم (۹۱۲ تا ۹۶۱ عیسوی) کے حرم میں چھ ہزار تین سو لونڈیاں ہوتی تھیں جو گھر بار کے کاموں اور شاہی تمتع کے لئے خریدی گئی تھیں"۔ دیکھئے انرک سارعہ "موریش سپین" (انگریزی میں) صفحہ ۷۲ لندن ۱۹۶۲۔ "عثمانی ترکی سلاطین کے حرم میں کنیزوں کی تعداد ہمیشہ تین سو سے ۱۲۰۰ تک ہوا کرتی تھی جن میں چار کنیزیں کسی خاص وقت میں سلطان کی منظور نظر ہوتی تھیں جنہیں شاہی حرم کی زبان میں "قادین" کہا جاتا تھا ان میں ایک کنیز کو سلطان اپنے شاہی بستر پر حصہ لینے کی عزت بخشا کرتا تھا جسے یہ شرف حاصل ہو جاتا وہ "اقبال" کہلاتی تھی" دیکھئے این۔ ایم پنزر "حرم" (انگریزی میں) صفحہ ۷۷۔ لندن۔

جمال پاشا الغزی لکھتا ہے: "سلطان کے محل میں ایک ہزار سے زیادہ عورتیں تھیں۔ ان میں چار نکاحی بیویاں تھیں اور باقی کنیزیں جن پر سلطان کی نظر توجہ تھی۔ ان عورتوں کی نگرانی پر تین سو خواجہ سرا مقرر تھے

کی صورت میں ہوتے تھے، مگر عام مسلمانوں کے گھر کا اندرونی حصہ حرم یا زنان خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے عام مکان اس طرح سے بنائے جاتے تھے کہ اُن کی بیٹھ گلی یا سڑک کی جانب ہوتی، کہ کوئی راہگیر گھر کے اندر نظر نہ ڈال سکے۔ گھر کے اندر صحن ہوتا تھا جو "حرم" کہلاتا تھا۔ اس کے چاروں طرف کمرے ہوتے تھے، جہاں صاحب خانہ کا حرم یعنی بیویاں، کنیزیں اور دوسری عورتیں رہتی تھیں [2]

خواجہ سراؤں کا سردار" قزلر آغاسی" (عورتوں کا آغا) کہلاتا تھا۔ اس خواجہ سرا کا نام ہی سن کر محل کی تمام عورتیں لرز جاتی تھیں۔ کیونکہ یہ سلطان کا معتمد علیہ خادم ہوا کرتا تھا حتیٰ کہ وزیر اور سپہ سالار بھی اس کی خوشامد کیا کرتے تھے۔" دیکھئے" سلطانی محلوں کے راز" تالیف جمال پاشا الغزی۔ ترجمہ ملیح آبادی۔ یسری لائبریری۔ لاہور۔ ۱۹۶۲۔

وسطی افریقہ میں پندرھویں صدی کے نصف میں علی بن دونا ما نے ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ افریقیوں میں کثرت ازدواج کی کوئی حد مقرر نہیں ہوتی۔ مگر نئی مملکت کے شیخ الاسلام امام عمر مسبمر نے بادشاہ اور امرا کو ہدایت کی کہ وہ بیویاں "چار سے زیادہ نہ رکھیں" مگر غلام عورتوں کی تعداد جتنی چاہیں اپنے محلوں میں رکھیں اور مزید کہا کہ اگر بادشاہ کے پاس ایک ہزار کنیزیں بھی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، بورنیو دوسطی سوڈان) کے قبائلی سرداروں کو بھی اس نے ایسا ہی کرنے کی ہدایت کی۔" ٹی پنسر ٹرمنگھم" مغربی افریقہ کی تاریخ اسلامی" (انگریزی میں) صفحہ ۱۲۲۔ لنڈن۔ ۱۹۶۲۔

مسلم ہند کی تاریخ میں تمام بادشاہ سلطان، مغل شاہنشاہ، ان کے امرا، منصبدار اور حکام، زمیندار اور جاگیردار تعدد ازدواج اور کنیز داشتگی کے رسیا تھے اور ان میں اکثر و بیشتر کنیزوں کی اولاد ہوتے تھے ان میں شاہنشاہ اکبر کی مثال لاجواب ہے، وہ یک زوجگی کی شادی کا پرچارک تھا مگر خود لامحدود کثرت ازدواج کا عامل تھا اس کے محل سرا میں" تین سو بیویاں ہوتی تھیں جن میں اس نے کسی ایک کو بھی طلاق نہیں دی تھی" دیکھئے ڈاکٹر محمد یٰسین" اسلامک انڈیا کی سوشل تاریخ" (انگریزی میں) صفحہ ۱۲۵۔ لکھنو۔ ۱۹۵۸۔

2, G.E. Von Grunebaum. *Islam*: Essays in the Nature and Grow[th of] a Cultural Tradition. p. 148. Oxford 1969.

پردے کی پابندیاں

دسویں صدی عیسوی/چوتھی صدی ہجری تک مسلمان عورت کو پہلے وقتوں والی آزادی اور مساوات سے کلی طور پر محروم کر دیا گیا۔ مسلمان معاشرے میں پردے کا رواج اتنا عام اور سخت ہو گیا کہ آزاد عورت سوائے اپنے خاوند، باپ، بھائیوں اور چچا کے علاوہ کسی اور مرد کے سامنے نہیں جا سکتی تھی۔ اس کا گھر سے باہر نکلنا، بلکہ گھر سے باہر اس کی آواز کا سنائی دینا بھی معیوب اور غیر شرعی تصور کیا گیا۔ امام غزالی (متوفی ۱۱۱۱ء) لکھتے ہیں:۔

"مرد کا مذہبی جذبہ اور جوش اس قدر ہونا چاہیئے کہ وہ اس امر کی سختی سے تاکید کرے کہ اس کی مستورات جب گھر کے اندر کونڈی میں بھی کوئی چیز کوٹیں تو کوٹنے کی آواز باہر غیر مردوں کو سنائی نہ دے۔ اور اگر کوئی شخص گھر کے دروازے پر آکر کچھ دریافت کرے اور عورت کو جواب میں بولنا ہی پڑے تو اُسے اپنے منہ پر انگلی اس طرح رکھ لینی چاہیئے کہ بڑھیا کی آواز معلوم ہو۔" [1]

اس دور میں مردوں کی حرم کے اندر جانے کی سخت ممانعت ہو گئی، حتیٰ کہ دس سالہ لڑکے کو بھی حرم کے اندر جانے سے روک دیا گیا۔ ابوالاعلیٰ معری (متوفی ۱۰۵۸ء) جو عورتوں کو مکر و فریب کا مجسمہ تصور کرتا تھا، نصیحت کرتا ہے:۔

"جب لڑکا دس برس کا ہو جائے تو وہ حرم میں داخل نہ ہو اگر تو میری مخالفت کرے گا اور میری نصیحت پر کان نہیں دھرے گا، تو خواہ تجھے کتنی ہی عقل ملی ہو، تو یقیناً نادان ہے۔ خبردار! عورتیں دام تزویر ہیں، جن سے آبائی عزت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔" [2]

ان عقائد اور پابندیوں کے باعث مسلمان عورت کی روزمرہ کی زندگی حرم کی چاردیواری

---

[1] امام غزالی "نصیحت الملوک"۔ ص ۱۶۷

[2] "افکار معری" عرب کا ترقی پسند ادب، صفحہ ۶۵، ترجمہ عبدالرحمٰن طاہر سورتی۔ ادارہ فروغ تعلیم۔ لاہور۔

میں محبوس ہو کر رہ گئی۔ "الاغانی" کا مصنف اصفہانی (متوفی ۹۶۷ء) ایسی ہی پردہ دار عورت کے متعلق کہتا ہے:-

"وہ کبھی ایک میل بھی پیدل نہ چلی
وہ کبھی بے پردہ پالان میں نہیں بیٹھی
اس نے کبھی سورج نہیں دیکھا مگر نقاب سے"؛ [۳۵]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت عباسیہ کے دور انحطاط میں آزاد عورتوں کی آزادی بھی غلامی میں بدل گئی۔ وہ ساری عمر کے لئے حرم کی چار دیواری میں قید، تعلیم و تربیت سے بے بہرا دنیا کے معاملات سے بے خبر زندگی گزارتی تھی۔ مسلمان عورت کی تحقیر و تذلیل اس انتہا کو پہنچ گئی کہ اہلیت طبقوں میں بھی بیٹی کی پیدائش کو باعث شرم و ندامت تصور کیا جانے لگا۔ چنانچہ گیارہویں صدی عیسوی کی ایک چھوٹی سی بادشاہت کا حکمران' امیر عنصر المعانی (عہد حکومت ۱۰۲۹ء تا ۱۰۴۹ء) اپنی کتاب "قابوس نامہ" میں لکھتا ہے۔

"اگر بچی پیدا ہو تو اُسے پردہ دار' نیک دایوں کے سپرد کرو اور جب بڑی ہو جائے تو ملانی کو دو تاکہ نماز' روزہ اور دوسرے شرعی فرائض اُسے سکھائے۔ مگر اُسے تعلیم و تربیت مت دو۔ اور جونہی وہ جوان ہو تو کوشش کر کے شوہر کے حوالے کر دو' کیونکہ یہ بہتر ہے کہ بیٹی پیدا نہ ہو' اگر ہو جائے تو بہتر ہے کہ خاوند کے پاس ہو یا قبر میں"۔ [۳۶]

حرم میں آزاد اور غلام عورتوں کی زندگی

جب غلام عورتوں اور کنیزوں کو میدان جنگ سے پکڑ کر یا غلاموں کی منڈیوں سے خرید کر عباسی مسلمانوں کے گھروں یا حرموں میں لایا جاتا تو وہاں اُن کا آزاد عورتوں سے سابقہ پڑتا جو اُن کے مالکوں کی منکوحہ بیویاں ہوتی تھیں۔ یہ صورتحال ہر گھر اور کنبے میں' "آزاد" بیوی اور

---

[۳۵] حکایات اغانی صفحہ ۴۰ ۔ مترجمہ رئیس احمد جعفری ندوی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی - ۱۹۴۲

[۳۶] امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن قابوس بن وشمگیر' "قابوس نامہ" صفحہ ۹۸ ۔ طہران ۱۳۱۲ شمسی۔

غلام کنیز میں تناؤ اور تنازعے کا باعث ہوتی تھی۔ خلافت عباسیہ کی معاشری تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس خانگی "خانہ جنگی" میں تینوں فریقوں یعنی میاں بیوی اور باندی کی پوزیشن بدلتی رہی۔ یہ تبدیلی پردے، تعدد ازدواج اور کنیز داشتگی کے اثر و نفوذ کے ساتھ واقع ہوئی۔ شروع میں جب آزاد مسلمان عورت کی حیثیت اور مقام قرون اولیٰ کے اسلامی تعلیمات کے مطابق ابھی بلند تھا، تو اس کش مکش میں منکوحہ بیوی کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ یہ آٹھویں اور نویں صدی کا زمانہ تھا۔ اس دور میں آزاد مسلمان عورت اپنے غلام رقیب کے مدمقابل اپنا سر فخر اور اعتماد سے بلند رکھتی تھی۔ "الاغانی" کے حوالے سے مشہور مستشرق اگناز گولڈز یہیر لکھتا ہے:

"یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی کہ چہیتی کنیز کو اس کے مالک کی آزاد بیوی طعنے نہ دے اور اپنی نجابت و شرافت جتاتے ہوئے اپنے باپ، چچا اور بھائیوں کے نام فخر سے نہ گنوائے۔"[۱]

مگر بالآخر اس خانگی رسہ کشی کا فیصلہ کنیزوں کے حق میں ہوا، کیونکہ پردہ اور حرم سسٹم کا سارا معاشری رجحان اور دباؤ آزاد اور باوقار مسلمان عورت کے خلاف تھا۔ اس کے تحت مرد کی خاندان میں بالادستی اور برتری کے طفیل غلام عورتوں، کنیزوں اور باندیوں کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ اس کے علاوہ، کنیزوں اور غلام عورتوں کی تلخ اور مصیبت زدہ زندگی انہیں ایسے گر سکھا دیتی تھی جو وہ اپنے مالکوں کی آزاد بیویوں کے خلاف خوب استعمال کر سکتی تھیں۔ ان سب باتوں کے باوجود، آخری فیصلہ، جیسا کہ ہر انسانی کش مکش میں ہوتا ہے، کنیزوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے کیا۔ مسلمانوں کے حرموں اور گھروں میں کنیزوں اور غلام عورتوں کا ایسا سیلاب آیا کہ آزاد خود دار نجیب الطرفین مسلمان عورت اس میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی۔

۱۔ Ignaz Goldziher, *Muslim Studies*, Vol. I. p. 116. London, 1947.

شاہی حرم میں بیوی اور باندی کی رقابت کا حل بسا اوقات کنیزوں کی سپلائی بڑھا کر کیا جاتا تھا۔ ہارون الرشید (عہد حکومت ۷۸۶ء تا ۸۰۹ء) ایک وقت کسی مغنیہ کا شیدا ہو گیا تھا۔ ہارون کی ملکہ زبیدہ نے ہارون کے حضور میں دس دوشیزہ لونڈیاں پیش کیں تاکہ ہارون اُن کی صحبت میں اپنی محبوبہ کو بھلا کر صرف زبیدہ کا ہو رہے۔[1] فرماں رواؤں اور بادشاہوں سے کم درجے کے طبقوں میں بھی ایسے معاملے اسی طرح حل کر لئے جاتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کے معاملے میں ایک دو کنیزوں ہی سے کام چل جاتا تھا۔

آزاد عورتوں پر غلام عورتوں اور کنیزوں کی سبقت لے جانے کی کئی اور وجوہات بھی تھیں۔ درحقیقت بیوی اور باندی دو مختلف دنیا کی پیداوار ہوتی تھیں جہاں تک غلام عورتوں کا تعلق ہے وہ شروع شروع میں میدانِ جنگ میں پکڑ کر لائی جاتی تھیں۔ یہ سلسلہ خلافتِ عباسیہ کے ابتدائی دور تک جاری رہا۔[2] جب اس کا دورِ انحطاط شروع ہوا اور فتوحات کا سلسلہ رک گیا، تو جنگی قیدیوں کی تعداد کم ہو گئی مگر اس کا ازالہ غلام عورتوں اور کنیزوں کی خرید و فروخت نے کر دیا۔ خلافت عباسیہ کے لاتعداد شہروں اور قصبوں میں غلاموں کی خرید و فروخت کے لئے منڈیاں کھل گئیں جہاں ملک کے اندر اور باہر سے پکڑے ہوئے یا اغوا کئے ہوئے لاکھوں بچے[3] عورتیں اور مرد غلام بنا کر فروخت کئے جاتے تھے اسطرح ان غلام بچیوں اور عورتوں کو متعدد آقاؤں کے ہاتھ فروخت کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اپنی مصیبت زدہ زندگی میں ان غلام عورتوں اور لڑکیوں نے ایسے گرم سرد زمانے دیکھے ہوتے تھے جو آزاد عورت کے خواب میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ دراصل

---

[1] دیکھئے "عرب اور اسلام" از فلپ کے حتی، صفحہ ۱۲۴ مترجمہ مبارز الدین و محمد امین حسان ندوہ المصنفین دہلی - 1951

[2] میدان جنگ میں عورتوں کی پکڑ دھکڑ بعض اوقات مسلمان فوجوں کی شکست اور ہزیمت کا باعث بھی بن جاتی تھی۔ خلافت امیہ میں عربوں کی جنگ پواتیر زمیں شکست اور فرانس میں انکی پیش قدمی رک جانے کی بڑی وجہ یہی پکڑی ہوئی عورتوں کے کیمپ کو خطرہ تھا، جس کے لئے عرب میدان جنگ سے بھاگ گئے۔ ایم۔ اے انعان "تاریخ اسلام کے فیصلہ کن لمحات" ص ۵۰ اور ۷۱، ۷۲ (انگریزی میں) شیخ محمد اشرف - لاہور - ۱۹۴۹ -

غلام عورت اور آزاد بیوی دو مختلف دنیا کی مخلوق ہوتی تھیں۔ ناز وں میں پلی ہوئی آزاد عورت جو اپنی خاندانی عزّت و آبرو کا بھی پاس رکھتی تھی غلام عورت کی اُن ہوشیاریوں اور غمزوں کا کیا مقابلہ کر سکتی تھی جو اس نے ہر قسم کے دکھ اور غم اٹھا کر سیکھے تھے[۱]۔ دوسری وجہ غلام عورتوں کا سیلاب تھا جو عباسی معاشرے میں دولت و ثروت کے ساتھ ساتھ متواتر بڑھتا جا رہا تھا۔ اس طرح ہر گھر اور کنبے میں آزاد بیویوں کی بجائے غلام عورتوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ عباسی سوسائٹی کے عروج کے زمانے میں، یعنی دسویں اور گیارہویں صدی تک، آزاد عورت ایک معدوم شے بن گئی۔ عباسی حکمرانوں اور مقتدر طبقوں کے حرموں میں کنیزوں اور غلاموں کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ بلکہ ان کی مانگ اس قدر بڑھ گئی کہ جنگ کے میدانوں سے پکڑے ہوئے بچیوں، لڑکیوں اور عورتوں کی سپلائی بھی پورا نہ کر سکی۔ اس لئے بردہ فروشی کا بازار گرم ہوا۔ ملک کے اندر اور باہر سوداگروں نے باقاعدہ اور منظم طریقوں سے بچیوں، لڑکیوں اور عورتوں کو ان کے گھروں سے اغوا کر کے یا اُن کے گاؤں اور قبائل پر ڈاکہ ڈال کر یا شبخون مار کر غلاموں کی منڈیوں میں لانا شروع کر دیا۔ بچے اور بچیاں عموماً کم سنی میں پکڑی جاتی تھیں۔ چونکہ اس طرح کا "خام مال" بیچنے سے تاجروں کو زیادہ فائدہ نہیں ہوتا تھا، لہٰذا انہوں نے اپنے "مال" کی قیمت بڑھانے کے لئے بلکہ منہ مانگی قیمت وصول کرنے کے لئے ان

---

[۱] "الاغانی" میں ایک خوبصورت حربیہ (یعنی ایسی کنیز جو محنت و مزدوری کر کے رقم اپنے آقا کو دے) یہ گیت گاتی ہے:

ہم نے اپنے دوستوں سے طولِ شب کی شکایت کی
انہوں نے کہا، ہماری شب کتنی چھوٹی تھی
یہ اس لئے کہ اُن کی آنکھوں پر نیند چھا گئی
اور ہماری آنکھوں پہ نہ چھا سکی
اگر وہ ہماری طرح ستائے ہوئے ہوتے
تو وہ بستر پہ ہماری طرح ہوتے

دیکھئے، حکایات اغانی، صفحہ ۴۵۷

کم سن بچوں اور بچیوں کی باقاعدہ تعلیم و تربیت شروع کی اور انہیں انکی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں اور خوبیوں کے مطابق علوم و فنون سکھانے شروع کیے۔ یہ کام بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا کہ ان غلام بچوں اور بچیوں کے تمام اوصاف اور صلاحیتیں پوری طرح سے اجاگر کی جاسکیں۔ لڑکوں کو اکثر خصی کر دیا جاتا تھا تاکہ خواجہ سرائی کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ مگر انہیں تعلیم و تربیت اور فنونِ سپہ گری اور شہسواری سکھائے جاتے تھے، تاکہ بادشاہوں اور سلطانوں کی غلام فوجوں میں بھرتی کیا جاسکے۔ لڑکیوں کو خوبصورتی اور نزاکت بڑھانے اور چمکانے کے لئے بناؤ سنگھار کے ہر طور و طریقے سکھائے جاتے اور ان کی ذہانت بڑھانے کے لئے علوم و فنون سکھائے جاتے، اور گانا بجانا سکھایا جاتا اور ادب و شاعری اور حکمت و فلسفہ کے رموز سمجھائے جاتے۔ بعد ازاں یہ غلام لڑکیاں اور عورتیں ایک مالک سے دوسرے مالک کے ہاتھوں فروخت ہوتے ہوئے اور بسا اوقات ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچتے پہنچتے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے خوب واقف ہو جاتی تھیں جب ان عورتوں کا مقابلہ اُن کے مالکوں اور آقاؤں کی آزاد اور منکوحہ بیویوں اور عورتوں سے ہوتا تو وہ اپنے جنسی اور غیر جنسی داؤ پیچ سے اپنے آزاد حریفوں کو پچھاڑ دیتی تھیں خاص طور پر اس لئے کہ انہیں اپنے مالکوں کی شہوت رانی اور بوالہوسی کی شہ بھی حاصل ہوتی تھی۔ اس طرح بالآخر فتح ان غلاموں اور کنیزوں کی ہوتی۔ قرون وسطیٰ کے مسلم معاشرے میں خلافت عباسیہ سے لیکر سلطنت عثمانیہ اور مغلیہ اور سب مسلمان مملکتوں میں اس خاندانی ڈرامہ کا انجام صرف یہی ہوتا کہ "باندی تھی سو بیوی ہوئی اور بیوی تھی سو باندی ہوئی"۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ تھی کہ.... جب کبھی کسی شخص یا گروہ کو میدان جنگ میں شکست ہوتی یا کوئی ہزیمت اٹھانی پڑتی تو اس کا سارا "حرم" خواہ اس میں آزاد عورتیں ہوں یا غلام، اس کے دشمنوں کے تصرف میں چلا جاتا تھا۔ اس طرح مسلم معاشرے میں عورت کی حد تک شریف اور رذیل کا فرق بھی مٹ گیا۔ شادی کا رواج کم از کم مقتدر طبقوں میں برائے نام رہ گیا۔ عورت کی تذلیل اور پستی اس انتہا کو پہنچ گئی کہ آزاد عورت کی حیثیت

غلاموں کی طرح ہوگئی اور غلام عورت کی قدر و منزلت آزاد عورت جیسی ہوگئی جس کی مثالوں سے قرون وسطیٰ کی تاریخ بھری پڑی ہے، الجاہیز (متوفی ۸۶۹ء) نے ٹھیک کہا کہ۔

"عام طور پر آزاد عورتوں کی نسبت کنیزیں مردوں پر زیادہ حاوی ہو جاتی ہیں۔"[2]

مسلمان عورت کی تحقیر و تذلیل حرم سسٹم کے نفوذ اور غیر محدود کثرت ازدواج اور کنیز داشتگی کی وجہ سے مسلمان عورت کی تذلیل اور رسوائی انتہا کو پہنچ گئی۔ بلکہ اب اس کی انسانی ہستی اور شخصیت سے بھی انکار ہونے لگا۔ اس کو زر خرید شے یا اپنے فرا ابتداری گروہوں کی ملکیت اور مملوکہ تصور کیا جانے لگا ظاہر ہے کہ ایسی عورت کے لئے باہر کی دنیا کے کام کاج، سرگرمیوں اور تکمیلات میں حصہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جس کے دروازہ اس پر مردوں کے شک و شبہ اور بیجا جنسی احتیاط کے باعث بند ہو گئے۔ اس کے علاوہ، سیاسی اور معاشرتی انتشار اور خطرات کے باعث جو قرون وسطیٰ کے فرا ابتداری معاشرے کی عام حالت تھی، عورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلنا دشوار بلکہ ناممکن ہو گیا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں قرون وسطیٰ کے علماء اور مقتدر طبقوں نے قرآنی احکام کی انفرادیاتی اور فرا ابتدارانہ تاویل شروع کر دی تاکہ اُن کے مائیکرو سوشل مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ قرآن مسلمان عورتوں کو غض بصر کا حکم دیتا ہے کہ

"اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہو جائے اور وہ اپنے سینوں پر اوڑھنیوں کی بکل مار لیا کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر سوائے اپنے باپ خاوند وغیرہ" (الاحزاب ۳۲-۳۳)

اس آیت میں کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ عورت کو گھر سے باہر کی دنیا سے خارج کر دیا جائے یا عورتوں کو پبلک سرگرمیوں اور کاموں سے بیدخل کر دیا جائے۔ بلکہ اس

---

[2] *The Life and Work of Jahiz*. p. 258. London. 1969.

میں تو معاشری اخلاقیات کے اصول بیان کئے گئے ہیں تاکہ عورتیں احسن طور سے ان کاموں اور سرگرمیوں میں شرکت کر سکیں۔ مگر قرون وسطیٰ کے علماء نے اس آیت کو پردہ کی تمام پابندیوں کا جواز قرار دیا تاکہ عورت کو کلی طور سے حرم کی چار دیواری میں مقید کر دیا جائے۔ بلکہ اپنی رجعت پسندی میں بعض عالموں نے تو عورت کی ہستی ہی کو قابل نفرین اور باعث شرم و ننگ قرار دے دیا۔ مثال کے طور پر مشہور مفسر قاضی بیضاوی (چودھویں صدی عیسوی) غضِ بصر کی آیت کی تفسیر یوں کرتے ہیں:۔

"عورتوں کو حکم کہ اپنی زینت "زیور" سوائے اُن کے جو ظاہر ہیں" سے مراد "چہرہ دونوں ہاتھ ہیں جو شرمگاہ نہیں ہیں" لیکن زیادہ امکان یہ ہے کہ ان کو ظاہر کرنے کی اجازت صرف عبادت کی غرض سے دی گئی ہے، نہ کہ لوگوں کو دکھانے کے لئے۔ بلاشبہ "آزاد عورت" (یہ غلامی کا دور تھا اس لئے آزاد عورت سے مراد وہ عورت تھی جو غلام نہ ہو) کا سارا جسم شرمگاہ تصور کیا جائے اور کوئی حصہ سوائے خاوند اور قریبی رشتہ داروں کے کسی اور کو نہ دکھایا جائے سوائے بیماری میں علاج کے لئے اور عدالت میں گواہی کے لئے۔" [۱]

---

[۱] قرآن مجید کی ان آیات کی تاویل میں اختلاف علماء میں آج تک پایا جاتا ہے۔ مثلاً مولانا مودودی کبھی یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ "پردہ کے احکام" میں کہاں تک عورت کے جسم کو برقعہ سے ڈھانپنا چاہیئے۔ وہ لکھتے ہیں: "تم جن کپڑوں میں زینت کو چھپاؤ گی وہ تو بہر حال ظاہر ہی ہوں گے۔ تمہارا قد و قامت، تناسب جسمانی، ڈیل ڈول تو ان میں محسوس ہوگا کسی ضرورت یا کام کاج کے لئے کبھی ہاتھ یا چہرے کا کوئی حصہ تو کھولنا ہی پڑے گا۔ کوئی حرج نہیں اگر ایسا ہو۔" (پردہ ص ۳۱۴) لیکن چند صفحوں کے بعد وہ پھر لکھتے ہیں: "اس آیت کے نزول کے بعد سے عہدِ نبوی میں عام طور پر مسلمان عورتیں اپنے چہروں پر نقاب ڈالنے لگی تھیں اور کھلے چہروں کے ساتھ پھرنے کا رواج بند ہو گیا تھا۔" (فی ہذا صفحہ ۳۲۱) اگر مولانا صاحب کی تشریح کے مطابق اس قرآنی آیت نے چہروں کو ڈھانپنے کا حکم دے دیا تھا اور عہدِ نبوی میں مسلمان عورتوں نے کھلے چہرے، پھرنا بند کر دیا تھا تو پھر مولانا صاحب اب کیسے فرماتے ہیں کہ چہرے کو کھولنے میں "کوئی حرج نہیں

قرونِ وسطائی مسلمانوں میں عورت کا تصوّر

ان حالات اور تبدیلیوں کے باعث جو خلافت عباسیہ کے دورِ انحطاط میں عورت کے معاشرتی مقام اور رول میں رونما ہوئیں، قرونِ وسطائی اسلام میں عورت کا تصوّر اسلامِ اولیٰ کی نسبت یکسر بدل گیا۔ اوّل تو عورت کا پیدا ہونا نہ صرف باعثِ ندامت خیال کیا جانے لگا بلکہ یہ تصوّر بھی پیدا ہو گیا کہ عورت کے تمام جنسی عوامل مثلاً حمل، زچگی وغیرہ اور وہ تمام معاشرتی سلوک اور ظلم جو اس سے روا رکھے جاتے تھے اللہ نے اُسے سزا کے طور پر دیئے ہیں۔ امام غزالی لکھتے ہیں:

"جہاں تک اُن خصوصیات کا تعلق ہے جو اللہ تعالےٰ نے عورت کو سزا کے لئے دیئے ہیں ان کا جواز یہ ہے:

جب حوّا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور شجرِ ممنوعہ کا پھل کھایا تو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اٹھارہ چیزوں سے سزا دی۔ وہ ہیں۔

ا۔حیض، ۲۔ زچگی، ۳۔ اجنبی سے شادی کے بعد ماں باپ سے علیحدگی، ۴۔ حمل (اس اجنبی سے)، ۵۔ اپنے جسم پر اختیار نہ رکھنا، ۶۔ وراثت میں کم حصّہ لینا، ۷۔ اُسے طلاق دیا جا سکتا ہے مگر وہ خود طلاق نہیں لے سکتی، ۸۔ مردوں کے لئے چار بیویاں رکھنے کی شرعاً اجازت ہے جبکہ عورت کے لئے صرف ایک خاوند رکھنے

اگر ایسا ہو"؟ کیا یہ قرآنی حکم کی روگردانی نہیں؟

عورت کی کل جسم کو شرمگاہ قرار دینے کا تصوّر پردہ آئیڈیالوجی کا نقطۂ انتہا ہے، جو قرونِ وسطیٰ اور موجودہ زمانوں کے مسلمانوں میں عام ہو گیا اسکے باعث عورت کا پبلک میں نام لینا بھی باعثِ شرم و ننگ تصوّر کیا جاتا ہے اس رویے کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ ایک مثال تو ہم نے گذشتہ باب میں دی ہے جس کے تحت عورتوں کو کنایتاً "حرم" "محل" "گور" "ڈولی" "سواری" وغیرہ کے ناموں سے پکارا جاتا تھا اور پکارا جاتا ہے۔ ایک اور مثال اردو زبان کا لفظ "عورت" ہے جس کے لغوی معنے "ڈھکی ہوئی ستر یا شرمگاہ" ہیں جس کا "پردہ" واجب ہے۔ اس رویے کی بنیاد فرابنداری نظام ہے جس میں مرد عورت کی ہستی ہی کو موجبِ شرم و ننگ تصوّر کرتے ہیں اور اس کی انسانی شخصیت اور حیثیت کو بھی تسلیم نہیں کرتے جنسی شرم کا ایسا رویہ قدیم عیسائی پادریوں کے ہاں بھی پایا جاتا تھا مثلاً کلمنٹ جو سکندریہ میں دوسری صدی عیسوی میں گزرا ہے، عورت کو مخاطب کر کے کہتا ہے "یہ سوچ کر کہ تمہاری نیچر کیا ہے شرم آتی ہے"۔ اس کا ہمعصر رومی پادری ٹرٹولین کہتا ہے "عورت کی فطرت ہی شرمناک ہے"۔

کی اجازت ہے۔ ۹۔ عورت کو گھر میں پردے میں رہنا پڑتا ہے، ۱۰۔ عورت کو گھر میں اپنا سر ڈھکنا پڑتا ہے، ۱۱۔ یہ امر کہ دو عورتوں کے مقابلہ میں ایک مرد کی شہادت کافی ہے، ۱۲۔ اس سے کہ جب وہ گھر سے باہر نہیں جاسکتی تاوقتیکہ کوئی قریبی رشتہ دار اس کے ساتھ نہ ہو، ۱۳۔ اس امر سے کہ مرد جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں شرکت کرتے ہیں جب کہ عورت نہیں کرسکتی، ۱۴۔ عورت کو حکمرانی اور قاضی کے عہدوں کے لئے نااہل قرار دے دیا گیا ہے، ۱۵۔ اس امر سے کہ ایک ہزار اوصاف میں عورت کے حصے میں صرف ایک وصف آیا جبکہ مرد کے حصے میں نوسو ننانوے اوصاف آئے ہیں۔ ۱۶۔ اس امر سے کہ روز محشر عورت کو بدکاری کی سزا بدکار مردوں کے مقابلے میں آدھی ہوگی، ۱۷۔ اس امر سے کہ خاوند کے مرنے پر عورتوں کو چار ماہ اور دس دن کی عدت کرنی پڑتی ہے، ۱۸۔ اس امر سے کہ اگر اُن کے خاوند طلاق دے دیں تو اُن کو دوبارہ شادی کے لئے تین ماہ کی عدت لازمی ہے۔"[1]

اس طرح علمائے دین نے قرون وسطائی مسلم معاشرے میں مسلمان عورت کے گرتے ہوئے مقام اور حیثیت کو اسلامی عقائد اور طرز معاشرت کا جزو بنا دیا، بلکہ پرانے عیسائی پادریوں اور راہنماؤں کی طرح، عورت کے صنف ہی کو قابل شرم و ندامت قرار دے دیا۔ اور پھر اپنی تاویلات اور تصورات کو اپنے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے ذریعے عام مسلمانوں کے دل و دماغ میں بٹھا دیا۔ لہٰذا عورت کے بارے میں یہ تصورات اور نظریات اس زمانے سے آج تک مسلم معاشرے اور آئیڈیالوجی کے لازمی جزو بن گئے۔ ان عقائد میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

۱۔ عورت مرد کی نسبت کمتر اور گھٹیا ہستی ہے۔

ص[1] *Ghazali's Book of Counsel for Kings (Nasihat al-Muluk)* p. 164. Trans. by F.R.C. Bagley, Oxford U. P. London. 1964,

۲۔ عورت ناقص العقل ہے۔ اس عقیدے کو قرآن کی رُو سے تو کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا لہٰذا علماء نے احادیث کا سہارا لیا۔ یہ کام آسان تھا۔ چونکہ حدیثوں کو جمع کرنے کا کام خلافتِ راشدہ کے دور کے بعد شروع ہوا جب مسلمانوں میں مختلف گروہ بندیاں شروع ہو گئی تھیں، اس لئے اکثر موقع اور ضرورت کے مطابق نئی نئی حدیثیں مروی کر لی جاتی تھیں چنانچہ عورتوں کو "ناقصات العقل والدین" کی حدیث مروج ہوئی جس کے مطابق عورت کی عقل اور دین میں کمی اور کمتری اسلامی عقائد کا جزو بن گئی اور اس کی معاشری کمتری کا جواز بھی مل گیا۔

۳۔ عورت کی رائے اور مشورے کو قابلِ نفریں قرار دیا گیا۔ اس کے لئے بھی احادیث کا سہارا لیا گیا۔ مثلاً یہ حدیث بیان کی گئی کہ جب عورت سے مشورہ لو، تو اس کی رائے کے خلاف عمل کرو۔ علمائے دین کا تو کیا ذکر، عام عالموں نے بھی عورت کی رائے اور مشورے کی مخالفت کو اصابتِ رائے اور معقولیت قرار دیا۔ نظام الملک طوسی، سلجوق سلطنت کا وزیرِ اعظم، علوم و فنون کا دلدادہ اور قرونِ وسطائے اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی، جامعہ نظامیہ کا بانی، اپنی مشہور تصنیف "سیاست نامہ" میں "مشاورھن و مخالفوھن" کی حدیث کی ایسی ہی تاویل کرتا ہے[۱] چودھویں صدی کا مشہور مورخ، محمد علی ابن تقطقی اپنی کتاب "الفخری" میں اس حدیث کی تاویل کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> "اصابتِ رائے ہمیشہ عورتوں کی رائے کے مخالف سمت میں ہوتی ہے۔ اس لئے جب تذبذب پیدا ہو جائے تو اُن سے مشورہ کرو پھر ان کا جس طرف میلان ہو بس سمجھ لو کہ صحیح رائے اس کے خلاف ہے۔"[۲]

۴۔ عورت کو علم و ہنر اور تعلیم و تربیت کے نااہل قرار دیا گیا۔ متذکرہ بالا نظریات کا لازمی نتیجہ تھا کہ قرونِ وسطائے اسلام میں عورت کو ہر قسم کی تکمیلی زندگی کے لئے نااہل تصوّر کیا گیا

۱؎ ۔ نظام الملک طوسی، سیاست نامہ، ص ۱۹۵، مترجمہ محمد منور، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور۔ ۱۹۶۱ء۔

۲؎ ابن تقطقی، "الفخری" صفحہ ۴۷۔ ۴۸ مترجمہ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۶۲ء۔

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ "قابوس نامہ" کا مصنف لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا مخالف تھا نظام الملک طوسیؒ بانی جامعہ نظامیہ بھی عورتوں کی تعلیم و تربیت کے حق میں نہ تھا۔

۵۔ عورت کو تمام مصائب اور بدنصیبوں کی جڑ تصوّر کیا گیا۔ قرون وسطائے اسلام میں عورت کو اخلاقی کمزوریوں اور نقائص کا مجموعہ خیال کیا جانے لگا۔ یہ خیال عام ہوگیا کہ مردوں پر جو مصیبتیں، مشکلات اور آفتیں پڑتی ہیں وہ عورتوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ امام غزالی رمتوفی ۱۱۱۱ء لکھتے ہیں:

"یہ حقیقت ہے کہ تمام مشکلات، آزمائشیں اور بدنصیبیاں جو مردوں پر نازل ہوتی ہیں عورتوں کی وجہ سے ہوتی ہیں اور چند آدمی ہی ان سے اپنا مدعا حاصل کرسکتے ہیں۔ ایک شاعر نے ٹھیک کہا ہے کہ" دونوں جہاں میں تباہی اور بے ایمانی مردوں کو عورتوں کی وجہ سے ملی ہے۔" [۱]

امام غزالی عورتوں کو فطرتاً بدطینت اور فاسق قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

" ایک معلم لڑکیوں کو پڑھا رہا تھا۔ ایک دانا وہاں سے گزرا۔ اس نے کہا "یہ معلم بدوں کو بدی سکھا رہا ہے"۔ [۲]

وہ مزید لکھتے ہیں:۔

"مردوں کے نقائص عورتوں کی خوبیاں ہوتی ہیں۔ بزدلی اور شوم پن مردوں کو زیب نہیں، مگر عورتوں کے لئے وصف ہیں"۔ [۳]

قرون وسطائے مسلمانوں کا خاندانی نظام

خلافت عباسیہ کے دور عروج میں یعنی ۷۵۰ء سے ۹۵۰ء کے دوران اسلامی معاشرے میں قبائلی اور قرابتداری رشتوں، تعلقات، مفادات اور قرابتی گروہوں کے غلبے اور

۱۔ نصیحت الملوک ۔ ص ۱۷۲-۱۷۳

۲۔ ایضاً ص ۱۶۳

۳۔ ایضاً ص ۱۶۳

اثر و نفوذ نے خاندانی زندگی کا ایسا نظام قائم کر دیا، اور مردوں کو ایسی بالادستی، آزادی اور غلبہ حاصل ہو گیا جس نے قرون وسطائی مسلمانوں کے سارے معاشرے، تہذیب و تمدن اور طرز حکومت کو تہ و بالا کر دیا۔ وراثت اور ملکیت کے قوانین اور طریقوں کو خلاف تکمیلی بنا دیا۔ اس خاندانی نظام کی تشکیل تین غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی بنیادوں پر استوار کی گئی تھی۔

اول۔ تعدد ازدواج اور کنیز داشتگی، جنہوں نے خاندان کی ساری زندگی اور نظام کو مرد کی جنسی بے راہ روی، شہوت رانی اور لہو و لعب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

دوم۔ پردہ اور حرم کی قید، جس نے عورت کو نہایت مجبور اور حقیر ہستی بنا دیا

سوم۔ خاوند کی طلاق کی آزادی اور بے اصولی پن، جس نے مرد کو شتر بے مہار بنا دیا کہ وہ جب چاہے اور جسے چاہے اور جتنی بیویوں کو چاہے بلاوجہ اور بے روک ٹوک طلاق دے دے۔ یہ سب اصول شریعت کے حصہ بن گئے، اگرچہ وہ سب اسلام اولیٰ کی تعلیمات کے قطعی منافی تھے۔

اس خاندانی نظام سے بہت جلد نہایت مہلک عواقب و نتائج برآمد ہوئے۔ ہر خاندان میں بیویوں اور باندیوں کی اپنی چپقلش اور رسہ کشی کے علاوہ اُن کی اولادوں کے تنازعے اور جھگڑے شروع ہو گئے، جس کے باعث خاندانی زندگی اور ماحول میں ہر وقت تنازعے اور تناؤ اور درشتگی کا سماں چھایا رہتا تھا۔ عورتوں کی زندگی میں اس قدر بے اعتمادی بے چینی اور اضطراب اور مردوں کے ظلم و زیادتی کا اس قدر خوف اور خدشے لگے رہتے تھے کہ وہ صرف حیلہ سازی، جھوٹ اور مکر و فریب ہی سے اپنی حیثیت اور وجود کو قائم رکھ سکتی تھیں۔ لہٰذا قرون وسطائی مسلمانوں میں یہ عام خیال پیدا ہو گیا کہ عورت فطرتاً حیلہ ساز اور فریبی ہوتی ہے، جیسا کہ ان وقتوں کے ادب اور قصے کہانیوں، مثلاً الف لیلے کے قصوں سے ظاہر ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ "الاغانی" کی حکایات میں مسلمان عورت کا کردار و خصائل مختلف طور سے بیان کی گئی ہیں۔ وہ خلافت راشدہ اور خلافت امیہ کے دور کی عورت تھی۔ جب مسلمان عورت کو ہر علم و فن، کام اور ہنر میں تکمیلات اور کمالات حاصل کرنے کی آزادی تھی۔ ایسی تکمیلی عورتوں کو مکر و فریب کی

ضرورت نہ تھی۔ وہ مختلف علوم و فنون میں اور خاص طور پر فنون لطیفہ میں کمالات حاصل کرتی تھیں، مگر خلافت عباسیہ کے دور میں ایسا مسلم معاشرہ وجود میں آگیا جس میں مردوں کی بے لگام جنسی آزادی اور آوارگی نے مسلمان عورت کو مجبور اور لاچار ہستی بنا دیا جو صرف مکر و فریب، عیاری، چالاکی اور حیلہ سازی ہی سے غالب اور برتر مرد کی ہوس رانیوں اور زیادتیوں میں خود کو زندہ اور خوشحال رکھ سکتی تھی، خواہ وہ اس کی منکوحہ بیوی ہو یا زر خرید لونڈی۔ ظاہر ہے کہ وہ بچے اور اولاد جو ایسے نظام زندگی اور ماحول میں پیدا ہوتے اور پلتے تھے۔ اپنی آزاد یا غلام ماؤں جیسے کردار اور عادات کے حامل ہو جاتے تھے [۱]

قرآنی تقسیم وراثت کا مقصد خاندان کے ہر رکن، خواہ مرد ہو یا عورت، کو تکمیلی بنانا ہے تاکہ وہ قرابتداری بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی حق ملکیت سے تکمیلات حاصل کرے۔ مگر قرون وسطیٰ میں مسلمان معاشرے میں قبائلیت کے دوبارہ عود آنے سے اور تعدد ازدواج اور کنیز داشتگی کے عام ہونے سے قرآنی تقسیم وراثت کے عادلانہ تکمیلی مقاصد بالکل مفقود ہو گئے۔ اگر قرون وسطیٰ کے مسلمانوں میں یک زوجگی کا قانون نافذ ہو جاتا تو قرآنی تقسیم وراثت کا عادلانہ مقصد پوری طرح سے حاصل ہوتا، کیونکہ ہر وارث اپنی جائیداد اور زمین کو پوری طرح ترقی دیکر اپنی تخلیقی اور پیداواری قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا، مگر تعدد ازدواج اور کنیز داشتگی کے باعث ہر خاندان میں سگے اور سوتیلے بھائیوں اور بہنوں اور دوسرے لواحقین کی اتنی زیادہ تعداد ہو جاتی تھی کہ جائیداد کی تقسیم پر خاندانی جھگڑے اور تنازعے برپا ہو جاتے تھے، جن میں اُن کی تمام ذہنی اور تکمیلی قوتیں ضائع ہو

---

[۱] قرون وسطائے اسلام کی حرم کی زندگی میں جہاں اور مخرب الاخلاق و کردار اعمال و افعال پائے جاتے تھے وہاں اغلام بازی کا رواج بھی عام ہو گیا تھا وجہ یہ تھی کہ جب مردوں کی اپنی لاتعداد بیویوں اور کنیزوں کے تمتع سے طبیعت اکتا جاتی تھی تو وہ غلمان اور نوجوان لونڈوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس ضمن میں امیر عنصر المعالی کیکاؤس (متوفی ۴۹۰ھ) اپنی پند و نصائح کی کتاب میں اپنے بیٹے کو ایک نرالی نصیحت کرتا ہے۔ "در تابستان میل بغلامان کن و در زمستان میل بزنان" دیکھئے "قابوس نامہ" ص ۱۴م۔ مزید دیکھئے ایس خدا بخش "عربوں میں شادی اور خاندانی زندگی" صفحات ۵۰ تا ۵۳ (انگریزی میں) اورینٹالیہ۔ لاہور۔ ۱۹۵۳۔

جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں جائیداد اور زمینوں کے اتنے چھوٹے چھوٹے حصے بخرے ہو جاتے تھے کہ ایک دو نسلوں میں وہ تباہ و برباد ہو جاتی تھیں، جیسا کہ ہم اب تفصیل سے بیان کریں گے۔

اسلام اور اس کے تکمیلی ادوار کے خاتمے کے اسباب و عوامل پردہ اور حرم سسٹم کے نتائج

ظہورِ اسلام سے گیارہویں صدی تک

اگر قرونِ وسطائی علمائے دین و فقہ تعدد ازواج، کنیز داشتگی، پردہ اور حرم کے تباہ کن اثرات اور نتائج کو ملحوظِ خاطر رکھتے، تو وہ یقیناً ان کی قانوناً و شرعاً منسوخی پر زور دیتے، تاکہ حقِ ملکیت کی غیر تکمیلی اور تکمیل کش تقسیم نہ کی جائے۔ مگر اُن کے یہ وہم و خیال میں بھی نہیں آیا کہ ان معاشرتی معاملات اور تصورات کے مسائل میں بنیادی تغیرات آ چکے تھے، جو نئے خیالات اور نظریات کا مقتضی تھے[1]۔ قبائلی معاشرے میں زمین، چراگاہ اور جانور وغیرہ کی ملکیت قرابتداری گروہ یا قبیلے کی مشترکہ ہوتی تھی اور اُن کی حفاظت اور نگہداشت کرنا اور اس کی حفاظت کے لئے دشمنوں سے لڑنا بھی اس گروہ کے تمام افراد کی مشترکہ ذمہ داری ہوتی تھی۔ اس لئے اس گروہ کا ہر ایک خاندان زیادہ سے زیادہ اولاد

---

[1] دراصل قرونِ وسطائی علمائے دین و فقہ کو اصلاحِ معاشرے کا فکر و شعور ہی نہ تھا۔ یہ دہ آئیڈیالوجی ایسے ہی ذہن و فکر زندگی اور عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے قرآن کی ایسی تفسیریں اور تاویلیں کیں اور ایسی احادیث مروی کیں جو تعدد ازواج، کنیز داشتگی پردہ اور حرم کو جائز ثابت کرتی تھیں۔ علاوہ ازیں، حکمرانوں، امرا اور اہلِ اقطاع (جاگیرداروں اور زمینداروں) کے بعد علماء ہی تعدد ازواج اور کنیز داشتگی کے سب سے بڑے رسیا اور پردہ اور حرم کے مداح اور داعی تھے شیعہ علماء تو متعہ کو جائز سمجھتے تھے۔ مگر سنی علماء بھی جھٹ شادی اور پٹ طلاق سے تقریباً وہی مقصد حاصل کر لیتے تھے۔ اس لئے وہ سب حضر و سفر میں بیویوں اور کنیزوں سے بھرے ہوئے حرم رکھتے تھے۔ لہٰذا آئیڈیالوجی اور عمل اور فکر و کردار کی ایسی ہم آہنگی میں علمائے دین و فقہ سے مسلم معاشرے کی زوال پذیری اور زبوں حالی کے بارے میں غور و فکر کرنے کی توقع کرنا بھی عبث تھا

نرینہ کا خواہشمند ہوتا تھا تاکہ اسے جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ جنگجو افراد، گلہ بان اور کاشت کار فراہم ہو جائیں، جن پر قبیلے یا گروہ کی خوشحالی، سلامتی اور بقا کا انحصار ہوتا تھا۔ یہ معاشری ضرورت صرف کثرت ازدواج ہی سے پوری ہو سکتی تھی۔ اس لئے ہر مرد کئی کئی بیویاں رکھتا تھا۔ جو وہ اپنے قبیلے کی عورتوں سے شادی کر کے یا مخالف اور دشمن قبائل سے جنگ وجدال کے ذریعے حاصل کرتا تھا۔ ظہور اسلام کے وقت عرب معاشرے کی بھی یہی حالت تھی۔ ظہور اسلام کے بعد رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے عہد میں بھی عرب معاشرے کو اس کی کچھ ضرورت رہی۔ لہٰذا قرآن نے چار بیویوں تک کی پابندی عائد کر دی جس کی غرض وغایت بالآخر یک زوجگی کو مروج کرنا تھا۔ اس کے بعد اسلام کی فتوحات کا زمانہ آیا۔ اس دور میں بھی محدود کثرت ازدواج کی ضرورت رہی۔ مگر جب عرب فاتحین خلافت اسلامیہ کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں آباد ہو گئے، تو ان کی زندگی اور معاشرے میں ایسی بنیادی تبدیلی آئی، جو نئی خاندانی تنظیم کی متقاضی تھی۔ لیکن یہاں علمائے دین وفقہ نے لغزش کھائی۔ کیونکہ اب مسلمانوں کو محض فوجی تکمیلات کو ہی جاری نہیں رکھنا تھا بلکہ ان اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، علمی، فنی، سائنسی اور تمدنی تکمیلات کو بھی حاصل کرنا تھا جو قرون اولیٰ کی فتوحات اور آبادیات کے بعد ضروری ہو گئی تھیں۔ لہٰذا اب معاشراً ضرورت یہ تھی کہ تعدد ازواج اور کنیز داشتگی کو اصولاً غیر اسلامی اور قانوناً وشرعاً ممنوع اور ملعون قرار دے دیا جائے۔ مگر ہوا سب کچھ اس کے برعکس۔ اس سے جو نتائج قرون وسطائی معاشرے پر مرتب ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کی سب تکمیلات کی بیخ کنی کر دی، یہ نتائج تاریخ اسلام کی چوتھی صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں رونما ہونے لگے۔ ہم ان عوامل وعواقب کو جو تاریخی علت ومعلول کی صورت میں ان نتائج کا باعث ہوئے، ذیل میں اختصاراً شمار کرتے ہیں :۔

۱۔ قرون وسطائی اسلام میں تکمیلی اہلیت کا غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی اہلیت بن جانا۔

۲۔ قبل تہذیبی معاشرے (یعنی قبائلی اور ذات پات کی تقسیم) کا دوبارہ قائم ہونا۔

۳۔ زمینوں اور اقطاع (جاگیروں) کی غیر اقتصادی تقسیم اور حصے بخرے ہونا جو بالآخر "موات" بن گئے

۴- مسلم معاشرے میں اقتصادی ترقی اور ارتقاء کا نیم جاگیر داریت اور نیم قبائلیت کی حالت میں منجمد یا جمود زدہ ہو جانا۔

۵- تجارت اور صنعت و حرفت میں شرعی قوانین وراثت اور پردہ سسٹم کی غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی خاندانی ماحول کے باعث سرمایہ کاری اور ایجادات و اختراعات (کے سلسلے کا رک جانا۔

۶- اندرونی ایلیت کا خاتمہ اور بیرونی قبائلی ایلیت کے سیسیفین (Sisyphean) چکروں کا شروع ہونا۔

۷- تجارت و صنعت کا مسلمانوں کے لئے معیوب اور غیر شریفانہ کام تصوّر کیا جانا اور ان کا غیر مسلموں (یہودی، عیسائی، ہندو وغیرہ) کے ہاتھوں میں منتقل ہو جانا۔

۸- غیر مسلموں کی تجارتی سرمایہ کاری اور اجارہ داری کا شروع ہونا، جس نے مسلم معاشرے کی نیم جاگیر داریت کے جمود کو برقرار رکھا، کیونکہ دارالسلام میں غیر مسلم لوگ اپنے مائیکرو سوشل مفادات اور تعلقات کے تحفظ، سلامتی اور بقا کے لئے اپنی معیشت و معاشرت کو الگ تھلگ رکھتے تھے۔ جسے مسلم ریاست بھی کوئی ماکرو سوشل نظام میں مربوط نہ کر سکی۔

ہم اب ان معاشری اور تاریخی عوامل و عواقب کا قدرے تفصیلی تجزیہ کریں گے، کیونکہ قرون وسطائی اسلام کا معاشرہ اور تاریخ محض ان عوامل و عواقب کا معاشرہ اور تاریخ ہے۔

انسانی معاشرے اور تاریخ میں تکمیلی گروہوں کی گردشیں

ہر ایک انسانی معاشرے میں ہر وقت تکمیلی افراد گروہوں اور طبقوں کی گردش کا عمل جاری رہتا ہے۔ جو لوگ نئی تکمیلات حاصل کرتے ہیں، ان کے خاندانوں اور گروہوں میں ایک دو نسل تک ان کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ لوگ نئی تکمیلی ایلیت بن جاتے ہیں۔ اس اثنا میں ان کی مثال، اثر و رسوخ اور دوسری تکمیلی ترغیبات اور محرکات سے معاشرے میں کوئی اور افراد اور گروہ اور نئی تکمیلات حاصل کرتے ہیں۔

جن کے باعث نئے اور پرانے تکمیلی افراد، گروہوں اور طبقوں میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے یہ تضاد نئی اور پرانی ایلیت کے تعاون اور اشتراک عمل سے یا تصادم اور جدوجہد سے ختم ہو جاتا ہے۔ تضاد کا حل کسی صورت میں ہو، اگر نئی تکمیلات کا سلسلہ جاری رہتا ہے تو معاشرے میں نسل در نسل نئے نئے تکمیلی افراد گروہ اور طبقے اوپر آتے رہتے ہیں اور غیر تکمیلی افراد اور گروہ اپنا اثر ورسوخ، برتری، اقتدار اور امتیازات کو کھو کر نئے تکمیلی گروہوں اور طبقوں میں مدغم یا معدوم ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل ہر ایک ترقی پذیر معاشرے کی اندرونی تکمیلی گروہوں کی گردش ہے، جس سے اس کی ترقی اور تاریخ بنتی اور بڑھتی ہے۔ (صرف کلی قطعی تکمیلی اور مساواتی معاشرے میں اندرونی تکمیلی افراد اور گروہوں کی گردش کا عمل قطعی مختلف نوعیت کا ہوگا۔ اس میں نئی اور پرانی تکمیلات کی نوعیت اس طرح کی ہو گی کہ ان میں تضاد ہمیشہ اشتراک عمل، تعاون اور باہمی عمل سے رفع کیا جائے گا۔ اسلئے سارے معاشرے میں کوئی غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی نتائج اور عوامل وعواقب کلی اور قطعی طور پر پیدا نہیں ہوں گے۔ لہٰذا اس میں کوئی غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی افراد، گروہ اور طبقے رونما ہی نہیں ہوں گے، ہر شخص، مرد ہو یا عورت، نئی تکمیلات اور تخلیقات حاصل کرے گا، کیونکہ وہ اولاً پیداواری تکمیل گر ہو گا، اس لئے تخلیقی تکمیل گر بھی بن سکے گا۔ مگر ایسا کلی اور قطعی تکمیلی مساواتی معاشرہ تاریخ انسانی میں ابھی کہیں بھی وجود میں نہیں آیا۔ یہ تاریخ اسلام کی ایک ٹریجڈی ہے کہ جیسا کہ ہم نے گذشتہ باب میں کہا، اسلام اول کا عظیم نصب العین ایسے ہی کلی اور قطعی تکمیلی مساواتی معاشرے کا قیام تھا، مگر پردہ اور حرم سسٹم نے قبائلی اور قرابتدارانہ عوامل کو بروئے کار لاکر تاریخ اسلام کا رخ قرون وسطائی اسلام کے غیر تکمیلی معاشرے کی طرف موڑ دیا، ورنہ تاریخ انسانی میں اسلامی معاشرہ پہلا کلی اور قطعی تکمیلی مساواتی معاشرہ ہوتا، جسے جدید اصطلاح میں سوشلسٹ معاشرہ کہتے ہیں۔ یہ خیال رہے کہ ایسا کلی اور قطعی تکمیلی مساواتی معاشرہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی کلیتاً قطعی اور مساویانہ طور سے تکمیل گر بنائے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ اس مسئلے پر ہم اگلے ابواب میں غور کریں گے۔)

بہر حال اندرونی تکمیلی ایلیت کی گردش ترقی پسند معاشرے کی ترقی، خوشحالی سلامتی، بقا اور ارتقا کے لئے ناگزیر عمل ہے۔ لیکن اس گردش کو روکا بھی جا سکتا ہے۔ جب کسی معاشرے میں اندرونی بارسوخ اور برسر اقتدار ایلیت غیر تکمیلی بن جائے، مگر وہ اپنے قرابتداری گروہوں اور تعلقات کے ذریعے نئے تکمیلی افراد اور گروہوں کو کچل دے، تو اس میں اندرونی تکمیلی ایلیت کی گردش رک جائے گی۔ تب سارے معاشرے پر جمود اور انحطاط کی فضا طاری ہو جائے گی اور وہ قرابتداری گروہوں اور گروہ بندیوں کے تعلقات میں جکڑ جائے گا۔ مگر ایسے جمود زدہ معاشرے کے بیرونی دشمن، جو متواتر نئی تکمیلات حاصل کر رہے ہیں، حملہ آور ہو کر اُسے اپنے تسلط اور استحصال میں لے آئیں گے۔ اگر حملہ آور گروہ جمود زدہ معاشرے میں آباد ہو جائیں، تو نئی مگر بیرونی ایلیت کی گردش شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی تکمیلی قوتوں کے ذریعے مفتوحہ معاشرے کے غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی عوامل کا استحصال ہی کریں اور خود اپنے ابتدائی معاشرے کے تکمیلی گروہ اور طبقے بنیں رہیں، تو یہ بیرونی ایلیت سامراجی طاقت بن جاتی ہے۔ اسلام اولیٰ، قرون وسطائی اسلام اور جدید اسلام کے معاشروں اور تاریخ میں انہی اندرونی اور بیرونی عوامل نے بنیادی فرق پیدا کئے ہیں۔

اسلام اولیٰ میں اندرونی تکمیلی افراد اور گروہوں کی گردش

تقریباً گیارھویں صدی تک اسلام اولیٰ کی تکمیلات اور ترقیات کا سلسلہ بڑھتے ہوئے پیمانوں پر جاری رہا۔ ظہور اسلام سے ایک ڈیڑھ صدی تک یہ تکمیلات اور ترقیات صرف عربوں نے ہی حاصل کیں، جنہوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی تھی مگر خلافت امیہ (۶۶۰-۷۵۰ء) کے دور میں غیر عرب قبائل گروہ اور لوگ، یعنی ایرانی، مصری، عیسائی، ترک، بربر وغیرہ بھی اسلام قبول کرنے لگے۔ ان نومسلم اقوام کو موالی کہتے تھے۔ عرب حکمران طبقوں میں قبائلی تفاخر علیحدگی پسندی اور عصبیت دوبارہ پیدا ہو گئی۔ چونکہ موالیوں نے علم و فنون میں تکمیلات حاصل کر لیں، اس لئے خلافت امیہ کے سقوط کے بعد عربوں کی خلافت اور حکمرانی میں اجارہ داری ختم ہو گئی۔ غیر عرب مسلمانوں

کے لئے تکمیل و ترقی کی تمام راہیں کھل گئیں۔ لہٰذا نظم و نسق اور حکومت کے علاوہ علم و ہنر زراعت، صنعت، تجارت و حرفت، سائنس و فلسفہ اور دیگر شعبہ جات میں عرب اور غیر عرب مسلمانوں نے تکمیلات اور کمالات حاصل کرنے شروع کئے۔ جنہوں نے اسلام اولیٰ کو چار چاند لگا دیئے۔ اس طرح سے خلافت عباسیہ اور اموی ہسپانیہ میں تکمیلی افراد کے گروہ کے گروہ وجود میں آ گئے اور بغداد سے قرطبہ تک علوم و فنون اور اقتصادی ترقی اور خوشحالی کا دور دورہ شروع ہوگیا۔ ہر نو مسلم گھرانے اور کنبے میں اسلام اولیٰ کی تکمیلی تعلیمات کے باعث تکمیلی قوتیں اور رجحانات بروئے عمل آتے تھے اور وہ مختلف قسم کے کمالات اور تکمیلات حاصل کرتے تھے۔ مگر ان میں تعدد ازواج، کنیز داشتگی، غلامی، پردہ اور حرم جیسے غیر تکمیلی ادارے اور رسم و رواج اور عقائد بھی مروج ہو جاتے تھے جو اُن کی خاندانی زندگی اور معاشرت میں غیر تکمیلی ماحول اور خلاف تکمیلی تقسیم جائیداد کے حالات پیدا کر دیتے تھے۔ اُن کے باعث ان افراد اور گروہوں کی تکمیلات اور کمالات کا سلسلہ ایک دو نسلوں کے بعد ختم ہو جاتا اور یہ اہلیت گھرانے اور گروہ ملک و معاشرے پر غیر تکمیلی بوجھ بن جاتے یا گمنامی میں چلے جاتے۔ مگر خوش قسمتی سے نئے نو مسلم افراد اور گروہ ان کی جگہ لیکر تکمیلات اور ترقی کا سلسلہ جاری رکھتے۔ اس طرح تکمیلی افراد اور گروہوں کی اندرونی گردش دو تین صدیوں تک جاری رہی یعنی اس وقت تک جاری رہی جب تک غیر عرب اقوام میں اپنے قدیمی اور آبائی مذاہب کو ترک کر اسلام قبول کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر جب خلافت عباسیہ کے تقریباً تمام آبادی نے اسلام قبول کر لیا، تو یہ اندرونی تکمیلی افراد اور گروہوں کی گردش کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اگر قرون وسطیٰ کے علمائے دین، فقہ اور شریعت خلاف تکمیلی عقائد اور قوانین مسلمانوں کی خاندانی اور معاشرتی زندگی اور معاشرت میں رائج نہ کرتے، تو اندرونی اہلیت کی گردش کا سلسلہ کبھی بند نہ ہوتا اور قرون وسطیٰ کے مسلمان ہر شعبۂ حیات میں بلند سے بلند تر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر تکمیلات اور ترقیات کی تمام منازل و مدارج طے کرتے رہتے۔ اور قرون وسطائی اسلام ہمیشہ ترقی اور خوشحالی کی راہوں پر گامزن رہتا۔

مزروعہ کا پھیلنا اور صحراؤں کی پسپائی: اسلام اولیٰ کی عظیم ترین تکمیل

قرونِ اولیٰ کے اسلام کی سب سے بڑی اور شاندار تکمیل ریگستانوں کو نخلستان بنا دینا اور صحرا کو مزروعہ میں بدل دینا تھی، جس کی وجہ سے صحراؤں کی بے آب و گیاہ زمینیں زیرِ کاشت آ گئیں اور وہاں زرخیز دیہات اور بارونق قصبے اور شہر آباد ہو گئے۔ مثال کے طور پر اس دور میں عراق میں ایک لاکھ بیس ہزار نہریں کھودی گئیں، دریاؤں اور ندی نالوں پر بند اور پشتے باندھے گئے جن کی مدد سے عراق کو آباد اور شاداب گاؤنوں، قصبوں اور شہروں کا ملک بنا دیا۔ زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لئے نئی اقسام کے بیج رائج ہونے اور نئی نئی قسم کی فصلیں پھل اور میووں کے درخت لائے گئے۔ دیہات اور مضافاتِ شہر میں پن چکیں، خراس اور نئے نئے پیداواری آلات اور طریقے مروج ہوئے۔ اس طرح ریتلی اور غیر آباد علاقوں میں، جو کبھی صحرا ہوتے تھے، ایسے شہر اور قصبے آباد ہو گئے جو زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کے مرکز، دولت و ثروت کے گہوارے اور علم و فضل کے آماجگاہ بن گئے۔ آمد و رفت کے لئے نئی نئی سڑکیں اور پل بنائے گئے اور جگہ بجگہ کاروان سرائے مسافر خانے اور مہمان خانے تعمیر ہوئے۔ جن سے سفر، تجارت اور کاروبار میں زبردست ترقی ہوئی۔ اسی طرح اندلس، شمالی افریقہ، مصر، شام، ایران، خراسان، سیستان اور ماوراء النہر (وسطِ ایشیا) میں صحراؤں اور بنجر زمینوں کو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اپنی تکمیلی قوتوں سے زرخیز اور قابلِ کاشت بنایا اور آباد کیا۔ نئے نئے شہر آباد کئے۔ ان تکمیلات میں ہوا چکی کی ایجاد تاریخِ انسانی میں پہلی تکمیل تھی جو انہوں نے سیستان اور خراسان میں حاصل کی جہاں سال بھر تیز ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ مگر جب قرونِ وسطیٰ میں دورِ انحطاط وجود شروع ہوا تو یہ تکمیل اس کی نذر ہو کر نیست و نابود ہو گئی۔[1] بہرحال ان تکمیلات اور کارناموں کے ذریعے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے صحراؤں کو پیچھے دھکیل کر زرخیز زمینوں میں بدل

1.- Cambridge History of Technology, Vol. I. p.

دیا اور بڑے بڑے شہر مثلاً کوفہ، بصرہ، واسط، بغداد، دمشق، رملہ، فسطاط، قیروان، قرطبہ نیشاپور، غزنی اور متعدد شہر اور قصبے آباد کئے گئے جو اہل علم و فضل کے مرکز بن گئے۔ جہاں تمام علوم و فنون، سائنس و فلسفہ، طب و حکمت اور تہذیب و تمدن پروان چڑھے۔ یہ تکمیلات اور کمالات حضرت عمرؓ کے عہد زریں سے شروع ہوئے اور اموی خلیفہ ہشام اور عباسی خلیفہ منصور کے عہد تک جاری رہے[1] مگر اس عرصے میں ان میں ایک بنیادی تبدیلی آ گئی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں یہ تمام تکمیلات ماکروشوشل مقاصد کے لئے حاصل کی گئی تھیں، مگر اموی ہشام کے عہد میں یہ اموی خاندان اور عرب قبائل اور قرابتداری گروہوں کے مائیکروشوشل مقاصد اور مفادات کے لئے حاصل ہوتی تھیں اور عباسی منصور کے عہد میں عباسیوں اور اُن کے ہمنوا عربی، ایرانی یا ترک قرابتداری اور قبائلی گروہوں کے مفاد کی خاطر حاصل کی گئیں۔ بالفاظ دیگر حضرت عمرؓ کے عہد میں یہ تکمیلات ساری امت مسلمہ کیلئے تھیں، مگر امویوں اور عباسیوں کے عہد میں وہ چند حکمران گروہوں اور طبقوں کے لئے ہوتی تھیں۔

موات کا معمورہ پر غلبہ: صحرا کی پیش قدمی

قرون وسطیٰ میں اسلامی معاشرے کے عروج و زوال کی تاریخ صحرا اور معمورہ (زیر کاشت زمین) کے مد و جزر کی کہانی ہے۔ اسلام اوّل میں مسلمانوں کی تکمیلی قوتوں نے صحراؤں کو معمورہ یعنی آباد اور زیر کاشت زمینوں میں بدل دیا۔ مگر خلافت عباسیہ کے دور انحطاط کے ساتھ جب تباہ حالی اور ویرانی شروع ہوئی تو زرخیز زمینیں بنجر ہو گئیں، دیہات ویران ہو گئے اور شہر اجڑ گئے، جن کے نتیجہ میں صحرا پھر پھیلنے شروع ہو گئے۔ اس تباہی اور تنزل کے اسباب اُن غیر تکمیلی محرکات، عوامل اور رجحانات میں پائے جاتے تھے جو پردہ اور

---

[1] حضرت عمرؓ کی تکمیلات کے لئے دیکھئے "الفاروق" از شبلی نعمانی: برائے ترقی زراعت صفحہ ۳۵۲، نہروں، بند، تالاب وغیرہ کیلئے صفحہ ۳۵۳، اور صفحہ ۳۷۸ تا ۳۸۲، مہمان خانوں کیلئے صفحہ ۳۸۳، سڑکوں وغیرہ کیلئے صفحہ ۳۸۴، سرایوں کیلئے صفحہ ۳۸۵۔ شہر آباد کرنے کی تکمیلات کیلئے صفحہ ۳۸۵ تا ۳۹۷۔ ناشران ایم۔ ثناء اللہ خان۔ ریلوے روڈ۔ لاہور۔ ۱۹۵۱۔

حرم، کثرت ازدواج، کنیز داشتگی اور آسان اور بلا عذر طلاق کے باعث مسلمانوں کے گھروں خاندانوں اور قرابتداری گروہوں میں کارفرما تھے۔ ان غیر تکمیلی عوامل اور رجحانات پر شرعی قوانین وراثت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ان کے تحت کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کے ترکے میں اس کی بیویوں اور کنیزوں کی صلبی اور اخیانی اولاد کے علاوہ اس کے قریبی اور دور کے رشتہ دار اور قرابتدار یعنی عصبہ بھی حصہ دار بن گئے تھے۔ بالفاظ دیگر، کثرت ازدواج کے باعث صلبی بہن بھائیوں کی بہتات ہوتی تھی اور آسان اور فوری طلاق کے باعث اخیانی بہن بھائیوں کی بہتات ہو جاتی تھی کیونکہ مطلقہ عورتیں دوسری شادی کر لیتی تھیں[1]۔ بہر کیف ان قوانین اور رسم و رواج کے باعث زمینوں اور جائیداد وغیرہ کی تقسیم پر ورثا میں تنازعے اور جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے اور دو تین نسلوں کے بعد ورثا کی بڑھتی ہوئی تعداد اس قدر ہو جاتی تھی کہ زمینیں اور جائیداد چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی تھی۔ زمینوں پر اس کا نہایت مہلک اثر پڑتا تھا، کیونکہ ان کے چھوٹے چھوٹے حصے اپنے مالکوں کی توجہ، ترقیاتی اور پیداواری کوششوں کے قابل نہیں رہتے تھے۔ اس لئے ایسی زمینیں بنجر اور غیر آباد ہو جاتی تھیں، جن کو فقہ کی اصطلاح میں "موات" کہا جاتا تھا۔ صاحب ہدایہ ایسی بنجر زمینوں کی وجہ یوں بیان کرتے ہیں:

"موات وہ اراضی ہیں کہ جو قابل انتفاع نہ ہوں۔ ان زمینوں سے پانی منقطع ہو جانے کی وجہ سے یا اُن پر پانی چڑھ آنے کی وجہ سے یا ایسا ہی کوئی اور سبب پیش آجائے جس کے باعث وہ اراضی قابل زراعت و انتفاع نہ رہیں۔"[2]

---

[1] Noel J. Coulson, *Conflicts and Tensions in Islamic Jurisprudence*, University of Chicago Press, Chicago. 1969. p. 9.

[2] دیکھئے ہدایہ کا اردو ترجمہ "سراج الہدایہ" جلد چہارم صفحہ ۳۵۸، مترجمہ مولانا محمد مالک کاندھلوی، ملک سراج الدین اینڈ سنز۔ لاہور۔ ۱۹۶۸۔

مشہور فقیہی الماوردی (متوفی ۱۰۷۰ء) لکھتے ہیں :

"موات ایسی زمین ہے جو پہلے آباد تھی، پھر برباد ہوئی۔ اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) عہد جاہلیت کی یعنی عاد و ثمود کی زمینوں کی طرح ہو (۲) اسلامی جو مسلمانوں کی ملک رہ کر پھر بیکار اور برباد ہوئی ہو۔"[۱]

غرضیکہ نویں صدی عیسوی میں خلافت عباسیّہ میں اہل اقطاع اور زمینداروں کے خاندانی تنازعوں اور زمینوں کے حصّے بخرے ہو جانے کی وجہ سے نہروں اور بندوں وغیرہ کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ زرخیز زمینیں بنجر اور غیر آباد ہو گئیں، مالکان زمین اور کاشت کاروں میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ اہل اقطاع یا جاگیرداروں نے آزاد کاشت کاروں کی بجائے غلاموں، خاص طور پر سیاہ فام غلاموں کو جنہیں زنج کہتے تھے، استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مگر اس استحصال کا نتیجہ بالآخر زنج کی خوفناک بغاوت میں نکلا جو عراق زیریں کے علاقوں میں ۸۶۲ سے ۸۸۳ عیسوی تک جاری رہی اور بہت خون خرابے کے بعد رفع دفع ہوئی۔ مگر اس نے خلافت عباسیہ کی بنیادوں کو ہلا دیا۔[۲] اس کے بعد ایران، خراسان، وسط ایشیا، مصر و عراق اور شمالی افریقہ میں بغاوتیں شروع ہو گئیں اور کئی صوبوں میں آزاد اور خود مختار بادشاہتیں اور حکومتیں قائم ہو گئیں جو برائے نام خلفائے عباسیہ کے اعلیٰ اقتدار کو تسلیم کرتی تھیں۔ ان میں خاندان سامانیہ اور غزنوی قابل ذکر ہیں۔ عباسی خلافت میں اقتدار اعلیٰ بھی دیلمی قبائل کے سرداروں کے خاندان بویہ کے ہاتھوں میں چلا گیا اور عباسی خلیفہ کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی رہ گئی۔

دسویں صدی عیسوی تک خلافت عباسیہ میں ہر طرف خاندانی جھگڑوں

---

[۱] علامہ ابی الحسن ماوردی، احکام سلطانیہ، صفحہ ۲۱۴ بترجمہ مفتی انتظام شہابی، محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل، کراچی۔ تاریخ ندارد۔
[۲] سید امیر علی، شارٹ ہسٹری آف دی سارسنز، ص ۲۹۱۔ مزید دیکھئے تھیوڈر نولڈکے "سکیچز فرام ایسٹرن ہسٹری" ۱۴۷ تا ۱۷۵۔ لندن ۱۸۹۲۔

قرابتداری تنازعوں، تقسیم جائیداد، زرعی لوٹ کھسوٹ اور استحصال، سیاسی انتشار اور طوائف الملوکی نے ایسے غیر تکمیلی گروہ اور طبقے پیدا کر دیئے جن کی وجہ سے تمام زرعی اور اقتصادی ترقی اور پیداوار ختم ہو گئی، خوشحالی کا دور ختم ہو گیا۔ لہلہاتے کھیت اور زرخیز زمینیں بنجر اور غیر آباد "موات" اور علاقوں میں بدل گئیں۔ دیہات برباد ہو گئے اور قصبے اور شہر اجڑ گئے[1]۔ تاریخ اسلام کا مشہور جدید مورخ خدا بخش لکھتا ہے:

"متاخرین کی جغرافیہ کی کتب میں جب کسی شہر کا ذکر آتا ہے تو کسی اور بات کا اتنا تکرار نہیں ہوتا جتنا ان الفاظ کا کہ "اس شہر کے بیشتر حصے ویران ہیں اور وہ صفحہ ہستی سے مٹ رہا ہے"۔[2]

بہر حال، دسویں صدی میں یہ تباہی اور ویرانی اتنی عام اور وسیع ہو گئی کہ دیہات، قصبے اور شہر برباد ہو کر ریگستان بن گئے۔ اس طرح وہ صحرا جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی قوت تکمیل نے پیچھے دھکیل دیئے تھے پھر پھیل گئے۔ ان تباہ شدہ علاقوں اور صوبوں میں سب سے پہلے وہ برباد اور بیابان ہوئے جو سب سے پہلے آباد اور خوشحال ہوئے تھے اور جو اسلام اور خلافت کی تاریخ و جغرافیے میں اسلامی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے مرکزی اور نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور جن کی تباہی و بربادی اسلام اولیٰ کی تہذیب و تمدن کی تباہی اور بربادی ثابت ہوئی۔ ان میں عراق زیریں کا زرخیز علاقہ جو سواد کے نام سے مشہور تھا صف اول میں آتا ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں اس صوبے میں کوفہ، بصرہ، واسط جیسے اسلامی تہذیب و تمدن کے مراکز اجڑنے لگے[3]۔ نہروں اور بندوں وغیرہ کا نظام، جن پر عراق کی خوشحالی کا دارومدار تھا، مقتدر اور متمول طبقوں کی غفلت شعاری، کاہلی اور لاپرواہی کے باعث درہم برہم ہو گیا۔ اس وجہ سے عراق زیریں بنجر اور ویران بیابان یا دلدل میں بدل گیا۔ اسی طرح کے

---

[1] دیکھئے "سفرنامہ ناصر خسرو" صفحہ ۱۳۷ اور ۱۵۲۔

[2] S. Khuda Bakhsh, *Caliphate*, p. 104. Orientalia, Lahore. 1954.

حالات مشرقی ایران مثلاً سیستان، کرمان اور خراسان کے صوبوں میں پیدا ہو گئے اور ان کی قدیم خوشحالی اور عظمت ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ شام، فلسطین، مصر شمالی افریقہ میں بھی ایسے ہی حالات پیدا ہوئے، جس کے باعث یہ صوبے خلافت سے کٹ کر عیسائی صلیبی مجاہدین (Crusaders) یا نئے مسلم حکمرانوں کے زیر نگین ہو گئے۔ اموی ہسپانیہ میں شمالی علاقوں اور قرطبہ میں بدحالی اس قدر پھیلی کہ اموی خاندان کو زوال آ گیا اور بربر قبائل کے نئے حملہ آوروں نے جنہیں المرابطین اور الموحدین کہتے تھے، اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ مگر وہ بھی اس انحطاطی روگ کو نہ ختم کر سکے۔ اس وجہ سے عیسائی جاگیرداروں نے، جو نئی تکنیکی فنون سے متحرک تھے، مسلم ہسپانیہ کا اندرونی روگ کا فائدہ اٹھا کر شمالی اور وسطی ہسپانیہ یعنی قرطبہ کو مسلمانوں سے چھین لیا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان ہولناک تغیرات کی کیا وجوہات اور اسباب تھے؟

حرم اور پردہ سسٹم کے مسلم معاشرے پر اثرات

ان اندوہناک تبدیلیوں اور تباہیوں کا آغاز مسلمانوں کی خاندانی زندگی کی اس افراتفری سے ہوا، جو تعدد ازواج، کنیز داشتگی، طلاق اور حرم اور پردے کی قید و بند نے پیدا کی تھی۔ قرون وسطائی اسلام کے فقہ اور شریعت کے مطابق جو بچے کنیزوں کے بطن سے ہوتے تھے آزاد بیویوں کے بچوں کی طرح باپ کے ترکے میں برابر کے حقدار اور حصہ دار ہوتے تھے۔ وراثت کے اس طریق تقسیم نے اس فرق کو مٹا دیا کہ مرد اولاد پیدا کرنے کے لئے نکاح اور شادی کا طریقہ اختیار کرتا ہے یا جنگ میں پکڑی دھکڑی عورتوں یا زرخرید لونڈیوں سے اولاد حاصل کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت عباسیہ کے دور عروج (۷۵۰ء تا ۹۵۰ء) میں مادری حسب و نسب کا خیال مٹ گیا۔ اس کے برعکس یہ پدر سرداری خیال عام ہو گیا کہ ماں کوئی ہو، نسل و نسب مرد یعنی باپ پر منحصر ہوتا ہے۔ اس لئے بیوی اور باندی کی تمیز بھی بے معنی چیز بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی تین حکمرانوں

کے علاوہ باقی تمام عباسی خلفاء کنیزوں کی اولاد تھے۔ یہی حال باقی سب عباسی خاندانوں اور طبقوں کا تھا۔ ایک مستشرق ایڈم میز لکھتا ہے:

"عباسی مسلمانوں کو اس بات پر خصوصاً بہت اچنبھا ہوتا تھا کہ عیسائی اور یہودی گھرانوں میں غلام عورتیں اپنے آقاؤں کے جنسی تمتع کے لئے نہیں ہوتی تھیں"۔[1]

کنیزوں اور غلام عورتوں کے بڑھتے ہوئے رواج سے ایسا وقت بھی آگیا کہ دو چار نسلوں کے بعد ہر مسلمان کنبے اور گھر میں ہر طرف اُن کی اولادیں ہی نظر آنے لگیں۔ ان کی کثرت کو دیکھ کر ایک عباسی شاعر المبرد (متوفی ۸۹۸ء) پکار اٹھا۔

ہمارے ارد گرد کنیزوں کے بیٹے
اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ
اے خدا! مجھے وہاں لے چل
جہاں یہ حرامی بچے نظر نہ آئیں[2]

غلامی، کنیز داشتگی اور تعدد ازدواج کے بڑھتے ہوئے رواج نے قرون وسطٰی کے مسلم معاشرے میں حرم اور پردہ سسٹم کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر اور اس کے فروغ کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ غلاموں، کنیزوں، باندیوں اور غلمانوں کی مانگ قیمت اور تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ نہ صرف بردہ فروشوں نے ہر طرف ڈاکہ اور شبخون کی واردات بڑھا دیں، بلکہ خلافت عباسیہ کے دور انتشار و انحطاط میں چھوٹے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں، قبائلی سرداروں اور سرخیلوں اور راہزنوں اور قزاقوں نے بھی اپنے باہمی جنگ و جدال اور لوٹ مار کو تیز تر کر دیا تاکہ

ص 1 Adam Mez, *The Renaissance of Islam*, p. 156. Translated by S. Khuda Bakhsh and D S. Margoulieth. Patna. 1937.

ص 2 Philip K. Hitti, *History of the Arabs* p. 333.

بردہ فروشوں کے منافع بخش "تجارت" سے خوب فائدہ اٹھایا جائے اور دولت جمع کی جائے مگر ان واردات اور لوٹ مار سے بچوں اور عورتوں، بڑوں اور چھوٹوں سب کی جان و مال، عزت و آبرو غیر محفوظ ہو گئی۔ ملک میں اغوا اور پکڑ دھکڑ کا خوف اور خدشہ ہر طرف پھیل گیا اور عدم تحفظ کا احساس عام ہو گیا۔ ہر ایک گھر اور کنبہ، محلہ اور گاؤں، شہر اور قصبہ، برادری، قبیلہ اور قرابتداری گروہ اپنے ہمسایوں کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھنے لگا اور اپنے خاندانی اور گروہی مفادات اور اپنے ممبروں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے بچاؤ کے لئے اپنے ہی ممبروں اور لیڈروں کا سہارا لینے لگا۔ اور اسی غرض سے ہر مرد، خاندان اور قرابتداری گروہ نے اپنی عورتوں کو حرم اور زنانخانے کی چاردیواری اور پردے کی پابندیوں اور بندشوں میں اور زیادہ سختی سے جکڑ دیا۔ ان کے نتیجے میں ان گروہوں میں مائیکرو سوشل تعلقات اور رجحانات زیادہ گہرے اور سخت ہو گئے ہر ایک گروہ اپنی چھوٹی سی دنیا سے پرے دیکھنے اور تعلق رکھنے سے پرہیز کرنے لگا۔ اس طرح قبائلی لوٹ مار اور جاگیردارانہ جنگ و جدال کا نظام معیشت پردہ اور حرم سسٹم کے نظام معاشرت کا لازمی جزو بن گیا اور مسلمان عورت کی دوہری غلامی کا یہ نظام مسلم معاشرے کا جزو لاینفک بن گیا۔ یہ وجہ تھی کہ پردہ، تعدد ازواج اور کنیز داشتگی اور غلامی کے حق میں اور عورتوں کی آزادی، رائے اور مشورے کے خلاف علمائے دین اور دوسرے ہم خیال عالموں کی تاویلات اور نظریات کیوں قرون وسطیٰ کے مسلمانوں میں اس قدر مقبول تھے۔ مگر وہ مسلم معاشرہ جو اس طرح مرد کے غلبے، بالادستی، شہوت رانی اور لوٹ کھسوٹ کی بنیادوں پر استوار ہوا تھا اپنے نسلی سائیکل کی غیر تکمیلی نوعیت کے باعث انحطاط و زوال میں مبتلا تھا۔

ترقی پسند اور زوال پذیر معاشروں میں اندرونی اہلیت کی گردش کی نوعیت

اگر کسی معاشرے میں ایسے معاشرتی، سیاسی اور نظریاتی عوامل، قوتیں، رجحانات، نظریات، رسم و رواج اور عقائد وغیرہ کار فرما ہوں جن کے ذریعے غیر تکمیلی یا خلاف تکمیلی اہلیت اپنے خاندانی

اور قرابتداری گروہوں کی مدد، اعانت اور سہارے سے اپنی غیر تکمیلی یا خلاف تکمیلی دولتمندی اثر و رسوخ اور حیثیت کو برقرار رکھیں، تو یہ معاشرہ مائیکرو سوشل گروہوں اور گروہ بندیوں کا مجموعہ بن جاتا ہے، جس میں ایسے گروہ اور گروہ بندیاں اپنے گروہی یا مائیکرو سوشل مفادات اور تعلقات کے تحفظ اور بقا کے لئے سیاسی اور حکومتی گروہوں اور طبقوں کی اعانت اور اطاعت بھی اختیار کر لیتے ہیں، خواہ یہ حکمران گروہ اور طبقے (یعنی گروہ بندیاں) معاشرے اور ملک کے اندر یا باہر سے آئے ہوں۔ لہٰذا ایسے معاشرے کا سارا نظام حیات و فکر، معاشرت اور معیشت، سیاست و ریاست، آئیڈیالوجی اور قانون، ادب و فلسفہ اور تہذیب و تمدن، مائیکرو سوشل نوعیت کے بن جاتے ہیں، جس میں ایسے حالات اور ماحول پیدا ہو جاتے ہیں جن میں نئے تکمیلی افراد اور اہلیت کو ابھرنے کے مواقع اور آزادی میسر نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے ملک و معاشرے میں ترقی رک جاتی ہے اور انحطاط و جمود طاری ہو جاتے ہیں۔ مگر ان سے ایسی کمزوری اور انتشار پیدا ہو جاتے ہیں جو بیرونی اہلیت کے حملہ اور تسلط کے لئے راہ ہموار کر دیتے ہیں۔

اس کے برعکس، ترقی پسند معاشرے میں اندرونی اہلیت کی گردش قطعی مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس معاشرے میں جب کسی تکمیلی فرد کا خاندان غیر تکمیلی یا خلاف تکمیلی ہو جاتا ہے تو اس کے افراد کو اپنی دولت، ثروت، اثر و رسوخ اور حیثیت و عظمت برقرار رکھنے کیلئے خاندانی اور قرابتداری گروہ یا گروہ بندیوں کا سہارا اور معاونت حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں ایسی معاشرتی، سیاسی اور آئیڈیالوجیکل قوتیں، عوامل، قوانین، نظریات اور رسم و رواج، رائے اور رویے کار فرما ہوتے ہیں جو گروہی امداد اور اعانت کے مانع ہوتے ہیں۔ سیاست اور حکومت پر کسی قرابتداری گروہ اور گروہ بندی کا غلبہ اور اجارہ نہیں ہوتا۔ اسلئے ایسے حالات، ماحول اور مواقع پائے جاتے ہیں کہ نئے تکمیلی افراد اور گروہ پرانے اور غیر تکمیلی یا خلاف تکمیلی افراد اور گروہوں کی جگہ لے لیں۔ اس طرح ہر نیا تکمیلی فرد ایک نیا تکمیلی خاندان بن جاتا ہے جس کے ممبروں کا اثر و رسوخ، دولت و ثروت اور حیثیت و مقام اس وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک وہ تخلیقی یا کم از کم پیداواری کام اور تکمیلات حاصل کرتے ہے

ہیں. مگر جونہی یہ افراد اور خاندان غیر تکمیلی یا خلاف تکمیلی بنتے ہیں تو انہیں گروہی سہارے کی بجائے عام معاشری عوامل و عواقب پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کی جگہ نئے تکمیلی افراد اور گروہوں کو دولت و ثروت، حیثیت و عظمت اور فخر و افتخار حاصل ہو جاتے ہیں. اس عمل اپروس میں موجودہ تکمیلی افراد، خاندان اور گروہ کی مثال گھریلو ماحول اثر و رسوخ، تعلیم و تربیت کے اثرات اور عام معاشری عمل (ایکشن) ردعمل اور باہمی عمل سے معاشرے میں دوسرے افراد اور گروہوں وغیرہ کو تکمیلی ترغیبات اور محرکات ملتے ہیں. لہٰذا جب پرانے تکمیلی افراد اور ایلیت غیر تکمیلی یا خلاف تکمیلی ہو رہے ہوتے ہیں تو اور افراد اور گروہ نئی تکمیلات کی جانب سمت بند ہو جاتے ہیں اور نئی تکمیلات حاصل کرتے ہیں. اس طرح معاشرے میں ہر وقت اور ہمیشہ نئے نئے تکمیلی افراد اور ایلیت کی گردش جاری رہتی ہے اور متواتر ترقی اور پیش رفتگی ہوتی رہتی ہے معاشرہ وسیع سے وسیع تر، عظیم سے عظیم تر اور مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہتا ہے ایلیتی خاندانوں، گروہوں اور طبقوں کو تنزل اور زوال آتے ہیں مگر اُن کی جگہ نئے خاندان، گروہ اور طبقے تکمیلاتی افق پر اُبھر آتے ہیں. اس لئے معاشرے کو کبھی انحطاط و زوال، جمود و سقوط کے دور نہیں آتے، بلکہ وہ سدا مستحکم اور وسعت پذیر معاشرہ رہتا ہے. اور اپنی مائیکرو سوشل گروہوں کی حدبندیوں سے تجاوز کر کے ماکرو سوسائٹی بن جاتا ہے. اسلام نے قرون اولیٰ کے مسلم معاشرے کو ایسا ہی ماکرو سوسائٹی بنا دیا تھا. مگر خلافت عباسیہ کے دور عروج میں مذکرہ بالا عوامل اور اسباب پیدا ہو گئے. جنہوں نے اس میں اندرونی ایلیت کی گردش کو پھر مائیکرو سوشل قوتوں اور رجحانات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا. جن کے باعث گیارہویں صدی کے اواخر میں مسلم معاشرہ پھر قرابتداری مائیکرو سوسائٹی کی زوال پذیر اور جمود انگیز دلدل میں پھنس گیا. اس طرح قرون وسطائی اسلام میں اندرونی ایلیت کا خاتمہ اور بیرونی ایلیت کے چکر شروع ہوئے.

خلافت عباسیہ میں اندرونی ایلیت کا خاتمہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے عباسی معاشرے میں پردہ اور حرم کے اندر مقید عورتوں اور کنیزوں کی بھانت بھانت کی اولاد ایسے غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی

ماحول اور اثرات میں پلتی تھی کہ ایک دو نسلوں کے بعد اپنے بزرگوں کی تکمیلی عادات و خصائل سے اتنی خالی ہو جاتی تھی کہ وہ اُن کے کمالات اور کارناموں کو جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس تکمیلاتی انحطاط کا اثر جلد ہی عباسی تہذیب و تمدن حکومت و ریاست، علم و فن پر پڑنے لگا۔ ہر نئی نسل اپنی تکمیلی استعداد اور صلاحیتوں میں اپنے باپ اور بزرگوں سے کمتر ہوتی تھی جنہوں نے سیاست اور حکومت اور فوجی فتوحات، علم و ادب، سائنس اور فلسفہ تجارت اور صنعت و حرفت میں ہر طرح کے کمالات حاصل کئے تھے۔ اس طرح عباسی معاشرے میں ہر خاندان اور قرابتداری گروہ میں ایک دو نسلوں کے بعد ایسے افراد پیدا ہو جاتے تھے جو ان تکمیلات کو بڑھانا تو کیا برقرار رکھنے کے اہل بھی نہ ہوتے تھے۔ لہٰذا جلد ہی تکمیلی خاندان اور گروہ پر انحطاط اور بدحالی طاری ہو جاتی اور وہ قعرِ مذلت اور گمنامی میں چلا جاتا۔ مورخین نے اندازہ لگایا ہے کہ ہارون الرشید (۷۸۶ تا ۸۰۹) کے عہد کے عربی اور ایرانی خاندان المامون (۸۱۳ تا ۸۳۳) کے عہد تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو گئے اور المامون کے عہد کے مقتدر خاندان المتوکل (۸۴۷ تا ۸۶۱) کے عہد تک پہنچتے پہنچتے قعرِ مذلت میں چلے گئے۔ بلکہ اکثر و بیشتر یہ انحطاط اور تبدیلی اتنی سرعت انگیز ہوتی تھی کہ ہر نئے خلیفہ کے عہد میں نئے افراد اور نئے خاندان اقتدار اور اثر و رسوخ حاصل کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے تھے۔ المعتضد (۸۹۲ تا ۹۰۲ء) کے عہد کا ایک عربی شاعر نوحہ خواں ہے کہ

"آزاد لوگ چلے گئے، انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا،
وقت نے مجھے وحشیوں میں رکھ دیا ہے
لوگ کہتے ہیں "تم گھر میں ہی کیوں پڑے رہتے ہو؟" میں جواب دیتا ہوں:
"باہر نکلنے میں کوئی مزہ نہیں رہا باہر کون ملیں گے؟ گھوڑوں پر سوار بن مانس" [۱]

اس کے کچھ عرصے کے بعد ایک اور شاعر ابوالاعلیٰ معرّی (متوفی ۱۰۵۸ء) پکار اُٹھتا ہے:

---

[۱] Ignaz Goldziher, *Muslim Studies* Vol. I. p. 141.

"ایک مدت سے شام و عراق ویرانہ بن چکے ہیں
جہاں کسی بادشاہ کا راج نظر نہیں آتا۔
لوگوں کی سیاست ان شیطانوں کے ہاتھ میں ہے
جو ان پر مسلط ہو گئے ہیں۔
اور حکام کا یہ شیطانی گروہ ہر شہر میں موجود ہے"۔[۵]

قرون وسطائی اسلام کی قرابتدار مائیکرو سوسائٹی

ہم نے گذشتہ باب میں ثابت کیا تھا کہ اسلام کا مقصد ایک اسلامی ماکرو سوسائٹی قائم کرنا تھا، جس میں کوئی قبائلی قرابتداری اور نسلی گروہ بندیاں اور علیحدگیاں نہیں باقی رہیں گی۔ اس میں عرب قبائل آپس میں گھل مل جائیں گے اور عرب و عجم کا فرق مٹ جائے گا۔ مگر اموی خلافت کی عرب نوازی نے عربوں کی قبائلی عصبیت کو دوبارہ جنم دیا اور عباسی خلافت نے عرب عجمی کے فرق کو پھر تازہ کر دیا۔ جب ساتویں عباسی خلیفہ مامون کے بعد خراسانیوں کا اثر و رسوخ ختم ہوا تو آٹھویں خلیفہ معتصم نے ترک غلاموں کو فوج اور حکومت میں اختیارات دینا شروع کیے۔ اس سے ترک غلاموں کا غلبہ شروع ہوا، جو دسویں صدی کے نصف میں دیلمی قبائل کے سربراہ خاندان بویہ کے ساتھ ختم ہوا۔ اس اثنا میں خلافت عباسیہ کے صوبوں میں آزاد اور خود مختار مملکتیں اور ریاستیں وجود میں آگئیں جو برائے نام خلیفہ کے اعلیٰ اقتدار کو تسلیم کرتی تھیں۔ جب ۱۰۵۵ء میں سلاجقہ کے بیرونی قبائل نے بغداد پر قبضہ کر کے عباسی خلیفہ کو اپنے زیر اثر کر لیا تو قرون وسطیٰ کی تاریخ میں ایک ایسا عنصر آ گیا جس نے دارالاسلام کے دروازے بیرونی حملہ آوروں کے لئے کھول دیئے۔ کیونکہ یہ واقعہ اس بات کا واضح اعلان تھا کہ اب دارالاسلام میں اندرونی طور پر اتنی قوت اور صلاحیت باقی نہیں رہی کہ بیرونی خانہ بدوش قبائل کے حملوں کو روک سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب مسلمان معاشرے میں کوئی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی اتحاد اور استحکام نہیں رہا، کیونکہ اب یہ لاتعداد چھوٹے چھوٹے قرابتداری گروہوں میں منقسم ہو گیا تھا، جنہیں ہم مائیکرو

۵۔ "افکار معری" صفحہ ۴۳

سوشل گروہ کہتے ہیں۔ ہر ایک گروہ قرابتی رشتوں اور مفادات میں منسلک تھا، جن کے تحفظ کرنے کو اس کا ہر ممبر پوری طرح تیار رہتا تھا۔ اور یہ گروہ بھی ہر ممبر کی عزت آبرو اور جان و مال کا تحفظ کرتا تھا مگر اس کے ارکان اپنے گروہ سے باہر کے لوگوں اور گروہوں کو کم و بیش، شک و شبے، نفرت اور مخاصمت کی نظروں سے دیکھتے تھے اور جب موقع ملے تو دوسرے گروہوں کے ارکان کے مال و دولت کو لوٹنے، ان کی عورتوں کو اغوا کرنے، اُن کی عزت و آبرو کو پامال کرنے اور اُن کی جان و مال کو تباہ کرنے کو تیار رہتے تھے۔ اس وجہ سے یہ گروہ دوسرے گروہوں سے الگ تھلگ رہتے اور باہمی ارتباط و اختلاط سے بہت بچتے تھے۔ اور باہمی لین دین اور تجارت میں مکر و فریب، حیلے اور حجت سے کام لیتے تھے۔

ان میں دو طرح کے قرابتداری گروہ ہوتے تھے۔ اوّل قبائلی، جن میں عصبیت اور اتحاد بہت مضبوط ہوتا تھا۔ مگر وہ زیادہ تر لوٹ مار اور غارتگری پر گزارہ کرتے تھے دوسرے گروہ ایسی برادریاں اور ذاتیں (کاسٹ) تھیں جو زراعت اور تجارت کے کام اور پیشوں پر گزارہ کرتی تھیں۔ ان کا کام اور کاروبار لوٹ کھسوٹ پر مبنی ہوتا تھا جس میں متمول گروہ کمزور اور غریب گروہ کے استحصال کرتا تھا۔ مگر دونوں قسم کے گروہ شادی، بیاہ میں الگ الگ رہتے تھے۔ اگر عورتیں دوسرے گروہ سے حاصل بھی کرتے تھے تو بھی ان میں باہمی اختلاط اور بھائی چارہ نہیں قائم ہوتا تھا، کیوں کہ مردوں کو غلبہ اور فوقیت حاصل تھی اور عورتوں اور مادری رشتوں کو کوئی اہمیت نہیں حاصل تھی۔ اکثر عورتیں اغوا کی ہوئیں یا زرخرید کنیزیں ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے آزاد عورتوں کی بھی بیحد ناقدری اور ذلت خواری تھی۔ تعدد ازدواج، آسان طلاق اور کنیز داشتگی جیسے رسم و رواج نے عورت کی حیثیت صفر کے برابر کی ہوئی تھی۔

شہروں اور دیہات میں قرابتی گروہ اور گروہ بندیاں

شہروں اور قصبوں کے محلوں میں ایک ہی قرابتی گروہ آباد ہوتا تھا۔ ہر گھر کے ساتھ دوسرے گھروں میں بھی رشتہ دار اور قرابتدار رہتے تھے، جو

عموماً ایک ہی قبیلے یا قرابتداری گروہ سے تعلق تھے۔ لہٰذا وہ شادی اور خون کے رشتوں میں منسلک ہوتے تھے، جو مردوں یا پدر سرداری تعلقات پر متعین ہوتے تھے۔ مادری رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ یہی قرابتداری رشتے کاروبار، پیشے اور سماجی حیثیت کو متعین کرتے تھے۔ مذہبی بنیادوں پر علماء اور سیاسی غلبہ کی بنا پر امرا اور زرعی بنا پر زمینداروں اور جاگیرداروں کی اپنی اپنی قرابتی گروہ بندیاں ہوتی تھیں اس کے بعد مذہب اور زبان کے فرق پر عرب، ترک، ایران، خراسان، بربر اور متعدد نسلیں اور شعوبیہ اقوام بنتی تھیں، جو محلوں، شہری حصار، دیہات اور قصبات میں الگ تھلگ رہتے تھے۔ مثلاً بغداد میں شروع ہی سے عرب اور ایرانی الگ الگ رہتے تھے جب معتصم باللہ (۸۳۳-۴۳) نے سمرا آباد کیا تو اس نے فرغانہ کے باشندوں کو ترکوں سے الگ بسایا۔ محلّوں اور شہروں کی طرز تعمیر جس میں قبیلے اور گروہ الگ الگ آباد ہوتے تھے، قرون وسطائی اسلام کے معاشرے کی بنیادی خصوصیت بن گئی۔ اس طرح سارے محلے میں ایک گروہ کا غلبہ اور شہر یا قصبے میں کسی ایک گروہ کا اثر ورسوخ قائم ہو جاتا تھا۔ یہ غالب گروہ اکثر و بیشتر اُن قبائل یا گروہوں پر مشتمل ہوتا تھا جنہوں نے اپنے زمانۂ اقتدار اور تسلط میں محلے یا شہر یا قصبے کو آباد کیا تھا اور اپنے علاقے میں غالب اکثریت یا گروہ بن گیا تھا۔ جب سیاسی عروج وزوال کے ساتھ یہ گروہ یا قبیلہ مغلوب اور محکوم گروہ بن جاتا تھا۔ تو نئے حملہ آوروں اور آبادکاری کے ہاتھوں چند نسلوں کے بعد اپنے مکانوں، زمینوں، بازار یا منڈی سے بیدخل اور اپنے کاروبار، پیشے، تجارت، زمینداری سے زبردستی محروم کر دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات نئے حکمران کوئی نیا شہر یا دارالخلافہ آباد کر لیتے تھے۔ تو وہاں بھی تجارت اور صنعت وحرفت نئے گروہوں کی ہاتھوں میں ہوتی تھی اس وجہ سے پرانے شہر، قصبے اور علاقے اپنی سابقہ خوشحالی سے محروم ہو کر گمنامی میں چلے جاتے تھے۔

ان مائیکرو سوشل گروہوں اور گروہ بندیوں کی باہمی دشمنی اور تباہ کاریوں کے

باعث قرونِ وسطائی اسلامی شہروں اور قصبوں میں انتشار اور گڑبڑ کا بازار گرم رہتا تھا۔ شہری زندگی میں کوئی اتحاد اور مرکزیت نہیں پائی جاتی تھی، اگرچہ قرونِ اولیٰ میں اسلامی شہروں اور قصبوں میں بلدیاتی مجلس شوریٰ پائی جاتی تھی[۱]۔ مگر جب قرونِ وسطیٰ کی مائیکرو سوشل انتشار اور طوائف الملوکی پھیلی تو یہ مرکزی ادارے ختم ہو گئے۔ ہر محلہ اپنے گروہی سرداروں کے کنٹرول میں چلا گیا۔ لوگ قرابتداری، نسلی اور مذہبی تقسیموں اور فرق میں بٹ گئے۔ ہر گروہ حاکم وقت کی براہ راست ماتحتی اور اطاعت میں تو ہوتا تھا مگر مشترکہ شہری یا بلدیاتی مفادات اور انتظامات کا کوئی شعور نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا ہر شخص اپنے خاندان اور اپنے قرابتی گروہ کے مفادات کو حاصل کرنے یا بچانے کے خیال میں رہتا تھا۔ اس کے لئے اوّل تو وہ حاکم وقت کی مدد اور اعانت کا طلب گار ہوتا تھا۔ لیکن جب حکومت کمزور ہو جاتی اور طوائف الملوکی پھیل جاتی تھی، تو وہ اپنے قرابتداری گروہ کی مدد اور اعانت کا سہارا لیتا تھا۔ اس وجہ سے ہر گروہ، محلے اور علاقے کے اپنے اپنے سردار ہوتے تھے جو شیخ، رئیس، اعیان، امام اور خواجہ وغیرہ کہلاتے تھے مصیبت اور آفت کے وقت یہ سردار اپنے اپنے محلے یا علاقے کی الگ الگ حفاظت کرتے تھے، مگر کبھی کسی کو اجتماعی یا مرکزی انجمن ادارہ یا تنظیم بنانے کا خیال نہیں آتا تھا۔ جب کوئی نیا حملہ آور شہر یا علاقے پر قابض ہو جاتا تو گروہ اور برادریوں کے رئیس، شیخ یا سردار نئے حاکم کی اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کر لیتے تھے۔ شہروں اور قصبوں کی اندرونی کمزوری، انتشار اور غیر مرکزیت کے باعث قرونِ وسطائی اسلام میں شہری تجارت، صنعت و حرفت کی سرمایہ کاری نہیں ہوئی۔ تجارت اور مالیاتی ترقی نہیں ہوئی بلکہ شہر محض دیہات کے سہارے رہتے تھے اور استحصالی جاگیرداریت اور غارت گر قبائلیت کا شکار بنتے تھے۔ ان حالات کے باعث ان شہروں اور اُن کے مختلف طبقوں میں کبھی اپنی اندرونی ترقی کی صلاحیت اور قوت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ وجہ تھی کہ قرونِ وسطیٰ کے تمام ادوار میں اسلامی تہذیب و تمدن میں شہروں اور شہری زندگی کو ثانوی حیثیت حاصل رہی اور ان پر قبائلیت اور دیہاتیت کا غلبہ رہا۔ اور قرونِ وسطائی اسلام کبھی ماکرو سوسائٹی نہ بن سکا۔

---

[۱] ایس۔ اے۔ قافہ قریشی "عرب ایڈمنسٹریشن" ص ۲۱۷، لاہور۔ ۱۹۵۶ء (انگریزی میں)

ان قرابتداری گروہوں کی روزمرہ کی زندگی قرابتداری تعلقات اور بندشوں کی وجہ سے نہایت محدود اور غیر تکمیلی ہوتی تھی۔ ارتباط اور باہمی عمل کے مواقع کم تھے۔ اس لئے روایات اور روٹین کے سہارے سب کام ہوتا تھا۔ کام اور ترقی کی تمام راہیں مسدود ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے باہمی لوٹ کھسوٹ اور لوٹ مار کا زور شور رہتا تھا۔ جو سارے معاشرے کو غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی بنا دیتا تھا۔ اس سے معاشرتی اور اقتصادی بدحالی میں اضافہ ہوتا تھا۔ لہٰذا لوگ اکتسابی اور تکمیلی کاموں اور مقاصد کی طرف راغب نہیں ہوتے تھے۔ اس وجہ سے معاشرہ اور زیادہ انتشار زدہ اور زوال پذیر ہو جاتا جو اس کو اور زیادہ مائیکرو سوشل بنا دیتا تھا۔ اس طرح غیر تکمیلیت انحطاط و انتشار اور قرابتداری مائیکرو سوسائٹی کا ایسا چکر چلا جس سے قرون وسطائی اسلام کبھی باہر نہ نکل سکا اس طرح گیارہویں صدی تک دنیائے اسلام میں ایسے حالات پیدا ہو گئے جن میں اسلام اولیٰ کی تہذیب و تمدن، علوم و فنون اور معاشرت و معیشت کی تمام تکمیلات اور کمالات کے نشان مٹ گئے اور وہ تمام اندرونی تکمیلی گروہ اور طبقے ختم ہو گئے جنہوں نے یہ کارہائے نمایاں حاصل کئے تھے۔ اس تکمیلی خلا نے بیرونی خانہ بدوش قبائل اور ایلیٹ کے لئے راہ ہموار کر دی، مگر ہر بیرونی ایلیٹ بھی قرون وسطائی اسلام کی پردہ سوسائٹی کے انحطاط اور زوال کی گرداب میں پھنس جاتی تھی جس کا تجزیہ ہم اب کریں گے۔

قرون وسطائی مسلم معاشرے میں سیسفین[1] گردشیں

(گیارہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک)

---

[1] سیسفس (Sisyphus) یونانی مائتھولوجی میں ایک بادشاہ تھا جس کو حرص اور فریب کی وجہ سے یہ سزا ملی کہ وہ ایک پتھر پہاڑ کے چوٹی پر لے جائے۔ مگر جونہی وہ چوٹی پر پہنچتا پتھر لڑھک کر نیچے آگرتا اور وہ پھر اُسے اوپر لے جاتا اور پتھر پھر نیچے لڑھک جاتا۔ اس طرح وہ ہمیشہ اس ناتمام کام میں مبتلا رہا۔ اسلامی تاریخ کے قرون وسطائی دور میں خانہ بدوش قبائلی ایلیٹ نے بھی سیسفس کی طرح بار بار تکمیل اور غیر تکمیل کا ایسا ہی مظاہرہ کیا۔

خانہ بدوش قبائلیت: بیرونی ایلیت کی سیسفین گردشیں

قرون وسطائی اسلام کی تاریخ ایسی بادشاہتوں اور سلطنتوں کی تاریخ ہے جن کو خانہ بدوش قبائل قائم کرتے تھے۔ تب یہ قبائل حکمران ایلیت بن جاتے تھے، مگر ایک دو نسلوں کے بعد وہ زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ تاریخ قرون اولیٰ کے اسلام کی تاریخ سے مختلف تھی، جس میں اسلامی تہذیب و تمدن متواتر تین چار صدیوں تک ہر قسم کی تکمیلات اور کمالات کا گہوارہ بنے رہے۔ اس کے برعکس قرون وسطائی سلطنتوں کو کبھی ایک صدی سے زیادہ عرصے عروج اور عظمت نصیب نہیں ہوئی، اور نہ ہی اس عرصے میں وہ ایسی اور اتنی ہی تکمیلات حاصل کر سکیں جو قرون اولیٰ میں مسلمانوں کو حاصل ہوئی تھیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ اور یہ عروج و زوال کی گردشیں کیوں اس قدر باقاعدگی سے واقع ہوتی تھیں؟

قرون وسطائی اسلام کا یہ تاریخی ڈرامہ خاندانی اور قرابتداری سٹیج پہ چار پانچ نسلوں میں کھیلا جاتا تھا۔ پہلی نسل حملہ آوروں کی نسل ہوتی تھی جو فتح اور شجاعت، جہانگیری اور قیام وسلطنت کی تکمیلات حاصل کرتی تھی۔ دوسری نسل جہانداری، حکمرانی، نظم و نسق اور امن اور ترقیات کی تکمیلات دکھاتی تھی۔ تیسری نسل کے زمانے میں دولت و ثروت اور عیش و عشرت کی محفلیں انتہا کو پہنچتی تھیں۔ تکمیلات کا دور غیر تکمیلات اور خلاف تکمیلات میں بدل جاتا تھا جو انحطاط اور تنزل کی ابتدا ہوتی تھیں اور چوتھی نسل غفلت شعاری، کاہلی، لاپروائی وغیرہ کا شکار ہو جاتی تھی جو بدامنی، انتشار اور طوائف الملوکی کے دروازے کھول دیتی تھیں تب حکومت اور سلطنت چند دنوں کی مہمان ہوتی تھیں۔ جب کوئی نیا قبائلی حملہ آور سرحدوں پر نمودار ہوتا تو حکمران طبقے شکست و ہزیمت اٹھا کر ختم ہو جاتے اور نئے حکمران طبقے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیتے تھے۔ اس طرح ایک سیسفین چکر ختم ہوتا اور دوسرا شروع ہو جاتا۔ یہ تھی مختصر الفاظ میں اُن متعدد سلطنتوں اور حکومتوں کی تاریخ جو سلجوقیوں، عثمانیوں، منگولوں، تاتاروں، مصری مملوکوں، ہندوستان کے سلاطین دہلی اور مغل شاہنشاہوں اور ان کے افغان، ازبک اور نادر شاہی دشمنوں اور لاتعداد چھوٹے چھوٹے مسلم حکمرانوں نے عراق، شام، مصر،

ایران' ایشیا کوچک' وسط ایشیا' ہندوستان' عرب وغیرہ میں اور بربروں کے متعدد قبائل نے شمالی افریقہ اور مسلم ہسپانیہ میں المواربطین اور الموحدین نے بار بار دہرائی۔ ہمیں یہاں اس تاریخ کی تفصیلات کا ذکر نہیں کرنا' مگر اس معاشرے اور تہذیب و تمدن کا تجزیہ کرنا ہے جس میں یہ سیفین گردشیں واقع ہوتی تھیں تاکہ ہم دیکھیں کہ ان ڈراموں کے پیچھے کونسے عوامل اور محرکات کار فرما تھے[1]

اس تاریخی ڈرامہ کا آغاز ہمیشہ کسی خانہ بدوش قبائل سے ہوتا تھا جو صدیوں سے ایشیا

---

[1] مسلمانوں کی تاریخ نویسی میں ابن خلدون وہ پہلا اور آخری فلسفی تاریخ تھا جس نے خانہ بدوش قبائلیت کے اس تاریخی کردار اور رول کا تجزیہ کیا ہے۔ مگر وہ اپنے نظریاتی خول سے باہر نہ نکل سکا۔ جس کے باعث وہ مسلمانوں کی تاریخ میں ان کی انحطاط زدگی اور زوال پذیری کی صحیح توجیح نہ کر سکا۔ اس کی وجوہات یہ تھیں کہ اول تو وہ مسلمان معاشرے اور زندگی میں پردہ سسٹم کے انحطاط پذیر اثرات اور نتائج کو قطعی نہ سمجھ سکا' دوم' وہ مسلم معاشرے میں قرابتداری گردہوں اور قبائل کے انتشار پذیر رول کی جانب کوئی توجہ نہ دے سکا بلکہ سوم' وہ یہ سمجھتا رہا کہ بدوی یا خانہ بدوش قبائل اور ان کا عصبیہ اور انرجی ہی واحد تاریخ ساز قوتیں ہوتی ہیں۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ یہ قوتیں تو محض قرون وسطائی اسلام کی پردہ سوسائٹی اور تہذیب و تمدن میں ہی کار فرما ہوتی ہیں۔ اس کی غلط فہمی قرون وسطیٰ کے دوسرے مسلم مورخین کی نسبت زیادہ حیرت انگیز اور عجیب ہے کیونکہ انہیں اس غلطی سے بچنے کے لئے وہ مواقع نہ ملے تھے جو اُسے نصیب ہوئے ۔ ابن خلدون قرون وسطیٰ کے اُن معدودے چند مسلمانوں میں سے تھا جنہیں دارالاسلام یعنی دنیائے اسلام کی سرحدوں سے پرے جانے کا اتفاق ہوا۔ جب وہ ہسپانیہ میں غرناطہ کی مسلمان مملکت میں مقیم تھا تو ۱۳۶۴ء میں اُسے مسلمان اور عیسائی حکومتوں میں معاہدے کی غرض سے عیسائی ہسپانوی بادشاہ پیٹرواول سے سویل کے مقام پر ملاقات کی۔ یہ شہر ابن خلدون کے خاندان کا آبائی وطن تھا جہاں سے وہ تین چار نسلوں پہلے ہجرت کر کے تیونس چلے گئے تھے۔ عیسائی بادشاہ ابن خلدون کی ذہانت اور قابلیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اُسے سپین میں دوبارہ آباد ہونے کی دعوت دی اور اس کی آبائی جاگیر واپس کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر ابن خلدون نے یہ پیشکش مسترد کردی۔ اگر وہ اسے قبول کر لیتا اور چند سال عیسائی مملکت اور یورپ میں گزارتا تو وہ یورپی اقوام کی نوزائیدہ مملکتوں اور لوگوں کی ابھرتی ہوئی طاقت اور وسعت پذیری کا راز اور مسلم معاشرے اور تہذیب و تمدن کے سیفین چکروں کے عروج و زوال کے صحیح اسباب معلوم کر لیتا۔ اور وہ اس نظریہ تاریخ کی اندھی گلی سے باہر نکل آتا کہ تاریخ میں تمام وسعت پذیری اور ترقی صرف بدوی قبائلی انرجی اور تکمیلیت میں ہی پائی جاتی ہے جیسے کہ قرون وسطائی اسلام کی تاریخ کا ہی خاصہ تھا۔

یا افریقہ کے کسی صحرا، بنجر پہاڑوں یا وادیوں میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ اپنی صحرانوردی اور خانہ بدوش زندگی میں یہ قبیلے حرم اور پردہ جیسے رسم و رواج اور طور و طریقوں سے قطعی پاک ہوتے تھے اور غلاموں کنیزوں اور کثرت ازدواج کا بھی کوئی علم نہیں رکھتے

ان تاریخی عوامل کو نہ سمجھتے ہوئے ابن خلدون نے محض اُن حالات، واقعات اور تعصبات کو فلسفہ بنا دیا جو قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں جمے ہوئے تھے وہ "تمدن انسانی کے نئے سائنس کا بانی" تصور کیا جاتا ہے، مگر وہ انسانی معاشرے میں جنسی اور خاندانی قوتوں کے رول کا تصور نہیں رکھتا تھا جو انسانی معاشرے کی ارتقاء اور تاریخ تہذیب و تمدن کی نشو و نما اور ترقی یا تنزل میں حتمی اثر رکھتی ہیں۔ وہ صرف پدرسرداری قرابتداری تعلقات اور رجحانات کا تجزیہ تو خوب کر سکا، مگر غیر قرابتدار معاشرے اور تہذیب و تمدن کو نہ سمجھ سکا جو اس یورپ میں وجود میں آچکے تھے جس کے مطالعے اور تجزیے کے لئے وہ تیار نہ تھا۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں کے صدیوں پرانے تعصبات اور توہمات کو اپنا فلسفۂ تاریخ بنا دیا۔ اُن تعصبات کی چند مثالیں ابن خلدون کے الفاظ میں مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ "دیہاتی بہ نسبت شہریوں کے بھلائی و نیکی سے زیادہ قریب ہیں"۔ (مقدمہ ابن خلدون" صفحہ ۱۴۸)

۲۔ دیہاتی شہریوں سے زیادہ بہادر اور شجاع ہوتے ہیں۔ شہری عیش و عشرت کے گہوارا میں پلتے ہیں اور پرامن زندگی گذارنے سے شجاعت و بہادری کے جذبات ان میں ایسے مرجاتے ہیں کہ پھر وہ عورتوں اور بچوں کی طرح بزدل ہو جاتے ہیں اور یہ بزدلی ان کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے۔ اب دوسری طرف دیہاتیوں کا یہ حال ہے کہ۔۔۔۔ لڑائی بھڑائی ان کی عادت ہو جاتی ہے اور شجاعت ان کی خصلت بن جاتی ہے"۔ (مقدمہ صفحہ ۱۵۰ اور صفحہ ۱۰۴)

۳۔ جنگ و جدال میں فتح و نصرت ہمیشہ صحرانورد قبائل کو نصیب ہوتی ہیں اور شہری لوگوں اور ملکوں کو ہمیشہ شکست اور ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑتا ہے: وہ لکھتا ہے: "وحشی اقوام دوسری اقوام کے مقابلہ میں غلبہ و اقتدار جلد حاصل کر لیتی ہیں صفحہ ۱۶۴۔ "وحشی اقوام کا ملک بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے" صفحہ ۱۷۱)
تمدن و شہریت آبادی کے اختتام اور اس کی عمر کے خاتمہ کی نشانی اور اس کے زوال کا پتہ دیتی ہے" (صفحہ ۴۰۰)

ظاہر ہے کہ یہ خیالات اور نظریات ایسے لوگوں کے معاشرے میں ہی پائے جاتے ہیں جو ابھی قرابتداری نظام معاشرت و معیشت سے باہر نہیں نکلے۔ انسانی معاشرے اور تاریخ میں ہمیشہ شہر اور دیہات، شہر اور صحرا میں

تھے وہ سادہ لوح جفاکش، محنتی اور قناعت پسند لوگ ہوتے تھے جنہیں ان مہذب چیزوں اور رسم و رواج کے لئے نہ فرصت اور نہ فراغت میسر ہوتی تھی۔ ان کی عورتیں آزاد اور باعزت زندگی گزارتی تھیں۔ جیسا کہ ایک خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش ماحول میں ممکن ہو سکتا

تضاد اور کشمکش جاری رہی ہے۔ قبائلی معاشروں میں جو بنیادی طور پر صحرائی اور دیہاتی ابتدا اور نوعیت کے ہوتے ہیں، دیہات اور صحرا کو شہر اور قصبات پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر غیر قبائلی معاشروں میں شہر اور شہری طرز زندگی اور طرز فکر کو دیہات اور صحرائی زندگی پر غلبہ اور کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے۔ ابن خلدون جو قبائلی معاشرے اور تہذیب و تمدن کا دلدادہ تھا غیر قبائلی نظام معاشرہ کو نہ سمجھ سکا، بلکہ وہ اس کے وجود ہی سے بے خبر رہا اور ایسے غیر مانوس لوگوں اور معاشروں سے بیزاری اور لاتعلقی کا اظہار کرتا رہا۔ مگر یہ کمزوری صرف ابن خلدون تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ پردہ دار مسلم قوموں اور لوگوں میں ہمیشہ پائی جاتی ہے کیونکہ وہ غیر مانوس اور اجنبی لوگوں اور طرز زندگی اور فکر سے احتراز اور فرار کی طرف مائل رہتے ہیں۔

ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ کی دوسری خامی تاریخ انسانی کے ماکروسوشل عمل کی لاعلمی ہے۔ وہ نہ صرف قبائلی اور قرابتداری گروہوں کو انسانی زندگی اور معاشرے میں حرف آخر تصور کرتا ہے بلکہ ان تاریخی اور معاشرتی قوتوں کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے جو معاشرے اور تمدن کو عظیم تر اور وسیع تر کرتی ہیں، جن میں انسانی کردار، خاندان اور عورت کے رول اہم اور نمایاں ہوتے ہیں ایسے معاشرے میں فرد کو صحیح طور پر تشکیل بنانے کے لئے تمام قبائلی اور قرابتداری رشتوں اور بندشوں کو ختم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ فرد کی پیداواری اور تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے جو قوم اور معاشرے کو عظیم سے عظیم تر اور وسیع سے وسیع تر بناتی ہیں۔ ایسا معاشرہ ابن خلدون کے وقت میں یورپ میں جنم لے چکا تھا سپین، فرانس اور دوسرے یورپی ممالک میں قبائلی اور جاگیرداری معاشرہ نیست و نابود ہو رہا تھا اور ایک نیا اور جامع معاشرہ وجود میں آ رہا تھا جس میں مندرجہ ذیل ماکروسوشل تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں۔

۱۔ غلامی کا رواج ختم ہو گیا تھا۔ لہٰذا مرد اور عورت غلام نہیں ملتے تھے اور کنیزوں اور باندیوں کا رواج ختم ہو چکا تھا۔

۲۔ تعدد ازدواج کی بجائے یک زوجگی کو قانوناً خاندان کی بنیاد بنا دیا تھا، جس نے عورت کو خاندان زندگی اور معاشرے میں مرد کے مساویانہ حیثیت اور مواقع فراہم کر دیئے تھے۔ اس وجہ سے وہ معاشرے

تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی تمام سرگرمیوں میں اور مجلسوں اور مشوروں میں شرکت کرتی تھیں۔ ان قبائل میں یک زوجگی کا رواج ہوتا تھا کیونکہ عام قبائلی اتنا ضرورت مند اور تنگدست ہوتا تھا کہ ایک بیوی کو بھی مشکل سے کھلا پلا سکتا تھا۔ سالہا سال کی صحرانوردی ان قبائلی مردوں

میں زیادہ سے زیادہ پیداواری اور تخلیقی کام اور تکمیلات سرانجام دے رہی تھی۔ لہٰذا اس کی زندگی مسلمان عورت سے بالکل مختلف ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے ابن خلدون جو عورتوں کو بزدلی اور انحصار پسندی کا مجسمہ تصور کرتا تھا، یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ عورت کی یہ کمزوریاں بھی اُس معاشرے نے پیدا کی ہوتی تھیں جس میں وہ رہتی تھی۔ وہ مردوں کے بارے میں تو خوب سمجھتا تھا کہ اگر بدو "شہر" میں آکر بزدل بن جاتے تھے اسی طرح عورت بھی پدرسری قرابتداری پردہ سوسائٹی میں بزدل بن جاتی ہے۔ مگر جس معاشرے میں اسے آزادی، خود مختاری، خود انحصاری کے مواقع اور حالات ملیں جیسا کہ قرون وسطیٰ یورپ میں حاصل ہو گئے تھے تو وہ مسلمان عورت کی طرح بزدل، خوفزدہ اور لاچار ہستی نہ رہتی۔

۳۔ شہریت کو بدویت پر غلبہ اور اقتدار حاصل ہو گیا یعنی شہروں کی تہذیب و تمدن کو دیہات اور خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قبائل پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ جس نے مائیکرو سوشل تہذیب و تمدن اور قرابتداری نظام کو ختم کر دیا اور ماکرو سوشل طبقوں اور طرز زندگی اور طرز فکر کو غلبہ بخش دیا اور جاگیرداری اور قبائلی طوائف الملوکی کا خاتمہ کر دیا مگر یہ تبدیلیاں اور انقلابات ابن خلدون کے وہم و خیال میں بھی نہ آئے وہ "بدویت کا شہریت پر غلبے" کو اٹل غیر متغیر قانون گردانتا تھا جس کے مطابق "سلطنت رفتہ رفتہ بدویت سے نکل کر شہریت تک پہنچتی ہے" (مقدمہ صفحہ ۱۹۹) مگر چودھویں صدی کا یورپ جس کے مشاہدے اور مطالعے سے ابن خلدون نے اتنا احتراز کیا، اس سیفین چکر سے نکل چکا تھا۔ وہاں ایسے طبقے اور گروہ مثلاً تاجر طبقے اور اہل علم و سائنس پیدا ہو چکے تھے جنہوں نے یورپ میں قومیت جیسی ماکرو سوشل قوت پیدا کر دی تھی جس نے ترقی اور تکمیلات کی ایسی راہیں کھول دیں کہ یورپ اور دنیا کی تاریخ کا رخ موڑ دیا گو کہ یہ نئی قوت ابن خلدون کی وفات کے تقریباً ایک سو سال کے بعد پوری طرح بروئے کار آئی لیکن اگر وہ ان تمام تبدیلیوں اور ترقیات کا مشاہدہ کر لیتا تو تاریخ کو محض "بدویت سے شہریت اور شہریت سے زوال اور تباہی تک کا ابدی چکر نہ سمجھتا، بلکہ اُسے تکمیلیت اور ترقی کی کہانی سمجھتا جو انسانی کو ہمیشہ ہر نئے دور اور ہر نئے زمانے میں ترقی اور پختگی، خوشحالی اور بہتری کی جانب لیجاتی ہے۔ مگر ابن خلدون ترقی اور تغیر کے مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ قرون وسطائی اسلام کی محدود اور مسدود پردہ سوسائٹی کی پیداوار تھا، جس میں وسیع النظری، مثبت پیش بینی پہل اور ثابت قدمی جیسے اوصاف اور صلاحیتیں مفقود ہوتی ہیں۔

اور عورتوں، بچوں اور بڑوں میں جفاکشی، محنت، بردباری، جرأت مندی اور بہادری، بہل اور ثابت قدمی جیسی عادات اور خصائل پیدا کر دیتی تھی۔ پھر ان خانہ بدوش قبائل میں بعض اندرونی اور بیرونی واقعات کے باعث جن کی تشریح یہاں ضروری نہیں، ایسی حرکت پیدا ہوتی تھی، جو انہیں صحرانوردی کی بجائے اپنے قریب یا دور متمدن ممالک یا اقوام کی جانب رواں کر دیتی تھی۔ جوں جوں وہ ان ممالک اور علاقوں کی سرحدوں کے قریب پہنچتے تھے، اتنی ہی زیادہ اُن کی عادات و اقدار، اخلاق و کردار، طرز معاشرت اور معیشت میں تبدیلیاں اور تغیرات پیدا ہوتے تھے۔

خانہ بدوش قبائل کی پیش قدمی

دارالاسلام کی سرحدوں کے جانب روانہ ہونے سے پہلے ان خانہ بدوش قبائل میں قبائلی اقدار، اور اخلاق و عادات پائی جاتی تھیں مگر جب وہ متمدن امیر اسلامی ممالک کی طرف کوچ شروع کرتے تو لوٹ مار اور غارتگری کے عادی بنتے جاتے تھے اب اُن کا ہر مرد خونخوار جنگجو بن جاتا تھا۔ جو زر، زن اور زمین کے لئے ہر قسم کے شبخون اور جنگ کے لئے تیار رہتا تھا، اب اس کے ہاتھ میں تلوار اور نیزے تھے جن سے وہ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے ہر ایک دشمن اور مخالف کا قلع قمع کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اب اسکی عورت، جو پہلے اسکی ہمسر اور آزاد ساتھی ہوتی تھی، محکوم اور معذور چیز بن گئی، جس کا مقابلہ ان عورتوں سے تھا جنہیں اسکے خاوند نے شبخون یا جنگ کے میدان میں پکڑا تھا اور اپنے خیمے میں ڈال دیا تھا۔ ان چیزوں کیلئے پیش قدمی کرتے ہوئے قبائل کے سردار اور سرخیل نہ صرف باہمی خانہ جنگیوں اور لوٹ مار میں مشغول رہتے تھے، بلکہ دوسرے قبائل اور اقوام کی عورتوں، زمینوں اور زر و دولت کو بھی لوٹتے، اکٹھا کرتے اور قبضہ کرتے رہتے تھے۔ اور کبھی کبھی نیم خانہ بدوش یعنی نیم سکونت پذیر زندگی بھی اختیار کر لیتے تھے۔ مگر بالآخر اُن کا رجحان متمدن اور دولتمند لوگوں اور علاقوں کی طرف بڑھنے کا رہتا تھا جن میں زیادہ تر مسلم لوگ، علاقے اور ممالک ہوتے تھے، جنہیں دارالاسلام کہا جاتا تھا جیسا کہ خلافت عباسیہ کے انتشار کے بعد اسلامی دنیا بن گئی تھی۔

ان حالات میں ان جنگ جو قبائل کی عادات، کردار، تصورات اور اقدار یکسر بدل جاتی تھیں۔ اب ان میں پہلے کی طرح شرم و عزت کے معنی دوسروں کے مال، آبرو اور جان کا احترام اور اعانت نہیں بلکہ ان پر قبضہ اور تصرف حاصل کرنا ہو گیا تھا۔ اب ان میں شرم و عزت

کے معنے عورتوں کی عزت اور حفاظت نہیں بلکہ انہیں پابندی اور قبضے میں رکھنا ہو گیا تھا بلکہ اپنے دشمنوں کی عورتوں کی پکڑ دھکڑ باعث عزت تصور کرنے لگے تھے[۱] پہلے انہیں اپنی عورتوں کا پبلک میں آزادانہ آنے پر کوئی اعتراض اور عار نہ ہوتا تھا، مگر اب ایسے آنا بے عزتی اور باعث شرم تصور کیا جانے لگا۔ پہلے عزت و شرم کے معنی محنت، کوشش اور پیہم سعی سے روزی کمانا تھے، مگر اب غضب اور زبردستی سے روزی حاصل کرنا باعث عزت و فخر، اور محنت و مشقت سے روزی کمانا باعث شرم بن گیا تھا، تاہم اب یہ قبائلی بڑے جانباز، دلیر، نڈر جنگ جو اور شجاع مرد بن جاتے تھے، جو جنگ و جدال کے سب داؤ پیچ سے خوب واقف اور ہر جنگی حیلے اور مکر و فریب کے خوب ماہر بن جاتے تھے۔ اپنے سردار اور سرخیل کی اطاعت اور فرمان برداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ اور اس کے ایک اشارے پر اپنی جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن میں اپنے قبیلے اور نسب کا فخر اور تکبر بھی خوب پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ اب قرار بداری معاشرے کے تمام اوصاف یعنی تفاخر، زبردستی ابتلا، خود غرضی، علیحدگی پسندی، جبر و ظلم کی عادات اور رجحانات کے حامل ہو جاتے تھے پس ان عادات و خصائل کے ساتھ وہ دارالاسلام کی سرحدوں پر پہنچتے تھے، جہاں وہ اکثر و بیشتر اسلام بھی قبول کر لیتے تھے، مگر اس کے باوجود انہیں اسلامی ممالک کو تاخت و تاراج کرنے میں کوئی عار نہ ہوتا تھا۔ ادھر دارالاسلام میں ایسے حکمرانوں اور حکمران اہلیت کی علمداری ہوتی تھی جو انحطاط اور تخریب کی انتہا کو پہنچی ہوتی تھی۔ لہٰذا اکثر و بیشتر ایک دو جنگوں ہی سے فتح و شکست کا فیصلہ ہو جاتا، پرانے حکمران طبقے شکست و ہزیمت اٹھا کر فنا و برباد ہو جاتے اور حملہ آور قبائل اُن کے تخت و تاج، محل و حرم، زر و مال، زمینیں اور دولت پر قابض ہو کر ایک نئی حکومت اور حکمران اہلیت کی بنیاد رکھ دیتے تھے۔ اس طرح ایک نیا سیفین چکر شروع ہو جاتا جو حرم سسٹم کے باعث عموماً تین چار نسلوں میں پورا ہو جاتا تھا۔

---

[۱] حملہ آور قبائل کے کردار میں اس تبدیلی کی ایک مثال چنگیز خان کے منگولوں کی تاریخ میں ملتی ہے۔ ایک مرتبہ چنگیز خان نے اپنے سرداروں سے دریافت کیا کہ دنیا میں سب سے بڑی خوشی کیا ہوتی ہے؟ کسی سردار نے کہا شکار اور کسی نے کہا لوٹ مار۔ مگر چنگیز خان نے کہا نہیں، سب سے بڑی خوشی آدمی کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنے دشمنوں کو مغلوب کرتا ہے، ان کے گھوڑوں اور مال و دولت کو لوٹتا ہے اور ان کے چہروں پر آنسو بہتے دیکھتا ہے۔ جب اُن کے عزیزوں اور پیاروں کو ختم کیا جا رہا ہو اور ان کی بیویوں اور بیٹیوں کو اپنے بازوؤں میں دبایا جا رہا ہو۔ دیکھئے، رمائیکل پراون "دی منگول ایمپائر" ص ۷۰۔۷۱ (انگریزی میں)

۱۔ پہلی نسل اور اس کی تکمیلات

نئے حکمران

فتح اور کامرانی قبائلی فاتحین کی کایا پلٹ دیتی تھی۔ اب وہ حکمرانوں اور جاگیرداروں کے طبقے بن جاتے تھے۔ اب انہیں وہ جوہر دکھانے کے موقعے ملتے جو انہوں نے اپنی سابقہ خانہ بدوش قبائلی جنگ و جدال میں اپنا لئے تھے، جن میں نہ صرف فوجی اور سپاہیانہ صلاحیتیں اور اوصاف ہی تھے بلکہ حکومت اور حکمرانی، تنظیم اور نظم و نسق کی صلاحیتیں اور خوبیاں بھی شامل ہوتی تھیں جو خاص طور پر اُن کے سرداروں میں پائی جاتی تھیں۔ یہ نئے حکمران جلد ہی اپنے مفتوحہ ملک اور لوگوں میں امن و امان قائم کر دیتے تھے جو سابقہ انحطاط زدہ حکمرانوں کے زمانے میں مفقود ہو چکا تھا اس طرح نئے حاکم، سلطان یا بادشاہ اپنے محکوم رعایا کا اعتماد حاصل کر لیتے۔ ڈاکوؤں اور راہزنوں کا قلع قمع کر کے راستے اور شاہراہ دوبارہ کھول دیتے، لوگوں کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ ہو جاتے، بازار، منڈیاں، میلے اور کاروبار دوبارہ شروع ہو جاتے، صنعت و حرفت پھر بحال ہونے لگتیں، تاجر اور سوداگر، کاریگر اور دکاندار پھر اپنا کام شروع کر دیتے اور ملک میں پھر امن چین اور خوشحالی کا دور دورہ شروع ہو جاتا۔ دور دراز صوبوں اور علاقوں میں بھی لوگ اطمینان کا سانس لیتے اور نئے حکمرانوں کے گن گانے شروع کر دیتے تھے۔

نئی فیوڈل ایلیٹ

نئے حکمران اپنے قبائلی لشکریوں، سرداروں اور ساتھیوں کو کبھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ فتح، غلبہ اور تسلط کے ساتھ ساتھ، جب شکست خوردہ ایلیٹ کا صفایا ہو جاتا تھا، تو وہ اُن کی زمینوں، جاگیروں اور جائیداد وغیرہ کو اپنے سرداروں اور ساتھیوں وغیرہ میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ہر سردار اور لشکری کو اس کے رتبہ اور کارناموں کے مطابق یا قرابتداری رشتے اور رسائی کے مطابق جاگیریں اور وظیفے عطا کر دیئے جاتے تھے۔ اس طرح وہ نئے جاگیردار، مقطعی (اقطاعدار)، تیمار دار، ضعیم اور صوبیدار وغیرہ بن جاتے تھے اور وسیع زمینیں گاؤں، علاقے، اور صوبے اُن کے زیر اثر اور تصرف میں آجاتے تھے، اور وہ نئی فیوڈل ایلیٹ بن جاتے تھے، اس طرح وہ لوگ جو کچھ عرصہ پہلے کسی صحرا میں غلہ بانی کرتے تھے اب وسیع میدانوں اور خطوں میں آباد ہو کر سیاہ و سفید کے مالک بن جاتے تھے۔ مگر یہ جاگیرداری نظام قبائلی نوعیت

سب کچھ چھین لے جائے اور اگر چاہے تو ہماری بسر اوقات کے لئے بھی ہمارے پاس کچھ نہ چھوڑے اور دوسری طرف جاگیر دار اور صوبیدار اور مستاجر یہ سوچتے ہیں کہ ہم کیوں افتادہ اور ویران زمین کا فکر کریں اور اپنا روپیہ اور وقت اس کے بارآور بنانے میں لگائیں، کیونکہ نہ معلوم کس وقت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور ہماری کوشش اور محنت کا ثمرہ نہ تو ہم کو ہی حاصل ہو اور نہ ہماری اولاد کو۔ پس زمین سے جو کچھ وصول ہو سکے کرلیں اور ہماری بلا سے، کاشتکار بھوکے مریں یا اجڑ جائیں اور جب ہم کو اس کے چھوڑ دینے کا حکم ملے گا تو ویران اور غیر آباد چھوڑ کر چلے جائیں گے[1]

برنیر کے نصف صدی کے بعد ۱۷۲۰ء میں مغلیہ خاندان کے ایک آخری مورخ محمد ہاشم خافی خان نے اپنی کتاب "منتخب اللباب" میں اکبر کے عہد کی خوش انتظامی اور زمینداروں کی رعیت پروری اور عمدہ انتظامات کا ذکر کرنے کے بعد اپنے وقت کے بادشاہ اورنگ زیب کے بیٹے اور جانشین محمد شاہ المعروف رنگیلا شاہ کے عہد میں جاگیرداروں اور مالگزاروں کی خلاف تہذیب لوٹ کھسوٹ کو یوں بیان کیا ہے:۔

"اس زمانے میں کچھ ایسی وضع بدلی ہے کہ لوگوں نے امور ملکی میں غور و خوض کو بالکل ترک کر دیا ہے۔ ملک کو آباد رکھنے کے لئے ذرائع پر غور نہیں کیا جاتا رعایا کی پرورش و نگہداشت کا کسی کو خیال نہیں ملک کی آمدنی اور محاصل میں اضافہ کی فکر نہیں کی جاتی۔ یہ اجارہ دار حاکم اور عمال دربار میں بڑی بڑی رقمیں

---

[1] ایضاً۔ ص ۲۰۳-۲۱۔ برنیر نے جاگیرداروں اور صوبیداروں کی طرز استدلال کا جو ذکر کیا ہے اس کی جڑیں قرابتدارانہ نظام کی خاندانی زندگی "حرم" تعدد ازدواج اور کنیز داشتگی اور ان قوانین وراثت و ملکیت میں ملتی ہیں جو قرون وسطائی اسلام کا معاشری اور شرعی نظام اور نظریہ تھے۔ لہٰذا ان خرابیوں اور تخریب کاریوں کا انسداد جو قرون وسطائی مسلم جاگیرداریت کا لازمی جزو تھے، محض شخصی بادشاہت کے بس کا روگ نہیں تھا، صرف قرون وسطائی یورپین فیوڈلیزم نے ایسی تکمیلی اداروں کے ذریعے جیسے یک زوجگی، خلف اکبر کی وراثت کا اصول، آزادی، نسواں نے اس خلاف تکمیل قرابتدارانہ نظام سے چھٹکارا حاصل کیا۔

باندھ کر عہدے حاصل کرتے ہیں اور اپنی جاگیروں اور پرگنوں پر جانے کے بعد اپنی رقمیں رعایا سے اگلوانے کے لئے، طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھاتے ہیں۔ اور غریب محصول ادا کرنے والی رعیت پر وبال بن جاتے ہیں۔ اُن کو قطعاً اپنے ملک کی آبادی اور خوشحالی کی فکر نہیں نہ وہ غریب رعیت کے دکھ درد کا کچھ خیال کرتے ہیں۔ چونکہ ان کا بھروسہ نہیں رہتا کہ وہ مزید ایک سال بلکہ سال بھر بھی اپنے عہدہ پر برقرار رہ سکیں گے اس لئے وہ پیداوار کے دونوں حصے فروخت کرا کے اپنا محصول وصول کر لیتے ہیں اور رعیت کے پاس کچھ نہیں چھوڑتے۔ اگر وہ اس ظلم پر اکتفا کر لیں اور کسانوں کے ہل بیل کو فروخت نہ کرائیں اور رعیت کے باقی ماندہ مال کو بلکہ میوہ دار درختوں اور ان کی موروثی اور ملکی زمین کو ٹھیکے نہ لگا دیں۔ تو یہ اُن کی بڑی خدا ترسی کا ثبوت ہوگا۔ غرض یہ رعایا کا حصہ غصب کر کے دربار کے نذرانے سہ بندی کی رقم وصول کرتے اور اجارہ داری کا نقصان پورا کرتے ہیں۔[۱]"

جاگیرداروں اور منصب داروں کے براہ راست استحصال کی تباہی اور بربادی کی رہی سہی کسر ڈاکوؤں، راہزنوں اور ٹھگوں کے گروہ مٹا دیتے تھے جو اس غیر تکمیلی معاشرہ کے دور انحطاط میں حشرات الارض کی طرح پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ جاگیرداری نظام اپنے تباہ کن نتائج میں اضافہ کر کے وسیع علاقوں، زمینوں اور دیہات کو بنجر اور بیابان بنا دیتا تھا۔ خافی خان لکھتا ہے:

"یہ تو ان حاکموں اور جارہ داروں کا ظلم تھا۔ اُن کے آگے بڑھتے ہی پیچھے سے ایک اور مصیبت جو آتی وہ اس علاقہ کے فتنہ پردازوں کی ٹولی ہوتی ہے جو لوٹ مار کر کے ملک کی بربادی اور رعایا کی تباہی پر مہر لگا دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ دس دس، بیس بیس کوس تک زمین غیر مزروع اور ویران پڑی ہے۔ کھیتی باڑی کی بجائے ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ ہیں جو مسافروں کا دامن کھینچتے اور ان

---

[۱] ہاشم علی خافی خان 'منتخب اللباب' حصہ اول' صفحہ ۱۸۸۔ مترجم محمود احمد فاروقی نفیس اکیڈمی۔ کراچی ۱۹۶۳ء۔

بے سرو پا جاگیرداروں کے دل میں نشتر بن کر کھٹکتے ہیں۔ بیشتر زرخیز پرگنے اور قصبے ان بدبخت حاکموں کے ظلم و تعدی سے ویران اور برباد ہو گئے ہیں کتنے ہی دیہات ہیں جو اس درجہ خراب اور بے چراغ کر دیئے گئے ہیں کہ اس طرف کا راستہ بھی چلنے کوئی تیار نہیں ہوتا۔"[۱]

عالم اسلام میں جاگیرداریت کی تباہ کاریوں سے موات کا بار بار واقع ہونا

ہم نے خلافت عباسیہ کے دور انحطاط کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس دور میں آباد اور زرخیز زمینیں بنجر ہو کر "موات" بن گئیں، دیہات اُجڑ گئے، زرخیز علاقے بیابان بن گئے اور قصبے اور شہر برباد ہو گئے۔ اس طرح اسلام اولیٰ کی عظیم تکمیل (یعنی صحراؤں کا نخلستان میں تبدیل کرنا) پامال ہو گئی۔ بعینہ یہ تکمیل اور غیر تکمیل کے چکر، جنہیں ہم نے "سیفین گردشیں" کہا ہے، بار بار مسلمانوں کی قرون وسطیٰ کی تاریخ میں دہرائے گئے۔ خانہ بدوش قبائل کی فاتح اہلیت کی پہلی نسل نے بنجر زمینوں کو زرخیز بنایا، نئے نئے گاؤں آباد کئے، نئے قصبے اور شہر تعمیر کئے، پرانے قصبوں اور شہروں میں زندگی کی نئی روح پھونک دی اور تہذیب و تمدن کی متعدد ترقیاں حاصل کیں، مگر اُن کی فرانبدارانہ اور خاندانی طرز معاشرت و معیشت نے ایک دو نسلوں کے بعد ایسی اہلیت کو جنم دیا جو تمام تکمیلی قوتوں سے خالی ہوتی تھیں اور صرف براہ راست استحصالی جاگیرداریت کے ظلم و تعدی سے اپنے آپ کو قائم رکھ سکتی تھیں۔ لہٰذا وہ ایسے غیر معقول اور انسانیت سوز مظالم اور تباہ کاریوں کے عادی ہو جاتے تھے جن سے وہ اپنے بزرگوں کی تکمیلات کو اندھا دھند پیمانے پر تباہ و برباد کر دیتے تھے۔ جن کا ہلکا سا نقشہ ہم نے اوپر چشم دید شاہدوں کی زبانی بیان کیا ہے۔ ان کے نتیجے میں مسلمان حکومتوں اور مملکتوں پر تباہی، بربادی اور زوال کے بادل چھانے لگ جاتے تھے۔ یہ کیفیت سترہویں اور اٹھارویں صدی میں تمام عالم اسلامی پر طاری تھی۔ برنیر جس نے نہ صرف مغلیہ سلطنت کے گوشے گوشے میں سیر کی بلکہ ایران و ترکستان سے تمام مصر تک سیر و سیاحت

---

[۱] ایضاً صفحہ ۱۸۸۔

کی ان ممالک اور حکومتوں کی زوال پذیری کے بارے میں لکھتا ہے:

"پس جو حقائق میں نے بیان کئے ہیں وہ اس امر کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ ایشیائی سلطنتیں جلد جلد کس طرح زوال پذیر ہوتی ہیں اور حکومت کی اسی ناقص طریقہ کا یہ نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے بہت سے شہروں کے مکانات کچے اور گھاس پھوس وغیرہ سے بنے ہوئے ہیں۔ اور یہاں کے شہر اور قصبے خواہ بالفعل خستہ حال اور ویران نہ ہوں مگر ایسا کوئی بھی نہیں کہ جس میں جلد تباہ اور خراب ہو جانے کے آثار نہ پائے جائیں۔ اور ہندوستان ہی پر کیا منحصر ہے یہ تو ہم سے ایک بہت دور کی سلطنت ہے۔ ہم اپنے قریب ہی کے بعض ایشیائی ملکوں کی حالت کا مقابلہ کر کے شخصی حکومتوں کے بے رحمانہ برتاؤ کے نتیجوں کی نسبت اپنی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ مثلاً دریائے دجلہ اور فرات کے دوآبے کو اور ایشیائے کوچک اور فلسطین اور انطاکیہ کے قرب وجوار کے عمدہ میدانوں اور بہت سے اضلاع کو دیکھ لیجئے کہ قدیم زمانہ میں کس کثرت سے زراعتیں ہوتی تھیں اور کیسے زرخیز اور آباد تھے اور اب ویران پڑے ہیں بلکہ ان کے بہت سے حصے دلدل ہو جانے اور آب وہوا کی خرابی سے انسان کی بودوباش کے بھی قابل نہیں رہے۔ یہی اندوہناک صورت مصر کی دکھائی دیتی ہے جہاں کی رعایا غلامانہ حالت میں ہے اور اسی برس کے عرصہ میں یہ بے نظیر ملک دسویں حصہ سے زیادہ ویران ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس مدت میں کسی نے دریائے نیل کی نہروں کی کچھ خبر نہیں لی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ دریا اپنے معمولی پاٹ کے اندر نہیں بہتا اور نیچی زمینیں بالکل غرقاب ہو جاتی ہیں اور ریت سے اس قدر اٹ گئی ہیں کہ بغیر بہت سے روپے اور محنت کے صاف نہیں ہو سکتیں پس ایسی حالت میں کیا کچھ تعجب کی بات ہے؟ کہ ان ملکوں میں صنعت وحرفت کو ویسی ترقی نہ ہو جیسی کہ ہمارے خوش نصیب فرانس اور ان ملکوں میں ہے جہاں کا طرز حکومت عمدہ ہے"[1]

---

[1] ڈاکٹر برنیر۔ ایضاً ص ۳۲۲

ایک انڈین مسلم خاتون مورخ، حمیدہ خاتون نقوی نے مغلیہ دور کے شہروں کی آبادی اور صنعت وتجارت کا خاص مطالعہ کیا ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ سترہویں صدی میں متعدد نئے شہر اور قصبے آباد ہوئے جو اس وقت کی اقتصادی ترقی اور خوشحالی کا ثبوت ہے مگر اٹھارویں صدی کے وسط سے نہ صرف یہ ترقی روک گئی، بلکہ لاہور سے آگرے تک اور سورت سے گوالیار تک تباہی اور بربادی پھیل گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ مغلیہ سلطنت کے انحطاط اور انتشار کا دور تھا جب مغل حکمرانوں یعنی اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں کے عہد کی مغل ایلیٹ میں مرہٹوں سکھوں اور دوسرے سرکش عناصر کے خلاف جد وجہد کرنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی اور نہ ہی اپنے باغی صوبے داروں اور حکام کی سرکوبی کرنے کی صلاحیت باقی رہی تھی۔ لہٰذا وہ ہر صوبے اور ہر میدان جنگ میں شکست اور ہزیمت اٹھا رہے تھے اور پسپا ہو رہے تھے۔ تاہم وہ مزید لکھتی ہے کہ آگرے کے مشرق میں لکھنو اور مرشد آباد کی نئی مسلم مملکتوں میں نئے شہر آباد ہو رہے تھے[۱]۔ مگر یہ ترقی عارضی ثابت ہوئی، کیونکہ ان نئی مملکتوں میں حکمران طبقوں کا سسیفین چکر ایک دو نسلوں میں ہی انحطاط زدہ ہو گیا جس کا انگریز سامراجیوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ان مملکتوں کو اپنے تسلط میں لیکر خاتمہ کر دیا۔

یہی کیفیت ساری دنیائے اسلام کی تھی، مثلاً سترہویں اور اٹھارویں صدیوں میں سلطنت عثمانیہ کے مختلف صوبوں میں بھی قصبوں اور دیہات میں موات جیسی تباہی اور ویرانی پھیل رہی تھی[۲]۔ غرضیکہ پردہ، تعدد ازواج اور کنیز داشتگی اس طرح سسیفین گردشوں کو جنم دیتے تھے کہ جہاں جہاں قرون وسطائی مسلم معاشرہ پھیلتا، وہاں وہاں بالآخر تباہی اور بربادی پھیل جاتی اور وسیع وعریض علاقے موات اور یاغستان یا سرکش اور نافرمان قبائل کی سرزمین بن جاتے تھے[۳]۔

۱؎ حمیدہ نقوی "یو۔پی میں شہروں کا فروغ ۱۵۵۰ تا ۱۸۰۰" جرنل آف اکنامک اینڈ سوشل ہسٹری آف دی اورینٹ۔ نمبر ۱ پارٹ (۱ (انگریزی میں)

۲؎ ایچ۔ اے۔ آر۔ گب اینڈ ہر لڈ بوین "اسلامک سوسائٹی اینڈ دی ویسٹ" جلد اول حصہ اول۔ صفحات ۲۵۷، ۲۵۸ اور ۲۷۰ تا ۲۷۱۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔ لندن۔ ۱۹۵۱۔

۳؎ "یاغستان" ایسے علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں خانہ بدوش اور سرکش قبائل کسی مرکزی حکومت کے تابع نہ رہیں اور غارتگری یا لوٹ مار کی زندگی گزاریں۔ قرون وسطائی اسلامی سلطنتوں میں متعدد علاقے پہلے "موات" اور پھر "یاغستان" بن جاتے تھے۔

انحطاط پذیر مسلم معاشرہ میں نئے تکمیلی خون کا نفوذ

اگرچہ قرون وسطیٰ میں سیفین مسلم معاشرہ میں دوسری نسل ہی سے انحطاط و تنزل کے آثار ہر طرف نمودار ہو جاتے تھے، مگر بسا اوقات کوئی اسلامی مملکت چار نسلوں کے بعد بھی سلامت رہتی تھی۔ جیسا کہ جنوب ایشیائی برصغیر میں مغلیہ سلطنت اور مغربی ایشیا میں سلطنت عثمانیہ کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان مملکتوں میں بعض نئی تکمیلی قوتوں کا نفوذ ہو جاتا تھا جو غیر تکمیلی افراد اور گروہوں کی جگہ لے کر ان مملکتوں اور معاشروں کے سیفین چکروں کو چار نسلوں کی حدود سے آگے بڑھا دیتی تھیں۔ ان نئی قوتوں میں وہ تکمیلی افراد اور گروہ شامل ہوتے تھے جو تقریباً ہر سال اسلام قبول کر کے اپنے نئے مذہب اور معاشرے کی تکمیلی جد و جہد میں شریک ہو جاتے تھے۔ اسی جد و جہد میں وہ نو وارد مسلمان بھی شامل ہو جاتے تھے جو قبائلی اور نیم قبائلی علاقوں اور ملکوں سے ہجرت کر کے جاگیر دارانہ اور ترقی یافتہ مسلم مملکتوں میں معاش اور منصب یا جاگیروں کی تلاش میں یا تجارت کی غرض سے آتے تھے۔ یہ لوگ ایسے مہم باز اور باہمت ہوتے تھے کہ بادشاہوں اور امراء وغیرہ کے ہاں ملازمت اختیار کر کے یا اپنی تکمیلی صلاحیتوں سے یا اپنے فرانبرداروں اور دوستوں کے توسل اور مدد سے مختلف عہدوں اور منصبوں پر فائز ہو جاتے تھے اور زمینیں اور جاگیریں حاصل کر لیتے تھے یا تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ دیتے تھے۔ اس طرح اپنی تکمیلی صلاحیتوں اور خوبیوں سے انحطاط پذیر معاشرے کی پیداواری اور تخلیقی قوتوں میں دوبارہ نئی جان ڈال دیتے تھے۔ مگر ایک دو نسلوں کے بعد ان نو مسلم اور نو وارد خاندانوں میں بھی تعدّدِ ازواج، کنیز داشتگی، پردہ اور حرم کے نظام وہی کمزوریاں اور خرابیاں پیدا کر کے ان کو بھی وہی تخریب و انحطاط، ذلت اور خواری کا شکار بنا دیتے تھے جو اُن سے پہلے خاندانوں اور گروہوں کا انجام ہوتا تھا۔ یہ وجہ ہے کہ قرون وسطائی اسلامی معاشرے میں کوئی خاندان اپنے تکمیلات کے سلسلے کو ایک دو نسل سے زیادہ عرصے جاری نہیں رکھ سکتا تھا، جس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے قعرِ مذلت اور گمنامی میں چلا جاتا تھا۔ ڈاکٹر برنیر مغل معاشرے کی اخلاقی اور کرداری زبوں حالی اور کمزوریوں کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"شہنشاہ ہند کو یہ بات میسر نہیں ہے کہ ملازمت کے لئے اپنی رعایا میں سے ایسے لوگوں کو منتخب کر سکے جو قدیمی رئیس زادے اور خاندانی امیروں اور شریفوں کے لڑکے اور بڑے بڑے کارخانہ داروں اور متمول سوداگروں کے بیٹے پوتے ہوں اور جنہوں نے بخوبی تعلیم پائی ہو اور اپنی عادات اور اطوار میں معقولیت اور سنجیدگی کا بدرجہ اعلیٰ خیال رکھتے ہوں اور جن کو اپنے بادشاہ سے محبت ہو اور دلیری اور دلاوری کے کاموں سے اپنے خاندان کی ناموری اور شہرت بڑھانے کے لئے مستعد اور بوقت ضرورت اس قابل ہوں کہ اپنی گرہ سے کھا کر دربار یا فوج میں بخوشی کام دے سکیں اور کسی اچھے وقت کی امید پر صرف بادشاہ کے ہنس کر بول لینے اور شاباش کہہ دینے پر قانع ہوں۔ بلکہ بجائے اس قسم کے لوگوں کے شہنشاہ ہند کے اردگرد جاہل اور وحشی غلام یا وہ خوشامدی لوگ رہتے ہیں جنہوں نے بہت ہی ادنیٰ اور ذلیل حالت سے درجۂ اعلیٰ پر ترقی پائی ہے اور جو وفاداری اور حب الوطنی اور معقولیت اور مردانگی اور عزت داری کے خیال سے بالکل خالی اور ناقابل برداشت غرور و تکبر سے بھرے ہوئے ہیں[۱]۔"

اس انحطاط پذیر صورتحال کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ بالآخر ایسا وقت آتا کہ نو مسلم اور نووارد افراد اور خاندان بھی اپنی تکمیلی قوتوں کے باوجود انحطاط زدہ معاشرے کی مردہ لاش میں نئی روح پھونکنے سے قاصر ہو جاتے تھے۔ تب وہ بھی پرانی مملکت اور معاشرہ کو چھوڑ کر مخالف طاقتوں سے مل جاتے تھے یا اپنے لئے خود کوئی نیا مقام پیدا کر لیتے تھے۔ مگر ہر دو صورتوں میں وہ پرانے مسلم معاشرہ اور مملکت میں انتشار اور زوال کے رجحانات کو بڑھا دیتے تھے مثلاً مغلیہ سلطنت کے حصے بخرے کرنے میں چھوٹے چھوٹے مہم بازوں کا تو کیا ذکر مشہور شخصیتوں میں

---

[۱] برنیر "شاہجہان کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب" صفحہ ۳۲۷

علی وردی خان نے بنگال میں، آصف جاہ نظام الملک نے دکھن میں اور سعادت خان نے اودھ میں یہ رول ادا کیا تھا۔ بہرکیف، جب نومسلم اور نو وارد افراد اور گروہ بھی اپنی تکمیلی قوتوں کو پرانے معاشرے اور مملکت کی تخریب کاری اور بیخ کنی میں لگانے لگتے تھے تو سیفین چکر کی چوتھی یا آخری نسل کا وقت آپہنچتا تھا۔

۴۔ چوتھی نسل اور سیفین سائکل کا دورِ زوال و سقوط

مخرب اخلاق و کردار خاندانی ماحول

سیفین اہلیت کی آخری نسل ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی تھی جو کاہلی، لاپرواہی، مفت خوری اور حرم سرا کے عیش و عشرت میں غرق ہوتے تھے۔ اس نسل کے تقریباً سب افراد کنیزوں، باندیوں اور حرم سرا کے لونڈیوں کی اولاد ہوتے تھے، جن میں اپنے اسلاف اور بزرگوں کے تمام تکمیلی صلاحیتوں اور اوصاف کا فقدان ہوتا تھا۔ اب وہ صرف غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی عادات، خصائل، نظریات اور عقائد کے مالک ہوتے تھے۔ خافی خان، جو مغلیہ سلطنت کی تاریخ کے دورِ انحطاط میں گزرا ہے اپنے چشم دید مشاہدات کی بنا پر اپنے زمانے کی نسلوں کے بارے میں لکھتا ہے:

"ہمارا یہ زمانہ تو خاص طور پر قابل نفرین ہے کہ اس میں انسانیت، ہنرمندی اور مروت کا تو نام نشان تک باقی نہیں رہا ہے۔ امیرزادوں کا یہ حال ہے کہ ہوشیار اور متعدد استاد مدتوں ان کی تربیت میں وقت ضائع کرتے ہیں، پھر بھی وہ انسانیت کے طریقہ سے اس قدر بیگانہ رہتے ہیں کہ وہ جب بھی نظر آتے ہیں تو مادر آزار، پدر بیزار اوباشوں کی صحبت میں نظر آتے ہیں۔ صاحب کمال باوقار نیکوکار دانشمندوں کے سایہ سے بھی بھاگتے ہیں۔ ان کی ساری استعداد اور ہنر گانے بجانے طنبورہ نوازی دھرپت کبت اور دوہرہ کی سمجھ تک محدود رہتی ہے۔ دوسرے کمالات کا حصول ان کے نزدیک محض دردِ سر ہے۔ اُن کے والدین تحریر و تعلیم

کے لئے عالم و فاضل ملاؤں کو زرِ خطیر صرف کر کے متقرر کرتے ہیں اور ان کو لکھنا پڑھنا بخوبی آجاتا ہے مگر اس کے باوجود کبھی کتاب اُن کے ہاتھ میں نظر نہیں آئے گی۔ تفسیر و حدیث، لغت اور تاریخ کا مطالعہ خط نویسی اور مضمون نگاری کی مشق کو وہ ایک فعل عبث اور لاحاصل مشغلہ سمجھتے ہیں۔ اپنے آباؤ اجداد کے نام کو ایک خط کشیدہ عبارت کی طرح زمانہ کے صفحات پر سے مٹتے جا رہے ہیں۔ اور گردش لیل و نہار کے معمولی سے وقفہ کے بعد خود بھی ہمیشہ کے لئے گمنام ہو جانے والے ہیں[1]۔

درحقیقت، چوتھی یا آخری نسل کے کردار و عادات کی خرابیوں اور کمزوریوں کا علاج استادوں کی تعلیم و تربیت کے بس کا روگ نہیں تھا۔ کیونکہ ان کی جڑیں اسلامی معاشرے کے خاندانی نظام میں گڑی ہوئی تھیں جو عورت کی تحقیر او تذلیل اور مرد کے مطلق العنان غلبے اور ہوس رانی کی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ یہ نسل استاد اور آتالیق کے پاس آنے سے پہلے کئی سال تک ایسے ماں باپ کی گود میں پرورش اور تربیت پاتی تھی جو کئی نسلوں سے خود کنیزوں اور ایسی ماؤں کی اولاد ہوتی تھیں جو حرم کی چاردیواری میں بند رہتی تھیں، وہاں وہ ایسی باہمی رقابت، رنجشوں اور جھگڑوں، خدشوں اور ناانصافیوں کا شکار ہوتی تھیں کہ بیوی اور کنیز کی تمیز مٹ جاتی تھی۔ کثرت ازدواج اور کنیز داشتگی کی افراتفری کے باعث اکثر بیوی، باندی اور باندی، بیوی بن جاتی تھی مغل معاشرے کے دور زوال کا ایک شاعر جان صاحب (۱۸۲۵-۱۸۹۷ء) کہتا ہے:

کر لیا اپنا انہیں آئی وہ مکّارا صیل
بی بی ہیں باندی بنی گھر کی ہے مختارا صیل

یاد رہے کہ مغل سلطنت کے دورِ عروج میں کنیزوں کو خواص اور دورِ زوال

---

[1] خافی خان "منتخب اللباب" حصہ دوم۔ صفحہ ۲۹۴۔

میں اصیل اور مغلانی کہا جاتا تھا۔ کیونکہ اب بہت سی کنیزیں جو خود مغلوں کی اولاد ہوتی تھیں اب خادماؤں اور داشتاؤں کے طور پر گھروں میں رکھی جاتی تھیں۔

قرون وسطائی مسلمانوں کی خاندانی زندگی ذات پات کی علیحدگیوں اور قبائلی دشمن داریوں اور تنازعوں اور نفرتوں کی مرکز ہوتی تھی، جو ہر شخص کے دل میں باہمی نفرت، نخوت اور تکبر کے جذبات پیدا کرتی تھی۔ مزید برآں اب مسلم اہلیت طبقوں کے مرد اپنا زیادہ تر وقت حرم کے اندر اپنی بے شمار کنیزوں اور بیویوں میں گزارتے تھے اور بچپن ہی سے اس حرم کے اندر بند زندگی کے عادی ہوتے تھے۔ اس لئے حرم کی عورتوں کی طرح وہ بھی باہر کی دنیا کے مسائل اور معاملات کو نہ صحیح طور سے سمجھتے تھے اور نہ ہی اُن کو حل کرنے یا ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور استعداد رکھتے تھے۔ لہٰذا ان میں اب اتنی بھی صلاحیت اور سکت باقی نہیں رہتی تھی کہ وہ اپنی حکومت، فوج اور نظم و نسق کے فرائض منصبی پورے کر سکیں اور اپنے زمینوں، جاگیروں یا تجارتی کاروبار کے کاموں اور فرائض کو سرانجام دے سکیں۔ ذہن و فکر، کردار و اخلاق کی یہ کمزوریاں اور خرابیاں مسلمانوں کے اعلیٰ ترین سے ادنیٰ ترین طبقوں میں پیدا ہو جاتی تھیں خواہ وہ سلطان اور شاہنشاہ ہوں، امرأ و رؤسا، جاگیردار، منصب دار اور زمیندار ہوں، سرکاری ملازم اور سپاہی ہوں، یا تاجر اور سوداگر یا کوئی قاضی اور عالم ہوں۔ ان سب میں ہر طرح کے غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی خیالات اور عادات پیدا ہو جاتی تھیں۔ جس کا تاریخی لحاظ سے سب سے بڑا ثبوت ان میں قیادت کا فقدان تھا۔

قرون وسطائی مسلم مائیکرو سوسائٹی میں قیادت کا فقدان

پردہ و حرم سسٹم قرون وسطائی مسلمانوں کے معاشرتی نظام کا جزو لاینفک ہوتا تھا، جس پر قرون وسطائی اسلام کی مائیکرو سوسائٹی کا سارا دارومدار ہوتا تھا۔ قرون وسطیٰ میں اسلامی معاشرہ خالصتاً قرابتداری بنیادوں پر قائم تھا۔ تمام لوگ، خواہ شہروں اور قصبوں میں رہتے ہوں یا گاؤنوں یا صحراؤں میں، مختلف قبیلوں، خیلوں، ذاتوں اور برادریوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر ایک قبیلہ، ذات اور برادری

متعدد خاندانوں پر مشتمل ہوتی تھی، جن کے اپنے اپنے لیڈر، سردار اور سرخیل ہوتے تھے جن کو مختلف مسلم ممالک اور علاقوں میں مختلف اور متعدد ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا، مثلاً عربی بولنے والے ممالک میں انہیں سید، اعیان، اکابر، رئیس وغیرہ، ترکی بولنے والے ممالک میں خان، بے بیلربے، پاشا وغیرہ، فارسی بولنے والے ممالک میں خان، ملک، امیر، آغا، اخوند وغیرہ اور جنوب ایشیائی برصغیر کے بعض مسلم طبقوں میں چودھری، سائیں، راجہ، پٹیل وغیرہ کے ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ ہر ایک شہر اور قصبہ متعدد محلّوں اور حصوں میں بٹا ہوتا تھا جس میں مختلف قبیلے، ذات اور برادریاں الگ الگ رہتی تھیں۔ اسی طرح دیہات بھی قبیلوں اور ذات برادریوں میں بٹے ہوتے تھے۔ ہر محلے، شہر اور گاؤں میں ہر ایک قرابتداری گروہ اپنے اپنے سردار یا لیڈر رکھتا تھا، مگر دوسرے گروہوں کے لیڈروں سے کم سے کم تعلقات رکھتا تھا کیونکہ ہر گروہ اپنے معاشرتی تعلقات میں علیحدگی پسند ہوتا تھا، اس لئے شادی بیاہ اور معاشری میل جول میں اپنے تعلقات اور رشتے اپنے گروہ کے اندر محدود رکھتا تھا۔ حکومت اور قانون بھی اس قرابتدارانہ استحصالی نظام کو قائم رکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے ماسوا اس کے کہ اندرونی بغاوت اور بیرونی حملہ آور اس کو ختم نہ کردیں۔ گروہی دشمنی، گروہی عزت و آبرو کے تصورات، مخاصمت، نفرت، مفاد پرستی اور استحصالی غلبہ اور استیلا کے باعث ان گروہوں میں اتحاد اور اشتراک عمل پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ خطرے اور آفت کے وقت بھی وہ متحد نہیں ہوسکتے تھے۔ لہٰذا بیرونی حملہ کے موقع پر اُن میں نہ تو باہمی تنظیم اور نہ ہی کوئی ایسا لیڈر پیدا ہوتا تھا جو سارے ملک کو تو کجا، سارے شہر یا علاقے کو ہی متحد کرکے دشمن کا مقابلہ اور مدافعت کرسکے۔ یہ وجہ تھی کہ جب کوئی نیا سیفین حملہ آور کسی مسلم ملک یا مملکت کی سرحدوں پر نمودار ہوتا تھا تو وہ ایک دو لڑائیوں کے بعد آسانی سے سارے ملک کو فتح کرکے نئی حکومت اور مملکت کی بنیاد رکھ دیتا تھا۔ نہ تو حکمران طبقوں میں اتنی سیاسی اور فوجی تدبر اور صلاحیت ہوتی تھی کہ دشمن کو سرحد پر ہی شکست دے کر ملک کا دفاع کرسکیں اور نہ ہی دارالسلطنت یا کسی اور شہر یا علاقے میں اتنا اتحاد اور اجتماعی قیادت پیدا ہوتی تھی کہ حملہ آور دشمن

کے خلاف کوئی نئی سیاسی اور فوجی قیادت پیدا کر کے ملک کی بقا اور سلامتی کا تحفظ کر سکیں۔ بلکہ نئے حملہ آور کے سامنے حکمرانوں سے لے کر مقامی اور شہری سرداروں اور سرخیلوں میں ایسی بھگدڑ مچ جاتی کہ ہر ایک شخص اور ہر ایک خاندان اور گروہ اپنی اپنی جان و مال، اہل و عیال اور عزت و آبرو کو بچا کر کسی محفوظ مقام، مثلاً دور دراز شہروں، علاقوں، جنگل یا پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو جاتا تھا۔ جب نئے حکمران دوبارہ امن و امان قائم کر لیتے، تو اجڑے ہوئے شہر اور دیہات پھر آباد ہونے لگتے تھے۔ یہ سیفین چکر کے خاتمے پر مسلمانوں کے شہروں، گھروں اور اہل و عیال کا جو قتل عام، تباہی اور بربادی ہوتی اس کی ایک مثال سکھوں کے ہاتھوں سرہند کی تباہی تھی جو ۱۷۰۹ اور ۱۷۱۰ میں واقع ہوئی۔ خافی خان اس قتل عام اور تباہی کا منظر یوں بیان کرتا ہے:۔

"سہرند (سرہند) مال و اسباب سے پُر بڑا آباد شہر تھا۔ یہاں مالدار تاجر صراف اور ہنرمند رہتے تھے۔ ہر قوم کے شرفا خاص طور سے صلحاء و فضلاء کا یہ مرکز تھا۔ سہرند والوں کو جان و مال اہل و عیال کو نکال لے جانے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ وزیر خان (فوج دار) کی شہادت اور سلطانی لشکر کے تباہ ہو جانے کی خبروں سے سب کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ ناچار وہ لوگ محصور ہو گئے اور ایک دو دن تک لاحاصل مدافعانہ لڑائی لڑتے رہے آخر کار تقدیر پر شاکر ہو کر مقابلہ ترک کر دیا۔ وحشی سکھوں نے جی بھر کر لوٹ مار کی۔ لوگوں کو قتل کیا۔ اُن کے اہل و عیال کو اسیر بنا لیا۔ تین چار دن تک وہ مظالم توڑے کہ پناہ بخدا۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچوں کو کھینچ لیا اور زمین پر ٹپک دیا۔ عمارتوں کو آگ لگا دی۔ امیر و فقیر کو خاک پر بٹھا دیا۔ جہاں بھی مسجد مقبرہ اور بزرگوں کے مزار نظر آئے سب کو گرا دیا۔ بلکہ مردوں کی ہڈیاں تک نکال کر پھینک دیں سہرند کی لوٹ مار کے بعد تمام پرگنوں میں انہوں نے باج وصول کرنے کیلئے اپنے عمال کو مقرر کر دیا۔"[1]

---

[1] خافی خان "منتخب اللباب" حصہ چہارم۔ صفحہ ۱۰۵۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ عزت و آبرو کے یہ نام لیوا لوگ جو اپنے شہروں، محلوں، اور گھروں میں ہر روز ذرا ذرا سی بات پر آپس میں لڑنے اور مرنے مارنے کو تیار رہتے تھے، مگر جب کوئی منیا دشمن اُن کے شہر کی فصیلوں کے باہر نمودار ہوتا تھا تو وہ ایسے حواس باختہ ہوتے کہ اپنی بیویوں، ماؤں اور بیٹیوں کی عزت و آبرو اور اپنی جان و مال کی حفاظت تک بھی نہیں کر سکتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی ایسی اخلاقی پستی، بے ہمتی، بزدلی اور نااہلیت سے زیادہ بدتر مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔

حکمران اہلیت کی نااہلیت مگر ان واقعات سے بہت پہلے مسلمانوں کی حکمران اہلیت کی تمام تخلیقی قوتوں اور قیادت کا جنازہ نکل چکا ہوتا تھا مسلمانوں کے علمی، سائنسی اور فلسفیانہ کمالات اور تخیلات کا تو خلافتِ عباسیہ کے زوال کے ساتھ ہی خاتمہ ہو چکا تھا۔ گیارہویں صدی کے بعد مسلمانوں میں کوئی بو علی سینا، ابن رشد، فارابی، خوارزمی اور البیرونی کے پائے کا عالم، حکیم، فلسفی اور سائنسدان پیدا نہیں ہوا۔ البتہ جہانگیری اور جہانداری میں ہر سیفین چکر کے آغاز میں پہلی ایک دو نسلوں میں بڑے بڑے فاتحین، جرنیل، حکمران، وزیر اور منتظمین ضرور پیدا ہو جاتے تھے۔ مگر ان کے بعد حکمران اہلیت کے تمام طبقوں میں ہر طرح کی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کا خاتمہ ہو جاتا تھا، خواہ وہ دارالسلطنت میں رہتے ہوں یا دور دراز کے صوبوں اور شہروں اور علاقوں میں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے تقلیلِ تخلیل کا یہ عمل دوسری نسل ہی سے شروع ہو جاتا تھا اور تیسری نسل میں تو انتہا کو پہنچ جاتا تھا۔ برنیر اورنگ زیب کے عہد میں مغلوں کی فوجی بدحالی اور ابتری کے متعلق لکھتا ہے:

> "چنانچہ جب میں ان بے انتظام فوجوں کو دیکھتا تھا کہ حیوانوں کے گلوں کے مانند چلتی ہیں تو میں ہمیشہ یہ خیال کرتا تھا کہ ہمارے صرف پچیس ہزار کار آزمودہ سپاہی جو پرنس کونڈے یا مارشل تورین کی کمان میں ہوں، ہندوستان کی فوج پر جو کتنی ہی کیوں نہ ہو غالب آ سکتے ہیں۔"[1]

---

[1] برنیر: شاہجہان کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیب، صفحہ ۱۰۴

ایک اور فرانسیسی سیاح 'ولنی' جس نے برنیر کے ایک صدی کے بعد اٹھارویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کی سیاحت کی تھی، عثمانی ترکوں کی عسکری اور سیاسی اہلیت کی نااہلیت کے متعلق لکھتا ہے:

"ترک، خاص طور پر ایشیا میں رہنے والے ترک ہم یورپ والوں سے فوجی اور دوسرے لحاظ سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں کسی منظم طریق جنگ کا کوئی تصور نہیں، جیسا کہ یورپ میں گذشتہ ایک صدی سے پیدا ہو گیا ہے۔ ہم نے جنگ کو ایک سوچے سمجھے اصولوں، قاعدوں اور طریقوں کا سائنس بنالیا ہے۔ اس کے برعکس ایشیا والے جنگ کی قیادت اور فوجی عمل کے ابتدائی اصولوں سے بھی نابلد ہیں[1]۔"

وہ شام، مصر کے ملوک فرمان رواؤں کی فوجوں میں ربط وضبط اور ڈسپلن کے فقدان کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"ہمارے یورپ میں جب کوئی جنگ کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک ایسے میدان کا خیال آتا ہے جہاں فوجوں کو بٹالینوں، کمپنیوں اور سکواڈرنوں کے مطابق آراستہ پیراستہ کیا گیا ہے، جو اپنی وردیوں، جھنڈوں اور پرچموں کے نیچے صف بستہ ہوتے ہیں۔ جنگی پلان اور نقشے کے مطابق برسرپیکار ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تمام اوپریشن سوچے سمجھے اصولوں کے مطابق سرانجام دیا جاتا ہے۔ یہ تدابیر ہمارے نقطہ نظر میں صحیح اور ضروری ہوتی ہیں۔ مگر جب ہم ان ملکوں میں جاتے ہیں جن کا ہم یہاں ذکر کر رہے ہیں تو وہاں نہ کوئی فوجی یونیفارم ہوتی ہے نہ کوئی گولہ بارود کا انتظام، نہ کوئی ترتیب، نہ صف بندی، نہ کوئی ڈسپلین اور نہ فوجی کمان کی سلسلہ بندی۔ ان کی فوج محض ایک بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ اُن کے مارچ کرنے کا طریقہ لشکر کی ہجوم گردی، اُن کی لڑائی محض ایک قسم کی کشتی، اور ان کی جنگ محض لوٹ مار کا دوسرا نام ہے[2]۔"

---

1. C.F. Volney, quoted by A.J. Toynbee, *A Study of History*, Vol. IV. p. 456.

2. *Ibid.* p. 456

قیادت کے فقدان کی بیماری تیسری اور چوتھی نسلوں میں مسلم حکمران اہلیت کی ممتاز ترین شخصیتوں کے اذہان و کردار تک سرایت کر جاتی تھی۔ شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اسلام کا زبردست محافظ تاجدار گزرا ہے۔ تاہم اس میں جہانداری کی اتنی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی کہ اپنے سیاسی تدبر اور دور اندیشی سے مسلمانوں کے مفادات کا کماحقہ تحفظ کر سکے۔ اس کے عہد میں یورپین سامراجیوں کے سمندری بیڑوں کی موجودگی میں انگریز اور پرتگیز اور دوسری یورپین اقوام کے سمندری لٹیرے بحر ہند میں ہر سال مسلمان حاجیوں کے جہاز لوٹتے اور ڈبوتے رہتے تھے، جن کی اطلاعات شاہنشاہ کے دربار میں برابر پہنچتی رہتی تھیں[1]۔ منوچی لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ حاجیوں کے دو جہاز، جن میں شاہی خاندان کی چند خواتین اور مرد بھی سوار تھے فریضہ حج ادا کرنے کے لیے مکہ جا رہے تھے سورت کی بندرگاہ کے قریب پرتگیزی قزاقوں نے لوٹ لئے اور شاہی خاندان کی عورتوں کو بے آبرو کیا۔ جب اس واقعہ کی خبر دربار شاہی میں پہنچی تو اورنگ زیب نے جھنجھلا کر اپنے وزیر جعفر خان کو مغلوں کا ایک جنگی بیڑا تیار کرنے کا حکم دیا تاکہ بحر ہند میں مغل طاقت کا دبدبہ قائم کر کے یورپین بحری غلبے کو ختم کیا جا سکے۔ مگر وزیر نے ایک پرتگیزی نگینہ ساز کے ساتھ ساز باز کر کے ایک بچوں والا تماشہ رچایا، یعنی دہلی کے ایک حوض میں ایک نمونے کا جہاز بنوا کر اورنگ زیب کو دکھایا یہ یقین دلا دیا کہ اس کی بحریہ قائم کرنے کی تجویز ناقابل عمل ہے۔ اس "تجربہ" کے بعد شاہنشاہ نے پھر کبھی بحری بیڑا تیار کرنے کا خیال نہ کیا[2]۔ لیکن اگر وہ یورپین سامراجیوں کے مدمقابل بحر ہند میں جنگی بیڑا تیار کر لیتا جس کے لئے اس کی وسیع و عریض سلطنت میں سرمایہ، سامان حرب اور آدمیوں کی کوئی کمی نہ تھی تو نہ صرف سلطنت مغلیہ کی تاریخ بلکہ ساری تاریخ ایشیا کا رخ بدل دیتا اور بحر ہند میں ان سامراجیوں کی ابھرتی ہوئی بحری قوت کو کچل کر تاریخ عالم کا رخ موڑ دیتا۔ مگر پردہ مائیکرو سوسائٹی ایسے حکمران نہیں پیدا کرتی جو ایسی دور اندیشانہ حکمت عملی اور مدبرانہ تکمیلیت کے حامل ہوں۔ بہرحال یہ واقعہ اس حقیقت کو صاف ظاہر کرتا۔

---

[1] دیکھئے خافی خان "منتخب اللباب" حصہ سوم صفحات ۲۵۶ تا ۳۵۹، ۲-۳۷ اور ۳۷۵ تا ۳۸۰

[2] نکولاؤ منوچی "ستوریہ ڈو موگور" جلد ۲۔ صفحات ۴۵ تا ۴۷۔ جان مرے۔ لنڈن ۱۹۰۷ء (انگریزی میں)

ہے کہ اورنگ زیب جیسی عظیم شخصیت کے ذہن و کردار میں بھی غیر تکمیلیت کے آثار پیدا ہو گئے تھے اور مغل فرمانرواوں میں حکمرانی کی اہلیت اور قوت قیادت مفقود ہو رہی تھی[1]

مغل حکمرانوں کو ہمیشہ توپخانہ کا بڑا شوق رہا۔ بابر پہلا تاجدار تھا جس نے اس برصغیر کی تاریخ میں توپوں کا استعمال کیا۔ اس کے بعد اکبر نے توپخانے میں چند جدتیں بھی کیں۔ علاوہ ازیں، مغلوں کے میر آتش اور توپچی بھی بابر سے اکبر کے عہد تک اسلحہ جنگ کے استعمال، ایجاد و اختراع میں پیش پیش ہوتے تھے۔ مگر اکبر کے بعد وہ اپنی فوجی اور فنی اوصاف اور صلاحیتیں کھو چکے تھے۔ اکبر کے جانشینوں کی جدت پسندی زیادہ سے زیادہ پیمانے پر فرنگی توپچیوں کی مرہون منت ہو گئی اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں کے عہد میں تو مغل توپ سازی کے کارخانے اور اسلحہ خانے ایسی توپیں بنانے لگے جو جنگی مقصد اور کارکردگی کے بجائے نمائش اور دکھاوے کے قابل ہوتی تھیں۔ مثلاً اُن کے دہانے تو بہت بڑے ہوتے تھے، جس کے باعث انکو داغتے وقت شور اور دھواں تو بہت ہوتا تھا مگر وہ گولہ چند گز تک ہی پھینک سکتی تھیں۔ اور بقول ایک جدید مصنف "یہ بڑی بڑی توپیں شور و غل زیادہ اور دشمن کا نقصان کم کرتی تھیں[2]"۔ درحقیقت یہ نمائشی اور ناکارہ توپیں مغل حکمرانوں کے ذہن اور تمدن کی صحیح عکاسی کرتی تھیں جو نمود و نمائش اور شور و غوغے کو سیاسی تدبر اور دبدبہ تصور کرتے تھے، مگر اپنے گرد و نواح کے حالات اور ترقیات سے قطعی بے خبر رہتے تھے۔

---

[1] ایک ایسے ہی اور واقعہ کے متعلق علامہ اقبال نے خوب کہا۔

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر

حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے ۔ "بانگ درا" صفحہ ۲۴۵

تاہم علامہ اقبال نے ایک صدی سے زیادہ لمبی مدت کے حساب سے غلط اندازہ لگایا۔ تیموری خاندان کی حمیت کا جنازہ شاہ عالم دوم کے عہد میں ۱۷۸۸ء میں غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں تیموری حرم کی بے حرمتی سے تو نکلا ہی تھا۔ مگر اس کی ابتدا ایک صدی پہلے اس وقت ہوئی جب اورنگ زیب نے اپنے شاہی گھرانے کی عورتوں کی بے عزتی کی سزا دینے کے لئے یورپین سامراجیوں کے خلاف بحری بیڑا بنانے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ دراصل "مغل اعظم" سب کچھ تھے سوائے "اعظم" کے۔

بہر حال، چوتھی یا آخری نسل میں حکمران اور متقتدر طبقوں کی حالت اس قدر خراب اور ابتر ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے حرم سراوں کے باسی بن جاتے تھے۔ ان میں اپنی حکومت اور سلطنت کو بچانے کی بھی کوئی صلاحیت اور سکت باقی نہیں رہتی تھی۔ مغل بادشاہ محمد شاہ المعروف "رنگیلا" کے عہد (۱۷۱۸ء تا ۱۷۴۸ء) میں جب مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا ہر ایک صوبے میں بغاوت اور خود مختاری کا اعلان ہو رہا تھا اور مرہٹے، سکھ، جاٹ اور روہیلے سرکشی کر کے دارالسلطنت دہلی کی طرف یلغار کر رہے تھے تو اس دور انتشار اور بد امنی کا ایک مورخ وارث اپنی کتاب "مراۃ واردات" میں لکھتا ہے:۔

"چند سال سے شاہی دربار کا یہ حال ہے کہ جب حکام دکھن گجرات یا مالوہ اپنے صوبوں میں مرہٹوں کے تاخت و تاراج کی اطلاع دہلی میں بادشاہ کو پہنچاتے ہیں تو حضور ظل سبحانی ان تشویشناک خبروں کی وجہ سے اپنے پر ملال دل کو بہلانے کے لئے باغ کی سیر کو چلے جاتے ہیں تاکہ وہاں درختوں اور پودوں کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکیں یا قریب ہی شکار گاہ میں چلے جاتے ہیں۔ دریں اثنا اُن کے وزیر اعظم اعتماد الدولہ قمر الدین خان اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے دہلی سے باہر تالابوں پر چلے جاتے ہیں جہاں وہ کنول کے پھولوں کا نظارہ کرتے ہیں یا باہر کسی میدان میں رنگ رنگیلیاں مناتے ہیں۔ ایسے وقتوں میں بادشاہ اور وزیر اپنی حکومت اور نظم و نسق کے کاموں سے بالکل بے خبر رہتے ہیں اور انہیں فوج اور مالیہ وصول کرنے کی جانب کوئی دھیان نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی امیر اور نہ کوئی اور شخص سلطنت کے تحفظ اور رعایا کی حفاظت کا فکر کرتا ہے، جبکہ خطرات ہر جانب سے متواتر دہلی کے قریب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔"[ط۱]

ط۱ Quoted by S. M. Ikram, *History of Muslim Civilization in India and Pakistan*, p. 354. Lahore. n.d

قرابتداری گروہوں اور لیڈروں کی انتشار انگیزیاں

جب حکمران ایلیت کی تکیبلی حالت خراب ہونے لگتی تو قرون

وسطائی اسلام کی مائیکرو سوسائٹی کا اندرونی مرض باہر پھوٹ آنے لگتا تھا۔ یعنی قرابتداری گروہوں اور انکے لیڈروں کی جاہ و حشم، جاگیر اور منصب، زر، زن اور زمین کے لئے عداوت اور کھینچا تانی شروع ہو جاتی تھی۔ درحقیقت یہ مائیکرو سوسائٹی ہمیشہ مسلمان حکمران اور غیر حکمران قرابتداری گروہوں اور قیادت کی باہمی رقابتوں اور دشمنیوں کا اکھاڑا بنی رہتی تھی۔ ہر نئے سیفین چکر کے ابتدائی دور میں نئے حکمرانوں اور ایلیت کی جنگی اور انتظامی صلاحیتوں، سیاسی غلبے اور طاقت کی وجہ سے ان قرابتداری گروہوں، قبیلوں اور ذاتوں کے لیڈروں کی باہمی لوٹ مار قدرے دب جاتی تھی یا نئے سیفین حکمران ان کی توجہ اور طاقت اپنی فتوحات کی طرف مبذول کرا دیتے تھے۔ مگر جب دوسری نسل میں حکمران ایلیت کی تکیبلی صلاحیتوں میں کمی شروع ہو جاتی تھی اور حکومت و نظم و نسق ڈھیلے پڑنے لگتے۔ اور فتوحات کا سلسلہ بھی رکنے لگتا، تو قرابتداری گروہوں اور لیڈروں کی زر، زن اور زمین جاگیر اور منصب کے لئے جھگڑے اور سازشیں مقامی، صوبائی اور ملکی سطحوں پر دوبارہ شروع ہو جاتی تھیں۔ اس کش مکش میں نو وارد مسلم ایلیت گروہ اور قائدین (جو نسب و حسب اور رنگ و نسل (ریس)، کی نخوت سے بھرے ہوتے تھے) اور دیسی نو مسلم ایلیت گروہ اور پرانے ایلیت گروہ سب ہی شامل ہوتے تھے۔ اس طرح سارے ملک میں فسق و فجور اور نافرمانی اور سرکشی کا بازار گرم ہو جاتا تھا۔ جب تیسری اور چوتھی نسل کا زمانہ آتا اور حکمران ایلیت حرم سراؤں کے باسی بن جاتے تھے اور حکومت کی باگ ڈور کسی وزیر یا خواجہ سرا کے ہاتھوں میں چلی جاتی تھی، تب حکومت اور سلطنت کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا اور ہر طرف مسلمان حکمران اور غیر حکمران قرابتداری گروہوں اور لیڈروں کی باہمی کشمکش سازشیں اور ریشہ دوانیاں انتشار اور فسق و فساد سے بڑھ کر بغاوت اور خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ اس وقت اُن کے پرانے دشمن بھی علم بغاوت بلند کر کے دور دراز علاقوں اور صوبوں پر قابض ہو جاتے تھے اور پھر مسلمان حکمران اور غیر حکمران ایلیت

کے ساتھ سازباز کر کے یا ان کی انتشار انگیزیوں کا فائدہ اٹھا کر دارالسلطنت کی طرف پیش قدمی شروع کر دیتے تھے۔[1] پھر ایسا وقت آتا کہ کوئی نیا قبائلی حملہ آور سرحدوں پر نمودار ہو کر مملکت اور سلطنت کا خاتمہ کر دیتا اور نئے سیفین چکر کا آغاز کر دیتا تھا۔ ایسی انتشار انگیزیاں اور خانہ جنگیاں ہر سیفین چکر کے دور انحطاط و زوال میں واقع ہوتی تھیں۔ صرف حکمران فرا ابتداری ایلیت گروہوں کی حسب و نسب، رنگ اور ریس (   ) میں فرق ہوتا تھا، کیونکہ ہر سیفین چکر میں نئے نئے قبائل اور نووارد فرا ابتداری گروہ اور نئی نئی نو مسلم ذاتیں اور گروہ فسق و فساد کے فرا ابتداری اکھاڑے میں اتر آتی تھیں۔ مثلاً مغلیہ سلطنت کی دور انحطاط کی تاریخ مغل، ایرانی، تاتاری، ترک، افغان اور عربی النسل کے نووارد گروہوں اور نئے اور پرانے دیسی نو مسلم ذاتوں اور گروہوں کی باہمی رقابتوں، سازشوں، جھگڑوں اور انتشار انگیزیوں سے بھری ہوئی ہے جن کی دشمنیوں، مخاصمتوں اور بغاوتوں نے نہ صرف سلطنت مغلیہ کو تباہ کیا، بلکہ اس کے نئے اور پرانے دشمنوں، مثلاً مرہٹوں، سکھوں، راجپوتوں وغیرہ کی بغاوتوں اور نادر شاہ اور ابدالی کے غیر تکمیل سیفین چکروں کی راہ ہموار کی۔ بالآخر مسلم ایلیت کی فرا ابتداری انتشار انگیزیوں نے انگریز سامراجیوں کو فتوحات حاصل کرنے اور اپنا اقتدار قائم کرنے کے مواقع فراہم کر دیئے۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کے ایلیت گروہوں میں پردہ، حرم، تعدد ازدواجی اور کنیز داشتگی ہر سیفین چکر کے دور عروج کو تقلیل تکمیل کے باعث دور انحطاط میں بدل دیتے۔ پھر حکمران اور غیر حکمران ایلیت گروہوں کی فرا ابتدارانہ رقابتیں اور فتنہ و فساد دور انحطاط کو دور انتشار میں بدل دیتے اور بالآخران کے تقلیل تکمیل اور فرا ابتداری انتشار انگیزی کے عوامل زوال اور سقوط کا باعث بن کر سیفین حکومت اور مملکت اور ملک و معاشرے کو تباہ و برباد کر دیتے تھے۔ غرضیکہ مسلم پردہ دار مائیکرو سوسائٹی ہمیشہ فرا ابتدارانہ انتشار انگیزی اور علیحدگی پسندی سے بھری ہوتی تھی اور آج تک ہے جیسا کہ ہم باب ششم میں تجزیہ کر کے بتلائیں گے۔

---

[1] خافی خان "منتخب اللباب" حصہ چہارم صفحات ۷۷ تا ۸۱ اور ۶۷۸ تا ۹۰۱ اور جا بجا۔

برصغیر کی مسلم مملکتوں کے دورِ زوال و سقوط میں سیسیفین عوامل کا تجزیہ

برصغیر جنوبی ایشیا کی مسلم تاریخ میں ہر ایک مسلم سلطنت یا بادشاہت کے سیسیفین چکر کے اختتام پر تین طرح کے انتشاری اور تخریبی عوامل بروئے کار آجاتے تھے: اول، مسلم حکمران اور متمول اہلیت کی غیر تکمیلی اخلاقی اور کرداری پستی اور رذالت، دوم، اندرونی نومسلم اور بیرونی نو وارد مسلم اہلیت کی انتشار پسندی اور علیحدہ پسندانہ تخریب کاریاں، اور سوم، ہندو ذات پات کی مائیکرو سوسائٹی کا مسلم معاشرے اور مملکت پر آبادیاتی دباؤ اور گھیراؤ[1]

---

[1] طوالت مضمون سے بچنے کے لئے ہم نے قرون وسطائی اسلامی دنیا کی دوسری مملکتوں اور سلطنتوں کے سیسیفین چکروں کا تجزیہ نہیں کیا مگر اس قدر ذکر کرنا ضروری ہے کہ ان تمام چھوٹی یا بڑی بادشاہتوں اور سلطنتوں میں بھی سیسیفین چکر کے اختتام پر ایسے ہی تین عوامل بروئے کار آجاتے تھے جیسے ہم نے برصغیر جنوبی ایشیا کی تاریخ کے تجزیے میں بیان کئے ہیں، فرق صرف تیسرے عمل میں ہوتا تھا یعنی ہر اسلامی مملکت کو اپنی اپنی جغرافیائی جائے وقوع اور تاریخی صورتحال کے مطابق ہندو مائیکرو سوسائٹی کے بجائے کسی اور غیر مسلم مائیکرو سوسائٹی کے آبادیاتی دباؤ یا یورپ کے خطے میں یا اس کے قریب یورپین ماکرو سوسائٹی کی نو آبادیاتی جارحیت کا سامنا ہوتا تھا

ہم یہاں ہندو مائیکرو سوسائٹی کا مختصر تجزیہ کریں گے تاکہ برصغیر کی مسلم تاریخ میں ہندو آبادیاتی پھیلاؤ کی نوعیت کچھ واضح ہو جائے۔

ہندو مائیکرو سوسائٹی پر ایک تجزیاتی نظر

ہندو مائیکرو سوسائٹی مسلم مائیکرو سوسائٹی سے کئی لحاظ سے قطعی مختلف تھی اور آج بھی مختلف ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں ہندو معاشرہ ذات پات کی تقسیم پر مبنی تھا اور آج بھی ہے۔ یہ تقسیم تفاعلی (فنکشنل) نوعیت کی ہوتی تھی اور آج بھی ہے جو مسلم معاشرے کی ذاتوں کی طرح تاریخی حادثات سے قائم نہیں ہوتی تھی بلکہ معاشرت اور معیشت کے مخصوص اور مقررہ کاموں، پیشوں اور شادی بیاہ کے تعلقات کی بنا پر قائم ہوتی تھی۔ ہندو ذات یا جاتی سے مراد لوگوں کا ایسا گروہ ہے جو کام، پیشے، معاشری وظیفے اور حیثیت کی بنا پر ایسے دوسرے گروہوں سے الگ تھلگ رہتا ہے اور اس علیحدگی کو شادی بیاہ اور رہن سہن کے چھوت چھات کے رسم و رواج سے قائم رکھتا ہے۔ ذات کو قدیم سنسکرت میں جاتی، فارسی اور اردو میں ذات یا قوم اور انگریزی میں کاسٹ کہتے ہیں۔ ہم مروجہ اصطلاح میں اسے ذات اور اس کی شاخ کو جاتی کہیں گے جسے انگریزی میں سب کاسٹ کہتے ہیں۔ نصابی کتابوں کے لحاظ سے ہندو معاشرہ عموماً چار ذاتوں پر مشتمل تصور کیا

برصغیر کی تاریخ میں مسلمانوں کے پانچسو سالہ دورِ اقتدار میں سات سیفین چکر وقوع پذیر ہوئے
ان کی ابتداء ۱۲۰۶ء میں خاندان غلاماں کے قیام سے ہوئی جس کا خاتمہ ۱۲۹۰ء میں خلجیوں کے ہاتھوں ہوا۔ خلجیوں کا

جاتا ہے مگر کسی خاص علاقے اور دور میں یہ ذاتیں حقیقت میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں نئی اور پرانی جاتیوں میں منقسم ہوتی ہیں۔ جدید ہندو انڈیا میں جاتیوں کی تعداد تقریباً تین ہزار ہے) شادی بیاہ اور خون اور رشتے کی پلیدیت کے تصورات کی بنا پر ہر ایک ہندو ذات یا جاتی کئی گوتوں میں منقسم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر ایک ذات یا جاتی ایک دراز دواجی گروہ ہوتی ہے یعنی اس کے مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے شادی کر سکتے ہیں مگر کسی غیر ذات کے مرد اور عورتوں سے شادی نہیں کر سکتے لہٰذا ہر ایک ہندو ذات اور جاتی ایک 'بند' گروہ ہے جس میں غیر ذات اور غیر مذہب کے لوگ رکن نہیں بن سکتے۔ یہ دراز دواجگی بھی کئی مزید شرائط اور رسوم کی تابع ہوتی ہے۔ پہلی شرط گوت کی پابندی ہے۔ گوت سے مراد کسی ذات یا جاتی کا ایسا گروہ ہے جو باہمی طور پر شادیاں نہیں کر سکتا، مگر اپنی ذات یا جاتی کی دوسری گوتوں سے میاں یا بیوی تلاش کرتا ہے۔ پس ذات ایک دراز دواجی گروہ ہے اور گوت اس کا براز دواجی گروہ ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ براز دواجی رشتہ ناطہ تلاش کرتے وقت دوسری گوت سے ایسا خاوند یا بیوی تلاش کی جائے جو ماں کی طرف سے پانچ پشتوں سے اور باپ کی طرف سے سات پشتوں سے رشتہ دار نہ ہو۔ اس شرط کے باعث ہندو مائیکرو سوسائٹی میں ماکرو سوشل رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ شادی بیاہ کے لئے ہر شخص کو اکثر کسی دوسرے گاؤں یا شہر میں رشتے ناطے تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ بہر حال شادی بیاہ کی ان شرائط اور نظام معاشرت کے باعث ہر ایک ہندو ذات یا جاتی دوسری ذاتوں اور جاتیوں سے کام اور پیشے کے اختلافات کو نسلاً بعد نسل قائم رکھتی ہے۔ برہمن ہمیشہ برہمن، کشتری ہمیشہ کشتری، ویش ہمیشہ ویش اور شودر ہمیشہ شودر رہتا تھا۔ ان ذاتوں اور جاتیوں میں تبدیلی ناممکن ہوتی تھی، اور کم و بیش آج بھی ہے سوائے عام افراتفری کے ایسے زمانوں میں جب لوگ اپنی روایات اور رشتوں کو قائم نہ رکھ سکتے ہوں۔ مگر جونہی پر امن حالات بحال ہوتے، تو یہ ذاتیں اور جاتیاں اپنی قدیمی روایتی تقسیم اور تفریق کے ساتھ دوبارہ قائم ہو جاتی تھیں۔ اس وجہ سے ہندو معاشرے میں ہر شخص کی ذات معاشری حیثیت اور پیشہ، مترادف نام بن گئے۔ ہر ذات یا جاتی اپنے اپنے کام، پیشے، شادی بیاہ، بود و باش اور میل جول میں دوسری ہندو ذاتوں سے الگ تھلگ ہوتی تھی اس لئے ہندو معاشرے میں ذات برادری کی پلیدی یا ناپاکی کا تصور بہت سخت اور ہمہ گیر ہے اس تصور نے ہندو معاشرے کو ذات پات کی مائیکرو سوشل علیحدگیوں اور بندشوں میں جکڑا ہوا تھا اور آج بھی ہے اور اس نے ہندو لوگوں میں باہمی معاشری ارتباط و اختلاط کو بہت کم کر دیا تھا، مگر یہی تقسیم کار اور تفریق مختلف ذاتوں اور

خاتمہ تغلقوں نے ۱۳۲۰ء میں کر دیا۔ تغلقوں کا خاتمہ ۱۴۱۴ء تیمور کے گورنر خضر خاں نے کیا، جس کے سید خاندان کی حکومت کو لودھیوں نے ۱۴۵۱ء میں ختم کر دیا۔ لودھی خاندان کا خاتمہ ۱۵۲۶ء میں بابر نے کیا، مگر اس کے بیٹے ہمایوں کی حکومت کو شیر شاہ سوری نے ۱۵۴۰ء میں ختم کر دیا۔ سوریوں کی حکومت محض پندرہ سال رہی، جب ۱۵۵۵ء میں مغلوں نے دوبارہ اپنی حکومت قائم کر لی، جس کا خاتمہ تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد قطعی نئے حالات میں ہوا جنہوں نے مسلم انڈیا کے سیفین چکروں کا ہی خاتمہ کر دیا۔

میں باہمی انحصار کی ضرورت بھی پیدا کر دیتی ہے، جو ہندو مائیکرو سوسائٹی کو مسلمانوں کی نیم قبائلی اور نیم جاگیردارانہ مائیکرو سوسائٹی سے ممیزہ کرتی ہے۔ پلیدیت اور پرہیز کے نظریات اور چھوت چھات کے رسم و رواج کے باوجود ہندو معاشرے میں معاشری اور معاشی انحصار اور تعاون کا عمل پایا جاتا ہے، جو اس کی تفاعلی تکمیلیت کا نتیجہ ہے۔ ہر ایک ہندو ذات یا جاتی اپنے کام، پیشے اور وظیفے کو روایتی تندہی، مستعدی اور ہنر مندی سے سرانجام دیتی تھی اور آج بھی دیتی ہے تاکہ دوسری ذاتوں اور جاتیوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ مثلاً برہمنوں کی ذات اپنی شادی بیاہ اور کھانے پینے کے پلیدیت یا چھوت چھات کی علیحدگیوں اور بندشوں کے باوجود اپنے "ذاتی" فرائض یعنی مذہبی پوجا پاٹ اور عبادت کے فریضوں کیلئے باقی تمام ذاتوں کی مذہبی پیشوا ہوتی تھی اور ان کے لئے پروہت اور پجاری کے فرائض ادا کرتی تھی۔ اسی طرح کشتریوں کی ذات دوسری ذاتوں کی فوجی محافظ ہوتی تھی، ویشوں کی جاتیاں زرعی پیداوار اور تجارتی کاروبار کے فرائض سرانجام دیتی تھیں اور شودروں کی کمین جاتیاں تینوں اونچی ذاتوں کے تمام کمین کام اور قابل نفرت پیشے اور ضروریات پورا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ، ہر ایک گاؤں یا قصبے اور شہر میں ہر ایک ذات یا جاتی کیلئے مقامی طور پر اپنے "ذاتی" کاموں اور مشترکہ معاملات اور مسائل کے لئے اپنے خاندانوں کے سربراہوں اور دوسرے مرد اراکین کی پنچایتیں اور مجلسیں قائم ہوتی تھیں جو کسی معتقد رکن مثلاً گاؤں کے زمیندار، یا مندر یا ایسے مشترکہ مقام مثلاً پنچایت گھر یا گاؤں کے چوپال میں جمع ہو کر اپنے معاملات اور مسائل حل کرتی تھیں، خاص طور پر ایسے رکن کے خلاف تادیبی یا تعزیری کارروائی کرتی تھیں جس نے جاتی کے رسم و رواج، روایات اور چھوت چھات اور شادی اور رشتوں ناطوں کی خلاف ورزی کی ہو۔ اسی طرح گاؤں، قصبے یا علاقے کی مختلف جاتیاں، خاص کر اونچی جاتیوں پنچایت بنا کر اپنے مشترکہ معاملات اور مسائل پر غور و فکر اور فیصلے کرتی تھیں۔ غرضیکہ اپنی معاشرتی علیحدگیوں، بود و باش کی پابندیوں اور چھوت چھات کی تفریقوں اور تقسیموں کے باوجود ہر ایک ہندو ذات اور جاتی باہمی طور پر اور ایک علاقے کی مختلف

برصغیر کی مسلم تاریخ ایک نکتے کو عین واضح کرتی ہے، یعنی برصغیری مسلم مملکتوں کی سرعت انگیز ناپائیداری اور تباہی. تقریباً پانچسو سال میں سات مملکتیں قائم ہوئیں اور تباہ ہوگئیں۔ ان کی اوسط

جاتیاں مشترکہ طور پر باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل سے اپنے مسائل حل کرتی تھیں اور ایک دوسرے کی امداد، حمایت اور دستگیری کرتی تھیں۔ لہٰذا کوئی ذات یا جاتی اپنے روایتی کاموں، پیشوں، فرائض اور وظائف میں غفلت شعاری اور لاپروائی نہیں برت سکتی تھی۔ اس وجہ سے ہندو معاشرے میں اس کے مائیکرو سوشل مفادات اور تعلقات کے باوجود اجتماعی انحصار اور تکمیل گری کی فرض شناسی اور معاشری جواب دہی اور ذمہ داری کے ماکرو سوشل فکر و شعور اور عادات اور رجحانات پیدا ہو جاتے تھے۔

برصغیر کے ہندو اور مسلم مائیکرو سوسائٹیوں میں دوسرا بڑا فرق اُن کے خاندانی نظاموں میں پایا جاتا ہے۔ ہندو مائیکرو سوسائٹی کی ہر ایک ذات اور جاتی ایسے خاندانوں اور کنبوں پر مشتمل ہوتی ہے جو دو تین زندہ نسلوں کا مشترکہ خاندان ہوتا تھا اور آج بھی کم و بیش ہوتا ہے۔ اس خاندان میں جائیداد اور ملکیت مشترکہ ہوتی ہے اور اپنا "ذاتی" کام پیشہ یا کاروبار باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ مشترکہ خاندان میں باپ، دادا یا بڑا بھائی جو بھی زندہ ہو اس کا سربراہ ہوتا ہے جو "کرتا دھرتا" یا "کرتا" کہلاتا ہے۔ اس کی نگرانی اور ہدایت کے تحت کنبے کے تمام چھوٹے بڑے اراکین اپنے اپنے کام اور فرائض انجام دیتے ہیں۔ لہٰذا اپنے خاندانی یعنی "ذاتی" کاروبار اور وظیفے، کام اور پیشے کی تکمیل ہر رکن کا اپنا خاندانی اور انفرادی فریضہ اور ذمہ داری ہوتی ہے، جس کی تکمیل میں اُسے معاشری اور انفرادی طور پر خواہ کیسی ہی کامیابی اور مقام حاصل ہو مگر وہ نہ تو اپنی "ذات" اور نہ ہی اس کا مقررہ روایتی پیشہ یا وظیفہ تبدیل کر سکتا تھا۔ مثلاً برہمن ہمیشہ پوجا پاٹ کے فرائض ادا کریگا خواہ ان کی تکمیل میں وہ امیر آدمی بن جائے یا غریب اور مفلوک الحال رہے۔ اسی طرح ایک کشتری اپنے جنگی فرائض ادا کرے گا خواہ ان کی تکمیل میں وہ زمینوں اور دولت، اقتدار اور اختیارات کا مالک بن جائے یا ان سے محروم رہے۔ ویشوں کے خاندان اپنے زرعی اور تجارتی کاروبار میں مشغول رہیں گے خواہ وہ اسی طرح امیر و کبیر افراد بن جائیں یا نقصان اور خسارہ اٹھا کر مفلس اور قلاش بن جائیں اور شودروں کے کنبے تو ہمیشہ گندے، پلید اور کمین فریضے اور پیشے اختیار کریں گے خواہ اُن کی حالت کتنی ہی ناگفتہ بہ اور قابلِ رحم کیوں نہ ہو۔

ہر خاندان کو اپنی ذات یا جاتی کے کاموں، پیشے، وظیفے یا فرائض کی نسلاً بعد نسلاً تکمیل سے بڑی مہارت، دسترس اور ہنرمندی حاصل ہو جاتی تھی جو ان کاموں، پیشوں، وظائف اور فرائض کی انجام دہی کو کمال کے درجہ تک

مدت ۵۰ سال ہوتی ہے' جو تقریباً دو نسلوں کی عمروں کے برابر ہوئی۔ اس قدر سرعت انگیز سیفیں چکر اور خاتمے کی وجوہات ہم نے واضح کر دی ہیں یعنی تعدد ازدواج' کنیز داشتگی' غلام داری' پردہ اور حرم سسٹم کی

پہنچا دیتی تھیں۔ درحقیقت ہندو ذاتوں اور جاتیوں کی تقسیم بھی اسی تقسیم کار اور تخصص کی بنا پر قائم ہوتی تھی' علاوہ ازیں ہر ایک خاندان اپنے کام' پیشے' وظائف اور فرائض کی مہارت' ہنرمندی اور کمال کو نسل در نسل جاری رکھتا تھا' کیونکہ وہ نہ صرف ایک تناسلی ادارہ تھا بلکہ ہر آنے والی نئی نسل کا تمدنی' معاشری اور معاشی یا پیشہ ورانہ تربیت گاہ بھی ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ہندو معاشرے میں تمدنی اور اقتصادی کاموں' پیشوں' وظائف اور روایات اور نظریات کا سلسلہ نسل در نسل جاری رہتا تھا اور اس کے قیام و دوام کی بنیاد بن جاتا تھا' جو اس کی سلامتی اور بقا کا ضامن بھی ہوتا تھا اور آج تک ہے بلکہ ہندو معاشرے کے قیام و دوام' بقا اور سلامتی کا یہ تسلسل ہندو عورت کی مخصوص حیثیت اور مقام و کردار پر مبنی تھا۔

ہر مائیکرو سوسائٹی کی طرح ہندو معاشرہ بھی عورت کی زندگی' مقام اور رول کو مختص کئے ہوئے تھا اور آج بھی اسی قدیمی اور روایتی انداز میں مختص کئے ہوئے ہے۔ لہٰذا ہندو معاشرے میں عورت کی حیثیت اور رول بیک وقت بہت اہم اور بنیادی مگر نہایت پست ہوتے تھے۔ ہندو معاشرہ عورت کو دو مختلف طرح سے استعمال کرتا تھا: اول' عمل تناسل کے لئے اور دوم عیش و نشاط کے لئے۔ پہلے عمل کے لئے تین اونچی ذاتوں کی عورتیں وقف تھیں اور دوسری ضرورت کے لئے زیادہ تر شودر یا ادنیٰ جاتیوں کی عورتیں مخصوص ہوتی تھیں ہندو معاشرے کی یہ ارتقائی خصوصیت ہے کہ اگر کوئی نیا کام یا کاروبار (خواہ وہ کتنا ہی غیر اخلاقی' مکروہ اور اوباش نوعیت کا کیوں نہ ہو) کسی خاندان یا گروہ میں دو چار نسلوں تک جاری رہے تو ایسے خاندان اور گروہ نئی جاتی شمار ہونے لگ جاتے تھے۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً نئی جاتیاں وجود میں آتی رہتی تھیں اور آج بھی آتی ہیں یا پرانی جاتیاں نئی طرح کے کام اور پیشے اختیار کر لیتی تھیں۔ اگرچہ ذات پات کی تقسیم اب قرون وسطائی سختی اور شدت کی نہیں رہی ہے' خاص طور پر بڑے بڑے شہروں میں جہاں زمانہ جدید کے نئے نئے کام اور پیشے وجود میں آ رہے ہیں تاہم وہاں بھی ذات پات کی روایتی تقسیم عورت اور خاندان کی زندگی کی حد تک بدستور قائم ہے۔

اپنے تناسلی فریضے کے باعث ہندو عورت اپنے خاندان اور جاتی کی پیدائشی اور مستقل محکوم اور غلام ہوتی تھی۔ اس لئے وہ خالصتاً گھر گرہستن عورت ہوتی تھی' اور اپنی عمر کے ہر دور میں اپنے خاندان کے مرد

انحطاط انگیز خرابیاں اتنی تیزی سے اثر دکھاتی تھیں کہ مسلم انڈیا کے حکمرانوں اور ایلیت گروہوں کے خاندان ایک دو نسلوں میں اپنی غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی عادات و کردار سے تباہ و برباد ہو جاتے تھے۔ مثال کے طور پر مسلمان حکمرانوں کی غیر تکمیلی اخلاقی اور کرداری حالت کو ہی لیجئے۔ برصغیر کی دہلی

سرپرست کی زیر نگرانی رہتی تھی۔ لہٰذا وہ بچپن میں باپ، جوانی میں خاوند اور بڑھاپے میں بڑے بیٹے یا خاندانی سربراہ یعنی کرتا دھرتا کے کنٹرول میں زندگی گزارتی تھی۔ اُسے کوئی آزادی اور حقوق حاصل نہ ہوتے تھے۔ وہ اپنے باپ بھائیوں، خاوند اور بیٹوں کی جائیداد میں حصہ دار یا حقدار نہیں ہوتی تھی۔ اُسے اپنی مرضی کی شادی اور طلاق کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ وہ اپنے گھر میں بند رہتی تھی، خواہ وہ گھر اس کے باپ اور بھائیوں کا ہو یا شادی ہونے کے بعد اس کے خاوند کا ہو۔ مگر پوجا پاٹ اور تہوار منانے کے لئے مندر، دریا یا ندی کے گھاٹ یا کسی مقدس مقام کی یاترا کے لئے باہر نکل سکتی تھی؛ جہاں بعض جاتیوں کی عورتیں غیر مردوں سے گھونگھٹ نکال لیتی تھیں۔ اسی طرح چند اور ضروریات کے لئے بھی وہ باہر نکل سکتی تھی، ورنہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ گھر کے کام کاج میں صرف ہوتا تھا۔ پیدا ہونے کے چند سال کے بعد لڑکی کے باپ یا سرپرست کو اس کی شادی کا خیال دامنگیر ہو جاتا تھا، بلکہ وہ بچپن ہی میں اس کی شادی کر دینے کا فکرمند ہو جاتا تھا، کیونکہ ہندو معاشرے میں بچپن کی شادیوں کا رواج بہت عام تھا۔ اکثر چھ سات سال کی عمر کی بچیوں کی شادی کر دی جاتی تھی۔ جب شادی ہو کر وہ اپنے خاوند کے مشترکہ خاندان میں آتی تھی تو وہ اپنے نئے خاندان کا جزو لاینفک بن جاتی تھی، جس سے وہ صرف مرنے کے بعد ارتھی پر ہی باہر نکل کر الگ ہو سکتی تھی۔ اپنے نئے گھر میں وہ نہ صرف اس کے مرد سرپرست کی نگہداشت میں رہتی تھی بلکہ اپنی ساس کی نگرانی میں بھی ہوتی تھی، جو اس سے بڑی سختی بلکہ سنگدلانہ نگہداشت اور سلوک روا رکھتی تھی۔ مگر ایک صورت میں اس کی یہ مجبور اور مظلوم حالت بدل جاتی تھی۔ اگر نئی نویلی بہو کے لڑکا پیدا ہو جائے تو خاندان میں اس کا مرتبہ اور مقام بلند ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ لیکن لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں اس کی حیثیت اور زیادہ مظلوم اور پست ہونے لگتی تھی اور خاندان کے دوسرے ارکان، خاص طور پر اس کی ساس اور نندوں کی بدسلوکی اور سنگدلی میں اضافہ ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ کئی بیٹیاں پیدا کرنے یا بانجھ رہ جانے کی پاداش میں تو اُسے جلد یا بدیر سوکن یا سوکنوں کا جلاپا بھی برداشت کرنا پڑتا تھا، تاکہ پچھلے جنم کے کرموں کی ماری کا خاوند دوسری بیوی یا بیویوں سے اولاد نرینہ پیدا کر کے اپنی دکھی آتما کو سکھ پہنچا سکے اور آگوان کے چکر سے مکتی یا نجات حاصل کر کے ابدی نروان پا سکے۔ اگر اس اثنا میں اس کا

اور آگرہ کی ساتوں سیفین سلطنتوں میں کل ۴۵ فرماں روا گزرے ہیں، جن میں صرف چودہ حکمران کم و بیش تکمیلی تھے یعنی صرف ایک چوتھائی تکمیل گر حکمران تھے۔ ان میں صرف تین حکمرانوں یعنی علاؤالدین خلجی، شیر شاہ سوری اور اکبر نے فوجی فتوحات کے علاوہ حکمرانی، حکمت عملی اور نظم و نسق کی

خاوند مر جائے اور وہ ابھی بے اولاد ہو یا صرف بیٹیوں کی ماں ہو یا کئی سوکنوں میں جوان تر ہو، تو اونچی جاتیوں کی ایسی بیوہ کو اکثر اپنے خاوند کے ساتھ مرگھٹ میں جل کر ستی ہونا پڑتا تھا۔ اگر ستی ہونے سے بچ بھی جاتی، تو اسے اپنے خاوند کے خاندان میں نہایت خراب اور خستہ حالت میں بیوگی کی ساری عمر نوکرانیوں اور باندیوں کی طرح گزارنی پڑتی تھی۔ ایسی ہندو عورت دنیائے انسانی کی بدنصیب ترین اور مظلوم ترین ہستی ہوتی تھی، جس کی مثال قرون وسطائی مسلمانوں کے گھروں میں اس کنیز سے بھی بدتر ہوتی تھی جو اپنے آقا کی منظورِ نظر نہیں رہی۔ لیکن جو ہندو عورت جوان بیٹوں کی ماں ہوتی تھی، تو وہ اپنی ساس کے مرنے کے بعد اپنے خاندان میں وہی مقام اور حیثیت حاصل کر لیتی تھی جو اس کی ساس کا تھا اب وہ بھی اپنی بہوؤں پر وہی سختی اور نگرانی رکھتی تھی جو اس پہ جوانی میں روا رکھی گئی تھی۔ اس طرح ہندو عورت تمام عمر اپنے خاندان، خاوند اور بیٹوں کی خدمت گزاری میں بسر کرتی تھی۔ ہندو عورت کے اس طرز زندگی کا ہندو خاندانی اور معاشرتی زندگی کیلئے نہایت اہم اور عظیم فائدہ "ذاتی" اور خاندانی تکمیلات کے تسلسل کو قائم و دائم رکھنے میں ہوتا تھا اور ہے۔ اپنی عمر بھر کی خدمت گزاری اور جذبہ ایثار سے ہندو عورت اپنے بیٹوں کا دل موہ لیتی تھی اور چونکہ وہ اپنی پوجا پاٹ اور "ذاتی" اور خاندانی فرائض اور وظائف کی روایات اور تکمیلات کی خود بھی سختی سے پابند ہوتی تھی، اس لئے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو اپنی طرح مذہبی، تمدنی، معاشی اور دوسری خاندانی روایات اور تکمیلات کی طرف سمت بند کر کے اُن کے حصول کے لئے ترغیب و تربیت دیکر تیار کر دیتی تھی۔ اس طرح ہندوؤں کی مختلف ذاتوں اور جاتیوں میں عموماً اور اونچی ذاتوں میں خصوصاً اپنے کاموں، پیشوں اور فرائض و وظائف کی روایات اور تکمیلات کا سلسلہ نسل در نسل جاری رہتا تھا، جو ہندو معاشرے کی بقا اور استحکام کا بنیادی سبب ہوتا تھا۔ اگرچہ اس طرز معاشرت و معیشت میں جدت پسندی اور تجربہ بازی کے لئے کوئی موقع اور آزادی نہیں تھی مگر روایت پرستی اور سابقہ تکمیلات کا تسلسل قائم رکھنے کو بہت اہمیت اور زور دیا جاتا تھا، جس کے لئے مشترکہ خاندانی زندگی کا نظام بہت مؤثر اور کارگر ادارہ ثابت ہوا ہندو خاندانی نظام میں خاوند کو ایسی مطلق العنانی نہیں حاصل تھی جتنی مسلمان خاوند کو اپنی بیوی یا بیویوں پہ حاصل تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہندو عورت اپنی محکومی اور مظلومی کے باوجود ایسی مجبور اور لاچار ہستی نہ تھی جیسی کہ مسلمان عورت

چند تکمیلات بھی حاصل کیں، مگر وہ بھی قرونِ وسطائی اسلام کے معاشرے کی بنیادی مائیکرو سوشل صورت کو تبدیل کرنے کا قطعی کوئی خیال و فکر نہ کر سکے۔ اس کے برعکس، یہ تینوں فرمانروا بھی اپنی حکمرانی کی ساری قوتوں اور حکمت عملیوں کو مائیکرو سوشل ریشہ دوانیوں، اپنے خاندانی اور قرابتداری گروہوں کے غلبے

ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو خاوند اپنے گھر کے اندر غلام عورتیں اور کنیزیں نہیں لا سکتا تھا، ہندو خاندانی نظام میں اُن کے لیے کوئی مقام اور اجازت نہ تھی کیونکہ ہندو معاشرے میں غلامی اور غلاموں کیلئے کوئی جگہ اور مقام نہیں تھا۔ جنسی آوارگی کے لئے وہ گھر سے باہر دیو داسیوں اور طوائفوں کے پاس جا سکتا تھا، جن کی اپنی جاتیاں ہوتی تھیں، مگر ان میں سے کسی کو داشتہ یا کنیز کے طور پر گھر میں نہیں لا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں، اگر ہندو عورت کو سوکن کا سامنا بھی ہو، تو وہ بیٹوں کے پیدا ہونے پر خاندانی زندگی میں اتنی اہمیت حاصل کر لیتی تھی کہ اس کا میاں اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال، وہ اپنے ایثار اور خدمت گزاری سے اپنے بیٹوں کے دلوں میں اعلیٰ مقاصد کی روح پھونک دیتی تھی، جن کی وجہ سے وہ جوان ہو کر ماں کے سکھائے ہوئے اصول اور مقاصد، روایات اور تعصبات کے حصول اور تکمیل کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتے تھے، جن میں اپنے خاندانی وظائف اور فرائض کی ادائیگی اپنی ذات اور جاتی کے پیشے کی انجام دہی، اپنے دھرم یعنی ذات پات کے نظام اور روایات و تعلقات کی "رکھشا" یا تحفظ اور بقا ان کی نظروں میں اولین حیثیت رکھتے تھے۔ ہندو ماں اور بیٹے کے ایسے تعلقات کی مثالوں سے ہندو معاشرے کی تاریخ بھری پڑی ہے، جس میں ہندو عورت نے بطور ماں یا بیوی کے اپنے دھرم کی حفاظت کے لئے اپنے بیٹے یا خاوند کو تکمیلی ترغیب و تلقین کی اور اُسے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے خلاف کمربستہ اور صف آرا کیا۔ اس کی ایک نمایاں مثال شیواجی کی ماں کا اثر تھا۔ اس نے بچپن ہی اپنے بیٹے کے دل میں مسلمانوں سے نفرت کے بیج بو دیے تھے، جس کے باعث بڑے ہو کر وہ ہمیشہ مغلوں اور دوسری مسلمان طاقتوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اس کے علاوہ راجپوت عورتوں نے اکثر اپنے خاوندوں اور بیٹوں کو مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما کیا۔ دراصل، ہندوؤں، خاص کر اونچی جاتیوں کے ہندوؤں کے دین دھرم کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ غیر ہندو لوگوں اور معاشروں کا خاتمہ کرنے ہی سے وہ ابدی نجات یا مکتی حاصل کر سکتے ہیں، کیونکہ اُن کے بنیادی عقائد کے مطابق تمام غیر ہندو لوگ اور معاشرے پلیت اور ملیچھ ہوتے ہیں، جن کا صفایا کرنا بھگوان کی اِچّھا ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر بھگوان کی اِچّھا اور پرماتما کی دیا کیا ہو سکتی ہے کہ بعض غیر ہندو لوگ اور معاشرے اپنی اندرونی تخریب اور انتشار کے عوامل کے باعث خود ہی اپنے آپ کو کمزور اور تباہ و برباد کر لیں، سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

اور نئے قرابتداری گروہوں کے ساتھ ساز باز کرنے پر مرکوز کرتے تھے۔ اکبر نے علاؤالدین خلجی اور شیر شاہ سوری کے جاگیرداری نظام کی اصلاحات سے استفادہ حاصل کیا اور شاہی جاگیرداریت کو منصب داری نظام کی صورت دیکر اپنی خاندانی حکمرانی اور سیاست کا آلۂ کار بنا دیا اور اس

ہندو معاشرے میں دوسری قسم کی عورتوں کی زندگی اور مقام بالکل مختلف نوعیت کا ہوتا تھا۔ وہ محض تفریح اور عیش ونشاط کا سامان ہوتی تھیں، مگر اسی بنا پر ہندو معاشرے میں ان عورتوں کا مقام بہت اہم اور نمایاں ہوتا تھا۔ ہندو مذہب اور معاشرے میں عیش اور عبادت میں فرق صرف ردیے اور روپ کا ہوتا ہے۔ دراصل ہندو عیش کو عبادت بنا لیتے ہیں اور عبادت کو عیش۔ لہٰذا ان کے مذہب میں گانا بجانا، رقص وسرود، مہادیو کا لنگم اور کسی نامعلوم دیوی کی یونی کی پوجا سب کچھ عبادت اور پوجا پاٹ کی مختلف صورتیں اور حصے ہوتے ہیں، جن سے پنڈت اور پجاری کو روحانی مکتی اور جنسی سکون اور سرور تینوں حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس راہ نجات کے لئے ایسی عورتوں کی حیثیت اور مقام کو خاص اہمیت حاصل تھی جو اپنی زندگیاں کسی مندر یا دیوتا یا دیوی کی عبادتی رقص وسرود کے لیئے وقف کر دیتی تھیں۔ یہ دیوداسیاں بن جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ ایسی عورتوں کی جاتیاں بھی ہوتی تھیں جو صرف عیش ونشاط کے لیئے قائم ہوتی تھیں۔ ان جاتیوں کا آغاز ادنیٰ جاتیوں کی اُن عورتوں سے ہوتا تھا جو اونچی جاتیوں کے مردوں کی جنسی تسکین کو اپنے لئے راہ فلاح وبہبود تصور کرتی تھیں، یا کبھی کبھار کوئی اونچی جاتی کی ایسی عورت سے بھی ہوتا تھا جو کسی نیچ جاتی کے مرد یا غیر ہندو مرد کے دام محبت میں پھنس جانے کی وجہ سے اپنے خاندان اور اعلیٰ جاتی سے نکال دی گئی ہو۔ بہر حال اونچی جاتیوں کے مردوں کو اپنی منکوحہ بیوی یا بیویوں کے علاوہ شودر اور نیچ جاتیوں کی عورتوں کو داشتہ بنانے کی آزادی بھی حاصل تھی، مگر ایک شرط پر کہ وہ اپنی داشتاؤں کو اپنے گھروں میں نہیں لائیں گے۔ دراصل یہ شرط دونوں طرف سے عائد ہوتی تھی۔ نہ تو مرد کا مشترکہ خاندان اور جاتی اس بات کی اجازت دیتے تھے اور نہ ہی داشتہ عورت کا اپنا خاندان اور جاتی اس کو اپنے کنٹرول سے باہر نکلنے کی اجازت دیتے تھے۔ اس دوطرفہ تقاضے کی صورت زمانہ قدیم وجدید میں جنوبی ہند کے میسور اور مدراس کے دراوڑی مادری معاشرے میں پائی جاتی ہے۔ بہر حال، اس شرط نے قرون وسطیٰ میں ہندو اور مسلم خاندانی نظاموں کو قطعی مختلف بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کی خاندانی زندگی کو کنیز داشتگی نے ہمیشہ پارہ پارہ کر دیا اور اس طرح سارے مسلم معاشرے کو سیفین الخلاط اور تباہی کے چکروں میں پھنسا دیا تھا، مگر ہندوؤں کی اعلیٰ جاتیوں کی خاندانی زندگی اس آفت سے محفوظ رہتی تھی۔ اُن کے مرد، خاص طور پر جاگیردار اور زمیندار اہلیت جاتیوں کے مرد گھر سے باہر

طرح جاگیرداری ظلم وستم کو کئی گنا بڑھا دیا، جس کے بوجھ کے تلے تمام مسلم معاشرہ انحطاط پذیری کا شکار ہو گیا، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ یہ حالات اورنگزیب کے عہد میں پوری طرح بروئے کار آگئے، جن میں ہندو آبادیاتی دباؤ اور گھیراؤ بھی اپنے اثرات دکھانے لگے۔

آوارگی تو کرتے رہتے تھے، مگر اس کا ان کی خاندانی زندگی، جائیداد، مشترکہ ملکیت اور تکمیلات کے تسلسل پر کوئی اثر یا رخنہ نہیں پڑتا تھا، کیونکہ ایک طرف تو ان کی "حرامی" اولاد کو اُن کے "عرفی" باپوں کی خاندانی جائیداد اور وراثت میں کوئی حصہ اور حق حاصل نہیں ہوتا تھا، جو ان مردوں کی منکوحہ بیویوں کی اولاد کے لئے محفوظ ہوتی تھیں۔ اس طرح مشترکہ خاندان کی زندگی میں جائیداد، وراثت، روایات اور تکمیلات کا سلسلہ جاری رہتا تھا جو ہندو معاشرے کی بقا اور سلامتی کی بنیاد کا راز تھا۔ دوسری طرف ان آوارہ مردوں کی "حرامی" اولاد اپنی ماؤں کی ذات یا جاتی کا حصہ بن جاتی تھی اور اس طرح بالآخر ایسی جاتیاں وجود میں آتی تھیں، جن سے شہروں اور قصبوں میں رنڈیوں اور طوائفوں کے بازار اور چکلے آباد ہو جاتے تھے، جہاں یہ بھانڈ اور بھڑووں کی جاتیاں بن کر اپنے پیشوں اور فن میں مہارت حاصل کرتی تھیں اور اپنے گاہکوں کے لئے ہر طرح کا سامانِ عیش و نشاط فراہم کرتی تھیں۔ مسلم انڈیا کی تاریخ میں جب سیفین انحطاط کا دور شروع ہوتا تو ان ہندو قبیلہ تول کے مرد اور عورتیں مسلمان بادشاہوں، سلطانوں، شہزادوں، حکام، امراء و روساء، جاگیرداروں، زمینداروں، منصب داروں اور راجاؤں اور نوابوں اور ان کی بے نام و ننگ اولادوں کے اربابِ طرب و نشاط بن جاتی تھیں۔ اس طرح ہندو معاشرہ مسلمانوں کے حکمران اور متمول ایلیت گروہوں اور طبقوں کی تخریب اور تباہی کا سامان پیدا کر دیتا اور پردہ اور حرم سسٹم سے پیدا شدہ تخریب کاریوں میں مزید اضافہ کر کے ان کی سیفین تباہی اور بیخ کنی کا سبب بن جاتا تھا۔ اس کے برعکس، ہندو معاشرے کی اونچی ذاتوں اور جاتیوں کے خاندانوں اور نظام معاشرت میں روایتی تکمیلاتی عوامل بڑی باقاعدگی اور تسلسل سے حسب دستور جاری رہتے تھے، جو بالآخر ایک آبادیاتی بھوت بن کر سارے مسلم معاشرے کو اپنے گھیرے میں لے لیتے تھے۔

ہندو خاندانی نظام میں جائیداد کا تصور بھی اس نظام اور معاشرے کے استحکام اور بقا کا سبب تھا۔ ہندوؤں میں جائیداد خاندان کی مشترکہ ملکیت تصور کی جاتی تھی، جو خاندان کے سربراہ (یعنی کرتا دھرتا) کی نگرانی میں رہتی تھی۔ مشترکہ خاندان عموماً چالیس پچاس افراد پر مشتمل ہوتا تھا (اور آج بھی کم و بیش ہوتا ہے) جن میں مرد اور عورتیں، بچے اور بزرگ، لڑکے اور غیر شادی شدہ لڑکیاں اور بیوائیں، شامل ہوتی تھیں۔ ان سب پر بزرگ مرد یعنی دادا یا باپ

ہندو ذات پات کے معاشرے کے آبادیاتی دباؤ اور گھیراؤ کے اثرات سہ طرفی قوتوں اور عوامل کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔

یا بڑے بھائی کا حکم چلتا تھا اور باقی سب لوگ اس کے حکم اور فیصلوں کے تابع ہوتے تھے، جائیداد اور آمدنی پر اس کا پورا کنٹرول ہوتا تھا اور سب کمانے والے ارکان اپنی اپنی کمائی اور آمدنی کو بے چوں و چرا اس کی تحویل میں دے دیتے تھے وہ اپنی رائے اور مرضی اور فیصلے کے مطابق گھر بار کے اخراجات چلاتا تھا خاندان کا ہر ایک مرد اور کمانے والا نوجوان یا لڑکا خاندانی پیشے یا کاروبار کا کام یا فرائض صبح سے شام بلکہ رات تک سر انجام دیتا اور رات کو اپنے دن بھر کے کاموں، کارروائیوں اور مصروفیات کی رپورٹ سربراہ (یعنی کرتا دھرتا) کے آگے بیان کرتا اور آئندہ کے لئے اس سے ہدایات لیتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے خاندان کے کاموں اور مفادات اور خدمات میں عمر بھر تگ و دو کرتا رہتا تھا۔ اس طرز کی خاندانی اور "ذاتی" زندگی سے ہندوؤں میں محنت و مشقت، اطاعت اور خدمت گزاری، ایثار اور وفاداری، مفاد پرستی اور خود غرضی، خاندانی اور ذات پات کی روایت پرستی، فخر اور قدامت پسندی کے جذبات اور عادات راسخ ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنے خاندانی اور "ذاتی" کاروبار اور وظائف اور کاموں کی انجام دہی میں فرض شناسی، تندہی، باقاعدگی، مستعدی، ہوشیاری، عیاری مکر و فریب اور حیلہ سازی بھی سیکھ جاتے تھے۔ ان حالات اور عادات کے باعث ہر ایک ہندو متضاد رویوں اور رجحانات کا مالک ہوتا تھا اور اس کی شخصیت اور کردار، ذہن و فکر، عقل و شعور بہت متناقض اور مخفی محرکات کے حامل ہوتے تھے (اور ہیں) ہندو بیک وقت عاجز، انکسار، پُرامن اور آہنسا پسند نظر آتے ہیں مگر بوقت ضرورت وہ عیار، حیلہ ساز، مکار، فریبی اور خونخوار بن سکتے ہیں، وہ موقع اور محل، وقت اور ضرورت کے مطابق اپنے ذہن و فکر، کردار و گفتار کی نیک یا بد، حسن و قبیح خصلتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے تھے (اور آج بھی لاتے ہیں) اس طرح وہ اپنے خاندانی "ذاتی"، گروہی اور اجتماعی مقاصد کے حصول اور تکمیل میں ان کمزور اور غیر تکمیلی افراد، گروہوں اور معاشروں کو تہس نہس کر دیتے تھے جو خود بھی اپنے اندرونی انتشار اور انحطاط کا شکار ہوتے تھے رہا ہیں) بلکہ اس توسیع پسندانہ کام میں ہندو معاشرے کی وہ جاتیاں بھی جو عموماً پُرامن اور آہنسا پرست ہوتی ہیں، مثلاً برہمن اور بنیا جاتیاں جنگ باز جاتیوں کے پیش پیش ہوتی تھیں۔ بہر حال ہندو معاشرے کی ایسی کایا کلپ آبادیاتی پھیلاؤ کے باعث پیدا ہوتی تھی

اول: ہندو جاگیرداری طبقوں کی سرکشی اور بغاوت جو مسلم جاگیرداری اہلیت کے انحطاط اور تکمیلی قوتوں کے فقدان سے فائدہ اٹھا کر علم بغاوت بلند کر دیتے تھے۔ ایسی بغاوتیں ہر سیفین چکر کے اختتام پر رونما ہوتی تھیں، مگر سلطنت مغلیہ کے دور انحطاط و زوال میں مرہٹوں، سکھوں

ہندو خاندان کی مشترکہ ملکیت، تعاون اور اشتراک عمل اس کے ہر رکن میں خاندانی جائیداد، کاروبار اور ذرائع آمدن کو بڑھانے کا خیال پیدا کر دیتے تھے، جو اس کی معاشری حیثیت، اثر و رسوخ اور فرائض و وظائف کی اہمیت کا ضامن بھی ہوتا تھا۔ اس لئے اونچی جاتیوں کے ہندوؤں میں محنت و مشقت، کام اور مقصد کی لگن، مشترکہ مفادات کی حفاظت کا احساس، فرض شناسی، کام اور مقصد کی انجام دہی میں سنجیدگی، دیانت داری اور ذمہ داری کے احساسات کفایت شعاری جیسی عادات اور رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں مشترکہ خاندان میں انفرادی تکمیلیت کے رجحان اور عادات کے لئے کوئی گنجائش اور مواقع نہیں ہوتے اور نہ ہی کوئی شخص آزادانہ اور خود مختارانہ زندگی کا خواہاں ہوتا تھا۔ کیونکہ ہر شخص جس ذات اور جاتی میں پیدا ہوتا تھا۔ اسی کے پیشے، کاروبار اور وظائف کو اختیار کرتا تھا۔ دراصل ہندو مائیکرو سوسائٹی کبھی بھی افراد کی آزادی اور مساوات کی حامی یا حامل نہیں رہی۔ بلکہ اس میں ہر شخص کو اپنی پیدائشی ذات اور جاتی کے فرائض اور وظائف، کاروبار اور پیشے ہی اختیار کرنے ہوتے تھے۔ بالفاظ دیگر، ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی ذات اور جاتی کے کاموں اور پیشے کو بلا روک ٹوک حاصل کرے اور تکمیل کرے۔ اس حق اور فرض کو پورا کرنے کے لئے اس کا خاندانی نظام اور ماحول اس کی ذات پات کا معاشری نظام اور ساری تہذیب و تمدن، دین اور دھرم مربوط اور منظم ہوئے تھے اور ہیں۔ لہٰذا ہندوؤں میں کوئی شخص اپنے خاندان اور معاشرے کے باہر نہ کچھ دیکھتا تھا اور نہ دیکھنے کا خواہاں ہوتا تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے خاندان اور جاتی کے کاموں، فرائض اور روایات کی تکمیل میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اگر وہ برہمن پیدا ہوا ہے تو وہ برہمنوں کے پوجا پارٹ کے فرائض میں ساری عمر مشغول رہتا تھا، اگر بنیا پیدا ہوا ہے تو ساری عمر تجارتی لین دین اور دھن دولت کمانے اور جمع کرنے کے فکر میں رہتا تھا۔ اگر زمیندار یا کاشت کار ہے تو ان کاموں میں ہی مشغول رہتا تھا۔ اگر تیلی، کمہار یا چوڑھا یا چمار پیدا ہوا ہے تو وہ ان نیچ ذاتوں کے کاموں اور پیشوں میں ساری عمر مصروف رہتا تھا وہ نہ اپنی ذات سے اوپر والی ذاتوں میں بلند ہونے کا خیال کرتا تھا اور نہ ہی اپنے سے نیچی ذاتوں کا فکر کرتا تھا۔ ذات پات کی اس تقسیم کا ایسے ہندوؤں میں انسانی مروت اور ہمدردی کے جذبات بھی اس مائیکرو سوشل نظام کے تحت آ جاتے تھے لہٰذا ہر ایک ہندو میں تنگ نظری، بخل، ذات پات کی نخوت اور علیحدگی پسندی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی اور آج بھی ہے۔ مگر اپنے خاندان اور جاتی

اور جاٹوں وغیرہ کی بغاوتیں کامیاب ہو کر مغل سلطنت کی تباہی کا باعث بنیں۔

دوم: ہندو تجارتی جاتیوں کی اقتصادی ترقی اور اثر و رسوخ: یہ عمل بھی ہر سیفین چکر کے آخر میں

کے لئے خدمت اور ایثار کا جذبہ اور اس وجہ سے سارے ہندو دھرم یعنی ذات پات کے نظام اور معاشرے کو قائم رکھنے کا احساس و شعور بھی پیدا ہو جاتا تھا جو زمانہ جدید کے قومی تقاضوں کی وجہ سے اور بھی زیادہ شدید اور ہمہ گیر بن گئے ہیں۔ اپنی انتھک محنت و مشقت' ایثار و قربانی' سنجیدہ مزاجی' ثابت قدمی' مستقل مزاجی' احساس ذمہ داری اور فرض شناسی کے باعث ہندو معاشرے کے غیر حکمران ذاتوں اور جاتیوں میں اپنی معاشی پیداواری تکمیلات کا سلسلہ نسل در نسل جاری رہتا تھا جس کے نتیجے میں اس معاشرے میں ہمیشہ دولت و ثروت اور مال و زر کی مقدار میں اور آبادی کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا تھا بشرطیکہ ہندو حکمران جاتیوں اور غیر ہندو حکمران اہلیت گروہوں کی غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی عوامل اس آبادیاتی فروغ اور پھیلاؤ کے مانع نہ ہوں۔ مگر جونہی یہ عوامل رفع ہو جاتے تھے' تو ہندو غیر حکمران جاتیاں اپنی پیشہ ورانہ روایتی تکمیلات کا یکساں تسلسل پھر برقرار کر لیتی تھیں۔ دراصل قرون وسطیٰ میں ہندو مائیکرو سوسائٹی تکمیلاتی لحاظ سے اپنی ہمعصر یورپین ماکرو سوسائٹی اور مسلم مائیکرو سوسائٹی سے مختلف تھی۔ یورپین ماکرو سوسائٹی میں ترقی' تکمیل کا عمل بروئے کار ہوتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہمیں نئی تخلیقی قوتیں اور تکمیلات وجود میں آگئیں جنہوں نے مغربی یورپ میں جاگیرداریت کو ختم کر کے نئے جدید مکروسوشل سرمایہ دار معاشرے کو جنم دیا۔ اس کے برعکس' جیسا کہ ہم نے تفصیل سے تجزیہ کیا ہے' قرون وسطائی مسلم معاشرے میں ہمیشہ تقلیل تکمیل کا عمل جاری رہتا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں سیفین چکروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان دونوں معاشروں کے برعکس' ہندو ذات پات کی مائیکرو سوسائٹی میں تسلسل تکمیل کا عمل یکساں روایتی سطح پر جاری رہتا تھا جس میں نہ تو نئی تخلیقی قوتوں اور تکمیلات ظہور پذیر ہوتی تھیں' لہٰذا اس میں نہ تو کوئی معاشرتی تبدیلی اور ترقی اور نہ کوئی نیا غیر قرابتداری ہندو معاشرہ تشکیل ہوتا تھا' اور نہ ہی کوئی تقلیل تکمیل کا عمل در آتا تھا' بلکہ ذات پات کے نظام کی حدود کے اندر ہندو خاندانوں اور جاتیوں میں حسب سابق روایتی پیداواری تکمیلات کا سلسلہ یکساں جاری رہتا تھا۔ اس یکساں تسلسلِ تکمیل کے عمل کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ ہندو معاشرے میں دو تین نسلوں کے بعد ہندوؤں کی اونچی جاتیوں میں روایتی دولت کی فراوانی اور ارتکاز ہو جاتا تھا جو ان کی ہمیشہ بڑھتی ہوئی آبادی کی معاشی' تمدنی اور دوسری معاشرتی ضرورت کی کفالت فروغ اور خوشحالی کا ضامن ہوتا تھا۔ بہر حال' قرون وسطیٰ کے ہندو اور مسلم مائیکرو سوسائٹیوں کے ان تکمیلی عوامل کے اس بنیادی فرق نے برصغیر جنوبی ایشیا کے ان دونوں معاشروں کی تاریخ پر نہایت اہم اور دور رس نتائج مرتب کئے۔

اپنے ذاتی "فرائض و وظائف کی مخصوص نوعیت کی وجہ سے ہر ہندو ذات کا تاریخی کردار بھی مختلف قسمت کا حامل رہا ہے۔ برہمن اپنے مذہبی یا دھارمک فرائض کے باعث برصغیر کی تاریخ کے تمام نشیب و فراز کے باوجود معاشرتی اثر و رسوخ کے حامل رہے ہیں۔ مسلمانوں کی مائیکرو سوسائٹی میں برہمنوں کے مشابہ علماء کے گروہوں کو ایسی متواتر تاریخی اور معاشرتی اہمیت

رونما ہوتا تھا مگر سلطنت مغلیہ کے دور انحطاط میں اس کے مخصوص نتائج مرتب ہوئے جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

اور اثر و رسوخ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ اگرچہ ہمارے علما کی مختلف قرابتداری گروہ مثلاً سیدوں، مفتیوں، قاضیوں وغیرہ کی اپنی الگ الگ ذاتیں بن جاتی تھیں، مگر برہمنوں کی جاتیوں کے برعکس یہ مسلم ذاتیں چند نسلوں کے بعد پردہ اور حرم سسٹم کی تخریب و انحطاط کا شکار ہو کر مٹ جاتی تھیں، کیونکہ انکی اولادوں میں کوئی تکمیلی صلاحیت اور قوت باقی نہیں رہتی تھی۔

کشتریوں کی جاتیوں پر تاریخ نے ہمیشہ گہرا اور سنگین اثر ڈالا ہے۔ درحقیقت یہ ذات ہندو جاگیردارانہ نظام کی روح رواں ہوتی تھی جو زمینداری فرائض اور مفادات کے تحفظ کیلئے فوجی صلاحیتوں اور سیاسی اختیارات اور اقتدار سنبھال لیتی تھی اور اس طرح راج پاٹ پر براجمان ہو جاتی تھی مگر اسی وجہ سے صرف یہی ہندو ذات تھی جو سیفین چکروں کا شکار ہوتی تھی، جن کی وجوہات بھی کثرت ازدواج اور داشتائیں ہوتی تھیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ برصغیر کی تاریخ میں ہندو جاگیرداری اور حکمران ایلیت کے اپنے سیفین چکروں نے ہندوانڈیا میں اقتدار اور حاکمیت کا ایسا خلا پیدا کر دیا تھا جس نے مسلمان سیفین حملہ آوروں کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔ تاہم ہندو مائیکرو سوسائٹی پر ہندو حکمران ایلیت کے سیفین انحطاط اور زوال و سقوط کا ویسا اور اتنا ہمہ گیر اثر نہیں ہوتا تھا جیسا کہ مسلمانوں کے معاشرے میں ہوتا تھا جو سارے مسلمان معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو معاشرے میں صرف حکمران ایلیت ہی غیر تکمیلی بنتے تھے، جبکہ باقی سب ہندو ذاتیں اور جاتیں بدستور اپنی روایتی تفاعلیت برقرار رکھتیں اور اپنی ذاتی تکمیلات حاصل کرتی رہتی تھیں کیونکہ ان کی خاندانی زندگی میں کوئی غیر تکمیلی عوامل نہیں در آتے تھے، جیسا کہ مسلمانوں کے تمام تکمیلی گروہوں اور ذاتوں میں سرایت کر جاتے تھے۔ ہندو معاشرے کی یہ خصوصیت اس کے تسلسل اور استحکام، بقا اور سلامتی کا باعث تھی۔

برصغیر کی مسلم تاریخ میں نئے سیفین حکمران جب عنان حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھال لیتے تھے تو وہ اپنی نئی مملکت میں امن و امان اور مضبوط نظم و نسق قائم کر دیتے تھے۔ اس امن و آشتی میں ہر مسلمان حاکم، جاگیردار اور صوبیدار اپنے اپنے علاقے اور جاگیر میں نئے نئے گاؤں اور بستیاں آباد کرتے تھے، جہاں ہندو معاشرے کی تمام غیر حکمران ذاتیں اور جاتیاں جوق در جوق آکر بس جاتی تھیں اور اپنے اپنے کاروبار اور پیشوں میں مشغول ہو جاتی تھیں۔ ہندو مائیکرو سوسائٹی کو اس امر سے کوئی خاص واسطہ یا سروکار نہ ہوتا تھا کہ حکمرانوں کا مذہب کیا ہے، بشرطیکہ وہ اس کے روایتی نظام حیات میں کوئی مداخلت اور رخنہ اندازی نہ کریں۔ اس لئے برصغیر کی تاریخ میں جب کبھی ایسے حکمران آتے تھے جو امن و امان قائم کر دیتے اور واجبی ٹیکس اور مالیہ وغیرہ وصول کرتے، مگر ہر ہندو ذات اور جاتی کے اپنے اپنے کاموں، پیشوں، عقائد

سوم۔ ہندو "تمدنی" جاتیوں، مثلاً بھانڈ بھڑواوں اور کلاونتوں کا مسلم ایلیٹ پر اثر و رسوخ اور افسوں گری۔ اس کا ذکر بھی ہم صرف مغل اور بعد از مغل دور کے مسلم ایلیٹ طبقوں تک محدود رکھیں گے۔

وظائف روایات اور تعصبات وغیرہ میں کوئی مداخلت یا مزاحمت نہ کرتے تھے، تو سارا ہندو معاشرہ ایسے فرمان رواؤں اور حاکموں کی سچ مچ پوجا شروع کر دیتا تھا، کیونکہ حاکموں کی پوجا بھی اُن کے مذہب و عقائد کا لازمی حصہ تھا مسلمان حکمرانوں میں صرف اکبر اور اس کے جانشین اس رمز کو سمجھ گئے تھے، لہٰذا ہندو ان کی پوجا کرنا اپنے لئے ثواب دارین خیال کرتے تھے مگر جب اورنگزیب کے عہد میں مغلوں کا دور انحطاط و انتشار شروع ہوا تو یہ سوانگ زیادہ مدت نہ چل سکا۔ صرف انگریز سامراجی ایسے حکمران ثابت ہوئے جن کی ہندو رعایا وں سے آخر تک پوجا کرتے رہے۔ مگر انگریزی سامراج کچھ ایسی سیکولر چیز تھی کہ انگریز حکمرانوں نے کبھی ہندوؤں کے راج درشن کا ایسا سوانگ اور ڈھونگ نہ رچایا جیسے اکبر اور اس کے جانشینوں نے رچا لیا تھا) مگر یہ راج درشن یا پوجا ایک طرح کا معاہدۂ عمرانی ہوتا تھا کہ تم امن و امان قائم رکھو اور ہم واجبی ٹیکس ادا کرینگے تاکہ ہماری آبادی پر امن طور سے گاؤں سے گاؤں اور شہر سے شہر پھیلتی رہے۔"

بہر کیف برصغیر کی مسلم تاریخ میں جب کوئی نیا سیفین چکر شروع ہوتا تھا، تو نئے مسلمان حکمران، حکام صوبیدار، منصب دار، جاگیر دار اور زمیندار اکثر نئے نئے قصبے اور شہر آباد کرتے تھے، جنگل صاف کر کے نئے نئے گاؤں آباد کرتے تھے، یا پرانے شہروں اور قصبوں یا دیہات جو سابقہ سیفین حکمرانوں کے انحطاط، انتشار اور سقوط کے زمانے میں اجڑ جاتے تھے، انہیں دوبارہ آباد کرتے تھے۔ ان نئے اور پرانے مقامات اور جگہوں میں وہ قلعے بناتے، حویلیاں، محل اور محل سرا کھڑا کرتے، مسجدیں اور خانقاہ بناتے اور نہریں، پل، سرائیں اور دوسری پبلک عمارتیں تعمیر کرتے تھے۔ ان نئے اور پرانے گاؤں، قصبوں اور شہروں میں وہ نہ صرف اپنے خاندانوں رشتہ داروں اور قرابتداروں، اپنے فوجیوں، سپاہیوں اور دوسرے متعلقین کو آباد کرتے تھے، بلکہ ہندوؤں کی مختلف جاتیوں کو بھی آباد کرتے تھے۔ اس طرح ان نئی اور پرانی بستیوں میں پھر ہندو بنیوں اور دوکانداروں اور تاجروں زمینداروں اور کاشت کاروں، ترکھانوں، تیلیوں، کمہاروں، چوڑھوں اور چماروں کی ذاتیں اور جاتیاں آباد ہو جاتی تھیں۔ بازار اور میلے لگتے تھے۔ زراعت اور کاشت کاری شروع ہو جاتی تھی۔ تجارت اور کاروباری لین دین فروغ پاتے تھے۔ صنعت و حرفت کی ترقی ہوتی تھی اور خوشحالی کا دور دورہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس ترقی اور خوشحالی کے دور میں سب ہندو جاتیاں اپنے اپنے مخصوص روایتی پیشوں میں خوب تجلیات حاصل کرتی تھیں۔ بنئے اور بقال دوبارہ اپنی دکانیں کھول لیتے تھے۔ موچی، تیلی، ترکھان اور کمہار پھر اپنے اپنے کام کاج شروع کر دیتے تھے

مغل سلطنت اور معاشرے کا انحطاط اور مسلمانوں کے ہر طبقے اور گروہ کے خاندان میں اخلاق وکردار کی تخریب اور غیر تکمیلیت سے ہوا جس نے شاہی خاندان سے لیکر امرا، منصب داروں، جاگیرداروں

جنگی اور چارچار اپنے مخصوص کام اور فرائض سرانجام دینے لگتے تھے. کائستھ قسم کی جاتیاں پھر مال گزاری اور منشی متصدی کے فرائض سنبھال لیتے تھے، برہمن اور پنڈت پھر پوجا پاٹ کے لئے مندر اور مٹھ اور پاٹ شالے کھول لیتے تھے. زمیندار اور کاشت کار جاتیاں پھر ہل چلانے اور فصلیں کاشت کرنے کے کام شروع کر دیتی تھیں اور ادھر نئے اور پرانے قصبوں اور شہروں میں متمول ہندو تاجر اور سوداگر، مہاجن اور ساہوکار اپنی تجارت کو خوب چمکاتے تھے اور سودی کاروبار کو فروغ دیکر دھن دولت خوب جمع کرنا شروع کر دیتے تھے. جلد ہی مسلمان حکمران، منصب دار اور جاگیردار بھی ہندو مہاجنوں، سیٹھوں اور ساہوکاروں سے قرض لیکر ان کے مقروض ہو جاتے تھے. اس طرح ہندو معاشرہ پھر اپنی قدیمی روایتی خدوخال کے ساتھ دوبارہ چالو ہو جاتا تھا اس خوشحالی اور دولتمندی کے دور میں ہندو آبادی کو خوب فروغ حاصل ہوتا تھا، ادھر مسلمانوں کی نووارد آبادی بھی نہ صرف تعدد ازدواج اور کنیز داشتگی کی وجہ سے بلکہ ان کی سیفین ایلیٹ کی بڑھتی ہوئی آسودگی اور خوشحالی زر و زمین کی فراوانی اور دولت کی ریل پیل کے باعث اور سابقہ سیفین چکروں کی بچی کھچی آبادی کے ساتھ مل کر خوب زوروں سے بڑھتی تھی، مگر ایک دو نسلوں کے بعد جب سیفین چکر کا دور انحطاط و انتشار شروع ہوتا تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے آبادیاتی پھیلاؤ اپنے اپنے عوامل و عواقب کے باعث ان دونوں مائیکرو سوسائٹیوں کے مابین تضاد اور تصادم پیدا کر دیتے تھے. چونکہ یہ تضاد و تصادم جاگیرداری نظام نے پیدا کئے تھے اس لئے انکی نوعیت زمانہ جدید کے سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام کے دور کے ہندو اور مسلم معاشروں کے تضاد اور تصادم، فساد اور جنگ سے قطعی مختلف ہوتی تھی، قرون وسطیٰ میں برصغیر کی جاگیرداریت، خواہ وہ ہندو، کھشتریوں، راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں کی قائم کردہ ہو، یا مسلمانوں کے شاہ سیفین حکمران ایلیت کی قائم کردہ ہو، ایک بنیادی معاشری اور اقتصادی تضاد کو حل نہ کر سکی، یعنی ہندو مائیکرو سوسائٹی میں ایسا جاگیرداری نظام نہ قائم کر سکی، جس میں انفرادی طور پر دولت کا ارتکاز ہو سکے، جو صرف مشترکہ خاندان کے نظام کو ختم کر کے ہی ممکن ہو سکتا تھا مگر مشترکہ خاندانی نظام صرف ایک ہی صورت میں ختم ہو سکتا تھا اور وہ تھا ذات پات کی تقسیم کار کی بجائے انفرادی جاگیردارانہ تقسیم کار، جس کے لئے ہندو خاندانی نظام سے ہندو عورت اور اس کی اولاد کو ہندو تعدد ازدواج اور نظام معاشرت کی دوسری بندشوں سے آزاد کرنے کی ضرورت تھی، مگر ہندو دھرم ان تبدیلیوں کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔

پس مسلمانوں کے سیفین حکمرانوں کی جاگیرداریت (فیوڈلیزم) ایک طرف تو ہندو مائیکرو سوسائٹی کی ذاتوں اور جاتیوں کے آبادیاتی پھیلاؤ کی دلدل میں پھنس جاتی تھی جسے وہ اپنے سیفین دور عروج میں تحمل اور فروغ کے مواقع

تاجروں، سوداگروں، علماء اور مسلمانوں کے ہر طبقے کے لوگوں کے خاندانوں کو متاثر کیا۔ اس دور میں تقلیلِ تکمیل کے عمل نے بالآخر یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمان حکمرانوں، امراء اور منصب داروں کی فضول خرچی اور نمود و

خود فراہم کرتی تھی اور دوسری طرف اپنے پردہ اور حرم سسٹم کے پیدا کردہ تخریب، انحطاط اور انتشار کے چکر میں مبتلا ہو جاتی تھی جو تقلیلِ تکمیل کے عمل کی وجہ سے مسلم حکمران ایلیت گروہوں اور طبقوں کی ہر نئی نسل میں شدید سے شدید تر ہوتے جاتے تھے۔ ہندو مائیکرو سوسائٹی میں، جاگیردار جاتیوں کو چھوڑ کر جو مسلم جاگیرداری ایلیت کی طرح تقلیلِ تکمیل کے عمل میں گرفتار ہو جاتے تھے، باقی تمام ہندو ذاتیں اور جاتیاں تقلیلِ تکمیل کی بجائے اپنے روایتی تکمیلات کا تسلسل جاری رکھتی تھیں، جو ان کی آبادی کے پھیلاؤ اور فروغ کا راز تھا۔ تاہم ہندو مائیکرو سوسائٹی اپنے تکمیلاتی تسلسل کے عمل سے ایک اور طرح کے تضاد کا شکار ہوتی تھی، جس کی وجہ سے وہ آپس میں بھی اور مسلمانوں سے بھی متصادم ہوتی تھی۔ یہ تضاد ہندو مائیکرو سوسائٹی کی کاشت کار اور مزارعہ جاتیوں اور تجارتی جاتیوں کا تضاد تھا۔ آبادیاتی فروغ اور وسعت پذیری کے دوران ہندو زمیندار اور کاشت کار جاتیوں کو نئے گاؤں اور علاقے آباد کرنے کا موقع ملتا تھا اور اُن میں زمینوں کی دولت جمع کرنے کا رجحان بڑھتا تھا جس کے باعث وہ ایک طرف تو مسلم جاگیرداری طبقوں اور حکمرانوں سے متصادم ہوتے تھے، تو دوسری طرف وہ اپنے ہندو تجارتی جاتیوں، مثلاً بنیوں، مہاجنوں اور ساہوکاروں کے سودی استحصال میں پھنس جاتے تھے۔ لہٰذا مسلمان اور ہندو جاگیرداروں کے براہِ راست استحصال اور لوٹ مار اور اپنے ہندو تجارتی جاتیوں کے سودی استحصال کے دوہرے ظلم و ستم میں پھنس کر ہندوؤں کے گاؤں اور آبادیاں برباد ہونے لگتی تھیں۔ ادھر مسلم حکمرانوں کا سیفین چکر بھی اپنے انحطاط و انتشار کی انتہا کو پہنچ جاتا تھا جو گاؤں اور آبادیوں کی تباہی کو بڑھا دیتا تھا۔ ان عوامل کے باعث ہندو آبادیاتی پھیلاؤ کا عمل رک جاتا تھا۔ برصغیر میں عام تباہی اور افراتفری پھیل جاتی تھی۔ مگر برصغیر کی مسلم تاریخ میں چھ مرتبہ ایسے ہوا کہ جلد ہی نئے سیفین حملہ آوروں نے آ کر حالات کو سدھار لیا مگر ساتویں مرتبہ مغلوں کے سیفین چکر میں حالات یکسر بدل گئے" جنہوں نے ہندو آبادیاتی پھیلاؤ اور گھیراؤ کی سٹرٹجی کو بالکل نیا روپ اور نیا رخ دے دیا۔ یہ تبدیلی برصغیر کی ساحلوں اور سرحدوں پر یورپین سامراجیوں کے نمودار ہونے سے پیدا ہوئی۔ سولہویں صدی کے اوائل سے برصغیر میں پہلے پرتگیزی، پھر ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز سامراجی (اور بالواسطہ طور پر روسی سامراجی) تجارت اور نوآبادیاتی مقبوضات کی غرض سے وارد ہوئے۔ وہ سب خاص طور پر انگریز سامراجی ایسی تخلیقی، پیداواری اور تنظیمی قوتوں، صلاحیتوں اور تکمیلات سے لیس تھے جو ہندو اور مسلمان لوگ اور معاشرے اپنی سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال کی تاریخ میں بھی حاصل نہ کر سکے۔ لہٰذا یورپین سامراجیوں کی آمد نے برصغیر میں انقلاب انگیز تغیرات برپا کر دیئے۔ سب سے پہلے انہوں نے برصغیر میں بلکہ قرونِ وسطیٰ کی ساری دنیا کے

نمائش کے باعث دولت اُن کے ہاتھوں سے نکل کر ہندو تجارتی جاتیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگی اس انتقالِ دولت کے عمل میں مسلمانوں کے خلاف تکمیلی نظریات اور عقائد، مثلاً قناعت

اسلام میں مسلمان سیفین ایلیت کی پانچ چھ سو سالہ فوجی برتری اور اجارہ داری ختم کر کے حکومت اور سلطنت ان سے چھین لی۔ کیونکہ یورپین سامراجی سامانِ جنگ اور جنگی اور سیاسی تنظیم و تدبیر میں اُن سے بدرجہا ترقی یافتہ تھے۔ مسلمان حکمران ایلیت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہندو لفنگیوں یعنی نئی اور پرانی ہندو جگ باز جاتیوں، مثلاً راجپوتوں، مرہٹوں اور سکھوں وغیرہ کا بھی خاتمہ کر دیا جو مسلم ایلیت کے سیفین چکروں کے دورِ انحطاط و انتشار میں سرکشی اور بغاوت کر کے برصغیر میں اِدھر اُدھر اپنی چھوٹی بڑی مملکتیں قائم کر لیتے تھے۔ اس طرح بالآخر انگریزوں نے سارے برصغیر کو فتح کر کے اپنی مضبوط اور مستحکم سلطنت قائم کر لی اور ایسا امن و امان قائم کیا جس میں ہندو تکمیلی معاشرے کی ترقی اور فروغ کے لئے نئی راہیں کھل گئیں۔ ہندو معاشرے کی تجارتی اور دوسری غیر حکمران جاتیوں کے لئے تاریخ میں پہلی مرتبہ مستقل تجارتی اور صنعتی فروغ اور ارتکازِ دولت کے زریں مواقع ہاتھ آئے۔ سامراجیوں کی آمد سے پہلے ان جاتیوں کی تجارت اور صنعت و حرفت کا فروغ اور ارتکازِ دولت کے عوامل جلد ہی سیفین انتشار اور افراتفری کی نذر ہو جاتے تھے جب تک کوئی نئی مسلمان یا ہندو سیفین ایلیت دوبارہ امن و امان قائم نہ کر دیتے، ان کے تجارتی اور صنعتی کاروبار معطل اور مفلوج رہتے تھے۔ مگر یورپین سامراجیوں، خاص کر برطانوی سامراجیوں کے اقتدار اور عملداری کے امن و امان میں ہندو تجارتی اور صنعتی جاتیوں مثلاً بنیوں، بقالوں، مہاجنوں، مارواڑیوں اور ساہوکاروں اور ان کی دیکھا دیکھی دوسری جاتیوں کے تجارتی اور صنعتی کاروبار اور پیشوں کو خوب فروغ حاصل ہوا اور انہوں نے دولت جمع کرنی شروع کر دی جس نے جدید ہندو معاشرے میں ارتکازِ دولت اور سرمایہ داری کا نظام کو جنم دیا۔ جدید بھارت کی سیاسی قیادت اور اس کی ایلیت جاتیاں انہی منافع خور سرمایہ داری کی پیداوار اور نمائندہ جماعتیں ہیں جو برطانوی سامراجیت کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھیں۔ اس طرح سے پرانا ہندو معاشرہ ایک سرمایہ دار معاشرہ بن گیا ہے اور اب ہر سرمایہ دار معاشرے کی طرح اور اپنے نئے اور پرانے سامراجی کرمفرماؤں کی مدد سے وہ سامراجی اور نوآبادیاتی دانت بھی تیز کر رہا ہے۔ اس کایا پلٹ نے ثابت کر دیا کہ برطانوی سامراجیت نے اپنے دو سو سالہ دورِ حکومت کی قلیل مدت میں ایسا منتر پھونک کر دکھایا جو ہندوؤں کے وید اور شاستر، کشتری اور برہمن اپنی تین ہزار سال کی تاریخ میں بھی نہ دکھا سکے اس کے برعکس، اس دوران میں برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلم معاشرے پر پردہ اور حرم سسٹم کے پیدا کردہ جاگیردارانہ انحطاط، انتشار اور پس ماندگی کے حالات اور ماحول طاری رہے جنہوں نے مسلمانوں کے ایلیت گروہوں اور

پسندی، توکل اور قرابتدارانہ صلہ رحمی وغیرہ نے اور زیادہ اضافہ کیا جو مسلمانوں میں خلاف تکمیلی علماء اور صوفیاء، خانقاہوں کے سجادہ نشین اور درویش ہر وقت اور ہر جگہ پھیلاتے رہتے تھے اور جن کی تعداد اور اثر و رسوخ سیفین چکر کے دورِ انحطاط میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی بدحالی کے ساتھ ساتھ بڑھتے جاتے تھے۔ اس طرح یہ نظریاتی طبقے بھی مسلمانوں کے انحطاط اور زوال میں تیزی پیدا کر دیتے تھے۔

جب مسلمانوں کے امیر خاندان، خواہ جاگیرداروں کے ہوں یا تاجروں اور منصب داروں کے ہوں، اپنی غیر تکمیلیت اور فضول خرچی کے باعث مفلس اور مفلوک الحال ہوتے تھے، تو وہ ہندو بنیوں، مہاجنوں اور ساہوکاروں کے مقروض بن جاتے تھے۔ اس طرح مسلم جاگیرداریت مسلمانوں کی زر و مال اور دولت کو ہندو تجارتی جاتیوں کے پاس منتقل کر دیتی تھی۔ مغل معاشرے میں اس تقلیل تکیل کے عمل کا ایک اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مسلمان تاجر اور سوداگر تجارت کے میدان سے خارج ہو جاتے تھے۔ ان کی جگہ ہندو تاجر اور سوداگر لے لیتے تھے۔ مثال کے طور پر سورت کی بندرگاہ میں جو مغلیہ دور میں برصغیر میں سب سے بڑی بندرگاہ تھی، اورنگ زیب کے عہد میں تاجروں اور سوداگروں کی اکثریت مسلمانوں کی تھی، مگر اس کے ایک صدی کے بعد وہاں ہندو تاجروں اور سوداگروں کی اکثریت بلکہ اجارہ داری قائم ہو گئی[1]۔ دوسری طرف بنگال میں مرشد آباد کی نئی سیفین مملکت میں بھی ایک ہی نسل میں ہندو مارواڑی تاجروں

طبقوں کے ذہن و فکر، عمل و کردار پر اداسی، پژمردگی، قنوطیت اور منفیت کے رجحانات پیدا کر کے انہیں "اداس نسلیں" بنا دیا، جنہیں انگریز سامراجیوں اور ان کے بے خبر اور بے علم بکار علماء اور دوسرے اہل علم و فکر نے اپنے غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی نظریات اور تاویلات سے عدم تکمیلی خوابوں کی دنیا میں بہلائے اور سلائے رکھا۔ صرف بیسویں صدی کے عظیم تغیرات اور انقلابات نے مسلمانوں میں بیداری کا الارم بجا کر ان کی نجات کی امید کی کرن روشن کر دی ہے۔ اس تبدیلی کا تجزیہ ہم اگلے ابواب میں کریں گے۔ بہر حال جدید ہندو مائیکرو سوسائٹی اپنے سرمایہ دارانہ قوتوں اور صلاحیتوں کے توسیع پسندانہ عزائم کیلئے پرانے ہندو آبادیاتی پھیلاؤ اور گھیراؤ کو نو آبادیاتی صورت دیکر برصغیری مسلم معاشرے کو نئے اور شدید تر خطرات سے دوچار کرنے میں مصروف ہے۔

---

[1] سورت میں مسلمان تاجروں کی کثرت اور غلبے کیلئے دیکھئے خافی خان "منتخب اللباب" حصہ سوم صفحات ۲۰ اور ۲۲۹ تا ۲۳۲ ہندو تاجروں کے غلبے کیلئے دیکھئے

اور سیٹھوں کو تجارتی غلبہ اور اجارہ داری حاصل ہو گئی، بلکہ اس نئی مملکت کی سرعت انگیز تباہی کی وجہ بھی ہندو بنیوں اور سیٹھوں کی انگریز سامراجیوں کے ساتھ ساز باز تھی۔ جب بنگال و بہار میں انگریز سامراجیوں کی عملداری قائم ہو گئی تو بنیوں اور سیٹھوں اور مارواڑی تاجروں کو اپنی تجارت کو فروغ دینے کے مواقع خوب میسر آ گئے۔ اگرچہ مسلم بنگال کے آخری دنوں میں لوٹ کھسوٹ کا جو بازار گرم ہوا تھا اس میں شیر کا حصہ تو انگریز سامراجیوں نے لیا، مگر ہندو تجارتی جاتیوں نے بھی اپنے ہاتھ خوب رنگے۔ ان میں سے بعض تو اس قدر امیر ہو گئے تھے کہ "جگت سیٹھ" کہلاتے تھے۔ اس طرح ہندو تجارتی جاتیوں نے ابتدائی ارتکاز دولت حاصل کر کے سرمایہ داری کی بنیاد رکھ دی۔ اس انتقال اور ارتکاز دولت کی بڑی وجہ نہ صرف ہندو تجارتی جاتیوں کی تکمیلی صلاحیتیں اور خوبیاں تھیں، بلکہ مسلمان تاجروں اور سوداگروں کی غیر لچکدار اور غیر تکمیلی طریقے اور رویے بھی تھے، جو برصغیر کی تجارت اور صنعت میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور ماحول میں تجارتی ترقی اور فروغ میں مانع ہو گئے تھے۔ برصغیر کی تجارتی اور صنعتی دنیا کو یورپین تاجروں، کمپنیوں اور طریقوں نے بنیادی طور پر بدل دیا تھا کیونکہ اب یہ تجارت صحیح معنوں میں بین الاقوامی تجارت کے میدان میں آ گئی تھی۔ مسلمان تاجر اور سوداگر اپنی غیر تکمیلی طریقوں اور طرز فکر و عادات کے باعث وہ طور و طریقے نہ استعمال کر سکے جو بین الاقوامی تجارتی مقابلے کے لئے ضروری تھے۔ برصغیر کی تجارت کا رخ اب مسلم ممالک کی بجائے یورپ کی منڈیوں کی طرف مڑ گیا تھا۔ ہندو تاجروں نے تاجرانہ ہوشیاری اور عیاری سے ان بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال کر ان کا پورا فائدہ اٹھایا[1]۔ اس طرح ہندو معاشرے کی تجارتی جاتیوں میں دولت کا ارتکاز شروع ہو گیا جو انگریزوں کے مقبوضات اور صوبوں میں آباد ہو گئی تھیں۔ پس انہوں نے دولت کے ارتکاز کے اس تسلسل کو نہ صرف جاری رکھا جو سلطنت مغلیہ کے دور عروج میں شروع ہو چکا تھا، بلکہ اس کو کئی گنا بڑھا کر نئے ہندو سرمایہ دار معاشرے کی بنیاد رکھی جو دو تین نسلوں کے بعد تجارتی ذرائع دولت کے سہارے صنعتی اور مالیاتی سرمایہ داری کے دور میں داخل ہونے لگا۔

جب ہندو بنیا، مہاجن اور مارواڑی جاتیاں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہی تھیں

---

[1] عبداللہ یوسف علی انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، بنیئے کی تعریف بطور انگریزوں کے گماشتے ص ۴۴، جگت سیٹھ ص ۵۲۔ نئے اور پرانے ہندو جگت سیٹھ ص ۲۱۸ - ۲۲۰۔ کریم سنز۔ کراچی نئی ایڈیشن ۱۹۶۷۔

تو بھی زمانے میں دوسری طرف ہندوؤں کی بھانڈ اور بھڑوا اور کلاونت جاتیوں کی گانے اور ناچنے والی رنڈیاں اور طوائفیں مغل اور بعد از مغل مسلم حکمران اور غیر حکمران ایلیٹ طبقوں کو اپنی آغوشِ طرب و نشاط میں سمیٹ رہی تھیں۔[1]

سیفین چکر کا انجام: سقوطِ مملکت اور آشوبِ شہر

جب تقلیل تکمیل کا عمل قرون وسطیٰ کی اسلامی مملکت اور معاشرے کے ہر طبقے، گروہ اور حصوں کو پوری طرح مخرب اور مفلوج کر دیتا تو ان کی عام تباہی و بربادی شروع ہو جاتی۔ ایسے حالات میں ایک سیفین چکر اپنے انجام کو پہنچ جاتا تھا تب وہ سلطان اور شہزادے، امرا اور حکام، منصبدار اور جاگیردار، زمیندار اور سپاہی، سوار اور توپچی جنہوں نے نسل در نسل اپنی عمریں حکمرانی اور جنگ آزمائی میں گزاری تھیں اپنے پیچھے ایسی نسلیں چھوڑ جاتے تھے جو ان کی طرح جوانمردی، ثابت قدمی اور بہادری سے اپنے سیفین دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے میدان جنگ سے فرار میں راہ فلاح تلاش کرتے تھے اور اپنے حرم سراؤں اور خلوت گاہوں میں چوہوں کی طرح گھس کر پناہ لیتے تھے مگر ان کے دشمن ان کو وہاں ہی بھسم کر دیتے اور بچے کھچوں کو باہر نکال کر کام تمام کر دیتے تھے اور ان کی بیشمار عورتوں، بیویوں، کنیزوں، ماؤں اور بیٹیوں کو اپنے تصرف میں لے آتے تھے اور ان کے مال و دولت اور زر و زمین کو آپس میں بانٹ لیتے تھے۔

یہ تھی قرون وسطیٰ کے اسلام کی تاریخ جو بغداد، قرطبہ اور غرناطہ سے بلخ و بخارا، دہلی اور مرشد آباد، لاہور، لکھنؤ اور سرنگاپٹم کے سقوط اور آشوب شہر تک اپنے آپ کو بار بار دہراتی رہی۔ ہر

---

[1] خافی خان، "منتخب اللباب" حصہ چہارم، صفحات ۱۳۹ تا ۱۴۱۔ مغلوں کے زوال کے بعد جب چھوٹی چھوٹی نوابی مملکتیں قائم ہوئیں جن کے نوابوں اور امراء کی رنگ رنگیلیوں سے اردو زبان کی ثقافت اور ادب و شاعری بھری پڑی ہیں، انگریز سامراجیوں نے سامراجی عیاری اور مکر و فریب سے اُن کی طرب و نشاط کی محفلوں کو تو بدستور قائم رکھا، مگر ان کے اقتدار اور خود مختاری کو ختم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر کے مسلم معاشرے پر قرون وسطائی انحطاط اور عیش پرستی کا ماحول قائم و دائم رہا۔ اور مسلمانوں کی ذہنیت پر "بے وقار نوابوں" کی جھوٹی اقدار اور روایات کا غلبہ باقی رہا۔

سقوط اور تباہی کے بعد حملہ آور فاتحین اپنی ہوس اور شہوت رانی میں شکست خوردہ اور تباہ حال حکمرانوں کی بے بس اور لاچار عورتوں کی پکڑ دھکڑ کر کے اپنے حرم بھر لیتے تھے۔ اور اس طرح اپنی نو زائیدہ مملکت کے سیاسی بدن میں سیفین جراثیموں کو پھر داخل کر لیتے تھے جو چار پانچ نسلوں کے بعد وہی سیفین گل کھلاتے جو انہوں نے سو سوا سو سال پہلے کھلائے تھے۔

قرونِ وسطائی مسلم معاشرے کا آخری دور

(انیسویں صدی کے اوائل سے بیسویں صدی کے ربع اول تک)

قرونِ وسطائی مسلم معاشرہ یورپی سامراجیوں کے نرغے میں

آخر کار اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں دنیائے اسلام پر ایسے نئے دشمن حملہ آور ہوئے جو اپنے یک زوجگانہ خاندانی نظام کے باعث حرم سراؤں کی عورتوں اور کنیزوں کے تصرف کے تو اتنے خواہاں نہیں ہوتے تھے جتنے مسلم ملکوں اور مملکتوں کے مال و دولت اور قدرتی ذرائع کے استحصال کے یہ مغربی اور مشرقی یورپ کی سامراجی طاقتیں تھیں۔ ان نئے حملہ آوروں نے تاریخ اسلام کے تقریباً ایک ہزار سال پرانے سیفین چکروں کا سارا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔ اپنی فاتحانہ یلغار اور پیش قدمی میں انہوں نے نہ صرف متمول جاگیردارانہ مسلم ملکوں اور مملکتوں کو تاخت و تاراج کیا بلکہ ان صحراؤں اور بنجر میدانوں اور علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا، جہاں سے خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قبائل اٹھ کر نئے سیفین چکروں کا آغاز کیا کرتے تھے۔ مثلاً روسی سامراجیوں نے قفقازیہ سے وسط ایشیا تک کے صحرائی میدانوں اور وادیوں پر قبضہ کر کے ترک، تاتار اور دوسری نسلوں کے قبائل اور اقوام کا قلع قمع کر دیا۔ اسی طرح برطانوی سامراجیوں نے مصر اور سوڈان سے برصغیر جنوبی ایشیا اور ملایا تک تمام مسلمان سلطنتوں، بادشاہتوں اور مملکتوں کا صفایا کر دیا۔ فرانسی سامراجیوں نے شمالی افریقہ کے عربوں، بربروں اور دوسری مسلم اقوام کو اپنا غلام بنا لیا اور دوسری یورپی سامراجیوں نے باقیماندہ اسلامی دنیا کو اپنا باجگزار بنا لیا۔ مختصر یہ کہ مغربی اور مشرقی یورپ کے سامراجیوں کے غلبے اور تسلط نے دنیائے اسلام میں ایسے نئے اور مختلف النوع حالات اور مسائل پیدا کر دیئے

جن میں مسلم اقوام اور ممالک آج تک مبتلا ہیں۔ یہ سامراجی طاقتیں مسلمانوں کے مریضانہ اور مفلوج معاشرے کی غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی کمزوریوں اور خامیوں سے خوب باخبر ہوتے تھے، جو یورپین سامراجیوں کے دنیائے اسلام کی سرحدوں پر نمودار ہوتے ہی عدم تکمیلی خرابیاں بن گئیں تھیں جن کے ذریعے ان حملہ آوروں نے مراکش سے لے کر ملیشیا تک اور ترکستان سے لے کر ٹیپو سلطان کے میسور تک قرون وسطائی اسلام کی ہر ایک مملکت اور ملک، معاشرے اور تہذیب و تمدن کی جڑ سے بیخ کنی کر دی۔

برصغیر کا مسلم معاشرہ اور برطانوی سامراجیت

ہم یہاں جنوب ایشیائی برصغیر کے اسلامی معاشرے کی مثال لیں گے، جہاں برطانوی سامراج کا تسلط قائم ہو گیا تھا۔ انگریزی سامراجی برصغیر میں وارد ہوتے ہی یہاں کی چند حقیقتوں کو فوراً تاڑ گئے، جن کا استفادہ کر کے انہوں نے اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ پہلی حقیقت ہندو کی قرابتداری نظام کی متوازیت زبردست باہمی تضاد تھا، جسے ہر طرح سے ہوا دیکران سامراجیوں نے خوب بھڑکایا اور بالآخر ان دونوں معاشروں کو قوم اور جدید تہذیب و تمدن کی صورت دے کر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا اور بر سر پیکار کیا۔ مگر سامراجیوں کی یہ کوشش بھی رائیگاں جاتی اگر مسلمان معاشرہ اپنے انحطاط و انتشار کے ناگزیر چکر میں مبتلا نہ ہوتا۔ بہر حال یہ دوسری حقیقت تھی کہ ساری دنیائے اسلامی کی طرح، برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے کردار اور معاشرہ زیادہ سے زیادہ غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی بن گئے تھے، جو انہیں روز بروز تباہ حال اور برباد کر رہے تھے۔ اس کے باعث مسلمانوں کو سب سے پہلے ہر ایک میدانِ جنگ میں شکستِ فاش ہوئی اور مرشد آباد سے پشاور تک اور ٹیپو سلطان کے میسور اور سرنگاپٹم سے والیان سندھ تک ہر مسلمان فرمان روا اور حکمران اہلیت کے ہاتھوں سے اقتدار اور حکومت چھن کر نئے سامراجی حکمرانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔ لیکن مسلمانوں کے ذہن و فکر کی غیر تکمیلیت کی بھی اس قدر انتہا تھی کہ نہ تو اُن کے شکست خوردہ اہلیت طبقے اور نہ اُن کے اہل علم و دانش اس زبردست تغیر و انقلاب کے معنی اور نتائج کو سمجھ سکے۔ بلکہ دینی اور غیر دینی علماء بدستور اپنے غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی خیالات اور تعلیمات کو پھیلاتے رہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی

غیر تکمیلی اور نصف تکمیلی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر نے انہیں اپنے غیر مسلم ہمسایوں اور ہم وطنوں سے جدید علوم و فنون اور سائنس اور فلسفے کے میدان میں بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد زراعت اور زمینوں صنعت و حرفت کے اقتصادی مقابلے کے میدان میں بھی مسلمانوں کے زمیندار، تاجر، سوداگر اور صنعت کار طبقے سامراجی استحصالیوں اور ہندو تجارتی و صنعتی جاتیوں کے ہاتھوں لوٹ گئے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی عموماً اور ان کے متموں اور مقتدر اہلیت کی خصوصاً نمود و نمائش، فضول خرچی اور لاپروائی کی عادات اور رجحانات تھے، جن کے باعث وہ متواتر قرضوں اور رہنوں کے نیچے دب کر اپنی زمینوں، مکانوں کاروبار اور جائیداد سے ہاتھ دھو رہے تھے۔ دراصل، سامراجیوں کی آمد سے پہلے جب سیفین الخطاط و انتشار کا دور شروع ہوتا تھا تو مسلمانوں کی غیر تکمیلی جاگیردار اہلیت براہِ راست استحصال اور لوٹ مار در : روئے "شمشیر" کی قوت سے اپنی کھوئی ہوئی زمینوں اور جائیداد کو دوبارہ چھین لیتے تھے یا اپنے قرضوں اور رہنوں سے ظلم و تعدی کر کے چھٹکارا حاصل کر لیتے تھے، مگر اب انگریز سامراجیوں کی عملداری میں ایسا "پیکس برطانیکہ" قائم ہو گیا تھا جس کے نظام و قانون اور عدالت میں براہِ راست استحصال کے ظلم و تشدد اور لوٹ مار ناممکن ہو گئی۔ مرزا غالب جو اس تبدیلی کو سمجھتے تھے، اپنے ایک خط میں مسلمان اہلیت کے ان زور و جبر کے طریقوں کا یوں تمسخر اڑاتے ہیں۔

"بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا، ادھر درباری مل کو مارا، ادھر خوب چند سکھ چین کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ چاٹو، نہ مول نہ سود۔"[1]

مسلمانوں کی اداس نسلیں

ان نئے حالات میں سامراجی قوانین اور عدلیہ کے فیصلوں اور ڈگریوں کے تحت غیر تکمیلی مسلم اہلیت گروہوں اور طبقوں کی زمینیں جائداد، مکان اور حویلیاں اور مال و اسباب قرقی اور ضبط ہو کر ہندو تکمیلی جاتیوں مثلاً مہاجنوں ساہوکاروں، بنیوں اور کھتریوں وغیرہ کو منتقل ہو رہے تھے اور ان بدلتے ہوئے حالات میں

---

[1] مرزا غالب کا ۱۸۶۲ء میں لکھا ہوا ایک خط۔ دیکھئے "اردوئے معلیٰ" حصہ اول جلد دوم ص ۸۱۲-۸۱۳ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل مجلس ترقی ادب، کلب روڈ لاہور۔ ۱۹۶۹۔

جنوب ایشیائی/برصغیر کے مسلمان من حیث القوم اور من حیث المعاشرہ خراب اور خستہ حال ہو کر ایسے قعرِ مذلت میں گر رہے تھے جس کی ایک جھلک مسلم بنگال کی ایسی مفلوک الحال مسلم اہلیت کی اداس نسلوں کی زبوں حالی میں دیکھی جا سکتی ہے جن کے بارے میں ایک انگریز مصنف ۱۸۷۱ء میں اپنے چشم دید مشاہدات کی بنا پر لکھتا ہے۔

"مرشد آباد میں ایک مسلم شاہی خاندان ابھی بھی اپنی حکمرانی کا نقالی ناٹک کھیل رہا ہے اور ہر ضلع میں سابقہ حکمران اہلیت کی اولادیں نخوت بھری بیزاری کے ساتھ اپنے خستہ حال گھروں میں خونِ جگر پی رہی ہیں۔ میں ایسے کئی خاندانوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جن کی ویران حویلیاں جواں سال بیٹوں اور بیٹیوں، پوتوں اور پوتیوں، بھتیجوں اور بھتیجیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور اس فاقہ کش ہجوم میں ایک بھی ایسا نہیں جو اپنی زندگی میں کچھ کر سکے گا۔ وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے برآمدوں میں یا اپنے ٹپکتے ہوئے اصطبلوں میں لاپرواہی اور کاہلی کی زندگیاں گزارتے ہیں اور قرضوں کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک روز کوئی قرض خواہ ہندو ہمسایہ ان کے لاتعداد رہنوں اور قرضوں کے لئے مقدمہ دائر کر دے گا اور پھر یکا یک ایک قدیم مسلمان خاندان ہمیشہ کے لئے گمنامی کی تاریکیوں میں غائب ہو جائے گا۔"[1]

ہم قرونِ وسطائی/اسلام کے قرابتداری اہلیت گروہوں اور طبقوں کی انحطاط پذیری اور تباہ حالی اور برصغیری مسلمانوں کی روز افزوں تباہی اور بربادی کا تجزیہ یہاں ختم کرتے ہیں۔ مگر اس برصغیر کی تیسری حقیقت کی نشاندہی کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ برطانوی سامراجیت کے تسلط اور علمداری میں اس برصغیر کے مسلمانوں کی غیر تکمیلیت اور ہندو جاتیوں کی تکمیلیت نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں من حیث المعاشرہ ذہن و فکر اور عادات و کردار کے اتنے وسیع فاصلے حائل کر دیئے کہ دونوں دو مختلف قومیں بن گئیں۔ ان میں ایک قوم کا رخ ہر طرح کی ترقی اور خوشحالی

---

[1] ولیم ہنٹر "انڈین مسلمان" ص ۱۱۵۔ ۱۸۷۱ تاریخ۔ دراصل بنگالی مسلمان برطانوی سامراج کے ابتدائی ادوار میں ایسی صورتحال سے دوچار تھے جو برصغیر کے باقی تمام مسلمانوں سے انہیں ممیزہ کرتی تھی، جس کے باعث وہ ان نازک اور المناک حالات میں تمام برصغیری مسلمانوں کی نئی قیادت اور راہنمائی کر سکتے تھے۔ اول تو وہ

کی جانب تھا اور دوسری کا انحطاط اور تباہی کی طرف تھا۔ بہرحال ان رجحانات اور حالات سے جو صورتحال مرتب ہو رہی تھی اس کا تجزیہ ہم دورِ جدید کے مسلمانوں کے پردہ دار اور تعدد ازدواجی معاشرے کی ضمن میں اگلے ابواب میں کریں گے کیونکہ یہ حقیقت بھی بدستور مسلمہ حقیقت رہی کہ سامراجی تسلط کے تغیرات اور ترقیوں کے باوجود پردہ سسٹم اور تعدد ازدواج کے اداروں نے مسلمانوں کی اپنی غیر تکمیلی خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی زبوں حالی کے قعر مذلت سے باہر نکلنے کی کوششوں اور جدوجہد کو ہمیشہ اکارت بنا دیا۔

قرونِ وسطائی مسلمانوں پر ایک آخری نظر

قرونِ وسطائی اسلام کی ہزار سالہ تاریخ میں مسلم ملکا اور مملکت کے ہر سیفین چکر کے خاتمے پر انحطاط، انتشار اور بدامنی نے نہ صرف سابقہ ادوار کی تمام سائنسی، فنی، علمی، صنعتی، زرعی حرفتی، اقتصادی اور تمدنی تکمیلات کو پائمال اور برباد کر دیا، بلکہ ایسی غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی فضا اور ماحول پیدا کئے جن میں عقل و دانش کی جگہ تقلید اور اوہام نے لے لی، فلسفہ اور سائنس کی جگہ عقیدت پرستی اور وہم نے لے لی، غور و فکر، مشاہدہ اور تجربہ کی جگہ اسلاف پرستی کی بھیڑ چال شروع ہو گئی جدت و ندرت، تجسس اور تحقیق کی جگہ کورانہ تقلید اور اسناد کی مقبولیت ہو گئی اور اصلاح اور ترقی کی بجائے قدامت پرستی اور روایات پرستی شروع ہو گئی ان حالات میں دنیائے اسلامی میں

ابھی آسودہ حال تھے۔ دوم وہ کلکتہ اور صوبہ بنگال میں اکثریت میں تھے اور سوم وہ برطانوی راج کے علمی، سائنسی فنی اور فکری اثرات سے سب سے پہلے براہ راست متاثر ہو رہے تھے لہٰذا وہ تمام جدید علوم و فنون، سائنس و فلسفہ، تجارت و صنعت کے میدانوں میں ہر طرح کی تکمیلی کمالات اور سبقت حاصل کر کے برصغیر جنوبی ایشیا کے تمام لوگوں کے لئے عموماً اور مسلمانوں کیلئے خصوصاً مشعل بردار ثابت ہو سکتے تھے، بعینہٖ اس طرح جس طرح بنگالی ہندوؤں، بمبئی کے بنیوں اور مہاجنوں اور مدراس کے براہمنوں نے انگریزی علوم و فنون اور صنعت و حرفت میں تکمیلات حاصل کر کے برصغیر کے تمام ہندوؤں کی قیادت اور راہنمائی کی اور برصغیری تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ مگر بنگالی مسلمان بھی پردہ سوسائٹی کے غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی اثرات اور تخریب کاریوں کے اتنے ہی شکار تھے جتنے اس عہد کے باقی تمام مسلمانانِ عالم اور وہ بھی جلد انحطاط و جمود کے اداسی اور پژمردگی میں ڈوب رہے تھے یہ پردہ سوسائٹی کی انحطاط و جمود انگیزی کی ایک اور بدترین مثال ہے۔

عالموں پر علماء کو سبقت حاصل ہو گئی، سائنسدان پر صوفی غالب آگیا، مفکر کو محتسب نے خاموش کر دیا، محقق کو مقلد نے علم و فضل کے دربار سے نکال دیا، استاد اور معلم کو ملّا نے مات دی، مصنف پر سارق نے ڈاکہ ڈال دیا، فلسفی پر قنوطی بھاری ہو گیا، تخلیق کار پر تقلید پرست فوقیت لے گیا، ترقی پسند پر رجعت پسند کو غلبہ حاصل ہو گیا، جدت پسند پر دقیانوسی چھا گیا، تاجر ٹیکسوں اور محاصل کے بوجھ تلے دب گئے، سوداگر کو راہزن نے لوٹ لیا، کفایت شعار کی جگہ فضول خرچ آگئے، پیداوار بڑھانے والوں کو مفت خوروں نے کنگال بنا دیا، محنت کشوں کو راشیوں، نوابوں اور ٹھگوں نے تباہ و برباد کر دیا، کاشت کاروں کو محاصل گزاروں، منصبداروں اور جاگیرداروں نے لوٹ کھسوٹ لیا، تعمیر کرنے والوں کی جگہ تخریب کرنے والوں نے لے لی، مختصر یہ کہ تکمیل گروں پر غیر تکمیل گروں اور خلاف تکمیل گروں کا غلبہ اور تسلط قائم ہو گیا اس طرح دنیائے اسلام پر ظلم تشدد، جور و ستم، تباہی و بربادی، جہالت اور غفلت کی ظلمتیں چھا گئیں ان میں خراسان سے عراق تک، وسط ایشیا سے کوہ قاف اور کریمیا تک، شام و فلسطین میں اور شمالی افریقہ کے سواحل اور وادیوں میں اور جنوبی ایشیا کے سرسبز اور زرخیز علاقے اور دیہات اور بارونق شہر تباہ و برباد ہو کر موات اور صحرا و بیابان بن گئے، جن میں لوگ پھر خانہ بدوش زندگی گزارنے لگے۔ غرضیکہ دنیائے اسلام پر تقریباً ایک ہزار سال سے پسماندگی اور بدحالی کے اندھیرے اور جمود طاری ہیں یہی وجہ ہے کہ اس صدیوں پرانی طویل مدت میں مسلمانوں نے دنیائے انسانی کو کوئی نیا خیال یا تصور، کوئی نئی ایجاد یا دریافت، کوئی نیا فلسفہ یا تھیوری اور کوئی نئی طرز معاشرت یا معیشت نہیں پیش کی ہے۔ پس قرون وسطائی اسلام کی زبوں حالی نے ثابت کر دیا کہ جو معاشرہ اور تہذیب تمدن اور جو لوگ اور افراد عورتوں کو پردہ اور حرم سسٹم، تعدد ازواج اور کنیز داشتگی جیسے اداروں سے ذلیل و خوار کرتے ہیں وہ پہلے تو اپنی غیر تکمیلیت اور مائیکرو سوشل تفرقوں کا شکار ہو کر خود ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں اور پھر اپنے دشمنوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو کر ایسے قعر مذلت میں گر جاتے ہیں جس سے باہر نکلنا اُن کے بس میں نہیں رہتا۔ بقول مولانا حالی :

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

"مسدس حالی"

یورپی سامراجی غلبے اور تسلط نے دنیائے اسلام میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں ان تبدیلیوں میں غلام داری کی قانوناً ممانعت، کنیز داشتگی کی بندش، حرم سسٹم کا خاتمہ وغیرہ شامل ہیں۔ مگر پردہ اور تعدد ازدواج آج بھی مروج ہیں۔ کیا زمانہ جدید کی روشنی میں مسلم معاشرہ پردہ اور تعدد ازدواج کے مخرب الاخلاق و کردار اثرات اور نتائج اور قرابتداری کی تقسیموں اور تفرقوں سے پاک ہوئے بغیر ترقی کر سکتا ہے؟ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہم جدید مسلم معاشرے اور زندگی کا تجزیہ کریں گے جکی ابتدا ہمیشہ عورتوں سے ہوتی ہے جو تعدد ازدواج اور پردہ میں زندگی گزارتی ہیں

قرون وسطائی مسلم معاشرے پر حرف آخر

قرون وسطائی اسلام کی سیفین تاریخ انسانی زندگی اور معاشرے کی ایک زبردست ابدی حقیقت کو روشن کرتی ہے، اگرچہ منفی انداز میں، کہ مرد کی عظیم ترین تکمیل اور کارنامے بھی اس وقت تک پائیدار نہیں ہوتے جب تک اُسے تکمیلی عورت کا تعاون، مدد اور سہارا نہ حاصل ہو۔ کوئی معاشرہ جو مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو تکمیل گری کے مواقع آزادیاں اور حقوق نہیں دیتا، کبھی پائیدار ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ مردوں کی تمام تکمیلات ایک دو نسلوں کے بعد معدوم اور فراموش ہو جاتی ہیں۔ صرف تکمیلی عورتوں کی رفاقت، شمولیت، شرکت اور معاونت ہی تکمیل گری کے تسلسل اور ترقی کو ہمیشہ یعنی نسل در نسل جاری رکھ سکتی ہیں۔ قرون وسطائی مسلم معاشرے مسلمان عورتوں کو ہر طرح کے تکمیلی کاموں، سرگرمیوں، مواقعوں اور حقوق اور آزادیوں سے محروم کر کے ایسی معاونت رفاقت، سہارے اور اشتراک عمل کے سب امکانات ختم کر دیئے تھے۔ اس لئے اس دور کی ہر نئی تکمیل دو چار نسلوں کے بعد حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی تھی۔

کیا زمانہ جدید کے پردہ دار مسلم معاشرے نے عورت کے غیر تکمیلی مقام اور رول بدل دیئے ہیں؟ اس سوال کا جواب ہم اگلے ابواب میں بیان کریں گے۔

باب۔ چہارم

عورتیں اور لڑکیاں تعدد ازدواجی اور پردے میں

زمانۂ جدید میں مسلم معاشرہ عبوری حالت میں ہے۔ اس میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں گو یہ تبدیلیاں اکثر و بیشتر مسلمانوں کی اپنی کوششوں اور غور و فکر کے باعث نہیں بلکہ دوسروں کے اثر اور دباؤ کے باعث واقع ہو رہی ہیں۔ ان میں ایک تبدیلی مسلمانوں کے گھروں اور رہائش گاہوں، خاص طور پر پردہ دار اہلیت اور نیم اہلیت گروہوں اور طبقوں کے مکانوں اور قیام گاہوں کی ساخت اور اندرونی ماحول میں واقع ہو رہی ہے۔ ہمارے پردہ دار گھر قرون وسطیٰ کے ہیبت ناک جیل خانہ کی طرح کے وسیع و عریض حرموں کی بجائے مقابلتاً معمولی اور سیدھے سادے زنان خانوں میں بدل گئے ہیں۔ اس تبدیلی کی وجوہات نہ صرف جدید تعلیم و تربیت کا اثر، بلکہ مسلمانوں کے امیر اور درمیانہ طبقوں کی انفرادی اور مجموعی طور پر بڑھتی ہوئی معاشی زبوں حالی اور مغربی تہذیب و تمدن کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ ہیں۔ ہماری جدید معاشری زندگی کے کل سپکٹرم کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم جدید مسلم معاشرے میں چار قسموں کے زنان خانے پاتے ہیں جن میں مسلمان عورتیں اور لڑکیاں اپنی ساری عمریں گذارتی ہیں۔

۱۔ جدید حرم نما زنان خانے

سب سے پہلے وہ قدیمی حرم نما زنان خانے ہیں جو مسلم ملک اور معاشرے کے ان حصوں اور طبقوں میں پائے جاتے ہیں جہاں قرون وسطائی جاگیرداری اور قبائلی نظام آج تک باقی ہیں۔ ایک انگریز عورت جس نے قیام پاکستان کے وقت ایک ایسے حرم نما زنان خانے کا خود مشاہدہ کیا تھا، لکھتی ہیں:

"ہم بالاخانے پر گئے اور ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک نیچی بچھی ہوئی تھی جس پر ایک میلا سفید کپڑا ڈالا ہوا تھا۔ جس کی میلی سفید دیواروں میں ایک کم گہرے اور بے ترتیب خانوں کی الماری لگی تھی۔ اس کے علاوہ

وہاں نہ کوئی اور فرنیچر تھا اور نہ کوئی اور خوش اسلوب شئے تھی....اور ساری جگہ ہیبت ناک عورتوں کے مجموعے سے بھری ہوئی تھی، جو بلوچ سٹائل کے بے وضع سفید کپڑوں میں ملبوس تھیں، مگر تمام میلی کچیلی۔

'ہم اب خواتین سے ملنے گئے، جو بلوچوں کے رواج کے مطابق مردانے سے الگ سڑک کے پار دوسری طرف الگ زنان خانوں میں رہتی ہیں۔ انکے صحن تک پہنچنے کے لئے ہمیں کتے کی ٹانگ کی ہڈی کی طرح کچی دیواروں کی ٹیڑھی سرنگوں سے گزرنا پڑا۔ تب ہم ایک کھلے مقام پر پہنچے، جو ریگستانی ریت سے بھرا ہوا تھا اور جس کی ارد گرد چند اور عمارتیں تھیں۔ پہلے ہم ایک پست اور تنگ و تاریک گھر میں گئے جس میں ہماری ملاقات لاتعداد سنیئر اور جونیئر خواتین سے ہوئی مگر نمبر ۳ اور ۴ بیویوں سے ہمیں ملاقات نہ کرائی گئی۔ ان کے علاوہ ایسی خواتین کا جم غفیر بھی تھا جن کی وجہ نہیں بتائی گئی مگر چونکہ یہ صرف بیویوں کی رہائش گاہ تھی، اس لئے داشتائیں (کنیزیں) نظر نہیں آئیں۔ ہمیں پرانا محل دکھایا گیا۔ یہ تین منزلہ برآمدوں والی عمارت تھی، جس کے کمرے ایک وسطی ہال کے ارد گرد بنائے گئے تھے جس میں سوائے دروازوں کے کوئی اور روشنی آنے کا انتظام نہیں تھا اور جس کے اندر ایک قالین، ایک میز اور ڈرائینگ روم کی کرسیوں کا ایک سٹ تھا۔ ہمیں موسم گرما کا گھر بھی دکھایا گیا جو پہلی منزل پر ایک بڑا ہال ہے۔ ہم برآمدے میں چھوٹے وارسیٹ پر بیٹھے۔

"چچا اور اس کے بیٹے اندر آئے اور اپنی ماؤں اور بیویوں کے آگے نہایت احترام سے جھکے۔ میں نے کبھی ایسی خواتین نہیں دیکھیں۔ وہ بھی مشرقی کہانیوں کی طرح کی تھیں۔ یہ عورتیں ظاہری طور پر مؤدب مخلوق تھیں، لیکن یہ بات بھی صاف ظاہر تھی کہ زندگی میں اُن کا ایک مقصد اور ایک ہتھیار اُن کی جسمانی جاذبیت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عورتیں جو کوہ قاف کی کنیزوں کی طرح

تمام حیلے بہانے استعمال کرنا جانتی ہیں۔ پانچ سال کی بچی جیسے دل اور دماغ کی مالک ہیں۔ اس مقام سے آگے اتفاقی عورتیں یعنی ناچنے والیاں رہتی تھیں جنہیں کبھی بھی بیویوں اور ماؤں میں نہیں لایا جاتا تھا مگر پھر بھی ایسا ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان عورتوں میں سندھی خدوخال اور نقوش نظر آتے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ خواتین ایسی شاہانہ بیگمات تھیں کہ انہوں نے کبھی صفائی نہیں کی کبھی کھانا پکانا نہیں کیا کبھی بچے کو دودھ نہیں پلایا اور نہ پالا پوسا اگرچہ وہ اکثر اور بار بار بچے جنتی ہیں کبھی سینا پرونا نہیں کیا، کبھی کشیدہ کاری نہیں کی، کبھی پڑھائی نہیں کی اور کبھی کہیں نہیں گئیں۔ انہیں قرآن بھی پڑھنا نہیں آتا جبکہ ہر مسلمان گھرانے میں قرآن خوانی لازمی ہوتی ہے۔ وہ جانوروں کی طرح بلا غور و فکر کی زندگی گزارتی ہیں، سایہ دار جگہ اور ٹھنڈے مقام میں رہتی ہیں، اپنے خاوندوں کو قبول کرتی ہیں اور ہر قسم کی کھانے اور پینے کی چیزیں چٹ کر جاتی ہیں۔ بیشک انہوں نے اپنی مسکینی اور رحمدلی اور حسد کی جھلک اور ہلکی سی بے چینی اور اپنی غیر شعوری قناعت پسندی کی وجہ سے مجھے بیلوں کے بغیر بھیڑوں کے ریوڑ کے علاوہ کسی اور چیز کا تصور نہیں یاد دلایا۔ .... ان ریگستانی خواتین نے اپنے مجموعی تاثر سے مجھے ہیبت سے بھر دیا پریذیڈنٹ کی اپنی بیوی بھی ایسی خاتون تھی جو نہ کبھی دیکھی گئی اور نہ دیکھی جا سکتی تھی اگرچہ میں اس کی دو بیٹیوں اور ظفر کے ساتھ جو ابھی اتنا کم عمر تھا کہ عورتوں کو دیکھ سکتا تھا' زنان خانے کے اندر بیڈمنٹن کھیلتی تھی۔ اس کی دو لڑکیاں علیگڑھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں اور پردے میں رہتی تھیں اگرچہ ان کی بہنوں نے موڈرن مردوں سے شادی کر لی تھی اور پردہ چھوڑ دیا تھا۔ تاہم لڑکیاں پردے سے تنگ اور اس سے سخت نالاں تھیں... کوئی حیرت کی بات نہیں کہ کئی بیویوں کے زنان خانوں کے ارد گرد اونچی اونچی دیواریں کھڑی کرتے ہیں پریذیڈنٹ اور سیکریٹری بھی ان اونچی دیواروں پر مسلح گارڈ کھڑی رکھتے ہیں۔

ہر ایک گھر قلعہ نما ہوتا ہے[1]۔

۲۔ دوسری قسم کے زنان خانے

دوسری قسم کے زنان خانے قدامت پسند اور روایتی خطوں اور علاقوں میں، خاص طور پر صوبائی قصبوں شہروں اور دیہات میں اپنی قرون وسطائی آب و تاب کے ساتھ پائے جاتے ہیں، جہاں عورتوں کی علیحدگی آج بھی معاشرتی علامت ہے اور ویسی ہی سختی سے قائم ہے جیسی زمانہ سلف میں تھی۔ ان زنان خانوں کا تعمیراتی نقشہ ملک سے ملک اور شہر سے شہر میں مختلف ہوتا ہے، مگر عام طور پر یہ زنانہ حصے مردانہ حصوں سے الگ تھلگ گھر کی صورت میں ہوتے ہیں، جن میں صرف عورتیں اور بچے رہتے ہیں۔ مرد اور کنبے کے جواں سال لڑکے مردانہ حصے والے گھر میں رہتے ہیں۔ پاکستان کے بعض صوبوں اور جنوب ایشیائی برصغیر کے دوسرے ملکوں میں ایسے زنان خانے کو حویلی کہتے ہیں[2]۔ اس زنان خانے میں ایک درمیانی صحن کے اردگرد کمرے یا رہائش گاہ بنے ہوتے ہیں جن میں عورتیں اور ان کے بچے الگ رہتے ہیں، خاص کر ایسے صاحب خانہ کی عورتیں جو کئی بیویوں کا خاوند ہو۔ شہروں اور قصبوں میں جہاں جگہ کی تنگی ہوتی ہے زنان خانہ اکثر گھر کی دوسری یا بالائی منزلوں میں ہوتا ہے جب کہ نچلی منزل مردانہ حصے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اس قسم کے زنان خانے کے بارے میں ایک ناول نویس خاتون یوں لکھتی ہے:

> "دلکشا ایک عالیشان عمارت تھی جو شہر کے قلب میں واقع تھی اس کی اونچی اور بے روزن دیواریں کسی اجنبی کو بلا پہرے والی جیل معلوم ہوتی ہیں اور بلاشبہ وہ عورتوں کے لئے جیل ہی تھی۔ یہ ایک چورس صحن پر مشتمل تھی جس کے اردگرد آٹھ کمرے تھے، دو ہر ایک پہلو میں

---

[1] L. F. Loveday Prior, *Punjab Prelude*, pp 157-63. John Murray, London 1952.

[2] پرانے دمشق کے شہر میں حویلی نما زنان خانے کی تفصیل فان کریمر کی کتاب میں دیکھئے۔
Von Kremer, *The Orient under the Caliphs*, p. 170-2.

پرانے مسلم شہروں میں حویلی نما زنان خانے کی تفصیل دیکھئے

غسل خانے سمیت تمام کمروں میں روشنی اندرونی روشندان یا چھت میں شیشے سے آتی تھی۔ ہر کمرے کی ایک کھڑکی تھی جو دروازہ کی طرح صحن میں کھلتی تھی۔"[1]

۳۔ بنگلہ نما زنانخانے تیسری قسم کا زنانخانہ جدید بنگلوں یا کوٹھیوں میں پایا جاتا ہے جو برطانوی ہند میں سول لائنوں اور ماڈل ٹاؤنوں جیسے جدید علاقوں اور پاکستان میں آزادی کے بعد جدید شہری آبادیوں مثلاً سٹلائیٹ ٹاؤنوں جیسے مقامات میں تعمیر ہوئے ہیں۔ ان جدید طرز کے گھروں میں زنانہ حصہ مردانے سے ملحق گھر کے عقبی صحن میں ہوتا ہے جس کے اردگرد سہ طرفی دیوار بنی ہوتی ہے مگر گھر کے زنانہ اور مردانہ حصوں میں کوئی دیوار نہیں ہوتی' جیسا کہ پرانے روایتی گھروں میں ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں یہ زنان خانہ باقی دو زنانخانوں کی نسبت قدرے ہوادار' صاف ستھرا اور روشن ہوتا ہے جو پاکستانی سوسائٹی کی جدیدیت یا "ماڈرنزم" کی علامت ہے۔

۴۔ ماڈرن زنانخانہ چوتھی قسم کا زنانخانہ جدید یا ماڈرن گھروں میں پایا جاتا ہے۔ جو مسلم ممالک میں خصوصاً اور پاکستان میں عموماً جدید شہروں اور قصبوں میں تعمیر ہوئے ہیں۔ ان گھروں میں زنانخانہ صرف روایتی اور رواجی شے ہے جو نظریاتی طور پر رواج اور رویوں کی صورت میں پردہ سسٹم کا نقطہ اختتام ہے۔ ان گھروں میں زنانہ اور مردانہ حصوں کے درمیان میں کوئی فرق اور دیوار وغیرہ نہیں ہوتی۔ تاہم عورتیں مردوں سے الگ عقبی حصے میں رہتی ہیں۔ یہی کیفیت برقع یا چادر کے استعمال میں پائی جاتی ہے جن کا جدید طبقوں میں رواج محض رواجی اور علامتی حیثیت سے باقی رہ گیا ہے۔ ان تبدیلیوں کے باوجود مسلم معاشرہ میں پردہ سسٹم اور تعدد ازواج ابھی رسمی اور قانونی طور پر مروج ہیں۔ سوائے اُن مسلم ممالک میں جہاں اُن کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا ہے مگر وہاں بھی دیہاتی اور دورافتادہ علاقوں میں پردہ سسٹم اپنی روایتی اثر و رسوخ سے آج بھی باقی ہے

۵۔ ٹاٹ کا پردہ آخر میں زنان خانے کی ایک پانچویں صورت بھی ہے جو غریب اور کم آمدنی والے طبقوں میں پائی جاتی ہے۔ جن کے گھر ایک یا دو کمروں پر مشتمل ہوتے

---

[1] اقبال النساء حسین "پردہ اینڈ پولیگیمی" ایک مسلم گھرانے کی زندگی (انگریزی میں) صفحہ ۱۰ (ایک ناول) بنگلور ۱۹۴۴ء

ہیں، جن میں درمیانی صحن کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کمروں کے اس دروازہ پر جو سڑک یا گلی میں کھلتا ہے ایک بوری یا ٹاٹ کا پردہ لٹکا رہتا ہے جو ان کی پردہ داری کرتا ہے مردانہ حصے گلی یا سڑک ہوتی ہے یا دیہاتی علاقوں میں جہاں کئی منسلک کنبے ایک ہی قرابتداری احاطے میں اکھٹے رہتے ہیں، گھروں سے گھیرے ہوئے احاطے میں ہوتا ہے۔ عورتیں سارے دن کمروں یا احاطے میں رہتی ہیں اور مرد باہر سڑک یا گلی یا احاطے کے مردانہ حصے میں رہتے ہیں یہ پردہ سوسائٹی کے غریب اور کم آمدنی والے طبقوں کا پردہ دار گھر ہوتا ہے۔

پردہ سسٹم کے دو دائرے

درحقیقت پردہ صرف ان عمارتی اور میکانیکی طریقوں کا نام ہی نہیں بلکہ ان رسم و رواج، رویوں اور ممانعتوں کا نام بھی ہے جو عورتوں اور جوان لڑکیوں کو مردوں سے میل جول سے منع کرتی ہیں۔ یہ رسم و رواج گھروں کے اندر بھی اسی سختی اور پابندی سے رائج ہوتی ہیں جیسا کہ گھروں کے باہر اس لئے پردہ سسٹم کے دراصل دو دائرے ہوتے ہیں: اول گھر کے اندر کا پردہ اور دوم گھر کے باہر کا پردہ۔

گھر کے باہر کا پردہ

گھر کے باہر کا پردہ لڑکی پر سن بلوغت کے شروع ہونے پر، بلکہ اس سے پہلے ہی عائد کر دیا جاتا ہے مسلم سوسائٹی میں بعض گروہوں اور خاندانوں میں، خاص طور پر چھوٹے شہروں اور قصبوں اور دیہات میں جہاں پردہ معاشرتی شان و شوکت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ سات یا آٹھ سال کی عمر میں لڑکیوں کو گھر سے باہر کے پردے کے پابندیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے اور ان کا زنان خانے سے باہر نکلنا بند کر دیا جاتا ہے۔ ایک پاکستانی مصنف بلوچستان کے قبائلی معاشرے کے بارے میں لکھتا ہے۔

> "لڑکوں اور لڑکیوں میں میل جول کو پسند نہیں کیا جاتا۔ بعض قبیلوں میں لڑکیوں کو آٹھ نو برس کی عمر سے پردہ کروا دیا جاتا ہے اور وہ لڑکوں سے الگ رہتی ہیں۔"[1]

---

[1] شاہد حسین رزاقی "پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج" صفحہ ۷۵ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔ ۱۹۶۵ء

یہی کیفیت پاکستان کے دوسرے صوبوں اور برصغیر جنوبی ایشیا کے دوسرے ملکوں کے مسلم معاشرے میں پائی جاتی ہے۔ ایک انڈین سوشیالوجسٹ ڈاکٹر جعفر حسن ہندوستانی مسلمانوں میں بیرونی پردے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"چھ چھ برس کی معصوم ہستیوں کو باہر نکلنے سے منع کرنا، دو سو چورس فیٹ کی چار دیواری میں عورتوں اور لڑکیوں کو ہفتوں ہی نہیں مہینوں زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا... وقت اور محنت ضائع کرنا سب کے سب اس بربریتی طریق کے ادنا (ادنی) کرشمے ہیں۔

..... اس میں شک نہیں کہ پردے کا رواج کم ہو رہا ہے اور ٹوٹ رہا ہے پھر بھی اتنا اہم ہے کہ آج خود بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں پردہ نشین عورتیں اور لڑکیاں ہزاروں کی تعداد میں پائی جاتی ہیں، نہ وہ سیر و تفریح کے لئے جاتی ہیں، نہ چہل قدمی اُن کی قسمت میں ہے، نہ وہ میلوں کی رونق سے واقف ہیں، نہ قدرت اور انسان کے کارناموں سے۔ گھر کی چار دیواری میں، گھرانے کے بیس بائیس محرموں میں اُن کی زندگی گذر جاتی ہے۔[1]"

عام طور پر مسلم پردہ سوسائٹی میں جب لڑکی کی عمر دس بارہ سال کی ہوتی ہے تو اسے 'پردے بٹھا' دیا جاتا ہے، یعنی اس کا گھر سے باہر جانا بند کر دیا جاتا ہے۔ بعض قدامت پسند اور روایت پرست خاندانوں اور طبقوں میں یہ پابندی بہت سختی سے عائد کر دی جاتی ہے مگر موڈرن طبقوں میں یہ سختی کم ہو رہی ہے۔

گھر کے اندر کا پردہ

گھر کے باہر کے پردے کی نسبت گھر کے اندر کا پردہ زیادہ دلچسپ چیز ہے، جو خاندانی زندگی کو دو حصوں میں بانٹ دیتا ہے۔ اس کے باعث نہ صرف گھر زنانہ اور مردانہ حصوں میں بٹ جاتا ہے بلکہ گھر اور کنبے کے اپنے رشتہ دار افراد اور بڑے چھوٹوں کو ملنے جلنے اور ایک جگہ جمع ہونے سے بھی روکتا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر جعفر حسن "ہندوستانی سماجیات" صفحہ ۶۸۔ علیگڑھ۔ ۱۹۵۵ء

اگرچہ اس ضمن میں بھی گذشتہ زمانوں کی پابندیوں اور سختیوں میں بہت کمی اور تبدیلی واقع ہورہی ہے تاہم گھر کے اندر کا پردہ قریبی رشتہ داروں، مثلاً چچا، ماموں، خالو اور پھوپھا اور ان کے جواں سال بیٹوں، حتیٰ کہ جواں سال بھائیوں اور بیٹوں کو بھی زنان خانے میں آنے سے منع کرتا ہے۔ کراچی کے ایک جریدے "اخبارِ جہاں" کا ایک پشاوری نامہ نگار لکھتا ہے:

"..... ہمارے ہاں پردے کا یہ عالم ہے کہ ہمارے گھروں میں سوائے چچا جان اور ماموں کے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں، اور نہ ہم دونوں بھائیوں کو اجازت ہے۔"[1]

بعض قدامت پرست اور سختی کے پابند گھروں میں مرد تو کجا، غیر عورتوں کو بھی زنانخانے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایسے گھر والے اپنی عورتوں کو صرف قریبی رشتہ دار عورتوں ہی سے ملنے جلنے دیتے ہیں۔ وہ اپنے گھرانے کی عورتوں کو زنان خانے میں اس طرح قید رکھتے ہیں جس طرح عمر قیدیوں کو جیل میں۔ حتیٰ کہ علاج معالجے کے لئے بھی گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے لاتعداد عورتیں ہر سال بغیر علاج معالجے کے بیماریوں سے مر جاتی ہیں جبکہ معمولی طبی امداد سے انکی جانیں بچ سکتی تھیں۔

زنانخانے کا ماحول

پردہ سسٹم عجیب و غریب طرح سے مسلمانوں کی خاندانی اور معاشرتی زندگی کو دو حصوں میں کاٹ دیتا ہے۔ وہ عورتوں کی زندگی کو باہر کی دنیا سے منقطع کر دیتا ہے اور مردوں کو گھر کے اندر کی زندگی سے لاتعلق بنا دیتا ہے، خواہ وہ خاندان کے قریب ترین اور عزیز ترین ارکان ہی کیوں نہ ہوں۔ خاوند/باپ اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر مردانے میں گزارتا ہے اور زنان خانے کے "زنانہ" معاملات سے بہت کم سروکار رکھتا ہے۔ صرف کھانا کھانے کے لئے وہ گھر میں جاتا ہے، مگر وہ بھی بسا اوقات مردانے میں اپنے عزیز و اقارب اور مرد ملاقاتیوں کے ساتھ کھا لیتا ہے۔ اگر گھر میں کھانا بھی کھائے تو بھی پردے کے رسم و رواج ایسے ہیں کہ مرد اور عورتوں کا اکٹھا کھانا کھانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے گھر کے مرد بھی اپنی عورتوں سے

---

[1] "اخبارِ جہاں" کراچی صفحہ ۱۲۔ مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۷۰ء۔

الگ کھانا کھاتے ہیں[۱]۔ دراصل یہ علیحدگی خاندان میں مردوں کی برتری، رعب اور دبدبہ قائم رکھنے کے لئے ضروری اور لازمی چیز ہے، جس کے بغیر یہ نظام معاشرت برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ کیونکہ اسی طرح عورت کی اطاعت گزاری اور "تابعیت" ممکن ہو سکتی ہے پردہ سسٹم کے ایک مشہور داعی، مولانا مودودی نے اس نظام میں مرد کی برتری کے تحت عورت کی تابعیت کی وضاحت یوں کی ہے:

"یہ تابعیت اس معنی میں نہیں ہے کہ اس (عورت) کے لئے ارادہ عمل کی کوئی آزادی نہیں، یا اسے اپنے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں (ہر شخص جانتا ہے کہ عمر قیدی کو بھی جیل خانے میں ادھر ادھر پھرنے کی کافی آزادی اور اپنے معاملات میں کافی اختیار حاصل ہوتا ہے، مصنف) بلکہ اس معنی میں ہے کہ نظام معاشرت کو اختلال و برہمی سے محفوظ رکھنے اور خاندان کے اخلاق و معاملات کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے بچانے کی ذمہ داری مرد پر ہے اور اس نظم کی خاطر عورت پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ جو شخص اس نظم کا ذمہ دار ہو اس کی اطاعت کرے، خواہ وہ اس کا شوہر ہو یا باپ یا بھائی[۲]۔"

لہٰذا پردے کی چار دیواری کے اندر مرد کی حاکمیت اور عورت کی محکومی اور اطاعت گزاری کو مزید یقینی اور ناگزیر بنانے کے لئے پردہ سسٹم کے حامیان بڑے شدومد کے ساتھ خاوند کو بیوی کی سرزنش اور مارپیٹ کی اجازت دیتے ہیں۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی بیوی اپنے خاوند کے حقوق پورے نہ کرے تو وہ اسے مارپیٹ سکتا ہے۔

---

[۱] ترک ماہر بشریات ڈاکٹر ذکیہ ایگلر جس نے کئی سال "پنجاب کے گاؤں میں رہ کر دیہاتی معاشرے کا خود مشاہدہ کیا" لکھتی ہے کہ گاؤں میں باپ (خاوند) اپنے کنبے سے الگ چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے جبکہ اس کی بیوی بچے اور کنبے کے دوسرے لوگ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں دیکھئے،

Dr. Zekiye Eglar, *A Punjabi Village in Pakistan*, p. 64. New York. 1960.

[۲] ابوالاعلیٰ مودودی "پردہ" صفحہ ۲۴۲۔

یہاں تک کہ وہ اس کی اطاعت کرنے لگے[1]۔" اور اگر پھر بھی اس کی اصلاح نہ ہو تو وہ اُسے طلاق دے کر خلاصی حاصل کر سکتا ہے، مگر عورت کو کسی صورت میں بھی مرد سے طلاق لینے کا حق حاصل نہیں[2]۔ دراصل پردہ سوسائٹی میں عورت پیدا ہونے کی ایک ٹریجڈی بھی یہی ہے کہ مرد بڑی آسانی سے اس کی ہر طرح سے درگت بنا سکتا ہے۔ اول تو وہ پردے کی چار دیواری کے اندر بند ہوتی ہے، جہاں سے اس کی آواز باہر نہیں جا سکتی، علاوہ ازیں پردہ سسٹم کے رسم ورواج اور غیر تحریری قواعد اور قوانین ایسے ہیں کہ عام رائے اور رویے ہمیشہ مردوں کے حق میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا عورتوں کو مردوں کے ہر طرح کے ظلم اور زیادتیاں سہنی پڑتی ہیں

وہ حسن کی شہزادیاں پردے کی ہیں آبادیاں
چشم فلک نے آج تک دیکھی نہیں اُن کی جھلک
سرمایۂ شرم و حیا زیور ہے ان کے حسن کا
شوہر کے دکھ سہتی ہیں وہ منہ سے نہیں کہتی ہیں وہ[3]

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی "حقوق الزوجین" صفحہ ۴۷: مولانا مودودی مسلمان عورت کی اس کے مرد کے ہاتھوں زدو کوب اور پردے کی پابندیوں اور امتناعات کو "گھریلو اصلاح" اور مرد کی خاندان میں برتری اور حاکمیت کو "خاندان کا نظم" قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں "پردے کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اگر اسے معاشرے کی اصلاح کی بنیاد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ گھریلو زندگی کی خوشیاں اور خاندان کے نظم کی مضبوطی کا براہ راست اس مسئلے سے تعلق ہے۔" (دیکھئے مولانا کی تصنیف "رسائل و مسائل" حصہ دوم صفحہ ۲۸، ۲۹) ہم ان نظریات کا تجزیہ اگلے باب میں کریں گے۔ یہاں ان کی تردید میں اتنا کہنا ضروری ہے کہ پردہ سوسائٹی کی طرح عورت کی مارپیٹ کو جائز قرار دینے کا تو کیا ذکر تکمیلی معاشرے میں عورت کو پھولوں کی چھڑی سے مارنا بھی ایک عظیم ظلم تصور کیا جاتا ہے۔ دراصل عورت کی شخصیت کا احترام، اس کے حقوق اور آزادیوں کی حرمت اور اس کی رضا و رغبت کی عزت انسانیت پرور، معقول اور مہذب زندگی اور معاشرے کی شرط اولین اور تکمیلی زندگی اور معاشرے کے لئے حرف اول کی حیثیت رکھتی ہیں۔

[2] ایضاً صفحہ ۴۹

[3] حفیظ جالندھری "سوز و ساز" صفحہ ۱۸۳۔ مجلس اردو۔ لاہور۔ تاریخ ندارد۔

کب سامنے آتی ہیں وہ غیرت سے کٹ جاتی ہیں وہ[1]

دراصل زنان خانے میں عورتوں کی زندگی آئے دن کے جھگڑے فساد لڑائی اور مار کٹائی سے دوبھر ہوتی ہے۔ زنانخانے ہر قسم کے تنازعوں اور باہمی رنجشوں، خوف اور خدشوں سے بھرا ہوتا ہے، میاں بیوی کے تنازعے جو اکثر میاں کی زور و زیادتی، نت نئی شادی کی امنگوں، طلاق کی دھمکیوں کے علاوہ، ساس بہو اور نندوں کے جھگڑے اور اگر دو یا زیادہ بیویاں ہوں، تو سوکنوں کی چپقلشوں اور جلاپے، بچوں کی مار پیٹ اور جائیداد اور آمدنی کے متعلق جھگڑے اور کھینچا تانی سب مل کر زنانخانے کے تنگ و تاریک ماحول میں عورتوں اور مردوں میں اشتعال اور برہمی کے اثرات اور فضا پیدا کر دیتے ہیں جو اکثر عورتوں کی زدوکوب پر ختم ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات اُن کی موت اور قتل کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ عورتوں کی اس حالت زار پر کراچی کا عورتوں کا ایک ہفت وار رسالہ اپنے اداریہ میں لکھتا ہے:

"ہمارے معاشرے کا بڑا المیہ یہ ہے کہ عورت کے لئے اس میں کوئی مقام نہیں چند مہذب اور باسلیقہ خاندانوں کو چھوڑ کر باقی تمام میں اس سے قطعی اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ مرد کبھی اس کے حقوق تلف کرنے سے نہیں چوکتا، خاص طور پر جس معاملے میں اس کا اپنا مفاد ہو۔ ایسے معاملات میں وہ اس کی قطعی پرواہ نہیں کرتا خواہ وہ اس کی ماں، بیوی یا بہن کیوں نہ ہو یہ بات خاص طور پر وراثت اور جائیداد کے معاملوں میں ہوتی۔ ایک یتیم لڑکی کا قصہ ہے جسے اس کے قریبی رشتہ داروں نے اس لئے قتل کر دیا کہ وہ اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتی تھی جس سے جائیداد اُن کے ہاتھوں سے نکلتی تھی۔ اس المناک مثال کے علاوہ اور بہت سی باتیں ہیں جو مردوں کی باقاعدہ عادات

---

[1] حفیظ جالندھری "سوز و ساز" صفحہ ۱۸۳ مجلس اردو۔ لاہور۔ تاریخ ندارد۔

بن گئی ہیں۔ مثلاً روزمرہ کے خاندانی جھگڑے، بیوی سے بدسلوکی، بچوں سے غفلت اور اُن کی ضروریات زندگی مہیا کرنے میں لاپروائی [1]

ایسے حالات اور واقعات نے نہ صرف مسلمان عورتوں کی معاشرے میں حالت خراب اور ان کی حیثیت کو پست کر دیا ہے بلکہ مردوں کی آزادیوں اور زیادتیوں، بے راہ روی اور جور و جبر نے اُن کی زندگیوں میں خوف و ہراس، خدشوں اور وسوسوں کا ماحول طاری کر دیا ہے۔ پردہ دار گھر کے محدود دائرے میں عمر بھر بند رہنے کے باعث عورتوں میں ایک طرف تو محکومی، محتاجی، احساس کمتری، سادہ لوحی اور بے بسی کے احساسات اور جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف ان میں عیب جوئی، کنبہ پروری حیلہ سازی اور مکر و فریب جیسی متضاد عادات اور رجحانات جڑ پکڑ جاتے ہیں۔

ایسے المناک حالات اور خوف و خدشوں سے بھرے ہوئے ماحول کا ان بچیوں پر کیا اثر ہوتا ہے جو ان مجبور اور مقید عورتوں کے بطن سے پیدا ہوتی ہیں؟

پردہ سوسائٹی میں لڑکی کی پیدائش پردہ دار مسلم خاندان میں خواہ وہ امیر کا ہو یا غریب کا، لڑکی کی پیدائش بہت دکھ اور رنج کا باعث ہوتی ہے۔ اس کی پیدائش سے اس کی ماں کو بہت منحوس اور اس کے خاندان کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ماں کی اس خطا پر مار پیٹ بھی ہو جاتی ہے۔ اخبارِ خواتین کا ایک نامہ نگار لکھتا ہے!

"حال ہی میں ہمارے پڑوسی شیخ صاحب کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ خبر سنتے ہی شیخ صاحب غصے سے بے قابو ہو گئے۔ اور زچہ پر گرجنے لگے وہ غریب سب کچھ صبر و سکون سے سنتی رہی اور اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہی۔" [2]

---

[1] اخبار خواتین۔ کراچی۔ مورخہ ۱۰ ارجون ۱۹۶۷ء

[2] اخبار خواتین صفحہ ۶ مورخہ ۳ ستمبر ۱۹۶۶ء۔ اور دیکھیے اخبار خواتین مورخہ ۸ تا ۱۴ جون ۱۹۶۷ء۔ زیر عنوان "قارئین یہ مسئلہ آپ حل کریں" صفحہ ۱۲۔

بیٹے اور بیٹی کی پیدائش کے بارے میں رویے اور امتیاز کے فرق کے متعلق مسٹر شاہد حسین رزاقی لکھتے ہیں!

"بیٹے اور بیٹی میں یہ نامناسب امتیاز کم و بیش پاکستان کے ہر حصے میں موجود ہے۔ مشرقی پاکستان میں لڑکی کی پیدائش پر خوش ہونے کے بجائے اظہار افسوس کرتے ہیں۔ مغربی پاکستان میں یہ برائی سب سے زیادہ پنجاب میں پائی جاتی ہے۔ یہاں لڑکے کی پیدائش پر تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ گڑ اور لڈو تقسیم کرتے ہیں اور سب لوگ مبارک باد دینے آتے ہیں۔ مگر لڑکی کی پیدائش پر یہ لوگ افسوس کرنے آتے ہیں اور یہ کہہ کر تسلی دیتے ہیں کہ اس مصیبت کے بعد خوشی کا دن بھی آئے گا اور لڑکا پیدا ہوگا۔ اگر کسی عورت کے کئی لڑکیاں ہوتی ہیں تو اس کو بدقسمت کہا جاتا اور اس سے برا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ سندھ میں بھی لڑکی کی پیدائش پر خوش نہیں ہوتے بلکہ افسوس کرتے ہیں اور آئندہ لڑکی نہ ہونے کے لئے ٹوٹکے کئے جاتے ہیں چنانچہ کنڈی منڈی اور ویڑہ کی رسمیں بیٹے اور بیٹی میں اس نامناسب فرق کا اظہار ہیں۔ پٹھانوں اور بلوچوں میں لڑکی ماں باپ کے لئے معاشی بوجھ نہیں ہوتی لیکن یہ لڑکی کو بجائے خود ایک مصیبت فرض کرتے ہیں۔ یہ لوگ لڑکے کی پیدائش پر بہت خوشی مناتے ہیں۔ دعوتیں ہوتی ہیں۔ گانا بجانا ہوتا ہے اور قبیلے کے لوگ بندقیں چھوڑتے اور مبارک باد دیتے ہیں مگر لڑکی کی پیدائش کی اطلاع قریبی رشتہ داروں تک کو نہیں دیتے"[1]

پس ہر مسلمان بچی ان بدشگون حالات اور المناک ماحول میں اپنی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔ پہلے ایک دو سال تو اُسے کوئی شدید نہیں ہوتی کہ ان باتوں اور امتیازوں

---

[1] شاہد حسین رزاقی "پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج" ص ۲۵۵ تا ۲۵۶

کو سمجھ سکے۔ مگر پردہ اور زنان خانے کا ماحول دو چار سال ہی میں یہ حقیقت اس پر روشن کر دیتا ہے کہ اس میں بیٹیوں کی وہ قدر و منزلت نہیں جو اس کے بھائیوں اور دوسرے ہم عمر لڑکوں کو میسر ہیں۔ بلکہ رفتہ رفتہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور سے یہی فرق اپنی ماں، بہنوں اور گھر کے دوسری عورتوں کے ساتھ دیکھ کر محسوس کرنے لگتی ہیں اس احساس کے ساتھ ساتھ اور اس کی وجہ سے نوزائیدہ بچی کے دل میں باپ کا خوف بھی سرایت کرنے لگتا ہے۔

پردہ سسٹم کا سارا نظام صرف ایک چیز پہ قائم ہے۔ وہ مرد کا غلبہ اور دبدبہ ہے۔ جو اُسے قرا ابتداری معاشرے میں حاصل ہوتا ہے۔ یہی غلبہ اور دبدبہ ہے جو نہ صرف عورتوں کو ایک مرد کی کئی کئی بیویاں بننے پر راضی رکھتا ہے، بلکہ زنانخانے میں بھی، بقول مولانا مودودی "مرد" کی "تابعیت" میں بلا چوں وچرا زندگی گزارنے پر مجبور کرتا ہے۔[۱] یہی غلبہ اور دبدبہ خاندانی زندگی میں خاوند کے خوف اور باپ کے رعب داب کی صورت میں بیوی اور بچوں پر مسلط رہتا ہے۔ لہٰذا جب خاوند/ باپ گھر میں آتا ہے تو وہاں ہر ایک عورت اور بچہ اس کے رعب اور دبدبے سے لرزاں و پریشان رہتے ہیں۔ بیوی اکثر سہمی رہتی ہے۔ اس کی ڈانٹ پیٹ ہوتی رہتی ہے یا طلاق کی دھمکی ملتی رہتی ہے لہٰذا باپ کے گھر میں آنے پر اس نوزائیدہ بچی اپنی ماں اور دوسری عورتوں اور بچوں میں خوف اور دہشت کے ردعمل کو غیر شعوری طور پر محسوس کرتی ہے۔

پردہ دار باپ اور بچی | پردہ دار گھروں میں باپ اور نوزائیدہ بچی کے تعلقات شروع

---

[۱] مولانا مودودی لکھتے ہیں: "جس طرح شادی شدہ عورت اپنے شوہر کی تابع ہے اسی طرح غیر شادی شدہ عورت اپنے خاندان کے ذمہ دار مردوں کی تابع ہے"۔ دیکھئے "پردہ" ص ۲۴۱-۲۴۲۔

ایک اور مولانا صاحب بیویوں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "خوب یاد رکھو کہ مردوں کو خدا نے شیر بنایا ہے دباؤ اور زبردستی سے ہرگز زیر نہیں ہو سکتے۔ ان کو زیر کرنے کی بہت آسان ترکیب خوشامد اور تابعداری ہے"۔ مولانا محمد ادریس انصاری "مسلمان بیوی"۔ ص ۷۰۔ ۷۹ دارالاشاعت کراچی ۱۹۷۳۔

ہی سے خوف وہراس، رعب وداب اور غصے اور غضب کے ماحول اور ردِ عمل میں استوار ہوتے ہیں۔ اول تو وہ اپنے باپ کو بہت کم دیکھتی ہے کیونکہ اس کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر کی مصروفیات اور کاروبار میں گزرتا ہے۔ جب وہ گھر میں آتا ہے تو اکثر شام اور رات گئے بے وقت۔ اس کے علاوہ، پردہ سوسائٹی کے رسم و رواج اور رائے اور رویے کے مطابق اسے اپنی بچی سے پیار و انس کا اظہار بھی نہیں کرنا ہوتا۔ علاوہ بریں، اس کی پیدائش بھی اس کے لئے سوہان روح بن گئی ہوتی تھی۔ اس کی پیدائش کا افسوس اسے کبھی نہیں بھولتا اور جوں جوں وہ بڑی ہوتی ہے توں توں اس کے بارے اس کے وسوسے اور خدشے غم اور افسوس بڑھتے جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ بچی سے پرے پرے رہتا ہے۔

اس نوعیت کے حالات اور تعلقات میں پردہ دار باپ اور بچی میں ایک اجنبیت سے پیدا ہو جاتی ہے جو فطری رشتے اور محبت کے باوجود دونوں میں ہمیشہ حائل رہتی ہے۔ اگر اس کی دو یا زیادہ بیویاں ہوں تو یہ اجنبیت اور زیادہ گہری ہو جاتی ہے بہرکیف پردے کے ماحول میں بچی کے دل و دماغ میں بچپن ہی سے اس اجتناب اور اجنبیت کی وجہ سے باپ کے رعب داب، خوف و دہشت کے جذبات اور تصورات سرایت کر جاتے ہیں جو اس کے ذہن و کردار کی نشوونما میں بنیادی اور حتمی حیثیت رکھتے ہیں۔

"موت کی دُعا" قرابتداری معاشرے میں عورت کی ایک ازلی بدنصیبی اس کی "موت کی دعا" ہے جو اس کے باپ کے منہ سے نہیں تو دل سے نکلتی ہے جب وہ پہلی مرتبہ اپنی بیٹی کی پیدائش کی خبر سنتا ہے۔ زیادہ سادہ لوح قبائلی معاشرے میں اس کے پیدا ہوتے ہی اس کی موت کی دعائیں اور بعض اوقات ترکیبیں بھی شروع ہو جاتی ہیں۔ پشتو کی ایک ضرب المثل ہے کہ "ښځې په کور ښه دي یا په گور ښه" "عورت گھر میں بہتر ہے یا پھر قبر میں" دراصل پردے کا رواج اور اس کا سارا نظام اس رویے پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کی پردہ سوسائٹی میں ایسے رویے اور دعائیں ہر مسلم ملک میں عام ہوتی ہیں۔ ایک مصری عالم حامد عمار مصر کی دیہاتی زندگی میں اس رویے کا

ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے!

"لڑکی کی پیدائش پر باپ کو یہ کہہ کر تنگ کیا جاتا ہے کہ "اللہ کرے وہ کبھی نہ پھلے پھولے" (یعنی پیدا ہوتے ہی مر جائے)۔ عام کہاوت ہے کہ ایک مرا ہوا بیٹا سات زندہ بیٹیوں سے بہتر ہے۔"[۱]

پاکستان میں بھی لڑکی کی پیدائش کو نحوست اور بدقسمتی تصور کیا جاتا ہے۔ لوگ ماں کی لعنت ملامت کرتے ہیں اور باپ کو طعنے دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات قبائلی معاشرے کا طریقہ یعنی بیٹی کو زندہ درگور کرنے کی دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں۔ ایک فوجی افسر کی بیوی لکھتی ہے:-

"میرے شوہر کہتے ہیں مجھے بچی اچھی نہیں لگتی یا تو اسے کسی کو دے دو یا پھر اس کا گلا گھونٹ دوں گا اور تم کسی کے سامنے اس کا ذکر نہ کرنا۔ بچی کو اس بری طرح مارتے ہیں کہ اس کا جسم نیلا پڑ جاتا ہے جب میں چھڑانی ہوں تو مجھے مارنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب تک روزانہ بیٹی کو نہ ماروں مجھے تسکین نہیں ملتی۔ سسرال والے بھی میرے شوہر کو بہکاتے رہتے ہیں اور انہیں بیٹی کا طعنہ دیتے ہیں۔"[۲]

پردے کی قیود اور پابندیاں رائے عامہ اور رویے

پردے والے گھر میں لڑکی کے کردار اور ذہن کا نشو و نما میں باپ کے خوف اور دبدبے کا رول پردے کی قیود اور پابندیوں سے مل کر اپنا اثر دکھاتا ہے اس سے پیشتر کہ ہم اس نشو و نما کا تجزیہ کریں پہلے ہم پردے کی قیود اور پابندیوں

---

[۱]

[۲]۔ اخبار خواتین "قارئین یہ مسئلہ آپ حل کریں" ص ۲۱، مورخہ ۸ تا ۱۴ جون ۱۹۷۴۔ سوال یہ نہیں کہ کس نے کس کو ہلاک کیا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسے نظریات، عقائد، خیالات اور تمدنی و معاشرتی ماحول ایسے ہیں جن میں کسی کا کسی کے ہاتھوں قتل ممکن ہے۔ اگر یہ ماحول نہ ہو تو موت کی دعا کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئیگی۔

اور رالیوں رذیوں کا ذکر کریں گے جو پردے میں پلنے والی لڑکی کو کم سنی ہی سے متاثر کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ اُسے بچپن ہی سے وہ فرق محسوس ہونے لگتا ہے جو اس میں اور اس کے بھائی اور گھر کے دوسرے لڑکوں میں روا رکھا جاتا ہے۔ اُسے زیادہ تر گھر اور زنانخانے کے تنگ و تاریک حصے میں رکھا جاتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں اس سے فرق برتا جاتا ہے جو دراصل پردہ دار گھر میں عورتوں اور مردوں کے مابین بھی پایا جاتا ہے۔ مردوں کی نسبت عورتیں گھر اور زنانخانے کے زیادہ "تنگ و تاریک اور غیر صحت مند حصوں میں رہتی ہیں۔ ان کا لباس بھی مردوں کی نسبت زیادہ غیر صحت مند ہوتا ہے۔ مثلاً سردیوں کے موسم میں اُن کا لباس نسبتاً کم گرم کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ نمایاں فرق کھانے پینے کی چیزوں میں پایا جاتا ہے۔ عورتوں کو عموماً مردوں کی نسبت کم غذائیت والی خوراک ملتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو انہیں مردوں کے آگے کا بچا ہوا کھانا ہی نصیب ہوتا ہے۔ یہی سلوک لڑکیوں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے انہیں بھی لڑکوں کی نسبت گھر کے تنگ و تاریک اور غیر صحت مند حصے میں رکھا جاتا ہے اور کھانے پینے کو بھی لڑکوں کے مقابلے میں کم اور گھٹیا خوراک ملتی ہے پہننے کو زرق برق کے کپڑے تو ملتے ہیں مگر صحت اور تندرستی کے نقطہ نظر سے وہ گھٹیا اور غیر مناسب ہوتے ہیں۔ اسی سلوک کی وجہ سے بچپن ہی سے لڑکیوں کی شرح اموات لڑکوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے جو پردہ سوسائٹی میں جنسی شرح اموات کی خصوصیت ہے اس کے باعث مسلم معاشرے میں عورتوں کی اوسط عمر مردوں کی اوسط عمر سے کم ہوتی ہے جیسا کہ ہم بعد میں تفصیلاً تجزیہ کریں گے۔

مگر سب سے سنگین فرق تعلیم و تربیت میں پایا جاتا ہے۔ اگرچہ کم سن بچی کو زنانخانے اور مردانے میں گھومنے پھرنے کی آزادی ہوتی ہے، مگر جونہی وہ پانچ چھ سال کی ہوتی ہے تو پردے کی پابندیاں نافذ ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کو لڑکوں کی نسبت کھیل کود سے منع کیا جاتا ہے۔ گھر سے باہر نکلنے پر بھی ڈانٹ ڈپٹ شروع ہو جاتی ہے اور بتدریج اس پر پردے کی پابندیاں عائد ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ کم سن لڑکی

پر گھر سے باہر کا پردہ گھر کے اندر کے پردے کی نسبت پہلے عائد کر دیا جاتا ہے۔ پردہ کے حامیوں کی رویئے، رائے اور تعصبات عورتوں اور لڑکیوں کے گھر سے باہر کی سرگرمیوں سیر، تفریح، کھیل اور ورزش وغیرہ کے سخت مخالف ہوتے ہیں وہ بڑی شدت سے پردے کی پابندیوں کو عائد کرنے کا پرچار کرتے ہیں۔ مثلاً مولانا مودودی حکم دیتے ہیں کہ

"عورت کا دائرہ عمل مرد کے دائرے سے الگ ہو، دونوں کی فطرت اور ذہنی وجسمانی استعداد کے لحاظ سے تمدن کی الگ الگ خدمات انکے سپرد کی جائیں اور ان کے تعلقات کی تنظیم اس طور پر کی جائے کہ وہ جائز حدود کے اندر ایک دوسرے کے مددگار ہوں مگر حدود سے تجاوز کر کے کوئی کسی کے کام میں خلل انداز نہ ہو سکے۔"[1]

مولانا امین احسن اصلاحی ان حدود کی وضاحت کرتے ہوئے جنہیں عورت تجاوز نہیں کر سکتی لکھتے ہیں:

"عورت کا اصلی میدانِ عمل اس کا گھر ہے نہ کہ باہر۔ اس لئے بغیر کسی حقیقی ضرورت کے اس کا غیر متعلق کاموں میں شرکت کے لئے نکلنا یا سیر سپاٹے، تفریح، تماشہ بینی اور پکنک کے لئے جانا یا اپنے حسن وجمال اور بناؤ سنگار کی نمائش کرتے پھرنا ناجائز ہے۔"[2]

باہر کے کاموں کی مزید تشخیص کرتے ہوئے مولانا اصلاحی عورتوں کے لئے ان انسانی ہمدردی اور فلاح وبہبود کے وہ کام کرنے کو بھی غیر اسلامی اور قابل مذمت قرار دیتے ہیں جو قومی خدمت اور خدمت خلق کہلاتے ہیں۔ مثلاً نرسنگ، فلاحی خدمات، قومی فوجی خدمات وغیرہ۔ وہ لکھتے ہیں:

"باہر کے اجتماعی فرائض میں سے اور کاموں کا تو کیا ذکر جو

۱۔ مودودی "پردہ" ص ۲۵۷۔

۲۔ مولانا امین احسن اصلاحی "پاکستانی عورت دوراہے پر" ص ۱۳۰۔

کام نیکی اور خدمتِ دین اور ہمدردی خلق کے بہترین کام ہیں ان میں بھی عورت کی شرکت کو (اسلام میں) پسند نہیں کیا گیا ہے[۱]۔"

یہی حال قومی پیداواری کاموں اور پیشوں کا ہے۔ لہٰذا وہ ان کے خلاف بھی حکم صادر کرتے ہیں:

"ملک کی معاشی خوشحالی کے لئے بھی صحیح طریق کار یہ نہیں ہے کہ عورت بھی کارخانوں میں، ملوں میں، کھیتوں میں، دکانوں میں اور دفتروں میں افزائش دولت کی مہم میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لے بلکہ معاشی نقطہ نظر بھی یہ تقاضہ کرتا ہے کہ عورت دولت کمانے کی بجائے مرد کی کمائی ہوئی دولت کو سنبھالنے اور اپنے سگھڑپن سے اس کو صحیح مصرف میں استعمال کرنے کی خدمت انجام دے[۲]۔"

یہ تو علمائے دین کی رائے ہے۔ حقیقت میں پردہ سوسائٹی میں عورت کا گھر سے باہر نکلنا اور عزت ووقار سے گھومنا پھرنا اور کام کاج کرنا عملاً بہت محال ہوتا ہے کیونکہ عام لوگوں کی رائے اور رویے بھی سختی سے علمائے دین کی رائے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہر طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ اخبار خواتین میں ایک خاتون نامہ نگار شکایت کرتی ہے کہ

"وہ بہنیں جنہیں بازار نکلنے کا اتفاق ہوتا ہے بخوبی جانتی ہیں کہ اکثر مردِ راہ چلتے میں دھکا مار جاتے ہیں یا کوئی بری بات کہہ دیتے ہیں[۳]۔"

بلاشبہ پردہ سوسائٹی میں عورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلنا کار دارد ہوتا ہے

۱۔ مولانا امین احسن اصلاحی "پاکستانی عورت دوراہے پر" ص ۱۳۱

۲۔ ایضاً ص ۲۱۳

۳۔ اخبار خواتین، خانم کی ڈائری ص ۱۲، مورخہ ۱۸ تا ۲۴ اپریل ۱۹۷۰۔

انہیں باہر ہر طرح کے خدشے اور خطرے در پیش آتے ہیں۔ جب کبھی وہ گھر سے باہر نکلتی ہیں تو مرد راہی گیر اُن پر آوازے کستے ہیں۔ بعض لوگ تو دھکے مارتے ہیں اور زیادہ متقی لوگ انہیں باہر نکلنے پر لعنت ملامت کرتے ہیں اور گھر میں پردے میں رہنے کے پند و نصائح کرتے ہیں اور گلیوں اور بازاروں میں اوباش اور آوارہ لوگ بدتمیزی سے پیش آتے ہیں اور گلیوں کے شریر لڑکے بالے ان پر آوازے کستے اور بھبکیاں لیتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور میں بعض اوقات بعض لوگ پردے کے جوش میں آ کر بازاروں میں عورتوں اور لڑکیوں کے باہر نکلنے اور بے برقعہ ہونے پر اس قدر برانگیختہ ہوتے ہیں کہ ان کی چوٹی کاٹ لیتے ہیں۔ مسجدوں میں مُلا اور خطیب اپنے خطبوں اور واعظوں میں بے پردگی کے خلاف جیسے وہ "بے حیائی" کہتے ہیں، اکثر خوب لعنت ملامت کرتے ہیں جماعت اسلامی اور پاکستان کی دوسری علمائی پارٹیوں کے ارکان اپنے جلسوں اور جلوسوں میں بے پردگی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو جسے وہ "بے حیائی کی وبا" قرار دیتے ہیں "تقریریں کرتے ہیں"، قرار داد منظور کرتے ہیں اور پوسٹر اور پلیکارڈ مشتہر کرتے ہیں۔ پاکستان کی صوبائی اور مرکزی قانون ساز اسمبلیوں میں علمائی جماعتوں اور پارٹیوں کے نمائندے پردے کی پابندی اور بے پردگی یا بقول ان کے "بے حیائی" کے خلاف تقریریں کرتے ہیں اور قرار داد اور بل پاس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اب تک ان جماعتوں اور پارٹیوں کو پاکستان کی کسی قانون ساز اسمبلی میں اکثریت نہیں حاصل ہوئی کہ اپنی قرار دادوں اور بلوں کو قانون بنا کر نافذ کر سکیں۔ بہر حال ایسے حالات، واقعات اور تنازعات کے باعث بعض اوقات عورتوں کو برقع پہن کر باہر نکلنے کی آزادی بھی میسر نہیں ہوتی۔ ان خدشات اور تعصبات کی وجہ سے ہمارے ملک میں پردے کی عام پابندی میں کمی ہونے کے باوجود اکثر گھرانے ایسے ہیں جن میں لوگ گھر کے باہر کے پردے کی پابندی ضروری خیال کرتے ہیں۔ بلکہ غیر پردہ دار عورتیں اپنی پردہ نشین بزرگوں کی طرح گھر میں بند رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

پردہ سسٹم کے عورتوں اور لڑکیوں کی صحت پر اثرات

ان ناساعدانہ رویوں اور

امتناعی حالات کے باعث پردہ دار لڑکیوں کی صحت اور تندرستی بچپن ہی سے متاثر ہونے لگتی ہے۔ انہیں کھلی ہوا، ورزش اور کھیل کود اور گیمز اور سپورٹس کے مواقع نہیں ملتے، سیر و تفریح کی ممانعت ہوتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ گھر کے ایسے حصے میں رہتی ہیں جہاں کھلی ہوا اور دھوپ کا گزر نہیں ہوتا اور انہیں خوراک بھی کم اور گھٹیا نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا جب وہ جوانی کو پہنچتی ہیں تو بیماریوں اور خرابیٔ صحت کا شکار ہونے لگتی ہیں۔ یہ بیماریاں اور خرابیاں اُن "فطری داعیات" کے باعث نہیں جن کو حامیان پردہ نے اس قدر اچھالا ہے[1]۔ اور جن کا تجزیہ ہم بعد میں کریں گے، بلکہ وہ فقط اُن حالات اور ماحول سے پیدا ہوتی ہیں جو پردہ سسٹم نے پیدا کیے ہیں۔ ان بیماریوں میں تپ دق (ٹی بی)، اوسٹیملاشیہ یا ہڈیوں خاص کر پیلوِس کی ہڈیوں کا نرم اور کمزور ہو جانے کی بیماری بہت عام ہوتی ہیں جو کھلی ہوا اور دھوپ کی کمی اور گندی اور تاریک جگہ رہنے کے باعث لاحق ہو جاتی ہیں۔ ایک برطانوی لیڈی ڈاکٹر جو سرینگر کشمیر میں زنانہ ہسپتال میں کام کرتی تھی لکھتی ہے۔

> "پہلی مرتبہ میری توجہ اس بیماری (اوسٹیملاشیہ یعنی ہڈیوں کا نرم پڑ جانے) کی طرف یہ معلوم کر کے مبذول ہوئی کہ جب کہ غریب عورتوں کے مقابلتاً آسانی سے بچے پیدا ہو جاتے ہیں خوشحال کشمیری عورتوں کو زچگی میں اس قدر مشکل ہوتی ہے کہ بعض اوقات وہ بچہ ان جنے مر جاتی ہے۔
>
> "ہر چیز کا ایسا انتظام کیا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو اندھیرے میں رکھا جائے[2] اور چونکہ روشنی زندگی کیلئے لازمی ہے اسکیلئے ان کے جسم اور ذہن بہت متاثر ہونے ہیں۔

---

[1] دیکھئے مولانا مودودی "پردہ" ص ۳۴ تا ۱۵، علامہ فرید وجدی "مسلمان عورت" ص ۷، تا ۵۸

[2] Kathleen Olga Vaughan, *The Purdah System and its Effects on Motherhood*, p. 1. Cambridge 1928

مگر مردوں پر بھی اثر پڑتا ہے کیوں کہ ان خوشحال اور مالدار خاندانوں میں تپدق بہت عام ہے جو ان میں اموات کی بڑھتی ہوئی تعداد کا باعث ہے اور یہ بیماری عورتوں سے شروع ہوتی ہے۔ عورتیں ہولناک پیمانے پر دکھ اٹھاتی ہیں ...اس میں شک نہیں کہ اگر بچی کے لئے جب وہ شیر خوار ہے اور لڑکی ہو اور عورت کے لئے روشنی کا انتظام کیا جائے تو عورتوں کو ان مشکلات سے قطعی نجات مل جائے گی جو بعد ازاں بچہ جننے کے ایام میں انہیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ہر جگہ کافی روشنی ہوتی ہے مگر انہیں میسر نہیں ہوتی

اس صورتحال سے جس کے باعث مشرقی عورتیں اپنے ہی گھروں میں قیدی بن جاتی ہیں، ان کے پیٹرو (پیلویس) کی ساخت بگڑ جاتی ہے، جس سے بچے کی پیدائش مشکل ہوتی ہے اور اگر ناممکن نہیں تو خواہ مخواہ خطرناک ضرور ہو جاتی ہے۔ تاہم روشنی میسر ہو تو اس بیماری کا سد باب ہو جائے گا۔"[1]

یہ بیماریاں اور کمزوریاں فطری نہیں ہیں، بلکہ یہ المناک صورتحال پردہ سسٹم نے پیدا کی ہے جو اپنے بالواسطہ اور بلاواسطہ نتائج اور اثرات سے لڑکیوں اور عورتوں کی صحت اور تندرستی کو خراب کر کے انہیں لاکھوں کی تعداد میں مختلف بیماریوں اور کمزوریوں کا شکار بناتی ہے۔[2] یہ صورتحال غیر فطری ہے کیونکہ حیاتیاتی لحاظ سے عورت مرد کی نسبت زیادہ قابل بقا ہستی ہے۔ یہ اس کی فطری برتری ہے جو قدرت نے نظام حیات میں عورت کو عطا

---

[1] ایضاً۔ ص ۳۷-۳۸۔

[2] ایک برطانوی سیاح عورت جنوبی عربستان کے ایک علاقے میں روزمرہ کی زندگی کے بارے میں لکھتی ہے: "وادی کے نیچے گاؤں سے ایک خوبرو عورت آئی۔ اس کا خاوند شادی کے بعد ہی اُسے چھوڑ کر سمالیہ چلا گیا تھا وہ کسی ایسے شدید درد میں مبتلا تھی کہ کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی اور دوائی کے لئے آئی تھی لیکن میں اسوقت سو رہی تھی۔ محمود جو دربان تھا اُسے اوپر والی منزل میں لے گیا اور وہاں اس نے اسکے پاؤں کے تلووں کو لوہے کی گرم سلاخ سے داغا۔ جب میں بیدار ہوئی تو وہ میرے پاس آئی اور ظاہراً بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئی تھی وہ میرے پاس بیٹھی اپنے نوجوان خاوند کی بخیریت واپسی کیلئے ایک قصیدہ گاتی رہی جس کے الفاظ

کی ہے۔ایک مصنف نے بالکل ٹھیک کہا کہ

"عورتیں مردوں کی نسبت قوت زائل کرنے والے تمام حالات کو بہتر طور سے برداشت کرسکتی ہیں: مثلاً بھوک پیاس گرمی سردی تھکان بیماری وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ نر کی نسبت مادہ جسماً قوی تر ہوتی ہے صرف پٹھوں کے لحاظ سے کم طاقتور ہوتی ہے۔ اس میں قوت برداشت (سٹیمینا) زیادہ ہوتا ہے اور وہ زیادہ لمبی عمر تک زندہ رہتی ہے[ا]۔"

مگر پردہ سوسائٹی کی گنگا الٹی بہتی ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان ممالک اور آبادیوں میں پردہ سسٹم کے صحت کش اثرات کے باعث آبادی کے جنسی تناسب میں عورتوں اور لڑکیوں کی نسبت مردوں اور لڑکوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ پاکستان میں ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ ہمیں بتاتی ہے کہ

اس کی پھوپھی نے بنائے تھے اور وہ نہایت درد بھری لے سے گا رہی تھی:

"واپس آجا تیرے چچا کی بیٹی رات پڑے اکیلی ہوتی ہے"

لڑکیاں جو اسے گھیرے ہوئی تھیں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ عطیہ نے شرماتے ہوئے سادہ لوحی سے پوچھا: "کیا یہ ٹھیک بات نہیں؟ کیا وہ میرا خاوند نہیں؟ کیا میں اسے واپس نہ بلاؤں؟"

"اور وہ کب تک پردیس میں رہے گا؟"

"کون جانتا ہے؟ شاید دس سال تک۔ اللہ کی مرضی۔"

اُن سب نے سرد آہیں بھریں کیونکہ ان وادیوں میں یہ سب کا غم تھا بلاشبہ سب اپنے اپنے خاوندوں کا سوچ رہی تھیں جو پردیسوں میں چلے گئے تھے اور دوسری عورتوں سے شادی کرلی تھی۔

"عورت کے لئے دنیا کی زندگی کتنی سخت ہوتی ہے" نور نے کہا جو خادمہ تھی۔" فریا سٹارک "عربستان کے جنوبی Freya Stark, *The Southern Gates of Arabia*, p. 139. دروازے" (انگریزی میں) ص ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ جون مرے۔ لندن۔ ۱۹۳۸۔

ا Ashley Montagu, *The Natural Superiority of Women*, pp. 58-59. Macmillan, London. 1958.

"عورتوں کی نسبت مردوں کی زیادتی برصغیر ہندوپاکستان کی تمام مردم شماریوں کی خصوصیت رہی ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس میں بھی ہر سو عورتوں کے لئے ایک سو تیرہ مردوں کی تناسب سے اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں[1]۔"

مردم شماری کی یہ رپورٹ مزید بتاتی ہے کہ دوسرے مسلم ممالک میں بھی جنسی تناسب میں یہی فرق پایا جاتا ہے:

"یہ امر قابل ذکر ہے کہ مردوں کی زیادتی دوسرے مسلم ممالک میں بھی پائی جاتی ہے: مثلاً اردن میں ایک ہزار عورتوں کے مقابلے میں ۱۱۵۴ مرد، الجیریا میں ایک ہزار اٹھارہ مرد، ترکیہ میں ایک ہزار گیارہ مرد ہیں[2]۔"

پردہ سوسائٹی میں صنف نازک کی اس المناک حالت کی وجہ صرف یہ ہے کہ پردہ سسٹم کے باعث ہمارے گھروں اور گھریلو زندگی میں ایسے حالات اور واقعات رویے اور رسم و رواج پائے جاتے ہیں جو لڑکوں اور مردوں کے مقابلے میں بچیوں لڑکیوں اور عورتوں کی شرح اموات کو بڑھا دیتے ہیں جیساکہ پاکستان کی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہے[3]۔"

عمر کے گروپ	جنسی تناسب (مغربی پاکستان میں)	
۰ ــ ۱ سال	ایک سو بچیوں کے مقابلے میں	۱۰۳ بچے
۱ ــ ۴ "	" " " " " "	۱۰۴٫۶۹ "
۵ سے ۹ "	" " " " " "	۱۱۴٫۶۶ "

[1] ایضاً ص ۵۴

[2] ایضاً ص ۵۵

[3] *1961 Census of Pakistan.* Vol. 1. Statement 3.8. p. IV 8.

عمروں کے گروپ	جنسی تناسب (مغربی پاکستان میں)
۱۰ سے ۱۴ سال	ایک سو لڑکیوں کے مقابلے میں ۱۲۲٫۶ لڑکے
۱۵ " ۱۹ "	" " " " " ۱۱۸٫۵ لڑکے
۲۰ " ۲۴ "	" " " " " ۱۱۲٫۹ "
۲۵ " ۲۹ "	" " عورتوں " " ۱۰۹٫۵ مرد
۳۰ " ۳۴ "	" " " " " ۱۱۰٫۷ "
۳۵ " ۳۹ "	" " " " " ۱۱۷٫۵ "
۴۰ " ۴۴ "	" " " " " ۱۱۹٫۵ "
۴۵ " ۴۹ "	" " " " " ۱۲۵٫۵ "
۵۰ " ۵۴ "	" " " " " ۱۲۹٫۶ "
۵۵ " ۶۰ "	" " " " " ۱۲۵٫۷ "
۶۰ سال اور اوپر	" " " " " ۱۳۲٫۴ "

یہ جدول کئی نکتے واضح کرتی ہے ۔ اول پردہ سوسائٹی میں پیدائش سے ایک سال کی عمر میں بچیوں کی تعداد بچوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے، جو غیر فطری امر ہے کیونکہ ہر آزاد معاشرے میں دونوں کی تعداد کم و بیش یکساں ہوتی ہے اس فرق سے ظاہر ہے کہ اپنی عمر کے اس نازک سال میں بچیوں سے ایسا ناپسندیدگی کا سلوک کیا جاتا ہے کہ وہ چل بستی ہیں ۔ اس سلوک کی مثالیں ہم نے اوپر بیان کی ہیں ۔ دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ لڑکیاں جب عنفوان شباب کے دور میں داخل ہوتی ہیں یعنی دس سے پندرہ سال کی عمر میں، تو اُن کی شرح اموات یکایک بڑھ جاتی ہے اور یہ حالت ۶۰ سال کی عمر تک کے گروپ تک جاری رہتی ہے ۔ یہ وہ عمریں ہیں جن میں نہ صرف گھر اور پردے کے تنگ و تاریک ماحول کی وجہ سے بیماریوں کا زور ہو جاتا ہے بلکہ لڑکیوں کی شادی اور زچگی

میاں بیوی کے تنازعے اور ساس بہو کے جھگڑے اور گھریلو فسادات نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کی ہلاکت کا باعث بن کر جنسی تناسب میں فرق پیدا کر دیتے ہیں۔ تیسری حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ بیس اور چالیس سال کی عمروں میں تو کچھ سنبھالا مل جاتا ہے مگر چالیس سال کی عمر کے بعد پردہ سوسائٹی کا ماحول پھر اپنا رنگ دکھانے لگتا ہے اور عورتوں کی شرح اموات برابر بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ ساٹھ سال اور اوپر کی عمروں میں تو ہر ایک سو مردوں کے مقابلے میں صرف ۷۶ عورتیں زندہ رہتی ہیں۔ اس کے برعکس غیر پردہ دار معاشرے میں عمر کے ان سالوں میں زیادہ عورتیں زندہ رہتی ہیں۔

اس مردم شماری کے اعداد و شمار ایک اور حقیقت واضح کرتے ہیں کہ جس طرح دنیائے اسلام کے ان ممالک میں جنسی تناسب میں عورتوں کی شرح اموات زیادہ ہے جن میں پردہ اور تعداد ازدواج کا زور اور زیادتی ہے، مثلاً سعودی عرب، اردن وغیرہ، اسی طرح ہر مسلمان ملک میں اُن علاقوں میں عورتوں کی شرح اموات زیادہ ہے جہاں پردہ اور کثرت ازدواج کا زور اور تاریکی زیادہ ہے اس کا ثبوت پاکستان میں صاف طور سے ملتا ہے۔ ۱۹۵۱ کی مردم شماری کی رپورٹ میں لکھا ہے!

"مغربی پاکستان میں بلوچستان اور سندھ میں ہر عمر کے مردوں کی تعداد کا تناسب ملک میں سب سے زیادہ ہے۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں ۴۰ سے ۶۰ سال کی عمر کے مردوں کی تعداد کا تناسب مشرقی پاکستان کے ہم عمر گروپوں سے قدرے زیادہ ہے۔[1]"

ان حقائق پر تبصرہ کرتے ہوئے رپورٹ میں لکھا ہے!

"اس بات کا شبہ کیا جا سکتا ہے کہ آیا عورتوں کی

---

[1] *1951 Census of Pakistan*. Vol. I. p. 54. Karachi. n.d.

شرح اموات پر پردے کے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، خلیسی تناسب وباؤں اور قحط کے ایام میں بڑھتا دکھائی دیتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صنف نسواں ایسی آفتوں سے زیادہ متاثر ہوتی ہے[۱]۔"

غرضیکہ، پردہ اور تعددِ ازواج کے رسم و رواج نے صنف نسواں کی صحت اور زندگی کے نظامِ حیات کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ یہ رسم و رواج اور معاشری ادارے عورتوں کی صحت اور تندرستی کو برباد کر دیتے ہیں، انہیں بیماریوں اور وباؤں کا شکار بنا دیتے ہیں اور ان میں قدرتی آفتوں کی مدافعت کی قوت کو زائل کر دیتے ہیں مگر ان کے جسمانی اور صحت پر مضر اثرات سے زیادہ سنگین اور ہولناک اثرات لڑکیوں اور عورتوں کے ذہن اور کردار کے نشو نما پر پڑتے ہیں۔

پردہ سسٹم میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت

جدید مسلم معاشرہ افراط و تفریط میں مبتلا ہے۔ اس میں آج کل دو رجحان پائے جاتے ہیں: اول، روایتی قدامت پسندانہ رجحان اور دوم، جدید آزادی پسندانہ۔ پہلا رجحان صنف نسواں کو گھر سے باہر ہر طرح کی معاشری اور پبلک سرگرمیوں، کاموں اور دلچسپیوں میں حصے لینے سے منع کرتا ہے، آزادی نسواں اور تعلیم نسواں کو معطون اور ملعون قرار دیتا ہے اور پردے اور تعدد ازواج کو ختم کرنے اور ترک کرنے کی تمام تجاویز اور کوششوں کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ قرون وسطائی طرزِ فکر اور طرزِ معاشرت ہے جو زمانۂ جدید کے بدلتے ہوئے حالات کے باوجود قائم رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس کو جدید رجحان کا سخت مقابلہ ہے جو صنف نسواں کو ہر طرح کی معاشری سرگرمیوں، کاموں اور کھیلوں میں حصہ لینے کی حمایت اور اعانت کرتا ہے، خاص طور پر اُن کے لئے تعلیم اور ملازمت کی آزادی کو تسلیم کرتا ہے اور پردہ اور تعدد ازواج اور عورتوں کی گوشہ

---

[۱] *Ibid*. p. 55.

نشینی کے رسم و رواج اور اداروں کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ دو متضاد رجحانات کیوں پیدا ہوئے؟ عام نظریہ (تھیوری) یہ ہے کہ یہ تضاد دنیائے اسلامی میں یورپین تہذیب و تمدن غلبے سے شروع ہوا، اگر فرنگی تہذیب و تمدن کو یہ غلبہ اور اثر و رسوخ حاصل نہ ہوتا، تو اسلامی دنیا اپنی مخصوص تہذیب و تمدن کی یک رنگی کو محفوظ و مامون رکھتی اور حسب سابق جاری و ساری رہتی۔ مگر یہ نظریہ سطحی اور غیر حقیقی ہے مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ اتفاقی شے نہیں بلکہ اس کی تکمیلاتی ترقی کا نتیجہ ہے، جس نے مسلمانوں کے معاشرے میں عدم تکمیلی صورتحال پیدا کر دی، جو اُن کی تہذیب و تمدن کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ تاہم تکمیلات اور ترقی یورپ کی اجارہ داری نہیں اگر مسلمان اقوام بھی قرون وسطیٰ میں ابتدائی اور تخلیقی تکمیلات کا سلسلہ جاری رکھتے تو وہ بھی یورپ سے سبقت اور فوقیت لے جاتے۔ ان کا سلسلہ تب رک گیا جب عورتوں کے لئے تکمیلات کا دروازہ بند ہو گیا اور ان کے لئے تکمیلات کا دروازہ تبھی بند ہوتا ہے جب انہیں گھر سے باہر کی دنیا کے تجربات اور تعلیم و تربیت سے محروم کر دیا جائے۔ ہم نے پچھلے باب میں بیان کیا ہے کہ قرون وسطیٰ میں علماء کی اکثریت کیوں عورتوں کی تعلیم و تربیت اور تجربات کے مخالف تھی۔ وہی رویے اور نظریات زمانہ جدید میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی جہاں پادریانہ فتویٰ صادر کرتے ہیں۔

"لیڈر صاحبان کا حوالہ دیکر آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ اگر اسلامی تہذیب اسی چیز کا نام ہے جس کی پیروی یہ حضرات خود اور اُن کے اتباع میں مسلمان آج کل کر رہے ہیں۔ تو پھر اسلامی تہذیب اور یورپین تہذیب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پھر تو مسلمانوں کو وہ سب کچھ کرنا چاہیئے جو آج یورپ میں ہو رہا ہے لیکن اگر اسلامی تہذیب اس تہذیب کا نام ہے جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے سکھائی تھی تو آج کل کے میڈیکل کالجوں اور نرسنگ کی تربیت

گاہوں اور ہسپتالوں میں مسلمان لڑکیوں کو بھیجنے سے لاکھ درجہ بہتر یہ ہے کہ ان کو قبروں میں دفن کر دیا جائے۔ رائج الوقت گرلز کالجوں میں جا کر تعلیم حاصل کرنے اور پھر معلمات بننے کا معاملہ بھی اس سے کچھ بہت مختلف نہیں ہے۔[1]

آزادیٔ پاکستان سے پہلے پردہ سسٹم مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتا تھا۔ لڑکیوں کی بھاری اکثریت کے لئے تو ہر طرح کی تعلیم کے دروازے پوری طرح بند ہوتے تھے مگر جو معدودے چند لڑکیاں تھوڑی بہت تعلیم حاصل بھی کرتی تھیں وہ زیادہ تر پرائیویٹ طور پر گھروں میں ہی دی جاتی تھی۔ درحقیقت ساری دنیائے اسلام میں تعلیم نسواں کی سخت مخالفت تھی، اور جنوب ایشیائی برصغیر کے مسلمان بھی اس سے مستثنا نہیں تھے، مگر قیام پاکستان کے بعد جیسے اور مسلمان ممالک میں حالات بدلنے لگے پاکستان میں بھی اس زمرے میں کچھ تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ تعلیم نسواں کے خلاف پاکستان میں عموماً اور بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں خصوصاً پرانے تعصبات کچھ کچھ کم ہو رہے ہیں اور ہر سال زیادہ سے زیادہ لڑکیاں سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پا رہی ہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء کے دس سالوں میں لڑکیوں کی تعلیم میں ۱۹ء۹ فیصد اضافہ ہوا۔ اگر پردہ سسٹم کے تعصبات ممنوعات اور امتناعات نہ ہوتے تو یہ اضافہ اور بھی زیادہ ہوتا۔[2] اب بھی ایسے لاکھوں

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی "رسائل و مسائل" حصہ اول ص ۱۴۴ مولانا مودودی کی لڑکیوں کیلئے دعائے موت، پردہ ذہنیت کا عام ردعمل ہے، جس کی کئی مثالیں ہم نے اوپر درج کی ہیں۔

[2] محمود حسن کا مضمون "تعلیم اور مغربی پاکستان میں مقامی ادارے" (انگریزی میں) "پاکستان کوارٹرلی" (انگریزی کا سہ ماہی رسالہ) شمارہ نمبر ۳ (۴) ۱۹۶۶ء ص ۱۲۲ مصنفہ سلیمہ ہاشمی اپنی کتاب میں لکھتی ہیں کہ پردے کی وجہ سے استانیوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے" (ص ۱۳۲) اور گاؤں میں پردہ سسٹم تعلیم نسواں میں حائل ہوتا ہے۔ ص ۱۳۳ دیکھئے سلیمہ ہاشمی "مغربی پاکستان میں دیہاتی عورتوں کی تعلیم" (انگریزی میں) لائل پور - ۱۹۶۶ء۔

واقعات ہوتے ہیں جو لڑکیوں میں تعلیم و تکمیل کے محرکات کو بچپن اور کم سنی میں ہی کچل ڈالتے ہیں[1]۔

تعلیم نسواں: پیچیدہ معاملہ ہوتا ہے۔ تکمیلات کی ترغیب اور سمت بندی میں تعلیم کا مقام گھریلو ماحول اور خاندانی ترغیبات کے بعد دوسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے عورتوں کی تعلیم کی اہمیت مردوں کی تعلیم سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا تعلیم نسواں کو تعلیم مرداں کی طرح صرف اقتصادی نقطۂ نظر سے نہیں جانچنا چاہیئے، بلکہ اسے ان اخلاقی، کرداری اور ذہنی اور عقلی تغیرات اور اثرات کے لحاظ سے دیکھنا چاہیئے جو وہ اولاً تعلیم یافتہ لڑکیوں اور عورتوں میں پیدا کرتی ہے، ثانیاً ان کے رشتہ داروں میں لاتی ہے جو ان کے علم و ہنر سے مستفید اور متاثر ہوتے ہیں، ثالثاً ان بچوں میں پیدا کرتی ہے جو ان کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں اور رابعاً اس سارے معاشرے اور قوم میں پیدا کرتی ہے جو تعلیم یافتہ لڑکیوں اور عورتوں کی مثال، خدمات اور تکمیلات سے مستفید اور متاثر ہوتی ہے۔ مگر یہی وہ اثرات اور فوائد ہیں جن سے پردہ سسٹم کی پیدا کردہ غیر تعلیم یافتہ مسلم معاشرے کو محروم رکھتی ہے، گو مردوں نے کماحقہ تعلیم حاصل بھی کر لی ہو، کیونکہ صرف مردوں کی تعلیم یہ اثرات اور تغیرات نہیں پیدا کر سکتی۔

اس لحاظ سے ہمارے ملک میں تعلیم نسواں کی حالیہ ترقی نے ہماری قومی ترقی، پیش رفتگی اور خوشحالی پر کوئی خاطر خواہ اثرات نہیں پیدا کئے۔ اول تو پاکستان میں عورتوں کی تعلیم کی ترقی بہت قلیل پیمانے پر ہوئی ہے ۱۹۶۱ کی مردم شماری کے مطابق ہمارے ملک کی آبادی میں صرف ۹ فیصد لڑکیاں سکول جاتی ہیں۔ مگر جلد ہی ان کی بڑی تعداد سکول کی تعلیم کو ترک کرنا بھی شروع کر دیتی ہے۔ دسویں جماعت

---

[1] ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک کم سن بچی جب پہلے روز سکول سے بستہ اٹھائے گھر واپس آئی تو اس کے نابلجان نے بستہ اس کے ہاتھ سے لیکر چولھے میں پھینک کر جلا دیا۔ اس کے بعد لڑکی پھر کبھی سکول نہیں گئی۔ ایسے واقعات مسلمانوں کے گھروں میں ہر روز ہوتے رہتے ہیں، جو بچپن ہی سے لڑکیوں کے تکمیلی تحریکات اور ترغیبات کو شعوری یا غیر شعوری طور سے کچل دیتے ہیں۔

پاس کرنے تک شروع کی سولہ لڑکیوں میں سے صرف چودہ لڑکیاں تعلیم کے میدان میں رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد لڑکیوں اور عورتوں کا کالجوں اور یونیورسٹیوں تک تعلیم حاصل کرنے کی تعداد میں بہت زیادہ کمی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے ملک میں تعلیم نسواں کے نظام میں ایک بڑی خامی لڑکیوں اور عورتوں کے لئے پیشہ ورانہ اور صنعت و حرفت کی تعلیم و تربیت کا فقدان ہے۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے درجوں میں اوسطاً سو افراد میں صرف سات لڑکیاں اور عورتیں ہیں۔ ان پیشوں اور فنوں میں معلمی، طب وکالت، تجارت اور انجینئرنگ وغیرہ کی تعلیم و تربیت شامل ہوتی ہے۔ ان میں صرف معلمی کے پیشے کی تعلیم میں سات میں سے چار لڑکیاں ہوتی ہیں، باقی تین لڑکیاں باقی ماندہ سب پیشوں کی تعلیمی کلاسوں میں ہوتی ہیں۔ یہ تعداد بہت قلیل ہے بہر حال یہ خامیاں صرف پردہ سسٹم اور اس کے تعصبات اور امتناعات کے نتائج ہیں۔ ان میں تعدد ازدواج کی رسم بھی اپنا عجیب وغریب اثر دکھاتی ہے، کیونکہ دوسری شادی کے خواہشمند مرد عموماً ایسی لڑکیوں کے خواہاں ہوتے ہیں جو ابھی سکول، کالج یا یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہوں۔

ہمارے نظام تعلیم پر پردہ سسٹم کی آئیڈیالوجی چھائی ہوئی ہے۔ سکولوں اور کالجوں میں مخلوط تعلیم کا کم و بیش فقدان یا ممانعت ہے، جس کے باعث لڑکے اور لڑکیاں بچپن ہی سے سکولوں اور کالجوں میں پردہ سسٹم کی علیحدگیوں کے ماحول میں تعلیم پاتے ہیں۔ گھروں اور خاندانوں کی زندگی کی طرح تعلیمی اداروں میں بھی اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی میل جول اور ربط و ضبط اور حسن سلوک کے آداب اور اطوار اور طریقے نہیں سیکھ پاتے، بلکہ اپنی تعلیمی عمر میں بھی پردہ سسٹم کی پیدا کردہ عادات اور رویوں کا بھونڈا پن اجڈپن اور جنسی اضطراب اور بے راہ روی کا شکار رہتے ہیں۔ یہ عادات اور رویے لڑکوں میں بدتمیزی، قبیح فعلی، مردانہ احساس برتری اور زور و جبر کی عادات اور رجحانات میں ظاہر ہوتے ہیں اور دوسری طرف لڑکیوں میں علیحدگی پسندی، فرار گزینی، گھبراہٹ اور خوف اور احساس کمتری کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس ضمن میں پردہ سوسائٹی

کا ایک اور تضاد بھی عیاں ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں میں عموماً لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہیں، مگر وہاں بھی پردہ سسٹم کا ماحول طاری رہتا ہے۔ کلاسوں، لائبریریوں اور دوسری جگہوں میں لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ رہتے ہیں۔ ان کی آپس میں بات چیت بھی اکثر و بیشتر معیوب بلکہ منع کی جاتی ہے۔ ایک یونیورسٹی کے حکام نے تو یونیورسٹی کی حدود میں لڑکوں اور لڑکیوں کو سڑک کی الگ الگ طرف چلنے کا حکم دیا ہے۔[1] دراصل پردہ سوسائٹی میں کردار و اخلاق کی تعلیم و تربیت میں بھی اہل علم و دانش کے ذہنوں پر وہی خوف اور خدشے طاری رہتے ہیں جن کا پردہ سسٹم خود بھی پیدا دار ہے

علاوہ ازیں، ہمارے تعلیمی اداروں میں شروع ہی سے بچوں کے ذہنوں اور تخیلات میں پردہ آئیڈیالوجی کے اثرات ڈالے جاتے ہیں اور اس طرح اُن کے دماغوں میں پردہ سسٹم کے عقائد اور نظریات، رایوں اور رویوں کو دانستہ یا نادانستہ طور پر ثبت کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ذیل میں اردو کی آٹھویں جماعت کی کتاب کے ایک باب میں سے چند سطور کا مکالمہ درج کرتے ہیں جو اکبر الہ آبادی کے بارے میں ہے۔ اس مکالمے میں ایک باپ اپنے دو بیٹوں سے اکبر الہ آبادی کے بارے میں دریافت کر رہا ہے۔ ایک بیٹا جس کا نام انور ہے، باپ سے پوچھتا ہے:۔

انور میاں: "اباجان! آپ نے کہا تھا کہ اکبر عورتوں کے تعلیم اور بے پردگی کے خلاف بھی تھے۔ یہ باتیں انہوں نے اپنے شعروں میں کس طرح کہی ہیں؟"

اباجان: "شعر تو میں ابھی سنائے دیتا ہوں، لیکن پہلے تمہاری ایک غلط فہمی دُور کر دوں۔ اکبر عورتوں کی تعلیم کے خلاف نہیں تھے۔ وہ صرف اس بات کے خلاف تھے کہ عورت تعلیم حاصل کر کے اتنی آزاد نہ ہو جائے کہ گھر کی ذمہ داریوں کو بھلا دے۔ چنانچہ یہ بات انہوں نے اپنے ایک شعر میں بڑے صاف لفظوں میں کہی ہے۔ ان کا شعر ہے ؎

"دو اُسے شوہر و اولاد کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو"

---

[1] درحقیقت اس قسم کی علیحدگیاں پردہ سوسائٹی میں روا جا اور عموماً ہر طرف اور ہر جگہ پائی جاتی ہیں، مثلاً ریلوں اور بسوں میں، سینما گھروں اور پبلک جلسہ گاہوں میں، شادی بیاہ کی تقریبات اور ہر طرح کے پرائیویٹ اور پبلک انجمنوں اور اجتماعات میں۔

انور میاں: "اور ابا جان! پردے کے متعلق انھوں نے اپنے شعروں میں کیا کہا ہے؟"

ابا جان: "شعر تو بہت سے ہیں، مگر میں اس وقت تمہیں صرف دو ایسے شعر سناتا ہوں، جو بہت مشہور ہیں۔ وہ شعر یہ ہیں ؎

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

انور اور اختر آخری مصرعہ سنتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ انور میاں نے تو ہنستے ہنستے یہ مصرعہ دہرا بھی دیا ؏

کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ابا جان بھی اُن کے ساتھ ہنسنے لگے اور پھر بولے" اکبر نے اپنے زمانے کی زندگی کے متعلق اس طرح کی سینکڑوں باتیں کہی ہیں۔ وہ باتیں سننے میں تو ہنسی کی باتیں معلوم دیتی ہیں لیکن اُن میں بڑی سچائی ہے۔ اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ اکبر کی شاعری جنگ آزادی کے بعد کی زندگی اور حالات کا بڑا صحیح آئینہ ہے۔ اس آئینے کو دیکھ کر ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے شروع کا ہندوستان کس طرح مغربی سیاست اور مغربی تہذیب کی غلامی میں جکڑا ہوا تھا اور کس طرح وہ اپنے آپکو اس غلامی سے آزاد کرانے کی کوشش میں مصروف تھا۔"

انور میاں نے یہ باتیں سن کر کہا" پھر تو ابا جان، اکبر الٰہ آبادی بھی حالی اور اقبال کی طرح ہمارے قومی شاعر ہیں۔"

ابا جان: "ہاں بیٹے! اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے۔"[1]

اس طرح ہمارے تعلیمی نصاب بچوں اور طالب علموں کے دل و دماغ میں پڑھ

---

[1] اردو کی آٹھویں کتاب۔ حصہ دوم، ص ۱۸۷ تا ۱۸۹۔ ویسٹ پاکستان ٹیکسٹ بکس بورڈ۔ ۱۹۶۷ء اگرچہ اس اقتباس میں قوم کا لفظ بار بار استعمال ہوا مگر اس کے معنی نہ تو شاعر ہی سمجھا اور نہ ہی مصنف مکالمہ، مگر اس کا تجزیہ ہم بعد میں کریں گے۔

آئیڈیالوجی کے وہ عقائد، تصورات اور رویئے جاگزیں کردیتے ہیں جو وہ اپنی خاندانی زندگی اور گھریلو ماحول میں کبھی دیکھتے، سنتے اور حاصل کرتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ امر قابل ملحوظ ہے کہ ہماری نصابی کتابوں میں کبھی کوئی باہمت، سرگرم، محب وطن باعمل اور باتکمیل عورت کی زندگی اور سیرت کے احوال اور کوائف نہیں لکھے جاتے ہمیشہ مردوں اور لڑکوں کی زندگی اور سیرتوں اور کمالات کا ہی ذکر ہوتا ہے یہ تفریق بھی پردہ آئیڈیالوجی کا واضح ثبوت ہے۔ اسی طرح سوائے چند مغربی خواتین مثلاً فلارنس نائٹ انگیل اور ہلن کیلر کے علاوہ کسی باکمال عورت کا ذکر نہیں ہوتا یہ بھی بات قابل ذکر ہے کہ تعلیمی نصابوں میں کبھی کسی دیانتدار، محنت کش مگر خودنمائی سے پاک کسی غریب عورت کا بھی کوئی ذکر نہیں ہوتا جبکہ ہمارے ملک کے محنت کش طبقوں میں ایسی عورتوں کی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔

پردہ سوسائٹی میں لڑکیوں کے ذہن و کردار کی نشوونما

یہ وہ حالات، اثرات ماحول اور عوامل ہیں جو پردہ سوسائٹی میں گھر سے یونیورسٹی تک، ہر گاؤں سے شہروں تک، درسگاہوں سے دفتروں تک پائے جاتے ہیں۔ ان حالات اور ماحول میں مسلمان لڑکیاں پیدا ہوتی اور بڑی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا، پردہ سوسائٹی میں لڑکی کی پیدائش اس کے گھر اور کنبے والوں، خاص طور پر اس کے باپ پر بہت شاق گزرتی ہے وہ اسے باعث شرمندگی اور ندامت تصور کرتا ہے۔ اس لئے روز اول ہی سے اس کے اور باپ کے مابین ایسا نفسیاتی پردہ حائل ہوجاتا ہے جو دونوں کی دنیا الگ الگ بنا دیتا ہے۔ وہ بچپن ہی سے محسوس کرتی ہے کہ جب باپ گھر میں آتا ہے تو اس کی ماں اور گھر کی دوسری عورتوں پر خوف اور فرار کی حالت طاری ہوجاتی ہے۔ یہی کیفیت گھر کے دوسرے مرد اراکین، مثلاً چچا، بڑے بھائیوں وغیرہ کے اندر آنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ردعمل بتدریج پردہ دار گھر میں پلنے والی بچی کے دل و دماغ میں بھی باپ اور گھر کے دوسرے مردوں کا خوف اور

فرار کے احساسات اور جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ خوف و فرار کا ردِعمل سخت پردہ نشین کنبوں میں شدید تر ہوتا ہے۔ اس لئے ایسے کنبوں میں پلنے والی لڑکیوں میں باپ اور دوسرے مردوں سے خوف و دہشت کا ردِعمل بھی شدید تر ہوتا ہے۔
جب یہ بچیاں ذرا بڑی ہو کر اپنے ہمسائے اور محلوں میں گھومنے پھرنے لگتی ہیں۔ تو وہ وہاں بھی یہی پردے کی علیحدگیوں اور مردوں کے خوف و ہراس کا ماحول دیکھتی ہیں۔ شادی بیاہ اور غمی و خوشی کے دوسرے موقعوں پر بھی وہ عورتوں اور مردوں کی علیحدگی اور مردوں کا غلبہ اور خوف کا ماحول پاتی ہیں۔ اس لئے بچپن ہی سے پردہ دار لڑکیوں میں مردوں سے خوف اور گھبراہٹ کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں جو بالآخر اُن میں احساس کمتری، بزدلی، فرار اور ڈرپوکی کے رجحانات بن جاتے ہیں۔ پردہ نشین لڑکیوں میں یہ خوف اور گھبراہٹ کے رجحانات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ مرد سے دہشت کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے مسلمان عورت میں بزدلی اور خوف کا مادہ اتنا پایا جاتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ان کو لازم و ملزوم تصور کیا جاتا ہے۔ مگر یہ صرف پردہ سوسائٹی اور تمدن کی خصوصیت ہے۔ اسی وجہ سے اس برصغیر میں عورت کو بزدلی کا مجسمہ تصور کیا جاتا ہے اور مرد آپس میں ایک دوسرے کو بزدلی اور بے ہمتی کا طعنہ بھی عورت کا دیتے ہیں۔ بلکہ سیاسی ہنگاموں اور رقابتوں کے موقع پر سیاسی لوگ اور لیڈر جب کبھی اپنے حلیفوں کو اشتعال اور شرم دلانا چاہتے ہیں تو عورتوں کے سامان آرائش مثلاً مہندی، چوڑیوں وغیرہ کو، جو عورتوں کی مبینہ بزدلی کی علامت تصور کی جاتی ہیں۔ دوسروں کے پاس بھیجتے ہیں۔ مگر صرف مسلمان پردہ دار عورتیں ہی بزدل، ڈرپوک اور بے ہمت اور بے جرأت ہوتی ہیں۔ غیر پردہ اقوام کی عورتوں میں خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، یہ کمزوری نہیں پائی جاتی۔ یہ یاد رہے کہ عورتوں میں مردوں کے خوف اور دہشت کی جذبات قرا ابتدارانہ پدر سرداری معاشرے کے قیام و دوام کے لئے ضروری شرط ہے۔

مگر جنسی علیحدگیوں کے علاوہ ایک اور علیحدگی بھی پردہ سوسائٹی پر مسلط ہوتی ہے۔ چونکہ یہ سوسائٹی حقیقتاً قرابتداری معاشرہ ہوتی ہے اس لئے اس میں مرد و عورت کی علیحدگیوں میں قرابتدارانہ گروہ بندی بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں ہر ذات اور برادری خیل اور قبیلے کے رسم و رواج اور رہن سہن کے طور و طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا خوشی اور غمی کے موقعوں اور تقریبوں میں مختلف ذاتوں برادریوں، خیلوں اور قبیلوں کے لوگوں میں آزادانہ میل ملاپ اور ارتباط و اختلاط نہیں پائے جاتے، بلکہ علیحدگی اور گروہ بندی کی ایسی دیواریں اور پردے حائل ہوتے ہیں جو ہر ذات اور برادری خیل اور قبیلے کو دوسرے سے الگ اور دور رکھتے ہیں ہر ذات، برادری اور قبیلہ شادی بیاہ اور دوسرے معاملات اور تعلقات کے لحاظ سے الگ رہتا ہے۔ ان رسوم و رواج کے باعث بچے اور بچیاں اپنے محلوں اور گاؤں میں اپنے ہمسایوں اور ہم شہریوں سے الگ تھلگ رہتی ہیں اور اپنی عمر زیادہ تر اپنے ہی خاندانی اور قرابتی گروہ میں گزارتی ہیں۔ صوبہ سرحد میں پٹھانوں کے بارے میں دو پاکستانی محققین لکھتے ہیں:۔

"ایک افغان خاندان کی نوجوان لڑکی دوسرے افغان خاندان کی شادی بیاہ کی تقریبات میں شرکت کر سکتی ہے مگر اُسے اعوانوں کے شادی بیاہ کی تقریب میں شرکت کو سختی سے منع کیا جاتا ہے۔[۱]

اسی طرح ڈاکٹر فریڈرک بارتھ سوات کے پٹھان قرابتداری معاشرے کے متعلق لکھتا ہے:

"ایسے لوگوں کی تقریبات کا کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی جو ذات پات اور رشتہ داری کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔[۲]

ڈاکٹر ایگلر پنجاب کے دیہات کے بارے میں لکھتی ہے:

---

۱ ؎

۲ ؎ [F]redrik Barth, *Political Leadership among Swat Pathans*, p. 54-55 [P]ress, London. 1959.

"قرابتی گروہ میں اور گہرے دوستوں میں ورتن بھاجی کی رسم پوری طرح قائم ہوتی ہے، جو تحفہ تحائف کا تبادلہ اور رسم ورواج اور دوسری تقریبات میں شمولیت پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس قرابتی گروہ جو ہر کنبے کا ایسے معاشری دائرے پر مشتمل ہوتا ہے جس میں یہ کنبہ دوسرے کنبوں سے رسمی تحفے تحائف لیتا دیتا اور ہر تقریب اور رسم میں شامل ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے رشتے داروں سے ایسے رسم ورواج اور تحفہ تحائف میں شریک نہیں ہوتا قطعی الگ تھلگ کر دیا جاتا ہے[1]۔"

یہ صورت حال گاؤنوں اور قصبوں میں پائی جاتی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں امیر طبقوں میں ذات پات اور برادری کے تعلقات بہت کمزور بلکہ مفقود ہو رہے ہیں ان ماڈرن طبقوں میں عورتیں اور لڑکیاں قرابتدارانہ بندشوں اور گروہ بندیوں سے کم وبیش آزاد ہوتی ہیں۔ مگر ملک و قوم میں ان تعداد بہت کم ہے اور ان میں قرابتداری بندشیں کبھی قطعی مفقود نہیں ہوتیں۔ امیر اور متوسط طبقوں کی لڑکیاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتی ہیں۔ جہاں پردہ اور قرابتداری نظام کی پابندیاں بھی کمزور ہو رہی ہیں مگر تاحال مفقود نہیں ہوئی ہیں۔

پس پاکستانی معاشرے میں موجودہ دور میں کم عمر کی لڑکیوں کی زندگیوں میں تین طرح کی حالتیں پائی جاتی ہیں۔ جو لڑکیاں سکول کی تعلیم حاصل ہی نہیں کرتیں یا سکول کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم ترک کر کے گھر میں بیٹھ جاتی ہیں یا بٹھا دی جاتی ہیں، وہ پرانی روایات اور رسوم ورواج میں پرانے وقتوں کی طرح جکڑی ہوئی ہیں۔ ان لڑکیوں کی آج بھی بھاری اکثریت ہے۔ دوسری قسم ان لڑکیوں کی ہے جو سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتی ہیں، مگر روایتی معاشرے کی پابندیوں کی بھی تابع ہیں، پردہ سختی سے کرتی ہیں اور قرابتداری تعلقات اور رواج کی بھی

---

[1] Dr. Zekiye Eglar, *A Punjabi Village in Pakistan* p. 21

پابند ہوتی ہیں۔ ان لڑکیوں کے لئے پردہ کی پابندیاں تعلیم و ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے۔[1] تیسرے گروہ کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرتی ہیں۔ پردے کی پابندیوں سے بھی آزاد ہیں اور قرابتداری تعلقات کی بھی روادار نہیں ہوتیں۔ ان کی تعداد بہت کم اور ان کا اثر و رسوخ بہت محدود ہے کیونکہ ان میں زیادہ تعداد نہایت امیرانہ طبقوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ لہٰذا ان کا پردے کو ترک کرنا اور قرابتداری بندشوں سے آزاد ہونا ملک و قوم کی بیشتر آبادی کے لئے کوئی قابل تقلید مثال نہیں ہوتی۔

لہٰذا پاکستانی لڑکی ابھی بھی پردہ اور قرابتداری تعلقات کی پابند ہے اور یہ پابندی جغرافیائی لحاظ سے دیہات اور قصبات میں قدیم روایتی معاشرے کی طرز کی ہوتی ہے۔ اور طبقاتی لحاظ سے کم امیر اور متوسط اور ادنیٰ طبقوں میں زیادہ سختی سے پائی جاتی ہے جن کی شہروں اور دیہاتی علاقوں میں آبادی بہت زیادہ ہوتی ہے اس لئے مجموعی طور پر پاکستان میں نوعمر لڑکیاں آج بھی نہایت محدود زندگی بسر کرتی ہیں، جس کا دائرہ زیادہ تر گھر اور ہمسایہ اور محلہ تک محدود ہوتا ہے، جہاں پردے اور قرابتداری نظام کا عمل دخل بہت زیادہ روایتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس دائرے میں وہی خاندانی زندگی کے خوف اور خدشات کا اثر و رسوخ ہوتا ہے۔ مردوں کی بالادستی ہے۔ عورتوں کے لئے قید و بند ہے۔ اور لڑکوں کی فوقیت پائی جاتی ہے۔ اس لئے ایسی لڑکی کو جو ابھی دس بارہ سال کی نہیں ہوئی، صرف اپنے گھر اور قرابتداروں کے ہاں گھومنے پھرنے کی آزادی ہوتی ہے ان حالات میں پاکستان اور تمام ایسے مسلم ممالک میں جن میں ایسا روایتی قرابتداری معاشرہ آج تک قائم ہے نوعمر لڑکیوں کی عادات انہی خوف اور فرار گزینی، خود بینی اور داخلیت پسندی پر مبنی ہوتی ہیں جو انہوں نے اپنے گھروں اور کنبوں میں بچپن سے سیکھی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اب ان میں اپنے قرابتی گروہ، ذات اور برادری اور قبیلہ وغیرہ کی علیحدگی

---

[1] ۱۹۷۴ء کے انٹرمیڈیٹ کے پری میڈیکل گروپ کے امتحان میں طالبات میں اول آنے والی لڑکی کی رائے ہے کہ "پردہ انسانی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔" دیکھئے روزنامہ جنگ "راولپنڈی" مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۷۴ء۔

پسندی کی زندگی کے باعث اپنے خاندان اور ذات یا قبیلے کی عصبیت غرور اور گھمنڈ بھی پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے، خاص طور پر اُن خاندانوں اور قرابتی گروہوں میں جو اپنے مقام اور علاقے میں بارسوخ اور باوقار حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ امیر اور متوسط طبقوں کے خاندانوں اور گروہوں کو اکثر و بیشتر حاصل ہوتی ہے۔

پردہ دار لڑکی کی اس عمر میں گھر اور زنانخانے کی زندگی کا ایک نیا اثر بھی شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اس گھریلو زندگی کے تنازعوں اور جھگڑوں اور اس کی بنیادی کاہلی اور بے عملی کے اثرات ہیں۔ اب گھر میں اس کی ماں اور باپ کے جھگڑے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ اب اس کا باپ اپنی ماں باپ بہنوں اور دوسرے رشتہ داروں کے ورغلانے اور اکسانے پر اپنی بیوی کو زیادہ تنگ کرنا شروع کر دیتا ہے اپنی طبیعت یا فضول خرچی کے باعث روپے پیسوں سے بھی تنگ دست رہتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ وہ اب دوسری شادی کا بھی سوچ رہا ہو یا دوسری بیوی گھر میں لا بھی چکا ہو۔ ان حالات میں گھریلو جھگڑوں میں پہلے کی نسبت زیادہ شدت اور کثرت ہو جاتی ہے۔ ان حالات کا نوعمر لڑکیوں کے ذہن و کردار پر شدید اثرات ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں، پردہ دار گھر اور زنانخانہ میں کاہلی سستی، بے کاری اور لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا ماحول ہوتا ہے۔ ان میں رہنے والیاں معاشرتاً الگ تھلگ رہتی ہیں۔ انہیں گھر سے باہر کی دنیا کے ذوق و شوق، سرگرمیوں اور کاموں اور کارناموں سے کوئی واسطہ، کوئی دلچسپی اور ترغیب نہیں ہوتی۔ اُن کے روزمرہ کے کام اور فرائض سرانجام دینے کے بعد ان پر کوئی نئی ذمہ داری اور کوئی نئے شوق اور نئی دلچسپیاں اور نئے محرکات نہیں نصیب ہوتے۔ لہٰذا انہی روزمرہ کی زندگی کا بیشتر حصہ گھریلو جھگڑوں، تنازعوں میں یا فضول باتوں اور رسم و رواج میں ضائع کرتی ہیں اول تو گھر کی صفائی اور ستھرائی کا کام نوکر اور نوکرانیوں کے ذمہ ڈال دیتی ہیں،

ورنہ یہ کام بھی بہت واجبی اور مجبوری میں سرانجام دیتی ہیں۔ لہٰذا اسلمانوں کے گھروں میں ہمیشہ گندگی، بے ترتیبی، بدسلیقگی اور بداطواری پائی جاتی ہیں۔ اُن کے ہاں کھانے پینے کے برتن گندے اور جوٹھے پڑے رہتے ہیں، فرنیچر میلا کچیلا اور بے ڈھنگ پڑا ہوتا ہے، کپڑے میلے اور الٹ پلٹ رکھے رہتے ہیں۔ غرضیکہ گھر کا سارا ماحول سستی کاہلی اور لاپروائی کا نمونہ بنا ہوتا ہے۔ اگر کچھ صفائی اور ستھرائی نظر آتی ہے تو وہ اکثر و بیشتر نوکروں اور نوکرانیوں کی وجہ سے۔ ورنہ گھر کی مالکہ اور دوسری عورتیں تو بلیٹھی اپنے جھگڑوں اور تنازعوں یا اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی گپ شپ میں مشغول رہتی ہیں۔[1]

ڈاکٹر ذکیہ انگلیہ پنجاب کے دیہات کے گھروں میں گندگی کے متعلق لکھتی ہے۔

---

[1] ایک دو نسلوں پہلے حیدر آباد دکھن کے پردہ نشین گھرانے کا نقشہ ایک انگریز عورت ذاتی مشاہدے کی بنا پر یوں بیان کرتی ہے: "صبح کے تقریباً آٹھ بجے گھر کی مالکہ شب خوابی سے بیدار ہو کر اس وقت انگڑائی لیتی ہے جب زرخرید ملازمہ (یعنی کنیز یا اصیل) آہستہ سے کہتی ہے "کیا بیگم صاحبہ نہیں اٹھیں گی" تب بیگم خراماں خراماں بستر سے باہر آتی ہے اور اپنی غلام خادمہ کو اپنے دانتوں کو مسواک کرنے اور منہ ہاتھ دھونے کی اجازت دیتی ہے اس کے بعد وہ قالین پر بیٹھ جاتی ہے اور بال سنوارنے کا حکم دیتی ہے۔ اس اثنا میں دوسری غلام خادمائیں اس کے صبح کے کپڑے بدلتی ہیں جلد ہی گھر کی دوسری خواتین بھی اس کے پاس آجاتی ہیں۔ وہ سب بیٹھ کر پان چباتی ہیں اور گپ شپ کرتی ہیں حتیٰ کہ دن کے دس بج جاتے ہیں تب ایک بڑی سینی میں ناشتہ لایا جاتا ہے جس میں چاول قورمہ اور مٹھائی ہوتی ہے ناشتے کے بعد اور سہیلیاں اور رشتہ دار عورتیں آجاتی ہیں اور سینے پرونے والی عورتیں اور زیادہ اونچی ملازمائیں آموجود ہوتی ہیں اور سب آپس میں باتیں کرتی اور ہنستی ہنساتی رہتی ہیں۔ دوپہر کو ریشمی کپڑوں کے بزاز اپنے تھان اور جوہری اپنے زیورات وغیرہ اپنی عورتیں کے ہاتھوں زنانخانے میں بھیجتے ہیں یہ سوداگروں کی عورتیں بہت باتونی اور گپی ہوتی ہیں اور ہر طرح کی خبر بیگمات کو سناتی ہیں مثلاً کسی کی منگنی ہوئی، کس کی شادی ہوئی اور کیا کیا تحفے اور جہیز دیا گیا وغیرہ وغیرہ یہ عورتیں سودا سلف کرتی اور قیمتوں پر کمی بیشی کرتی ہیں، کچھ خریدتی ہیں اور کچھ نہیں اور جب سوداگر چلے جاتے ہیں تو پھر کھانے کا وقت آجاتا ہے۔ شام کو غروب کے وقت صاحب خانہ یا اس کا بیٹا زنانخانے میں آتا ہے اور بیگم کو باہر کی دنیا کی خبریں سناتا ہے اور رات کو سونے کا وقت پھر آجاتا ہے۔" (الزبتھ کوپر "حرم اور پردہ" (انگریزی میں) ص ۱۷۰، لندن ۱۹۱۵ء)

"مسلن، یعنی کمین کی بیوی، گاؤں میں صفائی میں مصروف ہوتی ہے۔ وہ اپنے بڑے سے جھاڑوں کو ہاتھ میں لئے گھروں میں جاتی ہے وہاں وہ صحن میں ہر طرف چوسی ہوئی گنڈیریاں، سبزی ترکاری کے چھیلے ہوئے چھلکے، مکئی کی گلیاں، اور ہر طرح کے کوڑے کرکٹ کو جو لوگ دن بھر لاپرواہی سے اِدھر اُدھر پھینکتے رہتے ہیں، صاف کرتی ہے[۱]"

دو سوشل ورکرز پشاور شہر کے گھروں کے اندر کے حالات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ان دنوں میں جب سوشل ورکرز اپنے مریضوں کے گھروں میں جاتی ہیں وہ کمروں کی صفائی، برتنوں اور کپڑوں کے دھونے میں مدد کرتی ہیں سوشل ورکرز کے گروہ کی لیڈر نے کہا کہ ہمارا ملک اس لئے غریب ہے کہ ہماری مستورات اپنی غربت کا بہانہ بنا کر نہ صرف اپنی آمدن کی حد میں نہیں رہتیں بلکہ اپنے اردگرد کی چیزوں کو بھی صاف ستھرا نہیں رکھتیں[۲]"

انڈین سوشیالوجسٹ، ڈاکٹر جعفر حسن موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے گھروں کی حالت کا خاکہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"ہمارا پھوہڑ پن، ہماری بدسلیقگی اور ہماری گندگی ہماری غربت کا نتیجہ (نتیجہ) نہیں ہماری غربت کا سبب ہیں۔ اچھے اچھے کھاتے پیتے بلکہ امیر گھرانوں اور محلوں میں دیکھئے وہاں بھی دعوت کے موقعے پر بن دھلے گلاس رکھے ہوئے ہیں۔ دستر خوان گندا ہے۔ کباب یا میٹھے میں چیونٹے لپٹے ہوئے۔ چار یا پانچسو مدعو شدہ اور تین چار سو متوقع

---

[۱] دیکھیے ایگلر "پاکستان میں ایک پنجابی گاؤں" ص ۵۸۔ (انگریزی میں)

[۲] جہانگیر خان اور ایس ایم اعوان "سوشل ورک میں ایک تجربہ" (انگریزی میں) ص ۵۴۔۵۵ ویسٹ پاکستان اکیڈمی برائے دیہی ترقیات، پشاور۔ ۱۹۶۸ء

مہمانوں کے لئے دو ڈھائی سو نشستوں کا انتظام، جس کی وجہ سے لازمی طور پر نمودار ہونے والا میوزیکل چیئرز کا کھیل، ایک مہمان اٹھا کہ اس کی جگہ پر قبضہ کرنے کے لئے تین چار لپکنے کا نظارہ۔ جہاں گانا ہو رہا ہے اس کے قریب نوکروں اور ملازموں کی باتیں ہو رہی ہیں۔[1]

چند سال ہوئے کراچی میں گھروں کی حالت کے متعلق سروے نے مندرجہ ذیل حالات ظاہر کیے:۔

"اس سروے کے بعد میں یہ اندازہ کر سکی ہوں کہ ہماری گھریلو خواتین اوسطاً دن کا نصف حصّہ بالکل کوئی عملی کام نہیں کرتیں۔ پڑھی لکھی خواتین عام قسم کے رسالے یا اخبار پڑھنے میں تھوڑا بہت وقت صرف کرتی ہیں۔ لیکن وہ زیادہ دیر بیٹھ کر مطالعہ کرنے کی عادت نہیں رکھتیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ گھر پر رہنے والی عورتیں صفائی اور کھانے پکانے میں جتنا وقت لگاتی ہیں وہ اصل کام کے تقاضوں سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جس روز کسی تقریب میں جانے یا فلم دیکھنے کے لئے انہیں عجلت ہو تو وہی کام جو عام طور سے وہ تین گھنٹوں میں ختم کرتی ہیں اس کے نصف وقت میں تمام کر لیتی ہیں۔ دراصل وہ شعوری طور پر کام کو پھیلا کر کرنے کی کوشش کرتی ہیں تاکہ اپنے آپ کو زیادہ مصروف رکھا جا سکے۔ اگر وہ گھر کا پورا کام اپنی صلاحیت اور مستعدی کے مطابق کریں تو دن کا صرف چوتھائی حصہ اس کے لئے کافی ہے اور باقی آٹھ گھنٹوں میں انہیں کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

غیر تعلیم یافتہ خواتین فرصت کے یہ طویل اوقات محض اِدھر اُدھر کی باتوں میں گزارتی ہیں۔۔۔ جن خواتین کا وقت مطالعہ میں بسر ہوتا

---

[1] ڈاکٹر جعفر حسن: "ہندوستانی سماجیات" ص ۹۲

ہے ان کی اکثریت رومانی اور جاسوسی ناولوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ جیسا کہ یونسکو کی طرف سے پاکستانی خواتین کی مطالیاتی پسند کے وسیع جائزہ سے معلوم ہوا۔ یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ خواتین طویل ناول پڑھنا پسند کرتی ہیں.... تاکہ وہ زیادہ وقت اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف رکھ سکیں۔

پاکستان کی گھریلو زندگی گزارنے والی خواتین میں ننانوے فیصد سے زیادہ کسی کھیل میں حصہ نہیں لیتیں۔ میں جن خواتین سے ملی ہوں ان میں سے ایک بھی کسی کھیل کی شائق نہیں تھی۔

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ طویل وقت فراغت کے ساتھ گزارنے کے باوجود بہت کم خواتین یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوئیں کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بے کاری میں گزرتا ہے۔ بیشتر اس بات پر مصر تھیں کہ وہ بہت مصروف زندگی گزار رہی ہیں۔ اور مصروفیات سے اُن کی مراد عام طور پر سے یہی تھی کہ دن بھر بچوں کے شور میں وقت گزرتا ہے۔ ان کے ساتھ سر کھپانے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔ برتن دھونے کپڑے دھونے اور کھانے پکانے میں اتنا وقت لگ جاتا ہے کہ ایک پل بھی فراغت نصیب نہیں ہوتی۔ یہ بات ایسی خواتین نے بھی دوسرے انداز میں کہی جن کے ہاں نہ کوئی بچہ تھا اور نہ ہی ان کے گھر میں دو آدمیوں کی غذا تیار کرنے سے زیادہ کوئی کام تھا۔[۱]

کراچی شہر کے گھروں کا ایک اور سروے یہ بتاتا ہے:

"اس سروے سے اندازہ ہوا کہ مجموعی طور پر ساٹھ فیصد خواتین اپنی پوری توجہ اپنے ڈرائینگ روم پر صرف کرتی ہیں۔ باقی گھر میں

۱۔ اخبار خواتین "خواتین کی زندگی کا بیشتر حصہ بے کاری میں گزرتا ہے۔ از مسز راشدہ بٹ ص ۲۳ اور ۳۸ کراچی۔ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۷۷ء

چاہے چوہے دوڑتے رہیں، انہیں پرواہ نہیں ہوتی۔ صرف بیس فیصد خواتین ایسی ہیں جو گھر کے ہر حصے پر یکساں توجہ دیتی ہیں اور صفائی کا خیال رکھتی ہیں۔ بہت کم خواتین غسل خانے، باورچی خانے اور پچھلے صحن یا سٹور کی سجاوٹ پر توجہ دیتی ہیں۔ بیڈروم پر بھی اسی صورت میں توجہ دی جاتی ہے۔ جب یہ کمرہ استعمال میں زیادہ ہو اور ڈرائینگ روم کی جگہ استعمال میں آتا ہو[۱]"

ان حالات سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان عورتیں اپنی زنانخانے اور برقع اور پردے کی پابندیوں میں کام اور زندگی کے بارے میں غیر تکمیلی عادات اور رویے حاصل کر لیتی ہیں وہ اتنی سست الوجود اور کاہل ہوتی ہیں کہ اپنے گھروں کو بھی صاف ستھرا اور سلیقے سے نہیں رکھ سکتیں۔ وہ اپنے کپڑے اور ملبوسات بھی سی نہیں سکتیں اس لئے بازار کے "لیڈیز ٹیلرز" کا سہارا لیتی ہیں۔ اُن کی عادات اتنی ہی نکمی اور فروعی نوعیت کی ہوتی ہیں، جیسا کہ اُن کے گپ شپ اور مطالعے اور لٹریچر کے شوق سے ظاہر ہے۔ وہ اپنے گھر کے کاموں اور معاملات کو منظم کرنے اور خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی اہلیت اور صلاحیت بھی نہیں رکھتیں۔ اسی لئے پردہ دار گھر بدنظمی اور افراتفری کے گہوارے ہوتے ہیں جہاں نہ کوئی چیز قرینے اور سلیقے سے رکھی ہوتی ہے نہ کوئی کام اور معاملہ خوش اسلوبی سے نپٹایا جاتا ہے اور نہ کوئی اعلیٰ مقصد حیات پر کوئی غور و فکر کرنے یا تکمیل کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ کوئی روزمرہ کے فرائض اور ذمہ داریوں کو بھی پورا کرنے کا نہیں سوچتا ہے۔ البتہ ان گھروں میں ہر وقت جھگڑے اور چپقلشوں کا بازار گرم رہتا ہے جو کہ زیادہ تر صاحب خانہ کے ظلم و زیادتیوں اور بسا اوقات اپنی عورتوں پر فضیلت جتانے کی کوششوں سے اُن کی مارپیٹ اور بعض اوقات دوسری شادی کی تمناؤں کے باعث واقع ہوتی ہیں اس غیر انسانی اور ناروا سلوک اور حالات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان عورتیں ہمت اور خود اعتمادی، پہل اور خود اعتباری کی صلاحیتوں اور خوبیوں سے عاری ہوتی ہیں

---

[۱] اخبار خواتین کراچی ص ۳۸۔ مورخہ ۲۸ اکتوبر ۳ نومبر ۱۹۶۷ء۔

وہ ہر طرح کے ظلم و زیادتیوں اور ناانصافیوں کے آگے خاموشی اور عاجزی سے جھک جاتی ہیں جو اُن کے شوہر اور گھر کے دوسرے مرد بلکہ عورتیں مثلاً ساس بھی اُن پر روا رکھتے ہیں[1]۔ اُن میں نہ اتنی جرأت اور نہ اتنی شدید ہوتی ہے کہ ان ظلم اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائیں اور اصلاحِ احوال کی کوشش کریں۔ اس کے باوجود ظلم اور ناانصافیاں سہتے سہتے اُن میں درشتی اور بدمزاجی جیسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اُن کو اور زیادہ نااہل اور نکما بنا دیتی ہیں۔ غرضیکہ پردہ دار عورتیں ایک بدی کے چکر میں پھنسی ہوتی ہیں اور روز بروز ان کی کام اور تکمیل کی قوتیں اور صلاحیتیں خراب سے خراب تر اور کم سے کمتر ہوتی جاتی ہیں۔

تقریباً پچاس سال ہوئے مولانا عبدالحلیم شرر نے پردہ سسٹم کا تجزیہ کرتے ہوئے "پردے سے عورتوں میں کیا کیا عیب ہیں" کے بارے میں لکھا:

"ایک صاحب پوچھتے ہیں عورتیں سخت مزاج، بلند آواز، نافرمان، بدتمیز، بے ادب، پھوہڑ اور لاپروا کیوں ہوتی ہیں؟ اس کا جواب اگر وہ ذرا غور کرتے تو خود ہی معلوم ہو جاتا اور انہیں کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہ لاحق ہوتی۔ ان تمام خرابیوں اور عیبوں کا سبب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ عورتیں پردے میں رکھی جاتی ہیں۔ کچھ مذکورہ بالا برائیوں پر منحصر نہیں۔ عورتوں میں ان سے بھی زیادہ سخت بھونڈے اور بدنما عیوب اسی پردے کی بدولت پیدا ہو جاتے ہیں۔ پردے میں بند کرنے سے عورتیں کیاد اور فریبی ہو جاتی ہیں۔ پردے کی بدولت اُن میں یہ اخلاقی مرض پیدا ہو جاتا ہے کہ عیب کو چھپا کر کریں۔

---

[1] مولانا محمد ادریس انصاری "مسلمان بیوی کو میاں بیوی کی زندگی گزارنے کے طریقے" کے بارے میں دو ابتدائی نصیحتیں کرتے ہیں: "(۱) جہاں تک ہو سکے میاں کا دل ہاتھ میں لیے رہو اور اس کی آنکھ کے اشارے پر چلا کرو۔ مثلاً اگر وہ حکم دے کہ رات بھر ہاتھ باندھے کھڑی رہا کرو تو دنیا اور آخرت کی بھلائی اسی میں ہے کہ دنیا کی تھوڑی سی تکلیف گوارا کر کے آخرت کی بھلائی اور سرخروئی حاصل کرو۔ (۲) کسی وقت کوئی بات ایسی نہ کرو جو اس کے مزاج کے خلاف ہو۔ مثلاً اگر وہ دن کو رات بتلائے تو تم بھی دن کو رات کہنے لگو۔" دیکھیے "مسلمان بیوی" ص ۲۲۔ دارالاشاعت۔ کراچی۔ ۱۹۷۳۔

ناتجربہ کاری وسادگی کی وجہ سے اپنی ضعیف الاعتقادی کی غلطیوں کو شوہر کی آنکھ بچا کے مبتلا ہوں اور نقصان اٹھائیں۔ یہ اور اسی قسم کے صدہا عیوب عورتوں میں صرف پردے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں اور جب تک یہ منحوس پردہ باقی ہے نہ مٹ سکیں گے۔

"بدتمیزی بھی پردے ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ پردے میں کسی قسم کی سوسائٹی نہیں قائم ہوسکتی۔ مرد درکنار عورتیں عورتوں سے بھی نہیں مل سکتیں سوا برادری کی چند گنتی کی عورتوں کے انہیں کسی سے ملنے جلنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔ پھر بھلا ان میں برے بھلے اور نیک و بد میں امتیاز کرنے کی لیاقت پیدا ہو تو کیونکر۔ وہ مورکھ نادان ہیں جیسا کہ تم اپنی سیہ کاریوں میں آزادی حاصل کرنے کے لئے انہیں بنانا چاہتے ہو......

"پھوہڑ بھی عورتیں اسی پردے میں بیٹھنے کی وجہ سے ہیں اُن غریبوں کو کسی علم وفن کے سیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جو خاص اُن کے ضروری کام ہیں مثلاً پکانا، ابندھنا، سینا پرونا، ان کی تعلیم بھی اس قدر بے اصولی پن سے اور ناقص طریقے سے ہوتی ہے کہ جاننا نہ جاننے سے بدتر ہوتا ہے۔ پھر خدا ہی نے کہا ہے کہ وہ پھوہڑ ہوں گی۔

"رہ گئی لاپروائی۔ وہ اس لئے پیدا ہو جاتی ہے کہ گھر میں بند رہتے رہتے، زندگی کو بیکار صرف کرتے کرتے اور میاں کی آزادیوں سے اکتاتے اکتاتے اُن میں ایک قسم کی مایوسی پیدا ہو جاتی ہے جس کا لازمہ ہے لاپروائی۔ جب انسان مایوس ہو جاتا ہے تو پھر اُسے کسی بات اور کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی۔

"الغرض ثابت ہو گیا کہ عورتیں ان عیوب میں صرف پردہ کی وجہ سے مبتلا ہیں جس کا الزام عورتوں کے سر

نہیں خود مردوں کے سر ہے [1]۔"

ایک اور خرابی یعنی "پردے والی عورتیں اجلی نہیں رہتیں" کا تجزیہ مولانا عبدالحلیم شرر نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا:۔

"کپڑوں کے صاف رکھنے اور کثرت سے نہلانے دھونے کی ضرورت اسی حالت میں محسوس ہو سکتی ہے جب انسان باہر کی آمد و رفت کرے ہم جنسوں کی مختلف صحبتوں میں شریک ہو۔ دوسروں کی صفائی اور ان کے ستھرے پن کو دیکھے۔ اور یہ ضرورت اس کو نمایاں طور پر نظر آئے کہ صفائی اور طہارت کی کس قدر ضرورت ہے جب تک یہ باتیں نہ ہوں ممکن نہیں کہ کسی کا خیال صفائی کی جانب مصروف ہو۔ سوسائٹی ہی وہ چیز ہے جس میں ان کو لباس کی درستی و اصلاح، صفائی و پاکیزگی اور طہارت، نفاست کا سبق باہم ایک کو دوسرے سے ملتا ہے۔ مگر جس گروہ میں سوسائٹی ہی نہ ہو اسے اس بات کی ہرگز امید نہ رکھنی چاہیے۔ کہ اس کے ارکان ان امور میں کبھی کامیابی حاصل کر سکیں گے جن کی تعلیم صرف سوسائٹی میں ہی ہوتی ہے پھر جب پردہ کی وجہ سے عورتوں کو سوا چند عزیزداروں کے گھروں کے کسی عام زنانی سوسائٹی میں بھی آمد و رفت کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تو ان سے اس بات کی امید رکھنا کہ وہ صفائی سے رہیں اور میلے کپڑوں میں نہ رہیں امید موہوم ہے [2]۔"

گھروں کے ان حالات اور ایسے ماحول میں پردہ دار لڑکی سن بلوغت کو پہنچتی ہے اب وہ عورت بننے لگتی ہے۔ عمر کا یہ دور ہر معاشرے میں ہر ایک لڑکی کے لئے نہایت نازک دور ہوتا ہے۔ مگر پردہ سوسائٹی میں یہ تغیر دوچند نازک ہو جاتا ہے، کیوں کہ عمر کے اس دور میں لڑکی کو پردے میں بیٹھا دیا جاتا ہے۔ اس پر گھر سے باہر نکلنے

---

[1] ۔ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی "پردہ" صفحات ۴۴، تا ۴۸، جامعہ ملیہ دہلی۔ تاریخ ندارد۔

[2] ایضاً ص ۷۸، تا ۷۹۔

کی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔ اب وہ تھوڑے بہت باہر نکلنے کی آزادی جو پہلے اسے میسر تھی قطعی ختم ہو جاتی ہے۔ اس عمر میں بیشتر لڑکیاں سکول سے بھی اٹھالی جاتی ہیں۔ اور گھر بٹھالی جاتی ہیں۔ اس طرح ان کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اب لڑکی کی زندگی زنانخانے تک محدود ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جب مسلمان لڑکیاں جوانی میں قدم رکھتی ہیں تو ان میں وہ سب عادات اور رائے، رجحانات اور نظریات پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کی ماؤں اور دوسری بزرگ عورتوں میں پائے جاتے تھے۔ وہ انکی طرح خوف اور فرار کی عادی ہوتی ہیں۔ وہ باہر مرد کی دنیا سے گھبراتی ہیں۔ اور یہ وہ سوسائٹی کی زنانہ اور مردانہ تقسیم کو قانونِ قدرت تصور کرنے لگتی ہیں۔ گھر سے باہر کی چیزوں اور آدمیوں سے انہیں خوف آتا ہے۔ جب کبھی وہ باہر نکلتی ہیں۔ تو برقع کے باوجود سہمی سہمی اور خوفزدہ رہتی ہیں۔ اخبار خواتین کے ذاتی مسائل کے کالم میں ایک لڑکی دریافت کرتی ہے کہ" میں اپنے گھر میں رشتہ داروں اور سہیلیوں میں بیٹھ کر خوب باتیں کرتی ہوں۔ اور گفتگو کے دوران میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی، لیکن اگر کہیں کسی اجنبی لڑکی یا غیر خواتین سے ملاقات ہو جائے تو منہ کو تالا لگ جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟" مشورہ کالم کی مسائل کے حل کرنے والی جواب میں تجزیہ کرتی ہے کہ" بی بی۔ یہ مسئلہ آپ ہی کو لاحق نہیں۔ بہت سی لڑکیاں اس پریشانی کا شکار ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ گھر کے ماحول یا شخصی حالات کے باعث پیدا ہونے والی بیجا شرم ہے۔ یہ شرم خود اعتمادی کی کمی کا نتیجہ ہے۔" بیشک، اس عمر میں لڑکی میں گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ بڑھ جاتی ہے۔ مگر مسلم معاشرے میں پردہ سسٹم کی پابندیاں اور خوف اس میں خطرناک حد تک اضافہ کر دیتے ہیں۔ جس کے باعث پردہ دار لڑکیوں اور عورتوں میں خوف، خود اعتمادی کا نقصان، بیجا شرم، گھبراہٹ اور پریشانی اور بزدلی اور احساس کمتری جیسی عادات اور جذبات فطرتِ ثانیہ بن جاتے ہیں۔ ان میں کام اور عمل سے بیزاری۔ عام ہوتی ہے۔ پشاور کے کالج کی اسی طالبات کی عادات اور رویوں کا ایک سوالنامہ کے ذریعے تجزیہ کیا گیا۔ ان طالبات کی عمریں ۱۶ سے ۲۵ سال تک کے درمیان

تھیں۔ ان میں بعض لڑکیاں ایسی بھی تھیں جو مقابلتاً کم پردہ دار گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں مگر سب کالج کے آزاد ماحول میں اعلیٰ کلاسوں میں زیر تعلیم تھیں، سوالنامہ کے جوابات کا تجزیہ کرنے کے بعد سروے رپورٹ میں کہا گیا کہ

"طالبات سے پوچھا گیا کہ آیا انہیں ایسے اداروں اور دفتروں میں کام اور ملازمت کرنے پر اعتراض ہوگا یا نہ ہوگا جہاں مرد اور عورتیں یکجا کام کرتے ہیں؟ ۶۳ لڑکیوں کا جواب 'نہیں' دیا۔ تھا، پندرہ لڑکیوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا' اور دو لڑکیوں نے کوئی جواب نہیں دیا، ۶۳ لڑکیوں میں سے تین نے اپنے اعتراض کی یہ وضاحت کی کہ وہ پٹھان لڑکیاں ہیں جن میں مردوں کے ساتھ کام کرنے پر اعتراض ہوتا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ تقریباً اسّی فیصد لڑکیوں کو مردوں کے ساتھ کام کرنے میں عار تھا کیونکہ یہ اعتراض رسم ورواج اور روایات کے عین مطابق ہے۔[۵]"

مولانا عبدالحلیم شرر تو تقریباً دو نسلیں پہلے کی باتیں کر رہے تھے جب برصغیر کے مسلمان برطانوی سامراجی غلامی میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنی قومی اور معاشرتی اصلاح کے لئے خود مختار نہ تھے۔ مگر آج آزادی کے کئی سالوں کے بعد بھی ہمارے گھروں اور ہماری عورتوں کی ذہنی، اخلاقی اور کرداری حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اخبار خواتین میں ایک خاتون لکھتی ہے:

"محترمہ عشرت صاحبہ کا خط بعنوان 'عورت زندگی کے ہر محاذ پر شکست سے دوچار ہے۔' پڑھا، حیرت ہوئی محترمہ نے اس شکست کی ذمہ داری مرد ہی پر ڈالی ہے۔ میرے خیال میں تو مرد سے زیادہ ہم خواتین خود اس کی ذمہ دار ہیں۔ عورتیں اگر خود اپنے میں ہمت، خود اعتمادی اور ایمانداری جیسی اعلیٰ صفات پیدا کر لیں تو انہیں کسی دنیاوی سہارے کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں نہیں کھانی پڑیں گی۔ ہمارے معاشرے

کی اصلاح اب بھی ممکن ہے بشرطیکہ عورت خود میدان میں آجائے اکثر اخبارات میں یہی خبریں ہوتی ہیں کہ فلاں عورت کے ساس سسر نے اسے گھر سے نکال دیا۔ فلاں عورت کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ ہمارے ملک میں پچاس فیصد عورتیں یہ کہہ کر کہ وہ جاہل ہیں کچھ نہیں کر سکتیں اس لئے مجبوراً روٹی کپڑے کی خاطر شوہر کی مار سسرال والوں کی گالیاں اور جوتے کھا کر عمر گزارتی ہیں، میرا خیال ہے کہ بجائے یہ ظلم چپ چاپ سہنے کے وہ اس ظلم کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں تو اچھا ہے۔ جب وہ ہاتھ جن کو ہمارے مذہب اور معاشرے نے حفاظت کرنے کے لئے بنایا ہے عورت کو مارنے کے لئے اٹھ جائیں یا مگن ہو جائیں تو اس سہارے کی آس میں زندگی گزارنا نادانی ہے۔۔۔۔ ہمارے ملک میں عورت خود کو مظلوم، مجبور اور بے کس کہلوانے میں فخر محسوس کرتی ہے ظلم برداشت کرنا بزدلی ہے۔۔۔۔

" اگر کام کرنے کی ہمت پیدا ہو جائے تو آج بھی پاکستانی عورت اپنی ڈکشنری میں سے لفظ مجبور، بے کس، حرف غلط کی طرح مٹا سکتی ہے اپنی خودداری، عزت دانا کو اس حد تک نہ دبنے دیں کہ ہماری خاکستر میں ایک جنگاری بھی باقی نہ رہے۔ اگر عورت ہمت کرے اور ابتداء ہی سے اپنے پر ہونے والے ظلم و ستم کو روک دے تو میرے خیال میں عشرت صاحبہ جیسی بہنوں کو اپنا خیال بدلنا پڑے گا کہ آج کی عورت زندگی کے ہر محاذ پر شکست سے دوچار ہے [1]۔"

مگر کیا عورت کی حالت بدل سکتی ہے جب اس کی عادات و کردار میں کاہلی لاپروائی اور غیر ذمہ داری جیسی خرابیاں اور خامیاں رچی بسی ہوئی ہوں؟ کراچی کے رسالے اخبار خواتین میں ایک نامہ نگار اس سوال کے جواب میں " پاکستانی لڑکے غیر ملکی لڑکیوں سے شادی کیوں کرتے ہیں؟

---

[1] اخبار خواتین کراچی صفحہ ۷۔ مورخہ ۱۶ تا ۲۲ مئی ۱۹۷۰ء

"ایک صاحب وہاں رانگلستان میں) کہنے لگے کہ میں نے انگریز عورت سے شادی اس لئے کی کہ میں اُن دوستوں کا حشر دیکھ چکا ہوں جن کی بیویاں پاکستانی ہیں بیگم صاحبہ دس گیارہ بجے سو کر اٹھتی ہیں۔ غریب شوہر صبح خود ہی ناشتہ پکا اور کھا کر رخصت ہو جاتا ہے پھوہڑ پن کا عالم یہ ہوتا ہے کہ بچے کے پیشاب پاخانہ کے پوتڑے جگہ جگہ بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔ بچوں کی مناسب تربیت اور خاندان کی متوازن غذا کی طرف توجہ نہیں دی جاتی، گھر اندر اور باہر گندگی سے اٹا رہتا ہے۔ انہیں بس خبط ہوتا ہے تو ایک وہ شاپنگ کرنا بجٹ نہیں بناتیں، جو فضول چیز پسند آئی خرید لی۔ روتے بلکتے بچوں کو ایک دوکان سے دوسری دوکان سے گھسیٹے پھر رہی ہیں پھر یہ بھی ہے کہ یہ دیسی عورتیں زیادہ تر بیمار رہتی ہیں، کبھی سر میں درد، کبھی کمر میں درد، اور خدا جانے کیا کیا ہے۔ گھر کا یہ عالم کہ ہر وقت لڑائی جھگڑے لگے رہتے ہیں۔ یہاں غیر ملکی خاتون سے شادی کے بعد مجھے بچوں کا تو کوئی فکر نہیں۔ نہ بیکار شاپنگ اور نہ آئے دن کا ملنا جلنا اور فضول خرچی۔ اچھے گھر کی انگریز لڑکیاں با اصول سلیقہ مند اور با اخلاق ہوتی ہیں۔ وہ زندگی کی اہمیت اور وقت کی قدر و قیمت جانتی ہیں۔ کوئی ملنے کو آ جائے تو ملاقات کے ساتھ روزمرہ کا کام بھی نپٹاتی جاتی ہیں۔ یہ نہیں کہ بی ہمسائی صبح سے آن ٹپکی ہیں اور بیگم صاحبہ مسلسل گپ بازی میں مصروف ہیں۔ شوہر دفتر سے اور بچے سکول سے گھر پہنچے تو یہاں کا حال ہی خراب ہے اور کھانا تک موجود نہیں انگریز عورتیں اس لئے ملنے ملانے سے کتراتی ہیں اور اس کی ضرورت ہو بھی تو یہ کام فرصت پر اٹھا رکھتی ہیں۔ ملنے والوں کا بے وقت آنا انہیں پسند نہیں ہوتا۔ نہ ہر ملاقاتی کے لئے چائے کے دور چلاتی ہیں۔ اسی بنا پر ہم انہیں روکھے، بد اخلاق اور خدا جانے کیا کیا کہنے لگتے ہیں"[1]

---

[1] اخبار خواتین کراچی صفحہ ۷ مورخہ ۸ تا ۱۴ نومبر ۱۹۶۹ء۔

پس ان عادات و کردار کے ساتھ پردہ دار لڑکی کے سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد شادی ہو جاتی ہے۔ پردہ سسٹم کی غیر انسانی نوعیت کی ایک بدترین مثال پردہ سوسائٹی میں شادی کے رسم و رواج، عقائد اور نظریات ہیں۔ جن میں کم سنی کی شادی تعدد ازدواج کم عمر لڑکیوں کی معمر مردوں سے شادی کے رسم، بیٹیوں کو فروخت کرنے کا رواج، ٹٹا سٹا یعنی لڑکی کے بدلے لڑکی کی شادی کرنے کا رواج، وغیرہ سبھی شمار کی جا سکتی ہیں۔ ان سب سے ظاہر ہے کہ ہمارے مسلم معاشرے میں عورتوں اور لڑکیوں کو جنس فروخت تصور کیا جاتا ہے جسے خاندان کے اپنی ضروریات اور مردوں یعنی باپ کی اپنی مصلحتوں کی بنا پر ان کی رضا اور رغبت کے بغیر شادی کر دی جاتی ہے[۱]

پردہ سنڈروم Syndrome

اس طرح سے بالغ ہونے پر پردہ دار لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ اپنے نئے گھر رخصت ہو جاتی ہے، جہاں اُسے نت نئی ذمہ داریوں نئے نئے حالات اور ماحول کا سامنا ہوتا ہے جن کا تجزیہ ہم اگلے باب میں کریں گے تاہم یہ یاد رہے کہ شادی شدہ لڑکیاں اور عورتیں اپنی نئی ذمہ داریوں اور حالات کا مقابلہ ان عادات خیالات اور رویوں اور رجحانات کے ذریعے کریں گی۔ جو انہوں نے اپنے ماں باپ کے گھر میں اپنی پندرہ بیس سالہ زندگی میں حاصل کئے انہی عادات اور صلاحیتوں کو وہ آنے والی نئی نسلوں کو منتقل کر دیں گی جو ان کے ہاں پیدا ہوں گی۔ اس عمل کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہم ایک بار اجمالاً اُن عادات و خصائل، کردار اور سیرت پر نظر ڈالتے ہیں جو پردہ سوسائٹی میں لڑکیوں اور عورتوں کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے جسے ہم پردہ سنڈروم (Purdah Syndrome) یعنی عادات اور رویوں اوصاف و خصائل کا ایسا مجموعہ جو پردہ ماحول میں لازمی اور لابدی طور پر ایک فرد سے دوسرے

۱۔ پردہ سوسائٹی میں شادی بیاہ کی قبیح اور غیر انسانی رسوم و رواج کے لئے دیکھئے شاہد حسین زراقی "پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج" صفحات ۱۱۹ تا ۱۲۰، ۱۴۷، ۱۶۴، ۲۵۹ تا ۲۶۰، ۲۶۸ تا ۲۶۹۔ ذکیہ ایگلر "پاکستان میں ایک پنجابی گاؤں" (انگریزی میں) صفحات ۸۳-۸۴ اور ۱۶۴ تا ۱۶۶۔ مزید دیکھیے جعفر حسن "ہندوستانی سماج" صفحات ۶۰-۶۱۔ خالد اشرف "مغربی پاکستان کے قبائلی لوگ" (انگریزی میں) صفحات ۵۰-۵۳۔

فرد کو اور ایک نسل سے دوسری نسل کو اکٹھا ودیعت ہوتا رہتا ہے کیونکہ وہ اس ماحول اور حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ مختصراً "پردہ سنڈروم"[1] مندرجہ ذیل عادات اور خصائل پر مشتمل ہوتا ہے

---

[1] ہم اگلے ابواب میں بتائیں گے کہ پردہ سوسائٹی میں مرد بھی اپنا مخصوص پردہ سنڈروم کے حامل ہوتے ہیں۔ "سنڈروم" کی اصطلاح علوم طب اور نفسیات سے ماخوذ ہے۔ اس سے مراد کسی جسمانی یا نفسیاتی بیماری کی ایسی علتیں اور علامتیں ہیں جو لازماً اکٹھی رہتی اور ظاہر ہوتی ہیں۔ لہٰذا باہمی طور پر سب لازم و ملزوم ہوتی ہیں۔ علم معاشریات میں بھی اس اصطلاح کو انہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے یعنی کوئی ایسی معاشرتی خرابی جس کے محرکات اور عوامل یا عقائد، عادات رویے اور رجحانات جو عملاً اکٹھے ظاہر ہوتے اور اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ سب فرد کے ذہن و کردار میں ایک گچھے (   ) کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک عقیدے، خیال، عادات یا رویے کو دوسروں سے، بلا سارے سنڈروم کو متاثر کئے، خارج نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اگر کوئی سنڈروم سے متاثر شدہ فرد کسی ایک عقیدے، رویے یا عادت وغیرہ پر کسی وجہ سے اعتراض اور تنقید شروع کر دے اور عملاً اس کو ترک کرنا شروع کر دے، تو وہ جلد ہی سارے سنڈروم پر اعتراض و تنقید بھی شروع کر دے گا اور اس سے عملاً نجات حاصل کرنے کی کوشش بھی شروع کر دے گا، جو اس کی نفسیاتی اور کرداری تکمیلیت کا آغاز بھی ثابت ہوگی۔ مثلاً اگر کوئی پردہ دار عورت اس بات پر سوچنا شروع کر دے کہ عورتوں پر مردوں کی فوقیت اور فضیلت قابل تنقید عقیدہ ہے یا پردہ دار عورتیں کیوں ڈرپوک یا بے ہمت یا پھوہڑ ہوتی ہیں یا کیا عورت کی صنف فطرتاً اور لازماً ناکام اور تکمیل کے نااہل ہے، جیسا کہ پردہ آئیڈیالوجی کے حامی دعویٰ کرتے ہیں، یا عورتوں میں کیوں پہل، خود اعتمادی اور پیش قدمی کے اوصاف پیدا نہیں ہوتے، تو وہ اپنے پردہ سنڈروم کے باقی تمام عقائد، رویوں، عادات اور نظریات کو بھی قابل تنقید اور ناقابل قبول قرار دینا شروع کر دے گی اور عملاً اس سے نجات حاصل کرنا شروع کر دے گی۔ یہی حشر مرد کے پردہ سنڈروم کا ہوگا، جب وہ اپنے مخصوص مردانہ پردہ سنڈروم پر غور و خوض شروع کر دے گا۔ مگر چونکہ پردہ سنڈروم کسی مرد یا عورت کی انفرادی حالت نہیں، بلکہ معاشرتی محرکات، عوامل اور ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے وہ اس سے کاملاً نجات تبھی حاصل کرے گا یا کرے گی جب سارا مسلم معاشرہ پردہ اور تعدد ازواجگی سے نجات حاصل کرلے گا اور تکمیلی مارکہ سوسائٹی بن جائے گا۔ تاہم اس کی انفرادی تنقید اور کوشش معاشرتاً اجتماعی تبدیلی اور تغیر کی جانب ایک قدم ثابت ہوگی۔ "قطرہ قطرہ میشود دریا"۔

۱- پردہ دار لڑکیاں اور عورتیں محنت و مشقت کے نااہل ہوتی ہیں۔ وہ اپنی عادات میں کاہل، سست الوجود، منفعل، پھوہڑ، بدسلیقہ، بداسلوب اور بدتربیت ہوتی ہیں۔

۲- ان کے کردار اور قوت ارادی کمزور ہوتی ہیں۔ ان میں پہل اور پیش قدمی کی صلاحیت مفقود ہوتی ہے، اُن میں آزادانہ اور خود مختارانہ قوتِ عمل اور قوت فیصلہ نہیں ہوتی، ان میں ذمہ داری کا احساس اور شعور نہیں ہوتا۔ وہ عزم و ارادہ، مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کی خوبیوں اور اوصاف سے عاری ہوتی ہیں۔ وہ سیدھی سادی اور بھولی بھالی، عاجزانہ اور مجبور اور ضعیف الاعتقاد ہستیاں ہوتی ہیں۔

۳- پردہ دار لڑکیوں اور عورتوں میں مشکلات اور مہمات کے خدشوں کا مقابلہ کرنے کا شوق اور اہلیت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی روزمرہ کے مسائل اپنی کوشش اور تعاون سے حل کرنے اور حاوی ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ ان میں اجتماعی عمل اور تعاون، تنظیم اور باہمی عمل کی استعداد اور صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ زود رنج، متلون مزاج، اور تنگ مزاج ہوتی ہیں۔ وہ بزدل، فرارگزیں، بے ہمت ہوتی ہیں جو ذرا سی مشکلات اور خدشات کی صورت میں فرار کی راہ تلاش کرتی ہیں۔ اور صبر اور ثابت قدمی سے مشکلات اور خطروں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔

۴- وہ خود بین، مغرور اور متکبر ہوتی ہیں۔ وہ جھگڑالو اور چڑچڑی ہوتی ہیں۔ ان میں موقع اور محل شناسی نہیں ہوتی۔ وہ کام اور تکمیل سے جلد گھبرا جاتی اور بور ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اجتماعی کوشش اور محنت، تعاون اور تنظیم کی اہل نہیں ہوتیں۔

۵- وہ جاہل، ضعیف الاعتقاد، توہم پرست ہوتی ہیں اور ہر قسم کے اوہام اور خوف میں مبتلا ہوتی ہیں۔ اُن کے ہاں بھوت پریت، چڑیل اور اس طرح کی لاتعداد فرضی کہانیاں اور خدشات عام ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ ہر طرح کے جعل ساز اور حیلہ ساز اشخاص کے فریب میں بھی آسانی سے آجاتی ہیں۔ ان میں تعویذ اور گنڈوں کا رواج بہت عام ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن میں سوءظن، خود اطمینانی اور خوش فہمی، بے فکری اور لاپرواہی پائی جاتی ہیں وہ اپنے خیالات اور عقائد میں کٹر اور ضدی ہوتی ہیں۔ اُن میں حالات اور موقع کی

مطابقت پذیری کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اور اپنے مسائل کو خود اعتمادی اور مستقل مزاجی سے حل کرنے سے بھی عاجز ہوتی ہیں۔

۶۔ وہ اپنے رویوں اور نقطۂ نظر میں اپنے خاندان اور اس کی حیثیت، اپنے رشتہ داروں اور قرابتداروں سے پرے نہیں دیکھتیں۔ ان میں خاندانی اور قرابتدارانہ غرور اور نخوت، خود پسندی اور خودستائش بہت ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خاندانی اور قبائلی عصبیت اور اپنی ذات برادری کے تعصب اور تفاخر سے بھری ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان میں خاندانی اور قرابتدارانہ نخوت، غرور، گھمنڈ اور شیخی کے جذبات اور عصبیت بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ان میں وسیع تر قومی خیالات، جذبات، احساسات اور تصورات کا فقدان ہوتا ہے۔ کیونکہ پردہ دار لڑکیاں اور عورتیں مائیکرو سوشل ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان میں ماکرو سوشل یا قومی شعور قطعی نہیں پایا جاتا۔

باب پنجم

پردہ سوسائٹی اور خاندان میں بچوں اور نوجوانوں کے کردار و شخصیت کی نشوونما

"کہاں ہیں وہ مائیں ؟
ہم شخصیت کے بحران سے دوچار ہیں۔
قحط الرجال نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے
جو اہل دانش اٹھ جاتے ہیں وہ ایسا خلا چھوڑ جاتے ہیں
جو کسی طور پر پُر نہیں ہو پاتا
یہ بظاہر نہایت تکلیف دہ خیالات و احساسات ہیں
لیکن اس کا کیا کیجئے کہ امر واقعہ یہی ہے"[1]

اس المناک حقیقت کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لاہور کا ماہنامہ "حور" مزید لکھتا ہے :-

"اس المیہ کے پس منظر میں جب ہمیں نئی نسل کی پرورش و تربیت میں خامیاں اور کمزوریاں کارفرما نظر آتی ہیں تو دکھ اور تکلیف کا احساس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ مائیں کسی طور بھی اس ہولناک قحط الرجال یا شخصیت کے بحران سے بری الذمہ قرار نہیں دی جا سکتیں بلکہ دیکھا جائے تو اس کی ذمہ داری بنیادی طور پر صنفِ نازک پر ہی عائد ہوتی ہے۔"[2]

پاکستانی معاشرے کا یہ تجزیہ صحیح اور تنقید حقیقت پسندانہ ہے۔ مگر ہم صرف ماؤں اور صنف نازک کو ہی اس المیہ کا ذمہ دار قرار نہیں دے سکتے۔ بلکہ ہمیں ان حالات

---

[1] "حور" لاہور۔ سالگرہ نمبر ۱۹۷۰۔ صفحہ ۱۴

[2] ایضاً صفحہ ۱۴

اور ماحول، رسم و رواج اور نظام حیات کو بھی مورد الزام قرار دینا چاہیے جن کے تحت مائیں اور صنف نسواں نئی نسلوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے فریضہ میں کوتاہی کرتی یا اچار ہوتی ہیں۔ اس غفلت شعاری میں نہ صرف باپ بلکہ سارا مسلم معاشرہ بھی ملوث ہے۔ ہمیں اب یہ دیکھنا ہے کہ نئی نسلوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں پردہ سسٹم اور تعدد ازواج کس طرح خلل ڈالتے ہیں اور ان کے کردار اور ذہن کی نشو و نما اور ان کی تکمیلی صلاحیتوں اور قوتوں کو کس طرح ماؤف اور مفلوج کرتے ہیں۔ یہ انحطاط انگیز عمل ماؤں کی گود اور خاندانی ماحول سے شروع ہوتا ہے جو پردہ اور تعدد ازواج کے عائلی نظام میں بندھے ہوئے بلکہ جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

مسلم گھرانے کے زنانہ اور مردانہ حصے

جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں کہا، مسلمانوں کے گھر ہمیشہ دو حصوں میں منقسم ہوتے ہیں یعنی زنانہ اور مردانہ۔ ہم نے گذشتہ باب میں زنانے حصے کے اپنے مخصوص حالات اور محرکات کا عورتوں اور لڑکیوں پر اثرات کا مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے۔ اس باب میں پہلے زنانخانے کے حالات، ماحول اور محرکات کا لڑکوں اور نوجوانوں پر اثرات کا تجزیہ کریں گے اور پھر مردانے حصے اور گھر سے باہر کی زندگی کا ان پر اثرات کا جائزہ لیں گے۔

زنانخانے میں ہم جھانک چکے ہیں، اب ذرا مردانے پر نظر ڈالیں۔

آج کی پاکستانی اور دنیائے اسلام کی سوسائٹی کو ہم پردہ سسٹم کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت چار خطوں میں منقسم کر سکتے ہیں یعنی قبائلی عقبستان، زمینداری جاگیردارانہ دیہات، قصباتی علاقے اور جدید شہری حصے۔ ان خطوں میں زنانخانے کی نسبت مردانوں میں بہت فرق ہے۔ قبائلی عقبستان اور جاگیردارانہ دیہات میں قرون وسطائی مسلم معاشرے کی طرح گھر کا مردانہ حصہ زنانخانے سے الگ بنا ہوا ہوتا ہے اور بذات خود ایک مکان ہوتا ہے جو مردوں کا مہمان خانہ کہلاتا ہے[1]۔ پرانے شہروں میں اسے دیوان خانہ بھی کہتے تھے۔ صوبہ سرحد میں اسے حجرہ کہتے ہیں، یہ خالصتاً

---

[1] ذکریہ ایگلر "پاکستان میں ایک پنجابی گاؤں" ص ۲۱ اور ۳۰۔

مردوں کا حصہ ہوتا ہے اس لئے اس میں تمام پبلک یعنی گھر سے باہر کی دنیا کے معاملات ہوتے ہیں۔ اس میں عورتوں کا داخلہ سختی سے اور کاملاً منع ہوتا ہے، کیونکہ پردہ کرنا ان کی عزت اور ان کا یہاں مردوں میں آنا باعث شرم تصوّر کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فریڈرک بارتھ سوات کے پٹھانوں کے حجرے کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ خالصتاً مردوں کے کاموں اور سرگرمیوں کا مرکز ہوتا ہے، جسے وہ "کلب، خواب گاہ، مہمان خانہ اور مختلف تقریبات اور ضیافتوں کی جگہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں یہ جگہ پٹھانوں کی سیاسی زندگی کے بیشتر حصے کا مرکز ہوتی ہے"۔[1] جوان لڑکے اور غیر شادی شدہ مرد حجرے میں رہتے صرف شادی شدہ مرد اپنے بیوی بچوں کو ملنے گھر کے زنانہ حصے میں جاتے ہیں اور وہ بھی عموماً رات کو قبائلی جاگیردار، حجروں، میں دوسرے اقسام کے مردانوں کی نسبت ملول بہت قرابتدارانہ گروہ بندی، جارحانہ اور انقباضی ہوتا ہے۔ چونکہ قبائلی اور جاگیردارانہ معاشرے میں عورت اور مرد کا فرق بڑی شدت سے پردہ دارانہ ہوتا ہے اس لئے غریب غربا کی عورتیں بھی مردوں کی جگہوں سے الگ رکھی جاتی ہیں۔ اُن علاقوں میں جہاں قرابتداری معاشرہ ابھی بھی قرون وسطائی نوعیت کا ہے اور قرابتی گروہ مشترکہ رہتے ہیں، حجرہ کئی رشتہ دار خاندانوں کا مشترکہ ہوتا ہے۔ مگر زمانۂ جدید کی بڑھتی ہوئی انفرادیت کے باعث قرابتی گروہ کا مشترکہ پن ختم ہو رہا ہے۔ اس لئے مشترکہ حجرے کی بجائے ہر ایک خاندان کا اپنا اپنا حجرہ وجود میں آرہا ہے۔ قصبوں اور چھوٹے شہروں میں بھی ایسی ہی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ان مقامات پر جگہ کی تنگی کے باعث مردانہ حصہ زنانخانے سے الگ نہیں ہوتا بلکہ گھر کا ایسا حصہ جو سڑک یا گلی کی جانب ہوتا ہے یا مکان کی نچلی منزل ہوتی ہے مردانے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مگر ان مردانوں میں بھی ابھی تک قرون وسطائی ماحول پایا جاتا ہے، جہاں عورتوں کو کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ صرف ایسے مقامات پر، جہاں جدید

---

[1] فریڈرک بارتھ "سوات کے پٹھانوں میں سیاسی قیادت" (انگریزی میں) ص ۵۲-۵۳ مردانہ حصوں میں روزمرہ زندگی کے بارے دیکھئے اگلا باب۔

اثرات زیادہ پائے جاتے ہیں مثلاً جدید بنگلے یا کوٹھیاں، وہاں گھر کا سامنے والا حصہ بطور مردانے اور عقبی حصہ بطور زنانخانے کے استعمال ہوتا ہے جس کے تین طرف دیوار کھینچی ہوتی ہے۔ زیادہ جدید شہری گھروں میں زنانے اور مردانے حصے کی نمایاں تخصیص نہیں پائی جاتی۔ ایسے جدید گھروں میں مردانہ حصہ بیٹھک ہوتی تھی۔ یا جدید بنگلوں اور کوٹھیوں میں ڈرائینگ روم کہلاتا ہے۔ جن علاقوں میں قبائلیت یا جاگیرداریت کا غلبہ ہے وہاں کے مردانہ 'حجروں' میں ناچنے والی عورتیں اور ڈرائینگ روموں میں داشتائیں لائی جاتی ہیں، مگر گھر کی مالکہ اور بیوی وغیرہ کا وہاں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ بہرکیف یہ صورت حال پردہ دار ماحول کے عین مطابق تصور کی جاتی ہے۔

شہروں اور جدید مکانوں میں مردانہ اور زنانہ حصے باہمہ گر مدغم ہو رہے ہیں۔ اور ان میں فرق کرنا مشکل ہے۔ مگر چونکہ عام معاشری ماحول پردہ دارانہ ہے، اس لئے ایسے جدید گھروں اور کنبوں میں بھی مرد اور عورتیں الگ الگ رہتے ہیں اور فضا پردہ دار ہوتی ہے۔ مگر بعض جدید خاندانوں میں خاندانی زندگی کافی مربوط اور مشترک ہوتی ہے جو جدید معاشرے کی ترجمانی کرتی ہے تاہم پاکستانی سوسائٹی میں ہنوز ایسے خاندان نہایت کم اور بے اثر ہیں۔

پس پردہ سسٹم گھر اور کنبے کو مردانہ اور زنانہ حصوں میں تقسیم کرتا ہے جن میں مردوں اور عورتوں کے مابین سوائے حیاتیاتی احتیاجات یعنی خوراک اور جنسی تعلقات یا "نان و نفقہ" کے علاوہ کوئی اور معاشری اور تمدنی تعلقات اور رشتے نہیں ہوتے۔ ایسے تقسیم شدہ ماحول میں بچوں کی پرورش تربیت اور کردار سازی کی کس طرح کی جاتی ہے۔

پردہ سوسائٹی میں بچوں کی عادات و کردار کی تکوین و تشکیل یوم پیدائش سے بارہ سال کی عمر تک

پردہ سوسائٹی میں بچوں کی پرورش، تربیت اور کردار سازی کے فرائض اور ذمہ داری

محض عورتوں پر تصور کی جاتی ہے۔ پردہ سسٹم کے ایک داعی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس بارے میں قطعیت کے ساتھ لکھتے ہیں :

"جن لوگوں نے فطرت کی تقسیمِ عمل (یعنی مرد و زن کی تقسیم کار) کا لحاظ کیا انہوں نے تمدن و معاشرت کی خدمات میں سے صرف خانہ داری اور تربیت اطفال کی ذمہ داریاں عورت پر عائد کیں۔[1]"

وہ مزید لکھتے ہیں:

"خانہ داری اور پرورش اطفال جیسے خالص زنانہ کاموں میں کوئی مرد عزت محسوس نہیں کرتا۔[2]"

درحقیقت مولانا مودودی کی رائے مصری عالم علامہ فرید وجدی کی رائے کی صدائے بازگشت تھی۔ علامہ وجدی لکھتے ہیں :

"عورت کو قدرت نے دنیا میں جس غرض سے مخلوق کیا ہے وہ غرض نوع انسان کی تکثیر اور اس کی حفاظت و تربیت ہے۔ جس طرح مردوں کی طاقت سے یہ امر بالکل باہر ہے کہ وہ عورت کے طبعی فرائض میں حصہ لیں، اسی طرح عورت کی طاقت سے یہ امر باہر ہے کہ وہ مردوں کے علمی و تمدنی مشاغل میں شریک ہو۔[3]"

علامہ صاحب مزید لکھتے ہیں :

"قوموں کی ترقی کا بڑا راز تاریخ بتلاتی ہے کہ قومی افراد کی یہی ابتدائی تربیت ہے جو انسان اپنی زندگی کے ابتدائی حصہ میں صرف ماں کی کوشش اور توجہ سے حاصل کر سکتا ہے۔[4]"

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی "پردہ" صفحہ ۲۰۳

[2] ایضاً صفحہ ۲۵۶

[3] علامہ فرید وجدی "مسلمان عورت" صفحہ ۲۰

[4] ایضاً۔ صفحہ ۲۶۔

پردہ دار مسلم خاندان میں بد تربیت کا ماحول اور عوامل

یہ حامیان پردہ کے بچّوں کے خلاف تربیت کے نظریات ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی گاڑی کو صرف ایک پہیّہ پر چلانا چاہتے ہیں ان خلاف تربیت خیالات اور نظریات کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے گھروں اور کنبوں میں بچوں کی پرورش اور تربیت دو اصولوں پر مبنی ہے اول، خاندانی زندگی کا زنانہ اور مردانہ حصّوں میں تقسیم۔ دوم، اس تقسیم کی وجہ سے گھر کے اندر باپ کی غیر موجودگی اور گھر سے باہر ماں کی غیر موجودگی کا اصول۔ باپ کی غیر موجودگی "گھر کے اندرکے پردے" کی وجہ سے ہوتی ہے، جس کا ذکر ہم نے گذشتہ باب میں کیا ہے۔ اس طرح پردہ سسٹم مسلمانوں کی زندگی میں اوائل عمر ہی سے ایسی خلاف حاشری صورت حال پیدا کر دیتا ہے جس میں باپ اپنے کنبے کی اندرونی زندگی اور گھریلو ماحول سے اور اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت کے فرائض سے بیدخل اور لاتعلق ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پردہ سسٹم ماں کو بھی گھر سے باہر کی دنیا سے بیدخل اور لاتعلق رکھ کر اُسے اپنے بچوں کو باہر کی دنیا کے معاملات اور مسائل سے روشناس کرانے اور رہنمائی کرنے سے قاصر رکھتا ہے۔ یہ ہیں وہ حالات اور ماحول جن میں پردہ سوسائٹی کے مسلمان بچے اور بچیاں بچپن ہی سے پرورش اور تربیت پاتے ہیں۔ صرف جدید غیر پردہ دار خاندانوں میں یہ صورتحال قدرے مختلف ہو رہی ہے، جہاں ماں باپ دونوں اپنے بچوں اور بچیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے فرائض اور ذمہ داریوں کو باہمی اشتراک اور باہمی عمل سے سرانجام دیتے ہیں، مگر ہمارے ملک اور معاشرے میں ایسے خاندانوں کی تعداد بہت کم اور اثر و رسوخ بہت محدود ہے۔

مسلم کنبے میں نئی نویلی بہو کے ابتدائی مسائل

پردہ دار خاندان میں جب نئی بیاہی ہوئی دلہن آتی ہے تو اُسے اکثر جلد ہی مختلف قسم کی مشکلات اور کشیدگیوں کا سابقہ پڑتا ہے۔ اس کی آمد کے چند دنوں

کے بعد جب نئی نویلی بہو کی آؤ بھگت کچھ کم ہونے لگتی ہے تو اس کے اور اس کی ساس اور نندوں، دیورانیوں اور جیٹھانیوں (اگر وہ ہوں) کے تعلقات کچھ کشیدہ ہونے لگتے ہیں۔ ساس بہو کا تنازعہ دراصل دو نسلوں کے خلا کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بہرحال ساس بہو کی ٹکر کچھ ذاتی مزاجوں اور کچھ گھریلو اسباب کے باعث شروع ہوتی ہے۔ اقبال النساء اپنی ناول میں لکھتی ہے:

"نازنین، کبیر کی نئی نویلی بیوی ابھی ایسی لڑکی تھی جسے نہ موقع محل کا شعور اور نہ دنیا کی باتوں کا علم۔ لہٰذا وہ بڑی آسانی سے گھر کی تجربہ کار مالکہ کے حربوں کا شکار بن گئی۔ اس کی ساس کو اس کی خوبصورتی کے سوا کوئی اور چیز پسند نہ آئی۔ لیکن صرف خوبصورتی اس کے کس کام کی؟ شادی کے تین ماہ کے بعد جب زہرہ (ساس) اپنی گھریلو ذمہ داریاں اپنی بہو کو منتقل کرنے کا بیتابی سے انتظار کر رہی تھی، نازنین اپنے حمل کے باعث بیمار پڑ گئی۔ اب بیچاری ساس کیسے آرام کر سکتی تھی؟ حکومت چلانے کی اس کی امیدیں جو شادی کے وقت بہت بلند ہو گئی تھیں۔ دھڑام سے زمین پر آ رہیں۔ بستر میں پڑے ہوئے بیمار کی وجہ سے اس کے کام اور بھی بڑھ گئے"[1]

ساس بہو کے جھگڑوں میں میاں شاذ و نادر ہی اپنی بیوی کی حمایت اور طرفداری کرتا ہے۔ کیونکہ اوّل تو وہ گھر میں خاص خاص وقتوں پر آتا ہے اور دوسرے وہ اپنی ماں اور بہنوں سے بہت محبت کرتا ہے اس کے علاوہ، اُسے اپنی نئی نویلی بیوی کے خلاف اکسایا اور ورغلایا بھی جاتا ہے۔ خاص طور سے جب کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اپنی بیوی میں اس کی دلچسپی کم ہونے لگتی ہے اور اس کی ماں اُسے نئی بیوی لانے کی تحریص و ترغیب بھی دینا شروع کر دیتی ہے۔ ان تنازعوں میں خسر بھی عموماً اپنی بیوی اور بچوں کا ساتھ دیتا ہے اور مردانے میں بیٹھا اپنی بہو

---

[1] اقبال النساء "پردہ اینڈ پولیگمی" ص ۱۵ (انگریزی میں)

کے خلاف تاریں کھینچتا رہتا ہے۔ بہر حال یہ چپقلش اور جھگڑے اس وقت شدید بلکہ مہلک صورت اختیار کر لیتے ہیں جب ان میں جہیز اور جائداد وغیرہ جیسے سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ غرضیکہ پردہ دار کنبوں میں اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ نئی نویلی بیوی کے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے یا لڑکی پیدا ہونے پر یا لڑکا نہ ہونے کے باعث یا جہیز کم یا حسب تمنا نہ لانے پر یا ساس نندوں کے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کرنے پر یا خاوند کی بے راہ روی اور بدسلوکی کے خلاف شکایت کرنے پر سسرال کا سارا خاندان نئی بہو کے خلاف صف آرا ہو جاتا ہے۔ ایک خاتون لکھتی ہیں:۔

"۔۔۔۔ وہی لڑکی جو اسکول کے دنوں میں اپنی اچھل کود اور شگفتہ طبیعت کی وجہ سے ہر دلعزیز تھی میرے سامنے گم سم بیٹھی تھی۔۔ میری سہیلی معاشرے کی وہ کردار بن چکی تھی جو ہمارے ملک کی لاتعداد عورتوں کا مقدر بن گیا ہے۔ اس کی چھوٹی بہن نے بتایا: "شادی کو ڈھائی سال گزرے ہیں۔ باجی کی کوئی اولاد نہ ہوئی تو پہلے ساس نے بدزبانی شروع کی پھر خاوند نے ذرا ذرا سی بات پر پیٹنا شروع کر دیا ہم نے کتنی بار احتجاج کے طور پر ابا سے بہنوئی کے رویہ کی شکایت کی مگر وہ یہ کہہ کر ہمیں خاموش کر دیتے ہیں" ایک بیٹی کا باپ ہوں میرا کام داماد کو نصیحت کرنا نہیں بلکہ اس کی زیادتی کو صبر و تحمل سے برداشت کرنا ہے"۔ اور شاید انہیں کی خاموشی کا اثر ہے کہ باجی کی ساس ایک بہو بیاہ کر لے آئی۔ پھر ایک دن تینوں نے مل کر باجی کو گھر سے باہر نکال دیا وہ برقع پہن کر باہر نکلنے لگیں تو ان سے برقع چھین لیا اور دھکے دے کر گھر سے باہر پھینک دیا۔ دوسرے دن طلاق کا کاغذ بھی آ گیا۔ وہ دن اور آج کا دن باجی اس حالت میں بیٹھی ہیں"۔۔۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ غور کیا جائے تو عورتوں کی اس کیفیت کی وجہ ستر فیصدی مردوں کی زیادتی اور دوسری شادی ہے۔ جہاں تک عورتوں کا معاملہ ہے اس

کے متعلق میں دوسرے ممالک کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی البتہ جہاں تک ہمارے ملک کا تعلق ہے یہاں عورت کو اتنا پست کر دیا گیا ہے کہ وہ بیچاری زندگی کے ہر میدان اور شعبہ میں اپنے کو بے بس و مجبور پاتی ہے ... یہی وجہ ہے کہ میری سہیلی جیسی مظلوم ۵۰ فیصدی عورتوں کا پس منظر خاوندوں کی دوسری شادی سے وابستہ ہے جس سے اُن کے نازک جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور جب تک ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی اقدام اور وسیلے اختیار نہیں کئے جائیں گے، عورت زندگی کے ہر قدم پر مردوں کی محتاج رہے گی[۱]۔"

تعدد ازدواج اور طلاق کے قوانین اور سہولتوں کی آڑ لے کر اکثر خاوند نئی نئی بیویاں لانے کے لئے حیلے بہانے اور جواز پیدا کرتے رہتے ہیں۔ "اخبار خواتین" میں ایک صاحبہ اس بارے میں لکھتی ہے:۔

"ایک صاحب جو اپنی عمر ۴۰ سال سے کم بتاتے ہیں شرعی اور دنیاوی ضرورت کے تحت عقد ثانی کے خواہاں ہیں۔ دوسرے صاحب بچوں اور بیوی کی موجودگی میں بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر دوسری شادی رچانا چاہتے ہیں۔ ایک صاحب ایسے بھی ہیں جو پہلی بیوی کو از کار رفتہ قرار دیکر نئی بیوی کے متلاشی ہیں۔ پانچویں صاحب اپنی بیوی کو محض اس بنا پر طلاق دے چکے ہیں کہ اس نے تین بیٹوں کے بعد ایک بیٹی کو جنم دینے کا جرم کیا تھا۔ اب وہ دوسری شادی کرنے کے خواہشمند ہیں۔ غرض اس قسم کے درجنوں خطوط وصول ہوئے[۲]۔"

۱۔ اخبار خواتین صفحہ ۵ مورخہ ۱۸۔۲۴ اپریل ۱۹۷۰ء کراچی۔ مزید دیکھئے ماہنامہ "زیب النساء" لاہور کے خطوط کے آئینہ میں کے کالم میں ایک خاتون لکھتی ہے کہ اس نے اپنی ساس کو سنا کہ اپنے بیٹے کو دوسری شادی کرنے پر اکسا رہی ہے" زیب النساء شمارہ فروری ۱۹۶۶ صفحہ ۵۳۔ لاہور۔

۲۔ اخبار خواتین۔ شمارے نمبر ۵/۷ اور ۵/۸ مورخہ ۲۸ مارچ تا ۳ اپریل ۱۹۷۰ء اور ۴ اپریل تا ۱۰ اپریل ۱۹۷۰ء صفحہ ۳۰۔

ابھی رسالے کے " مسائل اور مشورے " کے کالم میں ایک عورت لکھتی ہے۔

" شوہر نے جبر سے دوسری شادی کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ میری شادی تایا زاد سے ہوئی جو اس کے مخالف تھے اور اب دوسری شادی کی دھمکی دی۔ گیارہ سال کے بعد مجھ سے زبردستی دستخط کروا کر دوسری شادی کر لی ہے "

اس پر مشورے دینے والی صاحبہ لکھتی ہیں۔

" بہن یہ صرف آپ کا مسئلہ نہیں۔ ہمارے یہاں بے شمار عورتوں کا مسئلہ یہی ہے۔ حکومت نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے عائلی قوانین جاری کئے لیکن اس سے بھی صحیح معنوں میں عورتوں کے حقوق کی حفاظت نہ ہو سکی۔ کیونکہ مرد جب دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو پہلی بیوی پر جبر کر کے اجازت نامہ لکھوا سکتا ہے[1] "

دنیائے اسلام کے بیشتر ممالک کی طرح پاکستان کے بیشتر علاقوں میں جہاں قبائلیت اور جاگیرداریت کا دور دورہ ہے۔ تعدد ازدواج نے عائلی زندگی میں عورتوں کی خرید و فروخت اور بیوی کی حیثیت قطعی جنس بازار کی جیسی بنا دی ہے۔ بیٹی کی پیدائش اس حد تک قبول ہے کہ بعد میں اُسے فروخت کرنا ہے۔ خواہ اس غرض سے دوسری شادی بھی کرنی پڑے۔ علاوہ ازیں دوسری بیویاں خاوند کو ایک فری خادمہ اور کمائی والی عورت فراہم کرتی ہیں۔ پاکستان کے پسماندہ علاقوں میں اکثر دوسری، تیسری اور چوتھی شادی اس لئے کی جاتی ہے کہ خاوند ان کی کمائی پر مفت خوری کر سکے۔ اس مقصد کے لئے طلاق کو بھی استعمال کیا جاتا کہ ہر چند سال کے بعد نوجوان لڑکی کو بیوی بنایا جا سکے اس ضمن میں ایک عرب قبائلی سردار کا مذاق بہت سلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

" سردار نے سر برٹن بارکر بتایا کہ اس کی چار بیویاں ہیں۔ جب

---

[1] اخبار خواتین۔ صفحہ ۳۳۔ مورخہ ۱۷ تا ۲۳ جنوری ۱۹۷۸ء

ان میں کوئی بڈھی ہو جاتی ہے تو وہ اس کے بدلے نوجوان بیوی لے آتا ہے۔ اس نے ایک چھڑی سے ریت پر چار لکیریں کھینچ کر کہا" یہ پانی بھر کر لاتی ہے، یہ اناج پیستی ہے، یہ روٹی پکاتی ہے اور یہ آخری والی کچھ نہیں کرتی کیونکہ یہ سب سے چھوٹی ہے اور میری مقبولِ نظر ہے"[۱]

یہ ہیں وہ نامساعد حالات اور ماحول جن میں نوجوان پردہ دار ماں اپنے کم سن بچوں کی پرورش کرتی اور انہیں تربیت دیتی ہے۔ اس کا خاوند پردہ سسٹم کی علیحدگانہ انتناعات اور تعصبات کی وجہ سے اس فرض میں اس کی کوئی مدد نہیں کرتا اور اس کی ساس، نندیں اور گھر کی دوسری عورتیں اپنی اپنی قسم کی مخالفت کی وجہ سے اکثر و بیشتر اس کے اس فریضے کی انجام دہی میں مخالفت کرتی ہیں اور ہر طرح سے رخنے ڈالتی ہیں

پردہ سوسائٹی میں بچوں کی تعمیرِ شخصیت اور کردار سازی کے طور طریقے

پردہ سوسائٹی اور خاندان میں بچوں کی کردار سازی اور تعمیرِ شخصیت کے طور پر طریقے اور تکنیک نہایت بھونڈے سنگدلانہ، جبری اور ممانعتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ عام طریقہ یہ ہے کہ ننھے بچے کے دل میں خوف پیدا کیا جائے[۲] یعنی پٹیائی" کا خوف، باپ کا خوف، بابے کا خوف، کسی جانور مثلاً کتے بلی کا خوف، کسی ہیبت ناک چیز یا واقعہ کا خوف، کسی بھوت پریت یا چڑیل اور ہوّے کا خوف جو گھر یا ہمسائے میں کسی کونے میں چھپا بیٹھا ہے اور اُسے کھانے یا اٹھا لے جانے کو تیار ہے۔ جب ذرا بڑا ہوا تو اس کی مار پیٹ شروع ہو جاتی ہے۔ یا سزا کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اُسے خوب گالیاں دی جاتی ہیں اور صلواتیں سنائی جاتی ہیں اور لعنت ملامت ہوتی ہے حتیٰ کہ

---

[۱] والٹر ایم گلیجن "دمین انڈر پولیگمی" ص ۲۱۴۔ لنڈن۔ تاریخ ندارد (انگریزی میں)

[۲]۔ مولانا محمد ادریس انصاری مسلمان ماں کو اولاد پرورش کرنے کے طریقوں کے بارے میں نصیحت کرتے ہیں: "ماں کو چاہیئے کہ بچہ کو باپ سے ڈراتی رہے"۔ دیکھئے "مسلمان بیوی" ص ۳۵۔

حتیٰ کہ اس کی دھپڑوں، ڈنڈوں اور لاتوں سے پٹائی بھی کی جاتی ہے۔ اس "ٹریننگ کورس" میں ماں باپ کے علاوہ گھر کے دوسرے مرد اور عورتیں، بڑے اور چھوٹے سب ہی شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر کوئی بچہ کسی وجہ سے گھر کے کسی ایک یا زیادہ افراد کو پسند ہو، تو وہ اپنے پیار و محبت اور لاڈ چاؤ میں دوسرے سرے پہنچ جاتے ہیں اور اس لاڈلے بچے کو متاکر بگاڑ دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے مسلمان ماں سب سے زیادہ قصوروار ہوتی ہے۔ کیونکہ مسلمانوں میں ایسی مائیں اکثر وہ ہوتی ہیں جو خاوندوں کے جور و ستم کی ماری ہوئی اور ساس سسر کی بدسلوکی سے نالاں ہوتی ہیں اس لئے وہ اپنے بچے میں، خاص طور پر اگر وہ بیٹا ہو، اپنا غمخوار اور سہارا تلاش کرتی ہیں۔ بہر حال بچے سے سلوک کیسا ہی ہو، یہ ہمیشہ گھر کی سیاست کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ بچے کی ڈانٹ ڈپٹ پٹائی اور لاڈ چاؤ اس کی تربیت اور تعمیر شخصیت کی غرض سے نہیں بلکہ گھر کے مختلف افراد کے باہمی جھگڑوں، چپقلشوں اور رنجشوں اور مخالفتوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اس گھریلو پالیٹکس میں بچہ تو محض ان کی باہمی محبتوں اور نفرتوں کا تختۂ مشق یا آلۂ کار بن جاتا ہے۔ بہرکیف، جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، قرابتداری معاشرے کے لئے، بچوں کی ایسی تربیت، خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، اپنی اپنی طرح سے بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ اس قسم کی تربیت اس معاشرے کے نسلی تسلسل میں نرسری سکول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لاشعوری عمر میں یہ ان کے دل و دماغ میں اس ماحول کی ایسی عداوتوں، نفرتوں اور مخالفتوں کی داغ بیل ڈال دے گی جو بڑے ہو کر انہیں شعوری اور غیر شعوری طور پر محرک کریں گی اور اس طرح ان کی خاندانی اور قرابتداری جھگڑے اور رنجشیں نسل بعد نسل چلتی رہیں گی۔

بچوں اور خصوصاً لڑکوں کے کردار سازی اور اخلاقی تربیت کا دوسرا طریقہ اُن کو آپس میں لڑانا ہے، خواہ وہ بھائی بھائی ہوں یا کزن، ہم جماعت ہوں یا ہم مدرسہ، ہمسایہ ہوں یا اجنبی۔ ایک اور طریقہ اُن کو شرم دلانا ہے۔ یہ دونوں

طریقے اکثر اکٹھے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جب کبھی کھیل کود میں یا میل ملاقات کے موقع پر کسی بچے کو کسی دوسرے بچے کے ہاتھوں کوئی ہار اور شکست ہتک اور اہانت ہو جائے یا ضرب اور چوٹ لگ جائے جو اس سے عمر میں کم، جسم میں چھوٹا، طاقت میں کمزور، اور حیثیت اور رتبے میں ادنیٰ ہو تو اس کی ماں، باپ، رشتہ دار اور ساتھی یا استاد اور معلم اسے ترکی بہ ترکی جواب دینے پر اکساتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "او ڈرپوک! دیکھو کیا وہ تیرے جتنا بڑا ہے؟" "جاؤ اس کو مارو" "اس کو گالی دو" "اس کا منہ چڑاؤ" یا "اس پر تھوکو" اس طریقے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر دوسرا بچہ غریب ہو یا ادنیٰ حیثیت کا ہو یا آنکھ ناک ہاتھ ٹانگ وغیرہ سے ناقص ہو تو اس بنا پر اس کی ہیٹی کی جاتی ہے اور بدسلوکی کی جاتی ہے، اس کے جسمانی نقص کی بنا پر اس کو ہتک آمیز ناموں اور الفاظ سے پکارا جاتا ہے، مثلاً اسے کانا، بہرہ، لنگڑا وغیرہ کے القاب سے پکارا جاتا ہے اور اسکے لباس وغیرہ کا مذاق اڑایا جاتا ہے یا ایک بچے کی ذات، قبیلے، رنگ ونسل، مذہب اور فرقے کی بنا پر تعریف کی جاتی اور فخر جتایا جاتا ہے اور دوسرے کی انہی بنا پر تحقیر و تذلیل کی جاتی ہے ظاہر ہے کہ یہ طریقہ گھر کے اندر کی نسبت مردسے میں اور مدرسے اور گلی کوچوں میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ جہاں الفاظ و حرکات بھی زیادہ کرخت اور درشت استعمال کئے جاتے ہیں۔ بہر حال طریقہ کوئی سا استعمال کیا جائے اور گھر کے اندر ہو یا باہر، ایسے موقعوں پر سب بڑے اور چھوٹے اپنے الفاظ و حرکات تحسین سے ایک بچے کی حوصلہ افزائی اور دوسرے بچے کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ اس طرح بعض بچوں میں اپنے خاندان، ذات پات، برادری اور قبیلے کی شان و شوکت، بڑائی اور تکبر، برتری اور نخوت کے جذبات اور خیالات سرایت کر جاتے ہیں اور دوسرے بچوں میں اپنی خاندانی حیثیت اور ذات برادری کی نسبت ذلت و خواری، فرومائیگی اور رزالت، کمتری اور بے قدری کے احساسات اور تصورات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح والدین، رشتہ دار اور عزیز، ہمسائے اور ملاقاتی، بلکہ استاد اور ماسٹر بھی اپنے بچوں اور شاگردوں کے دل و دماغ میں بچپن ہی سے دوسرے بچوں سے خاندان، ذات پات، برادری، قبیلے، رنگ و

نسل، زبان، مذہب اور فرقے اور دوسرے فرق اور امتیازات کی بنا پر نفرت اور مخالفت کے جذبات اور تعصبات دلنشین کر دیتے ہیں۔

"مبارک ہو! بیٹا ہوا ہے!!"

پردہ سوسائٹی میں تعمیر شخصیت کا بدترین طریقہ بیٹے اور بیٹی، لڑکے اور لڑکی میں فرق اور امتیاز جتانا ہے، جس کا مقصد بیٹے کو بیٹی اور لڑکے کو لڑکی پر ترجیح اور فوقیت دینا ہے۔ اس لحاظ سے نہ صرف باپ اور دوسرے عزیز و اقارب، بلکہ بعض اوقات ماں بھی بیٹے کو زیادہ شاندار اور قابلِ قدر ہستی تصور کرتی ہے اور اپنی بیٹی کو کمتر اور گھٹیا چیز سمجھتی ہے۔ یہ غیر معقول اور ناروا فرق یومِ پیدائش ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ جب بیٹا پیدا ہونے پر ہر طرف سے مبارک باد کی صدائیں بلند ہوتی ہیں جب کہ بیٹی ہونے پر اظہارِ رنج و ملال ہوتا ہے، اگرچہ بعض خاندانوں اور طبقوں میں علانیہ طور پر اور بعض میں دبی زبان ہیں، بہر صورت، اس طرح روزِ اول ہی سے لڑکے اور لڑکی کے اس فرق کو ایک کی شان و شوکت اور فخر اور افضلیت کا ذریعہ اور دوسرے کی کمتری، مذلت، رسوائی اور نحوست کا باعث بنایا جاتا ہے اور ان دو قسم کے بچوں میں ان کی جنس کی بنا پر امتیازی سلوک شروع ہو جاتا ہے، جو ان کے حساس ذہن و شعور کو ہمیشہ کے لئے متاثر کرتا ہے اس طرح یہ فرق اور سلوک بیٹوں کو آئندہ زندگی میں کامیابی اور سرخروئی کا سرچشمہ اور خاندان اور قرابتی گروہ کا سہارا تصور کرتا ہے اور بیٹیوں اور لڑکیوں کو "پرایا مال" اور خاندان اور قرابتداری گروہ کے ننگ و ناموس پر دھبہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے لڑکوں میں برتری، خوش فہمی اور مردانہ افضلیت اور حکومت چلانے اور گھمنڈ کرنے کے تصورات اور رجحانات پیدا کئے جاتے ہیں اور بیٹیوں کو فضول بلکہ منحوس چیز سمجھا جاتا ہے[1]۔

---

[1] اخبار خواتین "بچوں میں حاکمیت کا تصور مت پیدا کیجئے": "وہ خاتون چاہتی ہیں کہ بہنیں جو بھائیوں کے ساتھ سکول سے پڑھ کر آتی ہیں آتے ہی بھائیوں کے جوتے اتاریں ان کا یونیفارم ہینگر پر لٹکائیں، ہاتھ منہ دھونے کو پانی دیں کھانا انکے آگے رکھیں ... ایک ان پہ موقوف نہیں۔ اکثر گھروں میں دیکھا گیا ہے کہ لڑکوں کو فوقیت دی جاتی ہے" شمارہ بتاریخ ۲۳ فروری تا یکم مارچ ۱۹۷۴ء۔ کراچی

ظاہر ہے کہ ایسے فرق اور امتیازی سلوک کا طریقہ پردہ سسٹم اور قرابتداری معاشرے میں مرد کی فوقیت اور زور وجبر کے جواز اور عورت کی کمتری اور کم مائیگی کے تصورات اور آئیڈیالوجی کے لازمی جزو اور اس نظام معاشرت کے قیام و دوام کی ضروری شرط ہے

علاوہ ازیں، پردہ سوسائٹی اور خاندان میں بچوں کی تعلیم و تربیت منفی طریقوں سے کی جاتی ہے۔ انہیں اکثر امتناعات اور ممانعتوں کے ذریعے سکھایا پڑھایا جاتا ہے اور اکثر یہ کہا جاتا ہے "باہر مت جاؤ" "کھیلو مت" "گاؤ مت" "ناچو مت" "یہ آرٹ مت سیکھو" "وہ کام مت کرو" وغیرہ وغیرہ۔ اس کے برعکس ماں باپ، عزیز اور رشتے دار، استاد اور معلم انہیں مثبت انداز میں کچھ کام یا ہنر یا شوق پورا کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ ماں تو اپنی محدود اور مقید دنیا میں اتنے خدشوں اور وسوسوں کی شکار ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بے اختیاری طور پر وہی خوف اور وسوسے دل میں ڈال دیتی ہے جو اس کے دل میں پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں اور کوئی کام یا مشکل کا مقابلہ کرنے میں اس کی مدد نہیں کرتی اور کر بھی نہیں سکتی۔ باپ کو نہ اتنی فرصت ہوتی ہے اور نہ ہی اتنی رغبت اور صلاحیت کہ وہ اپنے محدود خیالات عقائد اور تعصبات سے باہر کی چیزوں کے متعلق اپنے بچوں کی حوصلہ افزائی کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کم عمری ہی سے مسلم معاشرے میں بچوں کی عادات اور اذہان کا نشوونما رک جاتا ہے۔ یہ عام مشاہدہ کہ مسلمانوں کے بچے شروع شروع میں ویسے ہی ذہین، متجسس اور شوق کے مالک ہوتے ہیں جیسے دوسری اقوام کے بچے مگر اس منفی تعلیم و تربیت اور اس کے امتناعات، سزاؤں اور دھمکیوں کے باعث جو اس تربیت کے لازمی جزو ہیں مسلمان بچے رفتہ رفتہ اپنی اوائل عمر کے ذوق و شوق، تجسس اور تلاش کے مادے اور جستجو اور کوشش کی صلاحیتیں کھو بیٹھے ہیں اور دس بارہ سال کی عمر کو پہنچنے تک اپنے فعل و عمل، رویوں اور چال چلن میں خاموش سہمے ہوئے، وسوسہ دار اور لاپروا عادات کے مالک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی ذہانت اور تخیل کی قوتیں کند ہو جاتی ہیں اور وہ لکیر کے فقیر بن جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر ایسے بیٹے اور باپ میں جو کسی

کام یا کمال کی تکمیل اور تحصیل کا شوق اور آرزو رکھتا ہو، تناؤ اور تکرار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال میں بیٹا تکمیلی توقعات والے باپ سے اجتناب اور فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس سے دونوں میں وہ خوف اور فرار کی عادات جو بیٹے کے دل میں بچپن ہی سے سرایت کر گئی تھیں بروئے کار آتی ہیں۔ اس کے برعکس، اگر بیٹا کسی تکمیلی خیالات اور مقاصد کا مالک ہو تو ماں اُسے اپنے وسوسوں اور خدشات کی وجہ سے ایسے راستے پر چلنے سے منع کرتی ہے۔ اس طرح پر وہ سوسائٹی میں نئی اور پرانی نسلوں کا فرق شروع ہو جاتا ہے جو بعد میں پوری طرح سے رونما ہوتا ہے۔

اس سلوک اور تربیت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بچے اپنے ماں باپ اور بزرگوں کے خوف اور سزا کے ڈر کے مارے اور مار پیٹ سے بچنے کی خاطر اُن سے ہر طرح کے جھوٹ بولنے لگتے ہیں اور حیلے بہانے اور فریب سے کام لینے لگتے ہیں۔ وہ اپنے فرائض سے بچنے اور کام سے دل چرانے لگتے ہیں وہ بڑی دیدہ دلیری سے ہر خرابی اور برائی سے منکر ہو جاتے ہیں۔ اپنی شرارتوں اور خرابیوں کا الزام دوسروں پر دھرنا سیکھ جاتے ہیں، وہ دوسرے بچوں کی چغل خوری اور غیبت کرنے لگتے ہیں۔ اور جب ذرا بڑے ہوتے ہیں تو سکول سے بھاگنے لگتے ہیں۔ بہر حال ان بچوں اور باپوں میں ایسے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں جن میں باپ سے باتوں کو چھپایا جاتا ہے اور باپ کو خوف وہیبت کی نگاہوں اور شک وشکایت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح ایسی باتوں کی ابتدا ہو جاتی ہے جو بالآخر لڑکوں کو بغاوت اور حکم عدولی پہ مائل کریں گی اور انہیں "ناخلف" اولاد بنادیں گی۔

بچّے کی کردار سازی کے پہلے تین نازک ترین مراحل کی نوعیّت ہر انسانی بچے کی عمر کے کم از کم پہلے بارہ سال کردار سازی اور تشکیل شخصیّت کے لئے نہایت اہم اور نازک مراحل ہوتے ہیں، جن کو اس غرض سے تین ادوار یا مراحل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، یعنی یوم پیدائش سے تین سال اور تین سے پانچ سال کی عمر تک اور پانچ سال سے بارہ سال کی عمر تک۔ ان ادوار میں ماں کی

حیثیت، یعنی اس کے ذہن و فکر، عادات و کردار کا مقام اور رول فیصلہ کن اور بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور ان میں باپ کی حیثیت اور رول ثانوی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باپ / خاوند کو مرد کی افضلیت، برتری، طاقت اور غلبہ کے وہ تمام قصے اور کہانیاں، روایات اور نظریات، تصورات اور عقائد کو قطعاً بھولنا پڑے گا جو پدر سرداری معاشرے اور آئیڈیالوجی کے پرچارک اور پوجاری جن میں پردہ سوسائٹی اور آئیڈیالوجی کے علمائی پرچارکوں کے خیالات اور نظریات کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اس کے کان اور دل و دماغ میں ڈالتے رہتے ہیں، در اصل بچے کی عمر کے ان نازک ترین ادوار میں باپ کی حیثیت اور رول خاموش اور سعادت مند مددگار اور ساتھی کی ہونی چاہیئے جو اپنے بچے کی کردار سازی اور تعمیر شخصیت کے فرائض کی انجام دہی میں اپنی بیوی کی تمام کوششوں اور کاوشوں میں کوئی بیجا اور بے محل دخل اندازی اور گڑبڑ پیدا نہ کرے بلکہ انہیں اپنی ضروریات، خواہشات اور اختیارات پر ترجیح دیتا اور مقدم سمجھتا ہے مگر درحقیقت وہ کرے گا وہی کچھ جو اس کے معاشرے اور تہذیب و تمدن کے رسوم و رواج، اور بنیادی آئیڈیالوجی کے عقائد اور نظریات ہوتے ہیں، کیونکہ ہر ایک باپ اپنے معاشرے کا بچہ ہوتا ہے۔

بہرکیف، بچے کی عمر کے یہ ادوار اس لئے نازک یا کریٹیکل نوعیت کے حامل ہوتے ہیں کہ ان میں وہ محض خواہشات، ضروریات اور حرکات کا بنڈل ہوتا ہے، جسے ان عادات، صلاحیتوں اور خوبیوں اور خاصیتوں کی کوئی شُد بُد اور شعور نہیں ہوتا جو ماں باپ اور معاشرہ اُسے بتانا اور سکھانا چاہتے ہیں۔ پس وہ ایسا بے ڈھب اور بے صورت ہیولیٰ ہوتا ہے جس کے ذہن و کردار کی تشکیل و تعمیر اولین طور پر ماں کرتی ہے۔ ماں یہ کام اپنی عادات و کردار، اپنے خیالات اور عقائد اور اپنی حرکات و سکنات اور اپنے افعال اور مثال کے ذریعے کرتی ہے۔ وہ جو سلوک اس سے پہلے پانچ سال میں خصوصاً اور پہلے بارہ پندرہ سال میں عموماً کرے گی، جو عادات اور حرکات اسے سکھائے گی اور جو خیالات اور تمنائیں اور آرزوئیں اس کے دل و دماغ میں ڈالے گی، ویسا ہی بچہ کم و بیش

بن جائے گا۔ اس لحاظ سے بچہ ان ابتدائی سالوں میں قطعاً ماں کے ہاتھوں میں کھلونا سا ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اُسے بنالے ۔ مگر ماں خود اپنے معاشرے اور تہذیب و تمدن اور ان کی آئیڈیالوجی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی اُن کی ساختہ پرداختہ ہوتی ہے اور اپنے خاوند کی طرح اپنے معاشرے کی بچی ہوتی ہے ۔ وہ وہی باتیں، وہی حرکات و سکنات، وہی خیالات اور عادات سکھائے گی جو اس نے اور اس کے میاں نے اپنے ماں باپ اور خاندان کے دوسرے ممبروں سے اور اپنے معاشرے کے دوسرے افراد سے سیکھے تھے

پردہ دار ماں کا غیر تربیتی اور غیر تکمیلی رول

پردہ سنڈروم کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کہ نوجوان ماں اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں نہایت غیر تربیتی رول ادا کرتی ہے ۔ اُسے اپنے بچے کو باقاعدہ، باسلیقہ اور باترتیب تربیت دینے کا نہ شعور ہوتا ہے اور نہ میلان طبع اور نہ ہی اس کے اردگرد کا ماحول اُسے ایسی تربیت دینے کی کوئی ترغیب و تحریک اور آزادی اور اجازت دیتا ہے ۔ اس کے برعکس وہ اپنے بچے میں اسی قسم کی عادات، رویے اور رجحانات منتقل کرنا شروع کر دیتی ہے جو اس نے خود اپنی پردے میں بند بیس پچیس سالہ زندگی میں سیکھے اور حاصل کئے ہیں ۔ اگر کوئی تعلیم یافتہ اور جدیدیت پسند ماں اپنے ننھے منھے بچوں کو توجہ اور تربیت دینے کی صلاحیت یا تمنا رکھتی ہے تو وہ اپنے حاسد سسرال والوں اور زنانخانے کی دوسری عورتوں اور ہمسائیوں کے ٹھٹھے مخول اور اور جگ ہنسائی کا نشانہ بن جاتی ہے ۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمنا اور آرزو کے باوجود اس میں عزم و ارادے کا فقدان اور سلیقے اور تنظیم کی صلاحیت بھی نہ ہو کہ اس فرض کو کما حقہ پورا کر سکے اس ضمن میں پاکستانی تعلیم یافتہ عورتوں کے علمی ذوق و شوق کا ایک سروے نے بہت حوصلہ شکن نتائج منکشف کئے ہیں چند سال ہوئے یونسکو کی ایک ٹیم نے ایک جائزہ بعنوان "مغربی پاکستان کی خواتین کیا پڑھتی ہیں ؟" شائع کیا ۔ اس کے مطابق پاکستان کی چار تعلیمیافتہ عورتوں میں صرف ایک کو اُن کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوتا ہے

جو بچے کی دیکھ بھال اور دودھ پلانے والی ماں کے فرائض اور کاموں کے متعلق ہوتی ہے۔

پردہ سوسائٹی میں بچے کے پہلے تین سال

پردہ سوسائٹی کے متذکرہ بالا حالات اور اثرات کے باعث بچوں کی عمر کے پہلے تین سالوں میں یعنی ایام رضاعت میں مائیں اپنے رضاعی فرائض کو بڑے بدترتیبی انداز اور غیر اسلوبی طور و طریقوں سے سرانجام دیتی ہیں۔ چونکہ ان کا خاندانی ماحول اور معاشرتی حالات بے قاعدگی اور بدنظمی سے بھرے ہوتے ہیں اور ان کی اپنی عادات بھی بڑی بے قاعدہ اور بدسلیقہ ہوتی ہیں، اس لئے وہ اپنے شیر خوار بچوں کو دودھ پلانے کے اوقات اور روٹین (   ) کا کوئی خیال اور لحاظ نہیں رکھتی ہیں اور نہ ہی بچوں کو پالنے پوسنے اور نہلانے دھلانے میں کوئی باقاعدگی اور پابندیٔ وقت کرتی ہیں۔ وہ جب چاہتی ہیں یا جب بچہ روتا ہے دودھ پلا دیتی ہیں اور جب چاہتی ہیں نہلا دھلا دیتی ہیں۔ اسی طرح جب بچہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو اس کے کھلانے پلانے میں بھی بڑی بے قاعدگی اور بدسلیقی برتی جاتی ہے۔ ان کے کپڑوں اور جسموں کی صفائی کا نہ کوئی خیال اور نہ کوئی درستی کی جاتی ہے۔ چند خاص موقعوں اور تقریبات کے سوا، وہ دن بھر میلے کچیلے گندے کپڑوں اور جسموں میں رونے پھرتے ہیں۔ اسی عمر میں ہمارے ملک کے ہر گھرانے اور کنبے میں لڑکے اور لڑکی میں امتیازی سلوک بھی شروع ہو جاتا ہے[2]، مثلاً لڑکوں کو بڑے لاڈ چاؤ میں رکھا جاتا ہے۔ ایک انگریز استانی، جو قیام پاکستان کے وقت لاہور میں مقیم تھی، پاکستانی بچوں، خاص طور پر، شیر خوار لڑکوں کے بارے میں لکھتی ہے:

> "کردار کا بگاڑ مہد سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور اس کے اثرات انسان کے ساتھ لحد تک رہتے ہیں۔ ہر ایک پاکستانی گھر میں شیر خوار لڑکا بادشاہ کی طرح رکھا جاتا ہے، جس کی سارا گھر پوجا کرتا ہے۔ مگر اسے کوئی

---

[1] "مغربی پاکستان کی خواتین کیا پڑھتی ہیں؟" صفحات ۶۴ اور ۶۵ تا ۶۳۔ نیشنل بک سنٹر آف پاکستان بندر روڈ کراچی۔ ۱۹۶۴ء۔

[2] پاکستانی گھروں میں لڑکوں اور لڑکیوں میں امتیازی سلوک اور تفریق کے بارے میں امداد نظامی "کراچی کے گھروں کی سروے رپورٹ"۔ "اخبار خواتین" مورخہ ۱۷ تا ۲۳ جنوری ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۱۔

یہ چیز بھی باقاعدگی سے نہیں سکھائی جاتی، حتیٰ کہ اس کے ابتدائی طبعی افعال بھی۔ وہ جہاں کھڑا ہوتا ہے۔ وہاں ہی پیشاب کر دیتا ہے، خواہ وہاں عمدہ قالین بچھی ہو۔ اور مہمان جمع ہوں۔ البتہ دوسری حاجت گھر کے پچھلے حصوں میں رفع کی جاتی ہے، مگر بلا کسی باقاعدگی کے۔ اس کی ماں یا دودھ پلائی اُسے وقت بے وقت دودھ پلاتی رہتی ہے۔ اسکے سونے اور جاگنے کے اوقات بھی مقرر نہیں ہوتے۔ اگر وہ سو رہا ہو اور مہمانوں کو خوش کرنا مقصود ہو، تو اسے جب چاہا جگا لیا جاتا ہے جب وہ خود کھانا کھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو وہ نہایت متنفرانہ طریقے سے کھاتا ہے، کیونکہ اُسے یہ ہرگز نہیں سکھایا جاتا کہ صفائی اور نفاست سے کس طرح کھایا کرتے ہیں۔ وہ اپنے معمولی اور سادے کپڑے بھی خود نہیں پہن سکتا[1]

ایک اور انگریز عورت جو سیاحت کی شوقین تھی، عربوں کے گھروں اور حرم سراوں کے متعلق لکھتی ہے:

"شیر خوار بچے حرم کے کھلونے ہوتے ہیں اور میرے خیال میں چوما چاٹی کے اس سیلاب سے قدرے پریشان اور تنگ مزاج بن جاتے ہیں جو اُن پر اس وقت نازل ہوتا ہے جب وہ قہوہ کے جام کے دوران ایک خاتون کی گود سے دوسری خاتون کی گود میں دیئے جاتے ہیں۔ بڑے بچے گھر کے اندر اور باہر بھاگے پھرتے ہیں اور ایک گھر کی خبریں دوسرے گھروں میں پہنچاتے رہتے ہیں۔ وہ میرے کمرے میں آزادانہ طور سے آتے جاتے ہیں اور اسی طرح اور لوگ بھی، خواہ وہ غلام ہوں یا خادمائیں، گول چہروں والی اور زیادہ صحت مند بدو لڑکیاں اور بڈھے اور بڑھیاں ہوں جو دوائی لینے آتی تھیں۔ وہاں ایک

---

[1] ایا۔ ایف لوڈے براؤ "پنجاب پریوڈ" ص ۱۱۷ (انگریزوں میں)

طرح کی دوستانہ جمہوریت ہر ایک کو خیر مقدم کرتی ہے۔ غلیظ ترین شخص قالین پر بیٹھ سکتا ہے اور اُسے تولیے کی طرح استعمال کر سکتا ہے یا اس کا ایک سرا اٹھا کر نہایت احتیاط سے اس کے نیچے تھوک سکتا ہے۔ در اصل یہاں زندگی اپنی تمام تفاصیل میں قرون وسطائی کاسل (فیوڈل قلعہ) کی طرح تھی یعنی ایسی زندگی جو اس قدر مشترک ہوتی ہے کہ اس میں نجی راز داری اور صفائی نایاب تکلف ہوتی ہے۔[1]"

بہر کیف، اگر کوئی ماں اپنے مادرانہ ذمہ داریوں اور بچے کی دیکھ بھال کے فرائض کو زیادہ انضباط اور باقاعدگی اور عمدگی سے سر انجام دینا چاہے تو گھر کے جھگڑوں اور حسدوں کے ماحول میں خاص طور پر بڑے بڑے مشترکہ خاندانوں کی فضا میں وہ ایسا کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ زیادہ امیر گھرانوں میں مائیں اپنے فرائض عموماً خادماؤں اور اناؤں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ صرف جدید، مربوط تعلیم یافتہ گھروں میں نوجوان ماں اپنے شوہر کی مدد اور تعاون سے یہ فرائض مقابلتاً زیادہ توجہ اور باقاعدگی سے سر انجام دیتی ہے:

"زیادہ تعلیم یافتہ اور معلومات رکھنے والی مائیں تین سے چار گھنٹوں والے وقفے والے اصول پر عمل کرتی ہیں اور ان کے بیچ میں بچے کو دودھ نہیں پلاتی ہیں، خواہ وہ روئے اور پریشان کرے۔ بعض ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ مائیں اوقات کی کوئی پابندی نہیں کرتیں۔ جب بچہ روئے یا مانگے دودھ پلا دیتی ہیں۔[2]"

ایام رضاعت میں پردہ دار ماں وہ تمام خوف، خدشے، محرومیوں اور مجبوریوں

---

[1] L.F. Loveday Prior, *Punjab Prelude*, p. 117.

[2] Talat Durrani, "*An Exploratory Study of Child-rearing in an Urban Community in the N.W.F.P*, in the Paksitan Psychological Studies, Vol. I No. I. 1969. Peshawar

کے احساسات جن میں وہ خود بھی مبتلا ہوتی ہے اپنے ننھے منے کے دل میں شعوری یا غیر شعوری طور سے ڈالنے لگ جاتی ہے اور اپنے جیسی لاچارگی اور انحصار پسندی دلنشین کرنے لگتی ہے۔ جب بچہ ذرا بڑا ہوتا ہے اور اپنے پاؤں چلنے لگتا ہے تو وہ اپنی باتوں اور اپنی حرکات وسکنات سے اسے بار بار تاکید کرتی ہے کہ زنانخانے سے باہر مت نکلے اور جب ذرا اور بڑا ہوا تو گھر سے باہر نکلنے سے بھی منع کرتی ہے کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتی کہ ہمسائے کے ایسے بچوں سے کھیلے جو خاندان یا رشتہ داری میں اس سے مختلف یا شریف نہیں۔ اس طرح وہ پردہ اور قرابتداری معاشرے کے وہ تمام تعصبات، خدشات اور خوف اس کی دل میں ڈال دیتی ہے جو اس کی پردہ دار زندگی کے لوازمات ہیں اور اسے اپنی طرح ایک پرخوف، ڈرپوک، شرمیلی اور خودبین شخصیّت بنانا شروع کر دیتی ہے۔

علاوہ ازیں، پردہ دار ماں اور زنانخانے کی دوسری عورتیں چھوٹے بچوں کو اپنی ضروریات اور احتیاجات کے متعلق خود کام کرنے کی کوئی صلاحیت اور عادت نہیں سکھاتی ہیں۔ بلکہ ہر کام اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی ماں اور دوسری عورتوں کا منہ تکتے اور سہارا لیتے ہیں۔

"یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ وہ شیر خواہ بچے جو اس طرح پرورش پاتے ہیں اور جنہیں بے انتہا دلجوئی سے پالا جاتا ہے اور اتنی بھی تربیت نہیں دی جاتی جتنی ایک کتیا اپنے پلّوں کو دیتی ہے، تو وہ نمایاں طور پر بدمزاجی سے مبرا ہوتے ہیں۔ وہ اس وقت چلاتے ہیں جب چوٹ لگے۔ وہ اس وقت روتے ہیں جب انہیں کسی چیز سے منع کیا جائے، مگر انہیں کبھی کسی چیز سے منع نہیں کیا جاتا۔ ان کی دنیا ان کی ہر خواہش کو پوری کرنے کو تیار رہتی ہے۔ پس وہ توقعات اور خواہشات سے بھری دنیا میں بڑے ہوتے ہیں۔ مگر انہیں کبھی اپنا راستہ آپ بنانے کے لئے جدوجہد کرنے یا تکلیف دہ اور مشکل حالات

کا مقابلہ کرنے کی تربیت نہیں دی جاتی۔ وہ تن آسانی میں پلتے ہیں۔ بلا شبہ، میں یہ سب کچھ لڑکوں کے متعلق کہہ رہی ہوں[1]۔"

بیشک اُن گھروں میں جن میں پردے کی سختی کم ہوتی ہے اور جہاں تعدد ازدواج کے اندیشے کم ہوتے ہیں، وہاں ماں اپنے فرائض کو زیادہ بہتر طور سے سمجھتی اور انجام دیتی ہے۔ مگر پاکستان میں ایسے گھرانے معدودے چند اور معاشرتاً بے اثر ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جن خاندانوں، گروہوں اور علاقوں یا ملکوں میں پردہ سسٹم کی پابندی سخت ہوتی ہے، اُن کے گھروں میں بچوں کے لباس اور بدن کی عادات زیادہ بدسلیقہ، زیادہ بے قاعدہ، زیادہ غیر پابندِ وقت زیادہ کاہلانہ اور زیادہ لاپرواہوتی ہیں۔

پردہ دار باپ اور شیر خوار بچہ ایک ماہر نفسیات لکھتا ہے:۔

"ماں اور باپ کے تعلقات خاندان کی مثلث کی دوسری دو طرفوں کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ننھا بچہ یہ محسوس کرے کہ اس کی قادر مطلق ماں باپ سے ڈرتی ہے تو حتماً بچہ بھی باپ سے ضرور ڈرنے لگے گا، بیشک، شیر خوار بچہ اپنے اردگرد کی چیزوں کو اپنی ماں کے نقطہ نگاہ سے جانچتا اور ان سے "متحرک" ہوتا ہے۔ وہ دنیا کو اپنی ماں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ پس اس کے لئے باپ وہ کچھ ہے جو ماں اپنے ردعمل سے اُسے ظاہر کرتی ہے۔ ماں سے ہمدردی میں بچہ بھی ماں کے خوف، نفرت، محبت یا پسندیدگی کے رویے اختیار کرلیتا ہے۔ بچہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ باپ ماں کی محبت پر کچھ عجیب قسم کا اختیار رکھتا ہے اور وہ خود بھی وہی اختیار حاصل کرنا چاہتا ہے مگر اس بات کا بہت کچھ انحصار اس پر ہے کہ وہ اس اختیار کے کیا معنے لیتا ہے۔ اگر باپ ماں کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے تو کم سن بچے

---

[1] لوڈے پرائر ایضاً ص ۱۱۶

کا ماں کا احترام اور لحاظ برقرار رہے گا، اگر وہ اس پر رعب داب رکھے گا اور وہ اس کے رعب کو مانتی بھی ہو تو بچہ کی نگاہ میں طاقت نہ صرف برحق ہو گی۔ بلکہ وصف بھی بن جائے گی، جیسے وہ محبت کرے گی تو وہ بھی اس سے محبت کرے گا۔ اس کے برعکس اگر ماں باپ کی رائے کو اختیار کا واحد ذریعہ مانے گی تو بچے میں بالکل مختلف جذباتی رویہ پیدا ہو گا یہ تمام اگر مختلف خاندانوں بلکہ مختلف ثقافتوں میں اختلافات کے امکانات کی نشان دہی کرتے ہیں[1]۔"

پردہ سوسائٹی میں شیر خوار بچے کے لئے باپ ایک غیر موجود شخص ہوتا ہے۔ بچہ زنانخانے میں رہتا ہے اور باپ باہر مردانے وغیرہ میں سارا دن گذارتا ہے، جب وہ زنانخانے میں آتا بھی ہے تو پردہ سسٹم کے باعث بچے اور باپ میں ایک نفسیاتی دیوار حائل ہو جاتی ہے، جو اس خوف اور دہشت سے بنی ہے جو باپ کی طرف سے ماں کے دل میں بیٹھ چکے ہیں۔ پردہ دار خاوند کا اپنی بیوی یا بیویوں سے سلوک لازماً سخت گیر اور اذیت انگیز ہوتا ہے، کیونکہ اس طرح ہی وہ اپنا رعب داب اور حاکمانہ اختیار اور دبدبہ قائم رکھ سکتا ہے۔ ننھا بچہ باپ کی زنانخانے میں آمد پر خوف اور سراسیمگی کی لرزش بلکہ بھگدڑ کو نوٹ کرتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ باپ کے آنے پر ماں میں گھبراہٹ اور بے چینی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں اور گھر کے دوسری عورتوں میں خوف اور فرار و اجتناب کے ردعمل ظاہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا بچے کے ننھے سے دل میں بھی بتدریج یہی ردعمل اور یہی جذبات سرایت کر جاتے ہیں۔ وہ بھی باپ کے زنانخانے میں آمد پر خوف اور اجتناب کے ردعمل ظاہر کرنے لگتا ہے۔ اور جب ذرا ہوش آنے لگتی ہے تو باپ سے منہ چھپاتا ہے اور اس کے پاس سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگتا ہے، خوف و فرار کے اس ردعمل سے بعد ازاں پردہ دار بچوں کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں دو متضاد عادات پیدا ہو جاتی ہیں، اول ماں پر بیجا سہارا لینا اور باپ سے بیجا احتراز کرنا۔

ص ۱ Ian D Suttie, *The Origins of Love and Hate*, p. 106. Penguin Books, 1963.

تین سے پانچ سال کی عمر تک

ان ابتدائی ردعملوں اور رجحانات کے ساتھ پردے میں پلنے والا بچہ جب ذرا بڑا ہوتا ہے تو ماں کی گود سے اتر کر گھر میں اور گھر سے باہر بھی نکلنا شروع کرتا ہے۔ اب وہ اچھی طرح سے بولنے اور چلنے پھرنے لگ جاتا ہے۔ مگر اپنی زندگی کے اس مرحلے میں وہ پردہ سسٹم کے اندرونی اور بیرونی بندوبست سے دوچار ہونے لگتا ہے اگرچہ اب بھی وہ زیادہ تر وقت زنانخانے میں گذارتا ہے، مگر گاہے بگاہے باہر بھی جاتا ہے۔ جہاں اسے گھر کے اندر کا لاڈ چاؤ، نرمی اور ملائمی کی بجائے کرختگی اور درشتی کے مردانہ ماحول سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اس میں گھر کے اندر بھاگ جانے اور ماں کا سہارا اور انحصار لینے کا رجحان اور زیادہ بڑھ جاتا ہے اور باپ سے بچنے کا رجحان مزید مضبوط ہو جاتا ہے، بلکہ اس ردعمل میں اضافہ اس وجہ سے بھی بڑھتا ہے کہ وہ زنانخانے سے باہر سب مردوں سے بھی باپ کی طرح احتراز اور فرار کے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ اور دوسرے مردوں سے پرے پرے رہتا ہے۔ درحقیقت اس مرحلے پر جب اس کی ننھی سی دنیا وسیع تر ہونے اور بدلنے لگتی ہے اور بچہ غیر مانوس لوگوں کو دیکھنے اور ملنے لگتا ہے اسے ماں کی راہنمائی اور راہبری کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مگر عین ایسے وقت پر اور ایسی ضرورت میں پردہ دار ماں اپنے مادرانہ فرائض سرانجام دینے سے قاصر ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر پردہ سوسائٹی کی خاندانی نظام کی بدتربیتی کی نوعیت عیاں ہو جاتی ہے۔ جو فریضہ ایسے نازک مرحلے پر ماں ہی سرانجام دے سکتی ہے وہ پردہ دار ماں انجام دینے سے قاصر رہتی ہے۔ کیونکہ وہ عمر قیدیوں کی طرح زنانخانے میں مقید ہے اور اپنے بچے کے ساتھ باہر کی دنیا میں نہیں جا سکتی اور اسے اس دنیا کے معاملات اور واقعات نہیں سمجھا سکتی۔ ادھر باپ یہ فرض اس لئے پورا نہیں کر سکتا کہ اس میں اور اس کے چار پانچ سالہ بچے میں ایسا نفسیاتی دیوار حائل ہے جو ان دونوں میں دل و دماغ کا رابطہ نہیں پیدا ہونے دیتی۔ اگر اس مرحلے پر باپ نے دوسری

شادی کرلی ہو، تو یہ نفسیاتی فاصلہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس مرحلے پر مسلمان بچے کی زندگی، پر پردہ سوسائٹی کی جنسی تقسیم بھی اثر انداز ہونے لگتی ہے:

"بچہ ہمیشہ بڑی عمر والے مردوں کی دنیا کی بجائے زنانہ دنیا سے منسلک ہوتا ہے۔ رسم ورواج کی تقریبات کے موقع پر بچے عموماً مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ رہتے ہیں۔ اگر اتفاقاً وہ مردوں کے اجتماع میں چلے جائیں تو انہیں اپنی حیثیت میں رہنا پڑتا ہے اور پہلے موقع ملنے پر وہاں سے کھیل کود کے لئے یا عورتوں میں جانے کے لئے چلے جانا پڑتا ہے۔ معاشری عمل کی اس سطح پر بچوں اور بڑوں میں میل جول اور باہمی عمل نہیں ہوتا ہے اگرچہ بچے کی زندگی کی سمت بندی بالغ مقاصد، ذمہ داریوں اور اقدار کی جانب ہوتی ہے۔ تاہم اُسے بڑوں کے دائرے میں داخل ہونے اور بڑوں کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے منع کیا جاتا ہے۔ اور بڑے بھی اپنے بچوں سے یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ ان کے معاملات اور اُن کے دائرۂ حیات کے بارے میں کسی طرح اپنی رائے کا اظہار کریں[1]۔"

اس طرح پردہ دار ماں اپنی پابند اور مقید زندگی کے باعث اور پردہ دار باپ اپنی مردانہ مصروفیات، رویوں اور اقدار کے باعث بچے کی پھیلتی ہوئی دنیا میں کوئی راہنمائی اور راہبری نہیں کرتے۔ لہٰذا پردہ دار بچوں کے کردار اور شخصیت پر، خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، پردہ سسٹم کے جیل نما نظام کے سیاہ سائے پڑنے لگتے ہیں، جو اُن کی عمر کے آنے والے ادوار اور مراحل پر زیادہ سے زیادہ گہرے ہوتے جاتے ہیں۔

اس عمر میں بچے کو ماں سے "وین" یعنی الگ کرنے کا مسئلہ آتا ہے جو بچے کی ماں پر زیادہ انحصاری کے باعث مشکل معاملہ بن جاتا ہے۔ نارمل سوسائٹی

---

[1] ڈاکٹر حامد عمار "ایک مصری گاؤں میں جوان ہونا" ص ۱۴۱ تا ۱۴۲ (انگریزی میں)

میں بچہ تقریباً تین سال کی عمر میں ماں سے علیحدہ ہو کر آزادانہ طور پر گھومنے پھرنے لگتا ہے اور پانچ سال کی عمر تک تو ماں کے سہارے سے بالکل آزاد اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس نفسیاتی عمل میں ماں بھی بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ وہ ننھے بچے کو ہر چھوٹے چھوٹے کام اور حرکات کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیتی ہے، تاکہ وہ آزادانہ اور خود مختارانہ طور پر نئی نئی باتیں دریافت کرے، نئے نئے شوق پورے کرے۔ اس طرح وہ اپنے میں خود اعتمادی، تجسس اور جرأت اور حوصلے کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ مگر پردہ دار ماں ایسی خود مختارانہ تربیت دینے کی کوئی شدید نہیں رکھتی ہے اور نہ ہی اس کا ماحول اور صورتحال اُسے اس کے مواقع دیتے ہیں۔ وہ اپنے بچے کو اپنی محدود اور مقیّد دنیا میں ہی بند رکھنا چاہتی ہے کیونکہ وہ ہی تو اس کی زندگی کا ایک سہارا اور اس کی خوشیوں کا ایک آسرا ہوتا ہے۔ لہذا وہ اس کے گھر سے باہر جانے پر گھبراتی ہے اور کوئی نیا کام یا حرکت کرنے سے پریشان ہو جاتی ہے کہ کہیں اس کے بچے پر کوئی آفت نہ آپڑے یا کوئی "بلا" نہ چمٹ جائے۔ جب وہ اچھی طرح چلنے پھرنے بھی لگ جاتا ہے تب بھی وہ اسے اپنے سے الگ نہیں کرتی۔ اس طرح بچے میں ہر بات میں ماں پر سہارا لینے کی عادت پڑ جاتی ہے جو بڑی عمر تک قائم رہتی ہے۔ یہ عادت ماں سے "وین" یا علیحدہ ہونے میں مانع ہوتی ہے۔ تاہم پردے کی پابندیاں اس نوعیت کی ہیں کہ جب بچہ گھر میں ایسی شرارت کرے جس پر ماں یا کوئی اور بڑا اُسے منع کرے یا سزا دے تو وہ اس سے بچنے کے لئے گھر سے باہر بھاگ جاتا ہے اور ماں دروازے پر کھڑی اُسے واپس بلانے کے لئے بے سود آوازیں دیتی رہتی ہے مگر وہ اب اسکے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ ماں کی اس مجبوری سے جلد ہی فائدہ بھی اٹھانے لگتا ہے۔ جب اس نے ماں یا کسی اور بزرگ کا کہنا نہیں ماننا ہوتا تو وہ زنانخانے سے باہر بھاگ جاتا ہے۔ اور جب گھر سے باہر باپ یا کوئی اور بزرگ کسی بات پر ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے تو وہ گھر کے اندر ماں کے پاس بھاگ آتا ہے۔ اس

طرح وہ گھر کے اندر اور باہر کے گورکھ دھندے میں ماں باپ دونوں کی حکم عدولی کرنے کی عادت سیکھ جاتا ہے۔ جب بڑا ہو کر سکول وغیرہ جاتا ہے تو یہی آنکھ مچولی کا کھیل اپنے استادوں سے کھیلتا ہے اور مدرسے سے بھاگنے اور غیر حاضر رہنے کا سبق سیکھ جاتا ہے۔ جو اس کی کام چوری کی عادت سیکھنے کا پہلا سبق ہوتا ہے۔

پانچ سے بارہ سال کی عمر تک

پردہ سسٹم کی غیر اخلاقی نوعیت اور مسلم معاشرے کی غیر تکمیلی تنظیم بچوں کی زندگی، کردار اور شخصیت کے نشو ونما میں اس سٹیج پر عیاں ہوتی ہے جب بچے اپنی ناز و نخرے والی عمر سے بڑھ کر ایسی عمر میں داخل ہوتے ہیں جب وہ سکول جانے لگتے ہیں اور گھر کی محدود اور مقید دنیا سے نکال کر باہر کی دنیا میں گھومنے پھرنے لگتے ہیں۔ تکمیلی اور ترقی پسند معاشرے میں بچے کی یہ عمر ماں باپ کے فرائض کو پورے طور پر عمل میں لاتی ہے۔ مگر پردہ دار خاندان اپنی تقسیم شدہ حالت کے باعث معاشری اور ثقافتی ترسیل کے نہایت اہم اور حیات پرور فرائض کے نااہل ہوتا ہے۔ اس کے مردانہ غلبے والے ماحول کے باعث پردہ دار ماں میں نہ اتنی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ہی اُسے اتنی اجازت اور آزادی میسر ہوتی ہے کہ وہ آزادانہ طور سے گھر کے اندر اور باہر اپنے بچوں کے کردار اور عادات ذوق و شوق اور خیالات اور اذہان کی تکمیلاتی ترغیب کی طرف سمت بندی کر سکے۔ اس خاندانی زندگی کی نہ صرف اپنی اندرونی حسد اور نفرت، تناؤ اور تنازعے، طلاق اور دوسری شادی کی دھمکیاں اور حقیقتیں مانع ہوتی ہیں، بلکہ پردہ دار ماں کی اپنی ذہنی ناپختگی اور ناتجربہ کاری بھی حائل ہوتی ہے اور حاکمانہ خاوند کا رعب اور دبدبہ بھی اس کی تکمیلی تربیت کاری کے فرائض میں مخل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مشترکہ خاندانوں میں ماں کی حیثیت عملاً بھی صفر کے برابر ہوتی ہے۔ دراصل پردہ دار خاندانوں میں بچہ اتنا ماں کا نہیں ہوتا جتنا سارے خاندان کی مشترکہ ملکیت سمجھا جاتا ہے لہٰذا جب کوئی چاہے، خاص طور پر ساس سسر اور گھر کے مرد اور عورتیں ماں اور

بچے کے بیچ میں مداخلت کر سکتے ہیں۔

بہر حال اس عمر میں بچوں کو سکول بھی جانا ہے، پڑھائی لکھائی بھی سیکھنی ہے۔ میل جول کے طریقے اور آداب بھی سیکھنے ہیں۔ باہر کی دنیا میں گھومنا پھرنا بھی ہے اور اس دنیا کے معاملات اور خدشات کو بھی سمجھنا ہے۔ اپنی پھیلتی ہوئی دنیا کی اقدار اور خیالات نصب العین اور اعلیٰ مقاصد سے بھی روشناس ہونا ہے۔ غرضیکہ ایک تکمیلی اور فعال شخصیت اور کردار کی نشو ونما کرنی ہے۔ ایسی مائیں جو ان ضروریات اور فرائض کو سمجھتی ہیں۔ اپنے بچوں کے ذہن و فکر، عادات اور عمل کی سمت بندی چھوٹی چھوٹی تکمیلات کی جانب موڑ دیتی ہیں۔ اس ضمن میں ڈیوڈ۔سی میکلیلینڈ اپنی کتاب "تکمیلی معاشرہ" میں ایک مشاہدے کے بارے میں لکھتا ہے:

"ماریان ونٹر باٹم (ایک نفسیاتی محققہ) نے معلوم کیا ہے کہ وہ مائیں جو اپنے بیٹوں سے اعلیٰ تکمیلات کی توقع کرتی ہیں، انہیں مندرجہ ذیل قسم کے کاموں اور سرگرمیوں کو اپنی عمر میں جلد سیکھ لینے کی توقع رکھتی ہیں:

شہر میں اپنا راستہ خود جان لینا

کام میں مستعد اور سرگرم رہنا

مشکل چیزیں خود انجام دینا

اپنے دوست خود بنانا

مقابلے اور امتحان میں بہتر رہنا یا سبقت لے جانا

علاوہ ازیں، وہ مائیں جو "ادنیٰ" توقعات رکھتی ہیں وہ زیادہ پابندیاں عائد کرتی ہیں۔ وہ اپنے بیٹوں کا ایسے بچوں کے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتیں جنہیں والدین ناپسند کریں اور نہ ہی وہ چاہتی ہیں کہ بچے اہم فیصلے خود کریں۔"[1]

پردہ دار مائیں نہ ایسا تجربہ رکھتی ہیں اور نہ ایسی صلاحیتیں کہ بچوں، لڑکے ہوں یا لڑکیاں، سے ایسے مطالبات کریں کہ "سونے خود جائیں"، "اچھی طرح

1۔ ڈیوڈ۔سی میکلیلینڈ: "تکمیلی معاشرہ" ص ۳۴۶ (انگریزی میں)

سے کام کرنے پر فخر کریں" "مشکل چیزوں کو کرنے کے لئے سخت کوشش کریں" "اپنے فیصلے خود کریں" وغیرہ۔ ایسے مطالبات بچوں میں خود انحصاری، خود اعتمادی، پہل قدمی، پیہم کوشش جرأت مندی، عمل اور فیصلے کی خود مختاری جیسی عادات اور صلاحیتیں پیدا کرتی ہیں۔ مگر پردہ دار مائیں اپنے بچوں کے لئے ایسے اعلیٰ مطالبات اور کام اور انجام دہی کے اعلیٰ معیار پیش کرنے سے قاصر ہوتی ہیں اس کے برعکس، وہ حقیقتاً اپنی بار بار کی تنبیہوں، ممانعتوں اور پابندیوں اور نصیحتوں سے انہیں خود مختارانہ اور خود فیصلہ کردہ سرگرمیوں اور کاموں سے منع کرتی ہیں اور باہر کی دنیا کے اپنے خوف اور خدشے ان کے دلوں میں بٹھا دیتی ہیں۔

پردہ سوسائٹی میں قرابتدارانہ جھگڑے اور تنازعے بھی ماں باپ کے خوف اور خدشوں میں اضافہ کرتے ہیں۔ مسلم سوسائٹی میں ہر طرح کے خاندانی جھگڑے، ذات پات اور قبائلی چپقلش اور تنازعے جاری رہتے ہیں جن میں مقامی دشمنیاں اور خاندانی اور قرابتداری بدلے اور فساد ہر وقت ہوتے رہتے ہیں۔ درحقیقت مسلم معاشرے میں مردوں کا غلبہ بھی "زن زر اور زمین" کے انہی کش مکشوں اور لڑائیوں کے لئے قائم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ بھائی بھائی سے اور کزن کزن سے دشمن داری رکھتا ہے، قبائلی معاشرے میں تو یہ دشمنداری اس قدر عام اور بروقت ہوتی ہے کہ پشتو زبان میں "توبور" یعنی چچیرے بھائی کے معنے ہی دشمن کے ہو گئے ہیں[1]۔ قدرتی امر ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں ہر شخص دوسرے کا دشمن ہو، ماں کس طرح اپنے بچے کو آزادانہ طور پر باہر جانے کی اجازت دے لہٰذا بچے سکول کم جاتے ہیں اور گھر سے باہر کم نکلتے ہیں ان کا زیادہ تر وقت اپنے خاندان کی حدود کے اندر ہی گزرتا ہے جس کے باعث ان کی عادات اور خیالات خاندانی اور قرابتداری تعلقات اور مخاصمتوں تک محدود ہو جاتے ہیں۔ اور وہ نئے لوگوں یا غیر اشخاص سے گھبرانے بلکہ ڈرنے لگ جاتے ہیں اس طرح

---

[1] فریڈرک بارتھ "سوات پٹھانوں میں سیاسی قیادت" صفحہ ۱۰۴ اور ۱۰۹ مزید دیکھئے پشتو کی لغت "ظفر اللغات" صفحہ ۲۵۴۔

مسلمان بچوں کے دلوں میں اپنے خاندانی ماحول اور قرابتداری طرز زندگی کے باعث باہر کی دنیا کے لوگوں اور غیر قوموں کا خوف بیٹھ جاتا ہے مگر اس کے باوجود ان میں اپنے رشتہ داروں' قرابتداروں اور ہم ذات اور ہم قبیلہ لوگوں کی مخالفت اور مخاصمت کے جذبات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ بھی انہیں دوسرے بچوں سے لڑنے جھگڑنے پر اکساتے رہتے ہیں اور دوسروں کی چیزیں چھین لینے یا چھپٹ لینے کی تحریص دیتے اور تلقین کرتے رہتے ہیں۔ باوجودیکہ اُن کی زندگی گہری قرابتدارانہ تعلقات پر مبنی ہوتی ہے' تاہم پردہ دار مسلمانوں کے گھر باہمی جھگڑوں اور "تنازعوں کا اکھاڑا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماں باپ' اور گھر کے چھوٹے بڑے' مرد اور عورتیں ہر وقت بچوں کو نئی اور پرانی خاندانی اور قرابتدارانہ عداوتوں' جھگڑوں اور تنازعوں اور قتل و غارت کے قصے کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ان بچوں میں بڑے ہو کر وسیع تر قومی جذبات اور احساسات پیدا نہیں ہوتے وہ ساری عمر اپنی محدود خاندانی اور قرابتدارانہ دنیا کی دشمنیوں اور ریشہ دوانیوں میں مشغول اور مبتلا رہتے ہیں ان میں بھی اپنے بڑوں اور بزرگوں کی طرح سنگدلی' کرختگی اور لاپرواہی جیسی مائیکروسوشل عادات اور خصائل سرایت کر جاتے ہیں اور انسان دوستی' انسانیت پروری اور خدمت خلق جیسے ماکروسوشل رجحانات بچپن ہی سے پیدا نہیں ہوتے جو قومی شعور اور ماکرو سوشل اتحاد اور میل جول کے لازمی جزو ہوتے ہیں۔ جو آئندہ چل کر ملک اور قوم کے لئے مہلک ثابت ہوں گے۔

پردہ سوسائٹی کی عام زندگی بھی ایسی پابندیوں اور نظریات اور عقائد میں جکڑی ہوتی ہے کہ پردہ دار کنبے اکھٹے باہر سیر و تفریح کے لئے بھی نہیں نکلتے ہیں۔ ملاقات اور دوسری تقریبات اور رسوم مثلاً شادی بیاہ وغیرہ کے موقعوں پر بھی مرد اور عورتیں الگ الگ کمروں میں یا شامیانوں وغیرہ کے نیچے جمع ہوتی ہیں۔ سفر میں بھی مرد اور عورتیں الگ الگ چلتی ہیں۔ جب باہر نکلتے ہیں تو مرد آگے آگے چلتے ہیں اور عورتیں برقعوں یا چادروں میں لپٹی سمٹی پیچھے پیچھے آتی ہیں۔ اُن کے ساتھ یا گود میں

چھوٹے چھوٹے بچے چمٹے ہوتے ہیں اور ذرا بڑے بچے مرد اور عورتوں کے گروہوں کے درمیان چلتے اور کبھی ادھر اور کبھی ادھر آتے رہتے ہیں۔ دراصل پردہ دار لوگوں کے سارے اجتماعات ہمیشہ تین حصوں میں بٹے ہوتے ہیں' ایک مردانہ' دوسرا زنانہ اور تیسرا بچگانہ۔ کم سن بچے تو اپنی ماؤں کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں' مگر ذرا بڑی عمر کے بچے اپنا الگ اجتماع بنا لیتے ہیں' کیونکہ اُن کے باپ اور دوسرے مرد بچوں کا اپنے پاس آنا پسند نہیں کرتے[1]۔ اس لئے سات آٹھ سال کی عمر سے چودہ پندرہ سال کی عمر کے لڑکے اپنا اجتماع الگ بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کا اجتماع میں بھی کم عمر کی لڑکیاں اپنا اجتماع الگ بنا لیتی ہیں۔

دراصل پردہ سوسائٹی میں بچوں سے عموماً اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ اُن کے رشتہ دار اور دوسرے بڑے لوگ مثلاً ہمسائے' ملاقاتی' اجنبی اور استاد انہیں بات بات پر مارتے ہیں' دھمکاتے ہیں' گالیاں سناتے ہیں' بدکلامی کرتے ہیں اور ان سے مار دھمکا کر کام کراتے ہیں۔ اس مار پیٹ کے مناظر ہر جگہ مثلاً گھروں' سکولوں' بازاروں' گلی کوچوں اور دوسری جگہوں میں اکثر دیکھے جا سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب کوئی شخص بچے کو پیار بھی کرتا ہے تو وہ اس کے دھپڑ مارے گا' اس کے کان کھینچے گا یا چٹکی بھرے گا۔ دراصل پردہ دار مسلم معاشرے میں عورتوں کی طرح بچوں سے بھی سختی اور مار پیٹ کا سلوک کیا جاتا ہے۔

چونکہ اوائل عمر ہی سے پردہ دار ماں نے اپنے بچوں کو اپنے کام خود مختارانہ طور سے کرنے اور اپنے پر انحصار کرنے کی عادات نہیں سکھائی ہوتیں اس لئے یہ بچے اپنے معمول فرائض بھی سرانجام دینے کے اہل نہیں ہوتے

---

[1] "دونوں جنسوں کے بچے مردانہ حصّے یا حجرے میں آ سکتے ہیں' مگر انہیں خاموش رہنا اور الگ کونے میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ زیادہ تعداد میں آئیں تو انہیں عموماً مار دھمکا کر بھگا دیا جاتا ہے۔" فریڈرک بارتھ "سوات پٹھانوں میں سیاسی قیادت" صفحہ ۵۳۔

وہ ہاتھ منہ خود نہیں دھوتے، اپنے آپ کو صاف ستھرا نہیں رکھتے وہ اکثر میلے کچیلے کپڑوں میں اور گندے منہ اور ہاتھ پاؤں کے ساتھ پھرتے رہتے ہیں[۱]۔ جو تھوڑی بہت صفائی ہوتی ہے وہ ماں نے نہایت بدسلیقگی اور لاپروائی سے یا ملازموں نے اپنے مخصوص بے توجہی کے ساتھ کی ہوتی ہے۔ اس بات کا مشاہدہ بچوں کے چہروں اور لباس سے کیا جا سکتا ہے جب وہ صبح سویرے سکول جا رہے ہوتے ہیں۔ ان میں بھاری اکثریت کے کپڑے میلے کچیلے اور ان کے منہ ہاتھ دھولے ہوئے نہیں ہوتے ہیں (ماسوا چند سکولوں کے بچوں کے مثلاً پبلک سکول یا عیسائی مشنریوں کے سکول، جہاں صبح کی صفائی پر سخت جرمانے اور سزائیں ملنے کا خوف ہوتا ہے) اس ضمن میں ایک عجب فرق یہ ہے کہ لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کے منہ اور کپڑے زیادہ گندے اور میلے ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پردہ سوسائٹی میں لڑکیوں پر زیادہ سختی ہوتی ہے جب کہ لڑکوں پر ماں کا کنٹرول بہت کمزور اور ڈھیلا ہوتا ہے۔

دراصل عمر کے اس دور میں ماں اور بیٹے کے تعلقات کی نوعیت بالکل الٹ جاتی ہے۔ عمر کے پہلے چھ سات سال تک بیٹا ہر کام میں ماں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے وہ اپنے باپ اور گھر کے دوسرے بزرگوں کا اس کی ماں سے سلوک اور ماں کی لاچارگی اور بے بسی کا زیادہ سے زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس پردے کی پابندیوں کو بھی جان لیتا ہے۔ تب وہ باپ کے حاکمانہ رویوں اور سلوک کو خود بھی اختیار کرنے لگتا ہے۔ ماں کبھی گھر کے باہر کے کاموں کے لئے اپنے بیٹوں کا

---

[۱] ڈاکٹر حامد عمار مصری دیہات کے بارے میں لکھتے ہیں جو پاکستانی دیہات اور قصبات پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے: "بچپن کے دور کی دوسری خصوصیت یہ کہ اس میں ماں کی بچے کی دیکھ بھال اور توجہ میں کمی آجاتی ہے۔ اس بات کا ثبوت بچوں کی شکل و صورت سے ملتا ہے۔ اب ان کا لباس اور بدن کم صاف ستھرے ہوتے ہیں اور یہ بھی کوئی حیرت کی بات نہیں ہوتی کہ ان کی ناک بہہ رہی ہو۔ اس دور کی اس غفلت کا جواز مائیں یہ پیش کرتی ہیں کہ چونکہ ان کے بچے دوسرے بچوں سے کھیلنے گھر سے باہر جاتے ہیں جہاں انکی نظر بد لگ سکتی ہے"۔ حامد عمار "مصری گاؤں میں جوان ہونا" (انگریزی میں) صفحہ ۱۱۱۔

سہارا لینے لگتی ہے۔ لہٰذا جب ماں، بہنوں اور دوسری عورتوں کو گھر سے باہر جانا ہوتا ہے تو نو عمر بیٹا ان کی رہبری کرتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو بڑی بہن یا کوئی اور عورت کو پردے کی احکام اور ہدایات بھی برابر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی نے برقع ٹھیک نہیں پہنا یا نقاب الٹ دیا تو وہ ان کو اسے ٹھیک کرنے کا حکم بھی دیتا ہے۔ دراصل اس عمر سے بڑا ہوتا ہوا لڑکا باپ والی برتری اور حکومت جتانے لگتا ہے۔ ماں اور بیٹے کے تعلقات کی باقی ساری عمر یہی نوعیت رہتی ہے۔ اب وہ ماں کی حکم عدولی پر بھی تل جاتا ہے۔ اگر ماں کسی بات کی نصیحت یا ہدایت کرے تو وہ زنانخانے سے باہر بھاگ کر اس کی تعمیل سے بچ جاتا ہے اور ماں زنانخانے کے دروازے پر بے بس کھڑی آوازیں دیتی رہتی ہے جن کی وہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے کم سے کم پروا کرتا ہے۔

ماں اور بیٹے کے تعلقات کے اس کایا پلٹ سے پردہ سسٹم کی غیر معاشری اور غیر اخلاقی نوعیت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ ماں اپنے بچوں کی گھر سے باہر کی حرکات و سکنات سے بے خبر اور لاعلم ہوتی ہے اور اگر کچھ سن بھی لے تو بالکل بے بس ہوتی ہے اس کی باہر کی دنیا کی لاعلمی اور ناتجربہ کاری اور اس کی گھر سے باہر نکلنے کی پابندی پردہ دار ماں کو غیر موجود ماں بنا دیتی ہیں۔ اب اس کے پاس صرف دو چارہ کار رہ جاتے ہیں۔ اول، اپنے بیٹوں کو بامر نیک کاموں کی تلقین اور پند و نصائح کرے یا ان کو قابو میں رکھنے کے لئے اپنے خاوند کا سہارا لے۔ یہ دونوں طریقے زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوتے۔ اس لئے بعض پردہ دار مائیں اپنے بچوں کو گھر میں رہنے کی نصیحت کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے پردے میں پلنے والے بعض لڑکے گھر میں اس قدر زیادہ وقت گزارنے کے عادی ہو جاتے ہیں کہ وہ باہر کی دنیا کا کماحقہ علم اور تجربہ نہیں حاصل کر سکتے، یہ حالت انہیں جاہل اور ضدی مزاج بنا دیتی ہے۔

چال چلن اور کردار کی یہ خود مرکزیت، اکھڑ پن اور غیر لچک پن ساری مسلم دنیا کی پردہ سوسائٹی کے بچوں کی نمایاں خرابی ہے[1]۔ پردہ دار بچے بہت زیادہ

---

[1] نرسری اور پرائمری سکول کے عرب بچوں پر ایک تجربہ کیا گیا جو ان کی عادات و کردار کی نشو و نما میں غیر لچک پن کا بین ثبوت پیش کرتا ہے۔ "اس خیال د ہائپوتھیسس کو جانچنے کا موقع ملا کہ وہ کے

شرمیلے، اکھڑ مزاج اور غیر مطابقت پذیر عادات کے مالک ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے سکول اور دوسری درسگاہوں میں تحصیل علم میں اور گیمز اور سپورٹس، ڈرامے اور کھیلوں کی سرگرمیوں اور کارکردگیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ یہ درسگاہیں اتنے کم اور اتنے خراب مقرر، کھلاڑی، اتھلیٹ، ایکٹر اور سوشل ورکر اور لیڈر پیدا کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ بھی ہے کہ ان کے طلبا کا علمی معیار اور ذہلیت اتنی پست ہوتی ہیں۔ دراصل پردے میں پلے ہوئے بچوں اور لڑکوں کے ذہن اور کردار، قوت فکر و فیصلہ اور شخصیتوں میں کاہلی، لاپروائی اور بے غوری کی عادات پک جاتی ہیں۔ ان میں کسی چیز اور کام کا شوق باقی نہیں رہتا، مگر فروعات کا شوق ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اگر بداخلاق بھی نہ ہوں کاہل اور نااہل ضرور ہوتے ہیں۔

"سب سے نمایاں بات یہ ہوتی ہے کہ لڑکے کو کسی چیز کا مشاہدہ کرنے کی دلچسپی اور شوق نہیں پیدا کیا جاتا، کوئی ایسا شغل نہیں سکھایا جاتا جس میں وہ مصروف رہ سکے۔ اسے نہ پھولوں کو دیکھنے، نہ پرندوں کا مشاہدہ کرنے یا کوئی اور ہنر حاصل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اسے نہ نقش کاٹنے یا چیزیں جوڑنے کے بارے میں کچھ سکھایا جاتا ہے۔ درحقیقت اس کے ہاتھ تقریباً بیکار رہتے ہیں، بشرطیکہ وہ

؎ مقام پر اسرائیل میں ملا کہ بچوں کے کردار کی تکمیلی ترغیب اور سمت بندی کا کام ماں باپ کو جتنا جلد ہو شروع کرنا چاہیے، عاکرہ میں یورپین سٹائل کا سکول تھا۔ چھلا پھینکنے اور خاکہ کھینچنے کا ٹسٹ جو پہلے میکسو کے کیتھولک سکول میں آزمایا گیا تھا، ۲۲ چار سے پانچ سالہ لڑکوں کا ٹسٹ لیا گیا، جن میں ۱۲ نرسری سکول کے اور باقی پرائمری سکول کے بچے تھے اور ۱۲ دس سال تک کے بچے تھے، جن میں ۱۱ نرسری سکول میں پڑھتے تھے۔ نرسری سکول کے تعلیم یافتہ اور دوسرے بچوں میں کوئی خاص فرق نہیں پایا گیا۔ چھلا پھینکنے کے ٹسٹ بھی ناقابل نتائج ثابت ہوئے جیسا کہ میکسو کے کیتھولک سکولوں میں ثابت ہوئے تھے، لڑکے چھلے کو کھونٹی سے مقررہ فاصلے سے پھینکنے میں اپنی جگہ سے نہیں ہلتے تھے خواہ انہیں کامیابی یا ناکامی ہوتی تھی، باوجودیکہ تجربہ کرنے والے نے بار بار انہیں یاد دلایا کہ وہ جہاں چاہیں کھڑے ہو چھلا پھینک سکتے ہیں۔" ڈیوڈ سی میکلیلنڈ "تکمیلی معاشرہ" ص ۴۱۵ - ۴۱۶

کسی کاشت کار یا کاریگر کا بیٹا نہ ہو۔ اگر وہ بنیئے کا بیٹا ہے تو بہی کھاتہ رکھنے کے لئے ضرور وہ مصروف رہتا ہے۔ اگر جنگجو طبقے سے تعلق رکھتا ہے تو لڑائی کے لئے تیار رہتا ہے۔ مگر یہ لوگ شرفا رجنٹلمین) ہیں جو باقی سب کام کے لئے بیکار ہیں۔ یہ لڑکا بغیر اچھی عادات کے بڑا ہوتا ہے صرف ایک خیال اس کے سر میں سمایا ہوتا ہے" میں ساری دنیا کا مالک ہوں۔ سب کچھ مجھے ملنا چاہیئے۔ لہٰذا اس کے کردار اور تربیت کی ساری بنیاد خود غرضانہ کاہلی پہ قائم ہوتی ہے۔[۱]"

پردہ دار نوجوان: بارہ سال سے چوبیس سال کی عمروں میں

عنفوان شباب کے ساتھ پردے دار بچوں یعنی لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگی اور تجربے میں بڑی نمایاں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ لڑکوں کو اب آخری اور حتمی طور پر زنانخانے سے مردانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی قدامت پسند اور روایت پرست گھرانوں میں بہت سختی سے عائد کی جاتی ہے۔ اب انہیں مردانے میں باپ اور دوسرے مرد بزرگوں کی نگرانی میں دے دیا جاتا ہے۔ وہ اب کم و بیش پوری طرح سے ماں کے کنٹرول سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ مگر لڑکیاں اب کلی طور پر زنانخانے کی چار دیواری میں مقید کر دی جاتی ہیں اور ان پر پردے کی تمام پابندیاں اور ممانعتیں پوری طرح عائد کر دی جاتی ہیں۔ یہ پابندیاں لڑکیوں میں اپنی جنس کے بارے میں گناہ اور قصور اور شرم و حیا کے احساسات پیدا کر دیتی ہیں۔ جیسا کہ قرون وسطائی وقتوں میں نسوانی ستر کا نظریہ تھا جس کی وجہ سے عورت کو گناہ کی گھڑی تصوّر کیا جاتا تھا۔ بہر حال نسوانی جنس کے گناہ اور قصور واری کے باعث پردہ دار لڑکیاں اور دوسرے لوگ بھی طبقہ نسواں کو کم درجے کے انسان بلکہ غیر انسانی ہستی

---

[۱] ایل۔ ایف۔ لوڈے پرائر "پنجاب پریوڈ" ص ۱۱۷

سمجھنے لگتے ہیں۔ان احساسات اور نظریات کی بنا پر لڑکیوں کو کام، عمل اور تکمیل کے ناقابل تصور کیا جاتا ہے جو انہیں ساری عمر تکمیلی زندگی گزارنے کے مانع ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر پردہ دار لڑکیوں کو ساری عمر کے لئے معاشری اور اخلاقی اپاہج بنا دیا جاتا ہے

پردہ سوسائٹی کے نوجوان لڑکوں میں اس کے برعکس تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں باہر مردوں کی دنیا میں آکر اور آغاز شباب کی بڑھتی ہوئی جسمانی قوتوں کے باعث انہیں کام، عمل اور تکمیل کے ایسے مواقع میسر آتے ہیں جو ان میں دونوں جنسوں کے زندگی اور معاشرے میں مقام اور اہمیت کے متعلق گمراہ کن، غلط اور غیر ذمہ دارانہ خیالات پیدا کر دیتے ہیں

باہر کی دنیا میں اپنی آزادئ نقل وحرکت اور آزادئ عمل کی باعث لڑکے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مردانہ جنس برتر اور بہتر ہے اور زنانہ جنس کمتر اور گھٹیا ہے مردوں کو زندگی کے تمام حقوق اور مراعات حاصل ہیں اور عورتوں کے حصے میں تمام ذلتیں اور خواریاں آئی ہیں اور یہ کہ مرد جو چاہے کر سکتا ہے جب کہ عورت کو اس کے ہر طرح کے سلوک اور برتاؤ کو خاموشی بلکہ ذلالت سے برداشت کرنا چاہیئے اور کسی قسم کی اصلاح اور بہترائی کی راہیں تلاش نہیں کرنی چاہئیں۔ ان آزادیوں اور تصورات کی وجہ سے پردہ دار لڑکوں اور نوجوانوں میں بہت سی غلط کاریوں اور بدکاریوں کو بھی فروغ حاصل ہوجاتا ہے۔ مثلاً لواطت وغیرہ۔ پاکستان کے قیام کے بعد، جب سے پردہ سسٹم میں کمی آنے لگی ہے، لڑکوں اور نوجوانوں میں اپنی آزادیوں کو نہایت غلط اور بھونڈے پن سے استعمال کرنے کا رواج بھی بڑھ رہا ہے۔ وہ برقع اور بغیر برقع والی عورتوں اور لڑکیوں کو چھیڑتے اور اُن پر آوازے کستے ہیں۔ رائے عامہ جو عورتوں اور لڑکیوں کا گھر سے باہر نکلنا ناپسند کرتی ہے ان اوباش لڑکوں اور آوارہ نوجوانوں کو منع نہیں کرتی۔ گوکہ اخبارون اور رسالوں میں نوجوانوں کے اس بدتمیزی اور بدچلنی کے واردات تقریباً ہر روز شائع ہوتے ہیں، مگر امن عامہ اور قانون کے ادارے خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔

اگرچہ پردہ دار نوجوان عنفوان شباب کے ساتھ ہی زنانخانے سے بیدخل کر دیئے جاتے ہیں، مگر وہ اس کے اندرونی حالات اور اثرات سے ساری عمر متاثر ہوتے رہتے ہیں. اوّل تو زنانخانے میں بارہ تیرہ سال عمر گزارنے کے بعد زنانخانے کی کاہلی، خوف اور تشویش اور تنازعوں کا ماحول ان نوجوانوں کی اپنی ذہنی خاصیت اور خصلت بن جاتا ہے. لہٰذا اپنی نئی نئی مردانہ قوتوں اور جارحانہ پن کے باوجود وہ بھی زنانخانے کی کاہلی، سستی، لاپرواہی، جہالت، خوف اور فراریت کی عادات اور خصائل کے مالک بن جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں، اب ان میں جوں جوں زنانخانے کی اندرونی حالات اور حقائق کی شدبد پیدا ہوتی ہے وہ اتنے ہی زیادہ اس کے اندرونی جھگڑوں اور تنازعوں میں الجھنے لگتے ہیں جن کیلئے وہ اکثر خود بھی اسباب پیدا کرتے ہیں. پردہ دار خاندان میں جب لڑکا بارہ پندرہ سال کی عمر تک پہنچتا ہے تو اس کے چار پانچ چھوٹے بڑے بہن بھائی پیدا ہو چکتے ہیں اور اگر اس کے باپ نے اور شادی یا شادیاں کر لی ہوں تو کئی اور سوتیلے بھائی، بہن بھی موجود ہوتے ہیں۔ ان حالات میں گھر میں تنازعوں اور سازشوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جن میں وہ اور اس کی ماں اور سوتیلی مائیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ماں تو بہت سے بچے پیدا کرنے کے بعد[1] اور اپنی آئے دن کے تنازعوں، مصیبتوں اور پریشانیوں کے باعث

---

[1] پردہ دار خاوند اپنے حاکمانہ حیثیت اور طاقت کو اکثر اپنی بیوی یا بیویوں کو لاتعداد اولاد پیدا کرنے پر استعمال کرتا ہے اور ان کے زبردستی حمل کرتا رہتا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اولاد نرینہ کا متلاشی ہوتا ہے دوسری وجہ میاں بیوی کے غیر مساویانہ پوزیشن ہے اور میاں کے ہاتھوں مار پیٹ کا خدشہ ہے جو پردہ دار بیوی کو ہر دم لگا رہتا ہے:۔

"مسمات بی بی زچہ بچہ صحت مرکز جمرود میں اپنے بیمار بچے کے ساتھ آئی۔ عملے نے اُسے خاندانی منصوبہ بندی کا مشورہ دیا. تو وہ کہنے لگی!

"میرا خاوند مجھے مارے گا"

جب اسے بتایا گیا کہ اس میں کوئی ہرج نہیں تو کہنے لگی "میرا خاوند خفا ہوگا"۔

بہت پریشان ہستی بن جاتی ہے۔ زیادہ بچوں اور پریشانیوں کے باعث ماں کی صحت جواب دے چکتی ہے اور وہ نفسیاتی اور ذہنی طور پر بیمار ہو جاتی ہے اسی حالت میں وہ اپنے جوان بیٹے یا بیٹوں کا سہارا لیتی ہے اور وہی اس کو غمخوار ہوتے ہیں اور اپنے باپ کی زبردستیوں اور زیادتیوں کا مداوا کرتے ہیں اس صورتحال میں پردہ دار کنبہ سہ طرفہ کش مکش کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس کی ایک طرف میاں/باپ، دوسری طرف اس کی بیوی/ماں یا بیویاں/مائیں اور تیسری طرف اُن کی اولاد یا اولادیں جن کو اپنے اپنے عزیزوں اور قرابتداروں کی علانیہ یا خاموش اور خفیہ سہارا اور مدد حاصل ہوتی ہے اس خاندانی پس منظر میں پردہ دار نوجوان اپنی بالغ زندگی شروع کرتے ہیں۔

ہم ان نوجوانوں کی گھر کے مردانہ حصے میں زندگی کا تجزیہ کریں گے۔ یہ مردانے دو طرح کے ہوتے ہیں، روایتی اور جدید طرز کے۔ جو اپنی خاندانی تنظیم، طرز زندگی اور معاشری اور نفسیاتی تعلقات میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

روایتی مردانے پرانی روش کے مردانہ حصے میں جہاں پرانی طرز کی مردانہ حاکمیت خوف، دباؤ اور دبدبہ پایا جاتا ہے۔ یہاں خاندانی قرابتدارانہ اور مقامی اثر و رسوخ رکھنے والے مرد اور بزرگ جمع ہوتے ہیں اور یہاں مہمانداری اور خاطر تواضع کا سلسلہ اور دکھاوا ہوتا ہے۔ ان مردانوں میں بزرگ اور سردار لوگ اپنے مخالف گروہوں اور سرداروں اور سربراہوں کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ تاکہ اپنی زمینوں، جائیداد کو بڑھائیں، ڈنگر مویشی

"کیوں؟"
"یہ اچھی بات نہیں"
جب اس سے دریافت کیا گیا کہ کیا اس نے اس کا ذکر اپنے میاں سے کیا تو کہنے لگی "نہیں"۔
"کیوں نہیں۔ یہ تمہارے اور تمہارے کنبے کے لئے فائدہ مند ہوگا"
"میرا میاں کہے گا کہ میں کیسی باتیں کرتی ہوں"
نتیجہ یہ ایسے خاندانوں میں جن میں شوہر کو غلبے کا رول حاصل ہوتا ہے بیوی مجبوراً میاں کے رویوں اور فیصلوں کی پابند ہوتی ہے۔"

Javed Iqbal Syed, *Interspousal Authority and Communication in Tribal Families*, Pakistan Journal of Family Planning, July, 1969. PECHS. Karachi.

جمع کریں، اپنی عورتوں کو دوسرے گروہوں کی دستبرد سے بچائیں اور مخالف گروہوں کی زمینوں اور جائیداد کو تباہ کریں، لوٹیں اور ان کی عورتوں کو اغوا کریں یا اٹھالیں اور ان کی کمزور حلیفوں اور ساتھیوں کی لوٹ مار کریں۔ بالفاظ دیگر، ان روایتی مزاجوں کی ساری سرگرمیوں، جھگڑوں، تنازعوں اور تگ و دو کا مقصد صرف وہ صدیوں پرانی کش مکش ہے جو تین چیزوں یعنی "زن، زر اور زمین" کے لئے ہوتی ہے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ وہی پرانے طریقے اختیار کرتے ہیں جو رشوت ستانی تحفے تحائف دینا، خوشامد اور چاپلوسی، خاطر مدارات، رعب داب، سازباز اور اثر و رسوخ پر مبنی ہوتے ہیں، جب یہ طریقے اپنے مقصد کے حصول میں ناکامیاب یا ناکافی ثابت ہوتے ہیں تو طاقت، زبردستی، ظلم و تشدد، حق تلفی اور قتل و غارت کو اختیار کیا جاتا ہے کیونکہ قرابتداری معاشرے میں روایتی گروہوں کی نظروں میں کسی کی زندگی عزت وآبرو اور جان ومال کے حقوق کی کوئی قدر اور کوئی احترام نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس معاشرے میں کنبہ پروری، اقربا پروری، جانب داری اور بدعنوانی کے طریقے عام ہوتے ہیں اور معاشری ماحول گروہ بندی، قبیلہ نوازی ذات برادری کے تعصبات تنگ خیالی، زور و جبر اور مقامیت کے خیالات اور تصورات سے رچا ہوتا ہے قانون کا احترام صفر کے برابر ہوتا ہے۔ جدید عدالتی کارروائی اور نظم و نسق کے انتظامات کو روکا جاتا ہے اور اگر کام میں لائے جائیں تو صرف اپنے گروہ یا جماعت کے مفاد کو حاصل کرنے کے لئے۔ اس طرح جدید حکومتی اداروں اور عوامل کو بھی اپنے مائیکرو سوشل مقاصد کے تابع بنا دیا جاتا ہے۔

نوجوان نسل میں پردہ سنڈروم کی ابتداء

یہ حالات اور ماحول ہیں جن سے لڑکے اور نوجوان روایتی پردہ دار مردانہ زندگی میں داخل ہونے پر دوچار ہوتے ہیں اور اس کے تضادات اور تعصبات اور تجربات سے متاثر ہو کر ان کے ذہن و کردار پردہ دار معاشرے اور آئیڈیالوجی کی عادات نظریات، خیالات، رویوں اور رجحانات کے حامل ہو جاتے ہیں، جنہیں ہم مردوں

کا پردہ سنڈروم (Purdah Syndrome) کہتے ہیں۔

اس مرحلہ پر نئی نوجوان نسل کے اپنے بزرگوں یعنی باپ، دادا، چچا، نانا، ماموں بڑے بھائیوں، کزن بھائیوں، دوسرے عزیز و اقارب اور ملاقاتیوں وغیرہ سے تعلقات ان کی بچپن کے خوف اور امتناعات اور نئی پابندیوں اور ممانعتوں سے پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ نوجوان بیٹے اپنے بچپن کے خوف اور اجتناب کی وجہ سے جو اُن کی عادات اور کردار کا حصہ بن جاتے ہیں باپ سے قریبی اور گہرے تعلقات سے بچتے ہیں۔ ؎ ان کا رویہ اور چلن ظاہری طور پر بے چون و چرا اطاعت اور فرمان برداری کا ہوتا ہے، مگر نفسیاتی طور پر بہت مخالفت اور نافرمان برداری کا ہوتا ہے۔ بس ان کی زندگی تضادات سے بھری ہوتی ہے۔ ان کا چال چلن ایک طرف تو ڈسپلین اور ظاہری تعمیل کا نمونہ ہوتا ہے اور دوسری طرف انڈسپلین اور نافرمانی کا جو ایسے موقعوں اور مقامات پر بدتمیزی جھگڑالو اور بدلگام عادات اور حرکات میں ظاہر ہوتا ہے جب وہ نوجوانوں کے اجتماعات میں بیٹھے ہوں یا جب وہ اپنے بزرگوں اور گھروں اور کنبوں سے دور سکول، کالج اور دوسری ایسی جگہوں میں ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ انہیں مطالعے اور کام کا کوئی شوق نہیں ہوتا بلکہ اپنے والدین اور بزرگوں کی کاہلی، غفلت شعاری، دوسروں پر

؎ "باپ کے اختیارات کو ساری عمر تسلیم کیا جاتا ہے: باپ اور بیٹے کے تعلقات عموماً رسمی ہوتے ہیں جن میں احتراز اور اجتناب کا رجحان پایا جاتا ہے اور محبت اور فرمان برداری کے مضبوط رشتہ ہمیشہ مانا جاتا ہے، دادا کے ساتھ تعلق زیادہ خوش کن اور گہرے ہوتے ہیں مگر کبھی ایسے نہیں ہوتے جو اس بزرگ کی عزت و احترام کو کم کریں اور اس کے اختیارات کو قابل بحث یا گفتگو بنا دیں"؛ فریڈرک بارتھ "سوات پٹھانوں میں سیاسی قیادت" صفحہ ۲۳

ڈاکٹر حامد عمار مصری دیہات کے بارے میں لکھتا ہے! "بہت سی ایسی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں بیٹے کو باپ سے علیحدہ رہنا ضروری ہوتا ہے خاص کر پبلک میں نوجوان بیٹے سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بعض اجتماعات میں باپ کے قریب نہیں بیٹھے گا اور اگر اس کی موجودگی ضروری ہو تو وہ ماتحت رول ادا کریگا جس کا اظہار وہ کم سے کم رائے دیکر اور اول ترین موقعہ پر مجلس سے رخصت ہو کر ظاہر کرتا ہے۔" "مصری گاؤں میں بڑے ہونا" ص ۵۲ (انگریزی میں)

مفت خورانہ انحصار کی عادات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

"ان کی زندگی کا عظیم مقصد کاہلانہ طور سے زندگانی گزارنا ہوتا ہے۔ چند ہی لوگ روزمرہ کا پورا کام کرتے یا کرنا چاہتے ہیں! وہ بھی کاریگر اور کاشت کار لوگ ہوتے ہیں۔"[1]

اعلیٰ تکمیلات کے شوق کا فقدان

تاہم اُن کے کردار کی نشوونما کا بدترین پہلو ان کی زندگی میں اعلیٰ اور بلند مقاصد اور نصب العین کا قطعی فقدان ہے۔ اس کی کچھ وجہ تو اُن کے والدین اور بزرگوں کا جابرانہ اور امتناعی کنٹرول ہے مگر اس کی بڑی وجہ وہ نہایت غیر متحرک اور غیر ارتقائی معاشری ماحول اور فضا ہے جس میں یہ لڑکے اور نوجوان پلتے اور سن بلوغت کو پہنچتے ہیں دراصل زندگی اور دنیا کے متعلق اُن کے تمام تصورات اور نقطہ نظر اُن کے خاندان اور قرابتی گروہوں اور دوست واحباب کے رشتوں اور مفادات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں، اس لئے ان نوجوانوں کو ایسے مواقع نصیب نہیں ہوتے جو ان کی اعلیٰ تکمیلات کی جانب سمت بندی کریں سوائے ان محرکات کے جو انہیں روایتی معاشرے کے تین لازمی مقاصد یعنی زر، زمین اور زن کی تلاش میں مصروف اور مشغول رکھتے ہیں، جس میں وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کو بڑے جوش وخروش سے سرگرداں دیکھتے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ ان نوجوانان قوم وملت میں تعلیم وتدریس، علم وہنر، سائنس اور فلسفے، آرٹ اور فن کی کوئی رغبت اور رجحان نہیں ہوتا، اور انسانی کمالات اور مہمات کے حصول اور تکمیل کا کوئی خیال نہیں ہوتا ہے اور کوئی قابل امتیاز اور قابل فخر کام یا کارنامہ کرنے کی کوئی جستجو اور تگ ودو نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ ان تمام اعلیٰ کاموں، مقاصد، کارناموں اور نصب العین کی تکمیل کے لئے سخت محنت ومشقت، یکسوئی اور دلجمعی، بے لوث لگن اور اخلاص، پہل قدمی اور اخلاقی قوت، جرأت اور خود انحصاری، خود اعتمادی اور

---

[1] L.F. Loveday Prior, *Punjab Prelude*, p. 116.

نئے خیالات اور عادات کو اپنانے کی صلاحیت کی ضرورت ہے۔ مگر ان اوصاف اور خصائل سے اُن کے ذہن و کردار بالکل عاری ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ آسان کامیابی اور فوری بدلہ اور معاوضہ لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ نئے مسائل اور مشکلات کے متعلق اُن کا رویہ اور رسائی بہت بے لچک غیر مبتدل، رسمی اور غیر مطابقت پذیر ہوتی ہیں۔ ان کا ذہن و فکر خود پسندانہ ہوتا ہے اور وہ نئے حالات اور صورت حال سے بدکتے اور گھبراتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ فطرت انسانی کی کمزوری ہے کہ اگر کوئی شخص اعلیٰ اور بلند مقاصد اور نصب العین سے عاری ہو تو وہ رزائل اور گھٹیا کام کا خواہاں اور کوشاں رہے گا۔ پردہ دار نوجوان کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے ناول نویس اقبال النساء لکھتی ہے:

"اگر کسی شخص کو اعلےٰ مقاصد اور نصب العین کے آزادانہ حصول کے مواقع نہ ملیں تو وہ اپنے لئے ایسی دنیا بنا لیتا ہے جس میں معاشری لوازم نہیں پائے جاتے اور جبر اور دباؤ کے ماحول میں بچہ کی زندگی دوزخی ہوتی ہے اور اعلیٰ اور بلند مقاصد کی غیر موجودگی میں وہ خراب مقاصد اختیار کر لیتا ہے۔

اکرم بچپن ہی سے سمجھدار، مستعد اور شرارتی تھا۔۔۔ جب اُسے سکول میں داخل کیا گیا تو اس نے اپنے سکول کی پڑھائی میں کوئی ترقی نہ کی اور ہر کلاس میں روک لیا جاتا تھا۔"[1]

اداس نسلیں ایسے بے مقصد ماحول میں پردہ دار نوجوان اپنا سارا وقت اور زندگی بے سود اور نکمی باتوں اور فضول کاموں میں ضائع کرتے ہیں۔ مثلاً کبوتر بازی، بٹیر بازی، پتنگ بازی یا ایسی بے کار حرکات ہیں جیسے گپ شپ یا پھر بداخلاقی شغل میں مبتلا ہو جاتے ہیں، مثلاً نشہ آور اشیاء کا استعمال اور لت۔ ان کی ساری عمر بیکاری اور فضول خرچی میں گزرتی ہے

[1] اقبال النساء، پردہ اینڈ پولیگمی، ص ۲۴۶-۲۴۷ (انگریزی میں)

بڑے ہو کر وہ اپنے خاندانی اور مقامی جھگڑوں اور دنگا فساد میں پڑے رہتے ہیں۔ اور اپنے خود غرضانہ مقاصد کے حصول کے لئے آپس میں لڑتے رہتے ہیں جس کے لئے وہ اپنے عزیزوں، دوستوں اور قرابتداروں کی مدد لیتے ہیں یا حکومت کی ملازمت کر لیتے ہیں تاکہ ان کے خاندانی اور قرابتی جھگڑوں اور سازبازمیں مقامی حکام کی حمایت حاصل ہو۔ اس طرح وہ اپنی غیر تکمیلی زندگی گزار کر قوم و ملت کے لئے اداس نسلیں بن جاتے ہیں، جن کا پیدا ہونا اور ناپیدا ہونا یکساں چیز ہوتی ہے۔ پاکستان کے بیشتر نوجوان ایسے طبقے بناتے ہیں۔

موڈرن مردانوں کے نوجوان

جدید مردانوں میں لڑکوں اور نوجوانوں کے حالات مواقع، مسائل اور خطرات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ یہ مردانے نئے شہروں اور صنعتی علاقوں میں وجود میں آ رہے ہیں۔ ان میں نوجوانوں کو بہت تھوڑے بزرگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیونکہ ان میں قرابتداری گروہ منتشر یا غیر موجود ہوتا ہے اور ہر ایک خاندان صرف کمانے والے مردوں یعنی باپ اور جوان بیٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لہٰذا باپ اور بیٹوں میں زیادہ باہمی میل جول کے مواقع ملتے ہیں۔ مگر باپ کو اپنے کاروبار کی وجہ سے زیادہ تر گھر کے باہر رہنا پڑتا ہے اور نوجوان بیٹوں کو بھی گھر سے باہر کی مصروفیات کے مواقع زیادہ ملتے ہیں۔ لہٰذا یہ نوجوان لوگ روایتی گھرانوں کے مقابلے میں اپنا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں، جہاں انہیں اپنے ہم عمروں اور دوسرے لوگوں سے میل جول اور باہمی ارتباط کے زیادہ مواقع ملتے ہیں جو انہیں نئے نئے خیالات اور امنگوں، نئے نئے مقاصد اور عزائم کے لئے ابھارتے رہتے ہیں پس ان کا معاشری اور نفسیاتی ماحول زیادہ متنوع اور پُر عمل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روایتی گھروں اور کنبوں کے نوجوان لوگوں کے مقابلے میں جدید گھرانوں کے لڑکوں اور نوجوانوں پر دوستوں، ہمسایوں، ہم شہریوں اور استادوں کے علاوہ گلی بازار، سنیما اور دیگر مقامات کے لوگوں کا اثر زیادہ پڑتا ہے۔ اس کے باعث والدین

کی اتھارٹی اور کنٹرول کمزور ہو جاتے ہیں، اور کنبے اور بزرگوں کا اثر کم یا مفقود ہو جاتا ہے۔ مگر چونکہ مسلم معاشرہ عموماً اور پاکستانی معاشرہ خصوصاً تاحال زیادہ تر روایتی معاشرہ ہے، جس میں جدید تکمیلی معاشرہ ابھی تک وجود میں نہیں آیا، اس لئے نوجوان طبقوں کے لئے متواتر تکمیلی ترغیب اور سمت بندی کے مواقع اور اثرات ناپید اور نایاب ہوتے ہیں۔ پاکستان کا عبوری معاشرہ ہر پرانی خاندانی اور قرابتدارانہ اتھارٹی اور کنٹرول کی کمزوری اور اضمحلال سے دوچار ہے، اپنے سامراجی حکمرانوں کے باقی ماندہ اثرات کے باعث آزادی کے بعد بھی قرابتدارانہ جاگیرداریت اور قبائلیت اور ذات پات کے نظام کو ایسا سیاسی غلبہ حاصل رہا کہ اس عبوری معاشرے میں غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی خیالات، نظریات، اداروں اور انجمنوں کو غلبہ اور تسلط حاصل رہا، اس لئے جدید پاکستانی معاشرہ انتشار اور اختلال کا شکار ہے جس کے سب سے زیادہ بدقسمت شکار نوجوان طبقے ہیں جنہیں ان کی بے انتہا قوتوں اور صلاحیتوں کے باوجود کوئی تکمیلی اثرات اور راہنمائی حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا جدید مردانوں کے لڑکے اور نوجوان بھی بے راہ روی، بدتمیزی، غیر ذمہ داری اور انتشار زدگی کے اطوار اور طریقوں پر گامزن ہو جاتے ہیں اُن میں بھی سنجیدہ اور متواتر لگن سے کام کرنے کی عادات اور صلاحیتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ وہ بھی روایتی معاشرے کی کنبہ پروری، دوست نوازی، جانب داری اور اقربا پروری کے ذریعے آسان کامیابی اور فوری نتائج کی تلاش کرتے ہیں۔ وہ بھی انہی عادات اور خرابیوں کے ساتھ سکول، کالج اور یونیورسٹیوں اور دوسری درسگاہوں اور تربیت گاہوں میں داخلے لیتے ہیں۔ جن کے نتائج کا تجزیہ ہم ابھی کریں گے بہر حال ماڈرن گھرانوں اور کنبوں کے نوجوانوں میں روایتی کنبوں کی نسبت زیادہ سنجیدہ، مستعد، محنتی، زیادہ متجسس اور مہم جو افراد پیدا ہوتے ہیں ہمارے ملک اور معاشرے میں جو تھوڑے بہت تکمیلی شخصیتیں ہیں وہ ان طبقوں کی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ ان جدید گھرانوں ہی سے زیادہ تر لڑکیاں اور

نوجوان عورتیں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم حاصل کر کے ملک و قوم کے لئے تکمیلی شخصیتیں ثابت ہوتی ہیں۔ البتہ آزادی اپنے خطرات بھی پیدا کرتی ہے جدید معاشرے کے نوجوانان میں بعض لوگ زیادہ بیہودہ اور غیر ذمہ دارانہ چال چلن کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں جس کا رجحان متذکرہ بالا اسباب کے باعث ہمارے ملک میں بڑھتا جا رہا ہے۔

پردہ سوسائٹی کے نوجوانوں میں، خواہ وہ جدید یا روایتی گھرانوں سے آئے ہوں، ایک بڑا نقص یا خامی پائی جاتی ہے جو پردہ سسٹم کی لازمی اور ناگزیر اثر کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ ہر دو طرح کے نوجوان تغیر و تبدل کے خوف، نئے خیالات اور حالات اور نئی ذمہ داریوں اور مہموں اور نئی طرز زندگی کے خوف سے بھرے ہوتے ہیں۔ وہ ہر نئی چیز اور ہر نئے خیال سے ڈرتے ہیں۔ اپنی جدیدیت پسندی کے باوجود وہ قدامت پسند ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی جدیدیت محض وقتی جوش اور سطحی حالت اور نمائش کا نام ہے۔ ان خوفوں اور خدشات کے باعث اُن میں متلون مزاجی اور اضطراب پائے جاتے ہیں اور وہ صحیح معنوں میں تکمیلی اور فعال شخصیّت اور کردار نہیں پیدا کر سکتے اور اعلیٰ مقاصد اور نصب العین سے مزین نہیں ہو پاتے۔ وہ اپنے حال میں مست اور مستقبل سے بے خبر اور لاپرواہ ہوتے ہیں۔ پس وہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنی پڑھائی اور تعلیم کے کاموں اور فرائض سے غافل اور لاپرواہ ہوتے ہیں اور کوئی کام اور ذمہ داری اُن کے سپرد کیا جائے تو وہ اس سے بھاگتے اور بچتے ہیں۔

درحقیقت پردہ سوسائٹی میں نوجوان لوگ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے اس لئے اجتناب اور فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں کہ وہ حقیقتاً بزدل اور طفلانہ ذہنیت اور کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ تن آسانی اور کاہلی کے عادی ہوتے ہیں اُن کے ذہن و فکر، کردار اور شخصیت کی نشو و نما آٹھ دس سال کی عمر پہ رک جاتا ہے۔ کیونکہ پردہ سوسائٹی کی ممانعتوں امتناعات اور پابندیوں

کے باعث اُن کے ماحول اور زندگی میں تمام معاشرتی باہمی عمل اور اثر و تاثیر اور اخلاقی و نفسیاتی ارتقاع کی تکمیلی ترغیبات اور ذوق و شوق غیر موجود اور مفقود ہوتے ہیں۔ وہ صرف اپنے بزرگوں کے خلاف گلہ شکایت تو کرتے رہتے ہیں مگر نہایت مجہول طریقوں سے اپنے والدین اور بزرگوں، اپنے استادوں اور پروفیسروں پر سہارا لیتے رہتے ہیں[1] اور کبھی اپنی حالت اور معاشرے کو بدلنے اور اصلاح کرنے کا کوئی خیال اور کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ محنت و مشقت سے ڈرتے ہیں وہ جدوجہد کرنے، مہم جوئی اور جستجو سے فرار کرتے ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں روایتی رسم و رواج میں رہتے ہیں اور نئے راستوں اور طرز زندگی سے بچتے ہیں کیونکہ اُن میں خوداعتمادی اور خودمختارانہ آزادی اور مہم جو طبیعت کا فقدان ہوتا ہے۔ مسلم نوجوانان دنیا کے نوجوانوں میں سب سے کم ترین مہم جو نوجوان ہوتے ہیں[2]

---

[1] "میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے نوجوان لوگ جو متوسط طبقوں کے گھروں میں پرورش پاتے ہیں کیونکہ اپنے والدین پر سہارا لینے پر قانع ہوتے ہیں اور ہمیشہ اُن پر ہی سہارا لیتے رہتے ہیں؛" ہمارے بیٹوں میں کام کی صلاحیت پاکستان ٹائمز راولپنڈی، مورخہ ۱۲ جولائی ۷۰، ۱۹ سنڈے میگزین۔

[2] مسلمان نوجوانوں کا اور ہندو اور سکھ نوجوانوں سے مقابلہ کرتے ہوئے انگریزی استانی لوڈے پائر لکھتی ہے:

"جب تم مسلمان سے ملاقات کرو تو تم اسے پہچان سکتے ہو۔ اس کی قطع و منع شریفانہ اور خوش کن ہوتی ہے۔ وہ سمجھدار مگر ہوشیار نہیں ہوتا۔ اس کی درسگاہی کارکردگی ہندو نوجوان سے بدرجہا پیچھے ہوتی ہے مگر جب کبھی وہ ہندو معیار تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں ایسی نفاست اور راست بازی پائی جاتی ہے جو ہندو میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ اگرچہ وہ اکثر و بیشتر نہایت احمق ہوتا ہے، تاہم وہ اچھے اطوار اور خیالات کا وارث ہے جو اس کو خوشگوار شخصیت بناتے ہیں گو کہ وہ زیرک و فراست سے عاری ہوتا ہے۔ وہ بہادری، شرافت، جذبات اور عشق و محبت کی کہانیوں اور نقشوں کا متوالا ہے۔ وہ کاہل ہے، اگرچہ قدرے شریفانہ، اگر دیہاتی لوگوں میں پلا ہو تو نمایاں قدرتی خودداری کا مالک ہوتا ہے۔ جب تم مسلمانوں سے لین دین کرو تو تم خواہ مخواہ محسوس کرو گے کہ تم ایسے لوگوں سے مل رہے ہو جو شاید غیر لچک، سخت اور محدود لوگ ہیں مگر اصالتاً اچھے ہوتے

مسلم نوجوانوں کے کردار و عادات

پردہ دار گھرانوں اور خاندانوں کا ماحول اور فضا ایسی ہے کہ لڑکوں اور نوجوانوں کو نہ ہی محنت و مشقت کے لئے اور نہ ہی کام، عمل اور تکمیل کے لئے تربیت دی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان کے تعلیمی نتائج اور اکڈیمک ریکارڈ اور دوسری درسگاہی کارگزاری اور کارروائیوں

ہیں جن تم اس طرح ہی سہارا لے سکتے ہو جس طرح اپنی چھڑی پر جو نہ تمہارے ہاتھوں میں پھٹے گی اور نہ سانپ بن جائے گی۔ یہ لوگ قدرے کلاسکی ہیں۔ جب میں یہ سطور لکھ رہی تھی تو میں نے سنا کہ پاکستان کے گورنر پنجاب کے برطانوی گورنر کو جب تک صوبائی اسمبلی کے انتخابات نہ ہو جائیں حکومت سنبھال لینے کا حکم دیا ہے کیونکہ رشوت ستانی اور رشتوں میں اقربہ پروری نے سارے نظم و نسق کو درہم برہم کر دیا ہے تاہم ان لوگوں میں جو رشوت ستانی اور زوال زدہ ہونے کے باوجود حکمرانی کی روح باقی ہے۔۔۔ سکھوں کے مقابلے میں مسلمان اس کاہلی اور سستی کا شکار ہیں جو حقہ نوشی نے ان میں پیدا کر دی ہے۔" لوڈے پارٹر" صفحہ ۱۲۰-۱۲۱

ڈیوڈ سی میکلیلینڈ اپنی کتاب "تکمیلی معاشرہ" میں مدراس کے ہندو اور مسلم سکولوں کی طلباء کا تکمیلاتی صلاحیتوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مسلمان لڑکوں کا اوسط تکمیلی صلاحیت ۴۲٫۴ تھی جبکہ ہندو طلباء کی اوسط تکمیلی صلاحیت ۵۶٫۵ تھی اور دس مسلمان لڑکوں کی اوسط تکمیلی صلاحیت صرف ۲۲٫۱ یہ سب ہندو اور مسلم لڑکے سکول پڑھنے آتے تھے اور باقی سارا دن اپنے گھروں میں رہتے تھے دیکھئے ایضاً ص ۱۴۴۔

ڈاکٹر حامد عمار مصری معاشرے کے بارے میں ذاتی مشاہدے کی بنا پر لکھتا ہے: "نفسیاتی لحاظ سے آغاز شباب والے لڑکوں نے اور اس سے بھی زیادہ آغاز شباب والی لڑکیوں نے اس مصنف کو یہ تاثر دیا کہ وہ عموماً بزدل، خوف زدہ اور مائل فرار ہوتے ہیں۔ اگر ان کا بچوں کے گروہ سے موازنہ کیا جائے تو یہ فرق اور بھی زیادہ نمایاں نظر آتا ہے ان نوجوانوں میں ماسوا چند کے، پہل قدمی، خود اعتمادی، خود دعویٰ گری اور میلان عمل کا فقدان ہوتا ہے۔ یہ مصنف ان خاصیتوں کی توجیہہ نوجوانی کی منفیت نہیں تصور کرتا بلکہ ان اثرات کا مجموعی نتیجہ سمجھتا ہے جو سخت گیر معاشری انضباط سے پیدا ہوتا ہے اور جو خاص طور پر جنس کے متعلق ان پر روا رکھا جاتا ہے۔

دیکھئے "مصری گاؤں میں جوان ہونا" ص ۱۹۰

سے ملتا ہے۔ ہم اس بات میں ان درس گاہوں میں تعلیم و تدریس کے گھٹیا معیار اور ان میں بدعنوانی، جانبداری، اقربہ پروری اور عام انڈسپلین اور فرائض منصبی سے کھلی اور حقیقی غفلت اور لاپرواہی" کا ذکر نہیں کر رہے جو اساتذہ اور پروفیسر شاگردان اور طلبا ہر دونوں میں عام ہیں۔ یہ بذات خود ایک مسئلہ ہیں۔ ہم یہاں صرف طلبا کی جمعیت کے تعلیمی ریکارڈ اور امتحانی کارگزاری اور کاروائیوں کا ذکر کر رہے ہیں جو ان کی عادات و کردار کا بین مظاہرہ ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد سے مسلمانوں میں اپنے بچوں اور نوجوانوں کو تعلیم دینے کا رجحان بہت فروغ پا گیا ہے۔ دو تین نسلوں پہلے جدید تعلیم کا یہ رجحان تقریباً ناپائید تھا۔ اگر سکول اور اعلیٰ درس گاہوں میں طلباء کی تعداد ہی کو مدنظر رکھا جائے تو یہ بذات خود ایک بڑی تکمیل ہے۔ اگر تعداد کے ساتھ ساتھ تعلیم کا معیار بھی اتنا ہی بلند ہوتا تو پاکستان میں ایک عظیم علمی، ذہنی، معاشری اور تمدنی انقلاب رونما ہو جاتا۔ مگر بلند معیاری کے لحاظ سے پاکستان میں فروغِ تعلیم میں ہولناک خلا پایا جاتا ہے۔ ہر سطح پر عموماً اور کالج اور یونیورسٹیوں میں خاص طور پر تعلیمی معیار اور کارگزاری بہت پست ہو گئی ہے، جو ہمارے نوجوانوں کی غیر تکمیلی عادات اور رجحانات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان کی تعلیمی پستی اخلاقی، علمی اور اکیڈمک میدانوں میں بہ یک وقت واقع ہو رہی ہے۔ یہ ابتری امتحانی نتائج میں پاس ہونے والوں کی کمی، امتحانات وغیرہ میں نقل اور دوسرے ناواجب ذرائع کے بڑھتے ہوئے استعمال اور مطالعہ اور پڑھائی سے لاپرواہی کے بڑھتے ہوئے رجحان وغیرہ سے صاف ظاہر ہو رہی ہے۔

تعلیمی اداروں اور درگاہوں میں نوجوان نسلوں کے کرداری انحطاط اور تخریب کے عوامل چند سال ہوئے

طلبا کے مسائل اور بہبود پر ایک سرکاری کمیشن کی رپورٹ میں طلبا اور اساتذہ کے بارے میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا گیا۔

"ہم جہاں کہیں بھی گئے ہم نے طلباء میں بڑھتے ہوئے انڈسپلین کے رجحان کے بارے میں تشویش کا اظہار سنا۔ اس سے زیادہ بُری بات طلباء اور اساتذہ میں مایوسی اور رائیگاں کوششوں کا احساس پایا۔ اساتذہ نے اپنے فرائض سے لاپرواہی کا طریقہ اختیار کرلیا اور اپنے طلباء میں ڈسپلین اور چال چلن کی درستی کی کوشش کو ترک کر دیا ہے۔ ہمیں امتحانات میں معیار کی تیزی سے گرنے کا بڑی شدت سے احساس ہوا اور یہ شکایات عام پائیں کہ امتحان میں ناواجب ذرائع کا استعمال بہت پھیل گیا ہے جس کا امتحان لینے والے نہ صرف جان بوجھ کر تغافل کرتے ہیں بلکہ بعض تو عملی طور پر اس میں تعاون اور مدد کرتے ہیں۔ امتحانات میں اندرونی اور بیرونی ممتحنوں کے طریقے میں اس قدر دھاندلیاں کی گئیں کہ راجشاہی اور ڈھاکہ یونیورسٹیوں میں اس طریقے کو ترک کرنا پڑا۔ ایک وائس چانسلر نے تو یہاں تک کہا کہ درسگاہی دنیا سے دیانتداری اور فرض شناسی جیسی چیزیں غائب ہو چکی ہیں۔"[1]

کمیشن کے ارکان نے ان خرابیوں اور دھاندلیوں کے اصلاح کے حسب معمول رائج طریقوں کی سفارشات پیش کیں۔ مگر وہ ان خرابیوں کی جڑ تک نہ پہنچ سکے جو ہمارے ملک کے قرابتدارانہ طرز معاشرت اور خاندانی زندگی میں" لڑی ہوئی ہے، جیسا کہ ہم اگلے باب میں بیان کریں گے۔ اس بنیادی وجہ کے باعث ہمارے نوجوانوں کی عادات اور کردار کی خرابی شروع ہو جاتی ہے۔ جو بالآخر درسگاہوں اور تعلیمی اداروں میں اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ اصلاح دراصل ہمارے گھروں اور خاندانوں کے نظام سے اور اس قرابتداری نظام سے جو اس سے منسلک ہے، شروع ہونی چاہیئے۔

---

[1] Report of the Cammission on Student Problems and Welfare, p. 5. Government of Pakistan Press. Karachi 1966

ہمارے نوجوان اپنے گھروں اور کنبوں میں، اپنے ہمسائے اور محلے میں وہ عادات اور رجحانات حاصل کرتے ہیں جو انہیں کام اور فرض سے غفلت شعاری، آسان کامیابی اور ناواجب ذرائع کی طرف مائل کرتے ہیں. جب پندرہ سولہ سال کی عمر تک اُن کی یہ عادات پختہ اور یہ رجحانات پکے ہو جاتے ہیں تو وہ کالجوں اور اعلیٰ تعلیم کی دوسری درسگاہوں میں آتے ہیں جہاں مثلاً سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آتے ہیں، تو وہاں بھی انہیں وہی "فرابتدارانہ گٹھ جوڑ"، غفلت شعاری اور لاپرواہی کا ماحول ملتا ہے، کیوں کہ ان درسگاہوں کے اساتذہ اور پروفیسر اور حکام بھی اسی پردہ سنڈروم کی غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی عادات، رویوں اور رجحانات کے حامل ہوتے ہیں جو نوجوان طلبہ اور طالبات اپنے گھروں اور محلوں میں سیکھ رہے ہوتے ہیں اور اپنے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مزید سیکھتے اور متاثر ہوتے ہیں. پردہ سوسائٹی کے ان فرابتدارانہ محرکات اور عوامل کے باعث ہمارے تعلیمی ادارے اور درسگاہیں تعلیم و تدریس اور علم و ہنر کی ترقی اور تحقیق کے مراکز کی بجائے ذہنی علمی اور فکری انحطاط، کاہلی اور پس ماندگی کے اڈے بن گئے ہیں جہاں استاد اور شاگرد دونوں کے علمی اور تعلیمی شوق اور لگن روز بروز کم سے کمتر ہو رہے ہیں. مگر اس کے برعکس اقربہ پروری، دوست لوازی اور دوسری بدعنوانیوں کے طریقوں کو خوب کام میں لایا جاتا ہے. تاکہ اپنے تعلیمی، علمی اور تحقیقاتی فرائض کو آسانی سے پردۂ غفلت میں ڈال کر آسان ڈگریاں اور ڈپلومے حاصل کئے جائیں یا ان اداروں کی ملازمت اور ترقیاں حاصل کی جائیں. ایک مصنف جس نے ہمارے تعلیمی اداروں کی اس زبوں حالی کا خود مشاہدہ کیا لکھتا ہے:-

"تعلیمی معیار کا انحطاط ہولناک ہے. بیشک جب تعداد کے بڑھانے کی ضرورت درپیش ہو تو معیاروں کی گراوٹ کچھ ناگزیر ہو جاتی ہے، مگر میں نے اساتذہ میں بھی تعلیم کی جانب عام لاتعلقی دیکھی، کالجوں میں سے ایک ہی ٹائم ٹیبل پر سات لیکچروں میں سے صرف دو لیکچر ہوئے تھے

اور مجھے طلبأ نے بتایا کہ یہ ہر روز کا معمول ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیکچرار اکثر جیسے کہتے ہیں "اتفاقی رخصت" پر چلے جاتے ہیں اور اپنی کلاس کو لیکچر کے بغیر ہی چلتا کرتے ہیں یا پھر طلبأ بھی جب لیکچر سننے کو دل نہ چاہا تو کلاس گول کر دیتے ہیں۔ سارا تعلیمی نظام آسان کردہ کلیدوں" کو رٹنے یا کتاب کے خلاصے جو امتحان کے ممکنہ سوالات کے حل پر لکھے جاتے ہیں' یاد کرنے پر منحصر ہے۔ اوسط طالب علم اپنی نصابی کتاب نہیں پڑھتا اور لیکچرار سوائے نصابی کتابوں کے کچھ اور شاذ و نادر ہی مطالعہ کرتا ہے۔ اُن کالجوں میں جن میں' میں گیا ایک میں پانچ لیکچراروں نے علانیہ اعتراف کیا کہ انہوں نے سال بھر میں ایک نئی کتاب بھی نہیں پڑھی۔ بلاشبہ بعض بااصول استاد ہیں' مگر عام کالج کے ماحول میں اُن کا مؤثر پن محدود ہے[1]۔"

نوجوان نسلوں کے کرداری انحطاط اور تکمیلی صلاحیتوں کی تقلیل و فقدان پر ماہرین تعلیم کی رائے

ہمارے تعلیمی اداروں اور درس گاہوں میں قرابتداری معاشرے کے غیر تکمیلی خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی محرکات اور عوامل اور ماحول کے باعث نوجوان نسلوں کی عادات اور کردار کی کمزوریاں اور خرابیاں ان درس گاہوں اور اداروں میں آنے کے بعد اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں' کیوں کہ گھروں اور خاندانوں کی نسبت جہاں روایتی قرابتداری کنٹرول بہت سخت ہوتا ہے' یہاں اُن کو اپنی خرابیوں اور کمزوریوں کے اظہار کے لئے مقابلتاً زیادہ آزادی اور زیادہ پرتموج اور ولولہ خیز ماحول اور مواقع دستیاب ہوتے ہیں' جن کا تجزیہ ہم نے اوپر کیا ہے۔ ہمارے نوجوانوں کے غیر تکمیلی عادات' کردار اور کارگزاری کا ثبوت پاکستان کے

[1] عارف حسین: پاکستان: اس کی آئیڈیالوجی اور خارجہ پالیسی" ص ۱۶۷ تا ۱۶۹۔ (انگریزی میں)

فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی ان رپورٹوں سے ملتا ہے جو وہ ۱۹۵۱ء سے گاہے بگاہے شائع کرتا رہا ہے۔ ۱۹۵۱ء کی رپورٹ میں کمیشن نے مقابلے کے امتحانات کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے امیدوار کی کرداری صلاحیتوں اور کارگزاری کا مندرجہ ذیل الفاظ میں تجزیہ کیا:۔

"امیدواروں میں جو منفی اوصاف پائے جاتے ہیں وہ مختصراً مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) ارباب اختیار کی علانیہ نافرمانی اور تمرد۔

(ب) شکایت اور گلہ۔

(ج) دوسروں پر انحصار۔

امیدواروں میں عموماً مندرجہ ذیل مثبت اوصاف کا فقدان تھا:

(ا) احساس ذمہ داری۔

(ب) خود اعتباری۔

(ج) خود مختاری۔

(د) پہل قدمی اور خود اعتمادی[1]۔"

۱۹۵۱ کی رپورٹ میں ان کرداری کمزوریوں کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ہمارا نظام تعلیم ہمارے نوجوان اشخاص کو اپنی شخصیت کی ترقیات کے کافی مواقع فراہم نہیں کرتا، ہم ان تمدنی قوتوں، ابتدائی خاندانی پرورش اور تربیت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو کردار کے بنانے میں بہت زیادہ حد تک ذمہ دار ہوتی ہیں۔ جدید ماہرین نفسیات کے مطابق ایک آدمی کی شخصیت آٹھ سال کی عمر تک کاملاً مستحکم ہو جاتی ہے "جب حقیقت یہ ہو، تو بچہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کی اصلاح

---

[1] پاکستان پبلک سروس کمیشن کی ۱۹۵۱ کی رپورٹ" ص ۱۴ تا ۱۵ (انگریزی میں)

کی اشد ضرورت عیاں ہو جاتی ہے۔ وہ اوصاف اور خوبیاں کو جو ایک امیدوار میں اور سرکاری افسر میں قابل تعریف ہوتی ہیں اور جن کو ہم ان میں تلاش کرتے ہیں بچے میں گھر اور سکول میں بڑے سخت ہاتھوں سے کچل دی جاتی ہیں[۱]۔ مثال کے طور پر ایک اچھے منتظم اور لائق نظم و نسق کے افسر کے لئے ضروری ہے کہ وہ گا ہے بگا ہے اپنی رائے کو منوانے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اپنی رائے اور قوت فیصلہ کی خود مختاری کے وصف سے متصف ہو۔ مگر یہی دونوں اوصاف یعنی خود مختاری اور وثوق گوئی یا خود اعتمادی، بچے میں برداشت نہیں کئے جاتے۔ شفیق اور مہربان ماں باپ اپنے بچے کے لئے ایک محفوظ زندگی مہیا کرتے ہیں اور اس طرح اس میں پہل قدمی اور خود مختاری کو ختم کر دیتے ہیں۔ ہمارے رسم و رواج کا ضابطہ کردار اور چال چلن بچے کو ہر طرح کے حالات میں "شریفانہ اطوار" کا سبق دیتا ہے والدین اپنی اس آرزو اور تمنا کے باعث کہ ان کا بچہ چھوٹی عمر میں ہی باتمیز اور مہذب بن جائے اس کی خود مختاری، وثوق گوئی، خود اعتمادی اور پہل قدمی کی عادات کو کچل دیتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ بچپن میں بزدلی اور شرمیلا پن ثبت کر دیا جاتا ہے تو اول درجے کی یونیورسٹی تعلیم کی اور موزوں نفسیاتی امداد کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بعد

---

[۱] ہم نے ابھی اوپر کہا تھا کہ ہمارے سکول، کالج اور دوسری درسگاہیں ایسے ہی سخت گیر اور جامد کردار کے مالک اساتذہ سے بھرے ہوئے جیسے ہمارے گھروں اور کنبوں میں باپ اور بزرگ پائے جاتے ہیں علاوہ ازیں ہمارے اساتذہ بھی ہمارے دوسرے ابیت گروہوں کی طرح نئے خیالات، نئے طور طریقوں، نئے علم و ہنر کی تلاش اور جستجو سے اسی طرح خائف رہتے اور گریز کرتے ہیں اور وہ بھی اپنے فرائض اور کام کی اصلاح اور درستی سے پہلو تہی کرتے ہیں کیونکہ وہ اصلاح اور درستی سے خوف کھاتے ہیں اور اپنے علمی کاموں اور محنت سے فرار کی راہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

کی زندگی میں ان خوبیوں اور اوصاف کو دوبارہ پیدا کیا جا سکے۔[1]

"ہمارے خاندانی نظام کے تحت بچہ ذمہ داریوں میں شریک نہیں کیا جاتا۔ یہ امر ہمارے نوجوانوں میں احساس ذمہ داری اور خود مختاری کے فقدان کا باعث ہو سکتا ہے۔ بہت کم امیدوار ایسے تھے جو بیس سال کی عمر سے پہلے اپنے والدین سے الگ رہے ہوں۔ ان امیدواروں نے جن کی تعداد بہت کم ہے جنہوں نے بورڈنگ سکولوں میں تعلیم پائی تھی خود مختاری، رائے کی خود اعتمادی اور احساس ذمہ داری کو زیادہ ظاہر کیا ہے۔"[2]

امیدواروں کی امتحانی کارگزاری کا تجزیہ کرتے ہوئے کمیشن نے امتحانی جوابات کے بارے میں لکھا:

(۱) **ناقص طرز اظہار**: امیدواروں کے خیالات کے اظہار کی صلاحیت ناقص تھی اور سائنس و آرٹس کے مضامین میں سنگِ راہ ثابت ہوئی۔

(۲) **خلط ملط طرز فکر**: ممتحنوں نے پایا کہ زیادہ تر امیدواروں میں صاف اور منطقی طرز پر سوچنے کی کمی ہے۔ وہ اپنے مواد کو تسلی بخش طریقے سے ترتیب نہیں دے سکتے یا اپنی دلائل کو زوردار انداز میں بیان نہیں کر سکتے۔ جنرل نالج کے ممتحن کے الفاظ میں، "ان میں خیال اور اظہار کا فقدان ہے۔ اس کے باعث ان کا بیان بے تکا پھیکا اور غیر ضروری اعادہ اور بے معنی یا مہمل نتائج پر مبنی ہوتا ہے۔"

---

[1] جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی یہ رائے کہ اعلیٰ یونیورسٹی تعلیم بچے یا لڑکے کی تقریباً بیس سال عمر کی مخرب اور گھٹتے ہوئے کردار اور اخلاق کی خامیوں اور خرابیوں کی اصلاح کر سکتی ہے ایک قابل ستائش مگر غیر حقیقی خیال ہے علاوہ ازیں ایک مخرب شدہ اور پر امتناع معاشرے میں اعلیٰ یونیورسٹی کا جنم لینا فوق العقل بنتا ہے۔ ہر ادارے کی طرح یونیورسٹیاں بھی اپنے معاشرے کا عکس ہوتی ہیں اولین ضرورت معاشرے کی آئیڈیالوجی اور معاشرت کو تبدیل کرنے کی ہے اس کے بعد تمام ادارے بشمول یونیورسٹیوں کے فعال اور تکمیلی بن جائیں گے۔

[2] رپورٹ ہذا۔ ص ۱۴ - ۱۵۔

(۱۳) "کچھ" لکھنے کا رجحان: امیدواروں میں کچھ نہ کچھ لکھنے کا رجحان پایا جاتا ہے، بہت سے امیدواروں نے ایسے جوابات لکھے جو سوالات سے کم و بیش کوئی تعلق یا مناسبت نہیں رکھتے تھے۔

(۱۴) تنقیدی صلاحیت کی کمی: کئی ممتحنوں نے شکایت کی کہ بہت سی مثالوں میں امیدواروں کا کوئی نقطۂ نگاہ معلوم نہیں ہوتا تھا انہوں نے مروجہ نعروں کی صدائے بازگشت لگائی' دوسروں کی رائے کا حوالہ دیا اور فرسودہ جوابات لکھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امیدواروں نے ان مضامین کا باقاعدہ اور مربوط مطالعہ نہیں کیا تھا جن کو انہوں نے امتحان کے لئے خود منتخب کیا تھا۔[1]"

ایک اور جگہ پر رپورٹ نے جنرل نالج کے ممتحن کی رائے کا حوالہ دیا:

"ٹھوس حقائق کی کوئی لگن نہیں۔ چیزوں کا خود مشاہدہ کرنے کی کوئی خواہش نہیں' اور اپنے مشاہدات کی تلاش کی کوئی جستجو نہیں ہر چیز صاحب اختیار رائے کے مطابق قبول کر لی جاتی ہے[2]"

کمیشن کی رپورٹ اس امر کو بھی واضح کرتی ہے کہ مضامین کے انتخاب میں امیدواروں کی بڑی اکثریت "آسان" مضامین کو منتخب کرتی ہے ان مضامین کو جو ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں اور جن کا نفس مضمون مشترک ہوتا ہے کہ مشکل مضامین کے مقابلے میں زیادہ اچھے نمبر حاصل ہو سکیں۔ لہٰذا ریاضی اور سائنس کے مضامین کو نہیں چنا جاتا' کیونکہ، جیسا کہ رپورٹ لکھتی ہے:

"ان مضامین میں صحیح تیاری اور مطالعے کی مسلسل محنت کے بغیر اچھے نمبر لینا مشکل ہوتا ہے[3]"۔

---

[1] ایضاً ص ۱-۲۔

[2] ایضاً ص ۳۔

[3] ایضاً ص ۹ تا ۱۱: مزید دیکھئے "فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی ۱۹۵۳ کی رپورٹ" صفحہ ۱۲ تا ۱۵۔ کراچی

۱۹۶۲ کی رپورٹ مرکزی پبلک سروس کمیشن نے سالانہ رپورٹوں کے سلسلے میں ۱۹۶۲ کی سالانہ رپورٹ بھی اپنے امتحانات کے نتائج مندرجہ ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا:-

"اپنے مشاہدوں اور تجربوں کی بنا پر جو انہیں انٹرویو بورڈ میں حاصل ہوئے اور جو سائیکولوجیکل رپورٹوں کے مطالعہ سے بھی حاصل ہوئے کمیشن اس رائے پر پہنچا ہے کہ اخلاقی طور پر اور کردار کے لحاظ سے بھی موجودہ نسل نیچے کو ڈوبتی جا رہی ہے۔"[1]

نسلی سائیکل میں تکمیلی خلا ہمارے معاشرے اور خاندانی نظام کے مطالعے اور تجزیے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پردہ اور تعدد ازدواج بچوں اور نوجوانوں کے ذہن و کردار کے نشو و نما پر ایسے اثرات اور نتائج مرتب کرتے ہیں کہ ہر نئی نسل پرانی نسلوں کے مقابلے میں تکمیلی صلاحیتوں اور قوتوں میں زیادہ خراب، کمزور اور نااہل ہوتی ہے۔ اس طرح ان کی عادات و کردار، شخصیت اور اذہان میں تکمیلی صلاحیتوں اور کارکردگی استعداد اور اہلیت میں کمی اور خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نسلی سائیکل میں اس تکمیلی خلا کے اسباب اور حالات کے پیچھے کونسے معاشرتی عوامل کام کر رہے ہیں جو یہ نتائج پیدا کرتے ہیں؟ مرکزی پبلک سروس کمیشن کے الفاظ میں، وہ کونسے عوامل ہیں جو ہماری ہر نئی نسل کو نیچے کو دھکیل رہے ہیں؟

پردہ سوسائٹی کے نسلی سائیکل میں تکمیلی خلا کے عوامل

اس سے پیشتر کہ ہم تکمیلی خلا کے عوامل کا تجزیہ کریں، ایک ممکنہ غلط فہمی دور کرنا ضروری ہے۔ تکمیلی خلا دو نسلوں کے معاشرتی اور تمدنی ترسیل اور تسلسل میں اخلاقی اور

---

[1] پاکستان ٹائمز، لاہور۔ ۲۳، مارچ ۱۹۶۲۔

کرداری خلا ہوتا ہے۔ ایسے خلے کو بعض اوقات نسلی خلا یا نوجوانوں کی بغاوت بھی کہتے ہیں۔ مگر ان دونوں اصطلاحات میں کئی فرق ہیں۔

اوّل، نسلی خلے سے ایسا نفسیاتی فرق تصور کیا جاتا ہے جو نوجوان اور بزرگ، نئی اور پرانی نسلوں کے خیالات، محرکات اور امنگوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق قدرتی بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ دونوں نسلیں اپنی عمر اور زندگی کے مختلف مرحلوں پر کھڑی ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور واقعات کو مختلف نقطۂ نظر سے دیکھتی ہیں۔ نوجوان نسل قوت اور توانائی اور نئی امیدوں اور تمناؤں سے بھری ہوتی ہے۔ وہ خوابوں اور نصب العین کی دنیا میں رہتی ہیں، جن کو وہ حقیقت بنانے کے لئے بے چین ہوتی ہیں خواہ اس کے لئے توڑ پھوڑ کی ضرورت بھی کیوں نہ پڑے۔ ان کو اپنی قوتوں پر اعتبار ہوتا ہے، اس لئے اپنے بزرگوں سے اپنے اختلاف کو ظاہر کرنے کے لئے بھی بیقرار ہوتے ہیں، خواہ یہ بزرگ والدین ہوں، استاد ہوں یا کوئی صاحب اختیار ہو۔ یہ نوجوانوں کی بغاوت ہے، جو والدین بزرگوں اور استادوں کی تقریباً بیس بائیس سالہ کنٹرول اور ممانعتوں، امتناعات اور گوشمالی اور ڈانٹ ڈپٹ کے خلاف شعوری یا غیر شعوری مخالفت اور سرکشی میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہم نے نسلی سائیکل میں تکمیلی خلا کو ان معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس قسم کی نوجوان نسل کی بغاوت قدرتی بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات ضروری بھی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ بغاوت معاشرے کو حیات نو اور ترقی کی جانب سمت بند کر دے تو یہ تاریخی نتائج کی حامل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ صرف قانون شکنی اور توڑ پھوڑ تک محدود رہتی ہے تو امن و امان کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بغاوت اور روگردانی عارضی بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ جب نوجوان نسل بالغ ہو جاتی ہے اور بزرگوں کی ذمہ داریوں اور مجبوریوں میں الجھ جاتی ہے تو اکثر ان کی نوجوانی کی بغاوتیں یا باغیانہ رائے اور رویے بدل جاتے ہیں اور بسا اوقات ختم ہو جاتے ہیں۔

دوم، نسلی خلا بعض اوقات معاشریاتی یا عمرانی معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی نئی اور پرانی نسلوں میں معاشری، اخلاقی، اقتصادی، تمدنی یا سیاسی قدروں نظریوں، توقعات، عقیدوں اور چال چلن کے فرق کے معنوں میں متصور ہوتا ہے۔ یہ فرق بلاشبہ دونوں نسلوں میں معرکہ خیز تضاد کی غمازی کرتا ہے اور ان کے معاشرے اور تہذیب و تمدن کے لئے بنیادی اور انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔ یہ معاشری اور تمدنی ترسیل اور تسلسل کے عوامل میں بگاڑ یا فساد، انقباض یا ٹھہراؤ کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ ان عوامل میں کہیں ایسا خلل اور خلا، کمی اور گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے اور ایسا معاشری نظام وجود میں آگیا ہے یا ایسے گروہ اور طبقے اور ایسے طور و طریقے اور ادارے پیدا ہو گئے ہیں جو ایسی عادات، طرز زندگی اور معاشرت، ایسے رجحانات اور مفادات کے علمبردار ہیں جو آنے والی نسلوں کو ایسے خیالات، نظریات، رویے اور رجحانات اور طور و طریقے نہیں سکھاتے یا ایسا معاشری ماحول اور فضا نہیں قائم کرتے جو معاشرے کی ترقی، پیش رفتگی اور ارتقا اور بقا اور سلامتی کے لئے ضروری اور لازمی ہوں۔ یہ صورتحال ملک اور قوم کی معاشری تاریخ کے انحطاط اور انقطاع پر منتج ہو سکتی ہے۔

مگر یہاں تجزیاتی احتیاط کی ضرورت ہے۔ انسان کی معاشری تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہر دور اور ہر ملک میں ہر طرح کے نسلی خلے پیدا ہوتے رہے ہیں نئی نسلوں کے انحراف اور سرتابی کی کہانی ازل سے ابد تک سنی جاتی رہے گی۔ نئی اور پرانی نسلیں اپنے معاشرے اور تاریخ کے تسلسل کے دو مختلف مقام اور مدارج پر کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ فرق ان کی عمروں کا فرق ہے جو اپنے اندر زمانوں کے فرق کو سمیٹے ہوتا ہے۔ بڑوں اور بزرگوں کی نسلیں اپنے معاشرے، ملک اور قوم کی زندہ تاریخ ہوتی ہیں۔ اُن کے ذہن و کردار، خیالات اور نظریات عقائد اور اقدار، رویے اور رائیں اس تاریخ کی پیداوار ہیں۔ مگر اسی تاریخ

نے ایسے نئے حالات، ماحول اور تقاضے بھی پیدا کر دیئے ہوتے ہیں جو نئی عادات اور صلاحیتوں، نئے خیالات اور نظریات، نئے عقائد اور اقدار اور نئے طرز فکر وعمل کے مقتضی ہوتے ہیں۔ یہ حالات نئی اور مختلف نوعیت کے کردار اور اذہان پیدا کرتے ہیں جو پرانی اور جامد قسم کے اذہان، کردار اور شخصیتوں سے متضاد اور متصادم ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔ مگر جب ہم اس طرح کے تضاد اور تصادم کا ذکر کرتے ہیں، تو یہ صرف دو نسلوں کے نسلی فرق اور خلے کا سوال نہیں رہتا۔ دراصل اس تضاد اور فرق میں کوئی "نوجوانوں کی بغاوت" کا مسئلہ بھی نہیں، کیونکہ نئے خیالات، نظریات، رویوں اور رایوں کے حامل افراد نئی نسلوں میں بھی اور پرانی نسلوں میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ تاہم ایسے افراد اور گروہوں کا ظہور ملک و قوم لوگوں اور عوام کی تاریخ اور ترقی، بقاء و سلامتی کی روح رواں ہوتا ہے، خواہ ایسے لوگ نئی نسل میں ہوں یا پرانی۔ فیصلہ کن امر یہ ہوتا ہے کہ کون سے لوگوں کے خیالات اور عقائد، نظریات اور طرز فکر و عمل معاشرے اور وقت کی ضرورت اور حالات سے مطابقت رکھتے ہیں اور ترقی اور خوشحالی اور فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہیں۔ ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ پرانی نسلوں کے خیالات، عقائد اقدار، تجربات اور رجحانات وقت اور حالات سے مطابقت نہ رکھیں اور اس طرح اُن کے قول و فعل میں بُعد پیدا ہو جائے لہٰذا نوجوان نسلیں اُسے مکر و فریب یا بے وقت کی راگنی تصور کریں، جو ان میں مخالفت اور بغاوت اور غم و غصہ کے جذبات برانگیختہ کر دیں۔ مگر دو نسلوں کے اس فرق کو بھی تکمیلی خلا کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ نوجوانوں اور بالغ یا بزرگ نسلوں میں نفسیاتی فرق کی طرح یہ معاشریاتی تضاد بھی معاشری ترقی اور ارتقا کے لئے ضروری ہے۔ درحقیقت بعض اوقات نوجوانوں کی پرانی نسلوں کی روایات اور عقائد، نظریات اور اقدار، طرز فکر و عمل کے خلاف اس طرح کی مخالفت اور بغاوت قوم و ملک اور معاشرے کے مستقبل اور تاریخ کو بنا سکتی ہے۔

دونسلوں میں یہ فرق اور تضاد کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ اس کی وجہ اُن کی عمروں کا فرق نہیں، کیونکہ ایسا فرق اور تضاد ہم عمر اور ہم نسل افراد میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ انسان کی زندگی اور وجود کی معاشرتی و تاریخی تسلسل میں وقوع پذیری ہے۔ یہ انسان کی وقت اور حیات کے دھارے میں قیدوبند ہے، جس کے باہر اس کا وجود ہی نہیں۔ تاہم انسانی ذہن و فکر اور عقل و فہم کسی خاص وقت اور مقام پر اپنی دنیا کے حالات، واقعات اور عوامل کو اپنے عمل و فعل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ مگر وہ زندگی، معاشرے، قدرتی دنیا اور تاریخ کے خارجی حقائق، عوامل و عواقب اور حالتوں کو کاملاً اور کلیتاً نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ایسا تضاد ہے جو انسانی علم، عقل اور شعور اور خارجی حقائق اور حالات میں ایک خلا اور بُعد حائل کر دیتا ہے، جس سے انسان کے عقائد، خیالات، نظریات تصورات، اقدار اور وفاداریوں اور وابستگیوں میں اور خارجی حالات اور واقعات اور حقائق میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس تضاد کو انسان مزید غور و فکر، مزید مشاہدے اور تجربے، علم اور مطالعہ سے رفع کر سکتا ہے جو اس طرح ہو۔ زیادہ صحیح سچے اور حقیقی نئے خیالات، نظریات، نئے عقائد اور اقدار، رویے اور منصوبے، نئی دلچسپیاں، مفاد اور تجویز اور پلان یا پروجیکٹ سے اس تضاد کے چیلنج کا مقابلہ کر سکتا اور قابو حاصل کر سکتا ہے یہ سب کاروائیاں اور سرگرمیاں، خواہ فکری ہوں یا عملی، تکمیلات ہوتی ہیں۔ مگر بعض لوگ، جن میں بالغ اور بڑی عمر کے افراد بھی ہو سکتے ہیں اور نوجوان بھی، اس چیلنج کو قبول نہیں کرتے اس طرح اُن کے ذہن و فکر، عمل و کردار، عادات اور عقائد میں اور معاشرے اور دنیا کے خارجی حقائق اور حالات میں بُعد اور نامطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بُعد اور خلا ان لوگوں اور گروہوں کو ایسے لوگوں، گروہوں سے متصادم اور متحارب کرا دیتا ہے جو اس بُعد اور خلا میں مبتلا نہیں ہوتے، خواہ یہ لوگ نوجوان نسلیں ہوں یا بزرگ اور بالغ

نسلیں یا دوست یا دشمن ہوں۔

مگر سوال یہ ہے کہ یہ بُعد اور خلا کیوں پیدا ہوتا ہے؟ بالفاظ دیگر، بعض لوگ اور گروہ بدلتے ہوئے حالات، واقعات اور تغیرات کا چیلنج کیوں نہیں قبول کرتے اور اپنے خیالات اور نظریات، اقدار اور رویوں کو کیوں نہیں فعال اور ڈائنمک بنا لیتے؟ ان کے ذہن و فکر، عمل اور عادات کیوں جمود زدہ غیر متحرک اور انحطاط پذیر ہو جاتے ہیں؟ اس کا ایک سبب لوگوں اور افراد کی بڑھتی ہوئی عمر بتایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑی عمر کے لوگ قدامت پسند ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ رائے حقیقت پسندانہ نہیں۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ علم اور تجربہ بڑھنے سے احتیاط کی عادات ضرور پیدا ہو جاتی ہیں، جو نوجوانوں میں اکثر وبیشتر نہیں ہوتی ہیں۔ مگر معاشرے اور زندگی کے حقائق سے روگردانی، نئے حالات، اور واقعات کے علم و آگاہی سے بے خبر اور لاپرواہ رہنا اور ان کے چیلنج کو قبول نہ کرنا کسی فرد یا گروہ کے مزاج اور مرضی، عمر اور عادات پر منحصر نہیں، بلکہ ملک و معاشرے اور قوم اور بنی نوع انسان کی ترقی اور خوشحالی، بقا اور سلامتی کا سوال ہے۔ لہٰذا کسی فرد گروہ یا لوگوں کی "قدامت پسندی"، رجعت پسندی یا لاعلمی اور غفلت محض ان کے معاشرے کا ایک غیر تکمیلی عنصر ہے۔ اگر معاشرے میں اس کے خلاف ایسے تکمیلی افراد، گروہ اور لوگ نہ ہوں جو اس کے تضاد کو معاشراً ختم کر دیں، تو یہ غیر تکمیلی عنصر اپنے معاشری اثر اور نسلی سائیکل سے پھیل کر آنے والی نسلوں پر چھا جاتے گا۔ اس طرح ملک و قوم کی ساری معاشری زندگی پر انحطاط اور جمود طاری ہو جاتے گا۔ تمام معاشری، معاشی، تمدنی، نظریاتی، علمی، فنی، سیاسی اور حکومتی نظام ہائے زندگی سابقہ اور موجودہ بالغ نسلوں کی تکمیلات ہیں۔ اگر کوئی قوم اپنے انحطاط پذیر عوامل اور عناصر کے باعث اپنی آنے والی نسلوں میں تکمیلی صلاحیتوں، قوتوں اور ترغیبات اور شوق پیدا نہیں کرتے اور انہیں اپنی زندگی، معاشرے اور تاریخ کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے

کی جانب راغب اور سمت بند نہیں کرتی، تو پھر ایسا نسلی خلا پیدا ہوگا، جسے ہم نے تکمیلی خلا کہا ہے۔ در اصل یہ خلا پرانی اور بڑی نسلوں کی کمزوری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ نئی اور نوجوان نسلوں کی تکمیلی گمراہی اس وقت شروع ہوتی ہے جب پرانی نسلیں خود تکمیلی راہوں سے گمراہ ہو جاتی ہیں۔ اگر پرانی اور بالغ نسلیں اپنے زمانے کے نئے حالات، تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا اور اپنے زمانے کے چیلنجوں کا مقابلہ نئی تکمیلات سے کرتی رہیں، تو وہ اپنے عمل اور مثال سے، یعنی اپنے قول و فعل اور اصلاح و تنقید کے عمل اور ماحول سے نئی نسلوں کو بھی اپنے وقتوں کے مسائل اور معاملات کے حل کرنے اور مقابلہ کرنے کی تکمیلی صلاحیتیں اور اوصاف سے لیس کر دیں گی۔ لیکن اگر انہوں نے نہ صرف اپنے وقت کے حالات اور چیلنجوں کا مقابلہ ہی نہیں کیا، بلکہ ایسا جمود زدہ اور انحطاط پذیر معاشرہ ودیعت کیا تو وہ نئی نسلوں میں غیر تکمیلی رجحانات اور عادات پیدا کر دیں گی۔ اس تکمیلی جمود اور انحطاط کی ابتدا پرانی نسلوں کے تکمیلی انحطاط سے ہوتی ہے، جو اُن کے غیر تنقید شدہ عقائد، نظریات، روایات، مقاصد زندگی، رسم و رواج، اداروں اور طرز زندگی سے شروع ہوتی ہے، یا ان افکار و اقوال سے ہوتی ہے جن کا وہ دعویٰ تو کرتے ہیں مگر ان پر عمل نہیں کرتے۔

نسلی سائیکل میں تکمیلی خلا ایک ایسی انومی[1] (Anomie) کو ظاہر کرتا ہے

---

[1] انومی کے معنے ہیں لااصولیت اور لاقانونیت۔ یہ اصطلاح یونانی زبان سے اخذ کی گئی ہے اور دو جزو سے بنائی گئی ہے یعنی ا + نوموس۔ ا کے معنے ہیں نا یا لا اور نوموس کے معنے ہیں "قانون" اصول یا قاعدہ معاشری سائنس میں اس کے معنی ہیں ایسی حالت جس میں ایسے غیر واضح، متضاد اور غیر مربوط طور طریقے پائے جائیں جن میں فرد دوسرے افراد سے اخلاقی طور سے بامعنی اور بامقصد تعلقات نہ قائم کرے یا جن میں حصول لذت کی کوئی حد نہ قائم رہے جو معاشری زندگی میں لاتنظیمی اور انتشار عمل کا باعث ہو۔ انومی سے افراد میں احساس محرومی اور ناکامی مقاصد کی بے حسی کی اور لاپروائی "فرار اور چال چلن کی بے راہ روی اور بے "قاعدگی پیدا ہو جاتی ہے اور معاشرے میں انتشار اور بدنظمی، یا غیر مربوطیت، بے اصولی پن اور لاقانونیت یا انارکی پھیل جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر، انومی فرد کی شخصیت و کردار کی بے اصولی کیفیت اور انارکی معاشرے کی تخریب زندگی اور انتشار کی حالت ہوتی ہے اور پھر دونوں بدی کا چکر بن کر ایک دوسرے کو بڑھاتی ہیں۔

جس کا ظہور تو فرد کے کردار اور شخصیت میں ہوتا ہے، مگر جس کا مبداء معاشرے کے اداریاتی نظام اور اس کی آئیڈیالوجی میں پایا جاتا ہے۔ یعنی ان نظریات، اقدار، خیالات رایوں اور رویوں میں پایا جاتا ہے جن پر معاشرے کے رائج الوقت ادارے اور طور و طریقے قائم ہوتے ہیں اور جو وہ افراد کے ذہن اور فکر و خیال پر منعکس اور مرتب کر رہا ہے۔ انسانی زندگی انفرادی اور اجتماعی لحاظ سے ہر وقت اور ہمیشہ مسائل (پروبلم) اور چیلنجوں سے دوچار رہتی ہے۔ اس لئے ضرورت یہ ہے کہ نئی نسلوں کو شروع دن سے اس طرح اور ایسے طور و طریقوں سے معاشرایا جائے یعنی ان کی اخلاقی، ذہنی اور کرداری نشو و نما اس طرح سے کی جائے کہ ان کے کردار اور شخصیت میں کام، محنت اور مشقت، کوشش اور عمل پیہم اور جدوجہد کی عادات اور صلاحیتیں اور قوتیں پیدا ہو جائیں۔ لیکن اگر معاشرے میں انومی پیدا ہو جائے، یعنی اس کا اداریاتی نظام اور آئیڈیالوجی بے مقصدیت، لاپروائی، اور ذہن و فکر کی کاہلی اور الکسی پیدا کریں، تو ایسے معاشرے میں پرورش پانے والے بچوں اور نوجوانوں کے ذہن و کردار میں کام اور محنت، کوشش اور جدوجہد، عمل اور تکمیل کی صلاحیتیں اور قوتیں ماؤف اور مفلوج ہو جاتی ہیں اور بعد ازاں وہ اپنے مسائل کو حل کرنے، اپنے کاموں کو انجام دینے اور اپنے وقت اور حالات کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے اہل نہیں رہتے اور اپنی بقا اور سلامتی کو راہ فرار اور منفیت اور کام اور تکمیل سے گریز میں تلاش کرتے ہیں۔[1]

مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کام اور تکمیل کی کیا ضرورت ہے؟ جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے، تکمیلی خلا بنیادی طور پر نہ تو دو نسلوں کی عمروں کے فرق سے پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی ان کی نفسیات یا اقدار، رایوں یا رویوں کے فرق

---

[1] نسلی سائیکل میں تکمیلی خلے کی منفیت اور انومی سے اس کے عمل کا غیر ضروری پن اور غیر معاشری پن بھی واضح ہوتا ہے۔ در اصل یہ خلا ترقی پسند معاشرے میں ہرگز ظہور پذیر نہیں ہوتا، بلکہ صرف پردہ سوسائٹی جیسے انحطاط زدہ اور تنزل پذیر معاشرے کے نسلی سائیکل میں ہی بروئے عمل آتا ہے۔

اور اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمام فرق اور اختلافات عمر اور عقل، وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مگر ایک چیز، جو انسانی زندگی اور معاشرے میں نسلاً بعد نسلٍ کبھی بھی نہیں بدلے گی وہ ضرورت تکمیل ہے یعنی ایسے کاموں، محنت و مشقت، کوشش اور جدوجہد اور عمل و تنظیم کی ضرورت ہے جن سے ایسی پیدا وار اور تخلیقات کی جائیں جن کے بغیر انسانی زندگی اور معاشرے کو قائم و دائم نہیں رکھا جا سکتا۔ انسانی زندگی اور معاشرے کے قیام، بقا و سلامتی، ترویج اور ترقی کے لئے ضروری حالات اور ماحول از خود یا قدرتاً پیدا یا سازگار نہیں ہوتے بلکہ ان کو پیدا کیا اور سازگار بنایا جاتا ہے۔ اس کے لئے جس پیداواری اور تخلیقی کوشش، محنت و مشقت اور تگ و دو کی ضرورت ہوتی ہے اُسے ضرورت تکمیل کہتے ہیں۔ یہ ضرورت انسانی زندگی اور معاشرے کی ابدی حالت کا نام ہے، بلاشبہ، اس کی عملی نوعیت تو بدلتی رہتی ہے، یعنی تکمیل کے لئے نئے طور و طریقے تکنیک، اور آلات اور اوزار، فن اور ہنر تو ایجاد اور دریافت ہوتے اور استعمال اور رائج ہوتے رہتے ہیں، مگر انسانی ذہن اور جسم کو محنت و مشقت، کام اور عمل سعی و کوشش اور جدوجہد کے وہ مخصوص حرکات و سکنات اور اعمال، جنہیں تکمیلی عادات و کردار کہا جاتا ہے، کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی، خواہ سائنس اور ٹیکنالوجی کیسے اور کتنے ہی خود بخود حرکت کرنے والے آلات، مشینیں، طریقے اور تکنیک وغیرہ کیوں نہ ایجاد اور دریافت کرلیں۔ اس وجہ سے ہم نے ضرورت تکمیل کو انسان کی حیاتیاتی ضرورت کہا ہے۔ لہٰذا جب تک کرۂ زمین پر انسانی زندگی باقی ہے، ضرورت تکمیل بھی باقی رہے گی۔[1]

انسانی زندگی اور معاشرے میں اس ضرورت کا نازک ترین مرحلہ نسلی

---

[1] جب کوئی شخص، گروہ یا طبقہ اپنی ضرورتِ تکمیل کا بوجھ کسی دوسرے شخص، گروہ، طبقے یا لوگوں پر ڈال دیتے ہیں، تو وہ اُن سے استحصالی رابطہ پیدا کر لیتے ہیں۔ استحصال دراصل اپنی تکمیلی ضروریات کو دوسروں کی محنت و مشقت اور کام اور کاوش کے ذریعے حاصل کرنے کو کہتے ہیں، خواہ یہ استفادہ عورت

سائیکل کا وہ وقت ہوتا ہے جب نئی نسلیں پرورش اور تعلیم و تربیت حاصل کر رہی ہوتی ہیں۔ یہ مرحلہ اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ آیا نئی نسلیں بالغ ہو کر اپنے متقدمین کی تکمیلات اور کاموں کی ذمہ داریوں اور فرائض سے اور اپنے وقت کے نئے مسائل اور مشکلات کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہو سکیں گی یا نہیں۔ پس معاشرے کو ہر وقت یہ ضرورت درپیش رہتی ہے کہ وہ نوخیز نسلوں کو تکمیلی ذہن و فکر، عادات و کردار کی صلاحیتوں اور رجحانات، شوق اور دلچسپیوں کی ترغیب اور سمت بندی کرے۔ مگر اس کا فیصلہ اس امر پر موقوف ہے کہ اس نے کس طرح کے والدین پیدا کئے ہیں۔ اگر والدین خود بھی تکمیلات کی جانب سمت بند ہوں گے، تو پھر ہی وہ اپنے بچوں اور نوجوان نسل کے ذہن و کردار کی تکمیلی تکوین و تشکیل کریں گے۔ لیکن اگر وہ خود ایسے معاشرتی اداروں، حالات اور ماحول میں رہتے ہیں جو تکمیلی زندگی کے کاموں اور کوششوں کے مانع، منافی یا مخالف ہوں تو پھر وہ اپنی اولاد کو بھی تکمیلی نہیں بنائیں گے۔ تب ہر نسلی چکر کے بعد نئی اور پرانی نسلوں کی تکمیلی صلاحیتوں اور خاصیتوں میں بُعد اور خلا پیدا ہو جائے گا، جو درحقیقت غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی اداروں اور آئیڈیالوجی کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔

پردہ سوسائٹی میں نسلی سائیکل اور قانونِ انحطاطِ شخصیت

مسلم معاشرے میں نسلی گردش کے عمل میں تکمیلی کمی اور خلے کا ظہور کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ اتنا ہی پرانا عمل ہے جتنا اس میں پردہ سسٹم کا رواج۔ قرون

سے حاصل کیا جائے یا مزدور سے، غلام سے یا کنیز سے، کسان سے یا محنت کش سے، کسی مفتوحہ لوگوں سے یا پس ماندہ قوموں سے۔ ان استحصالوں کی صورت اور نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ مگر صورت کچھ بھی ہو، جب کبھی کسی فرد، گروہ، طبقے یا لوگوں کی تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں سے کوئی اور شخص، گروہ، طبقہ یا قوم فائدہ اٹھانے یا ان کو کسی نظریے یا رشتے کے تحت تکمیلات حاصل کرنے کے مواقع، حقوق، آزادیاں اور سہولتیں سے محروم کرنے، تو ان کا استحصال شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے استحصالی نظریات، رشتوں اور معاشروں کا تجزیہ ہم نے پردہ سوسائٹی کی تاریخ میں قرونِ وسطائی مسلم معاشرے کے سیفین چکروں کے بیان میں باب ہفتم میں کیا ہے۔ جدید پردہ سوسائٹی کے استحصالی نظام کا تجزیہ ہم اگلے باب میں کریں گے۔

وسطائی مسلم معاشرے میں یہ قانون تقلیلِ تکمیل کو جنم دیکر ہر ایک مملکت اور معاشرے کے انتشار، تخریب اور انحطاط کا باعث ہوتا تھا اور اسلامی حکومتوں اور مملکتوں اور اسلامی تہذیب و تمدن کے بار بار زوال و سقوط کا سبب بنتا تھا، جسے ہم نے سیفین چکروں کا نام دیا ہے اور جن کا تجزیہ ہم نے باب سوم میں کیا ہے۔ دنیائے اسلامی پر یورپین سامراجیوں کے حملوں اور فتوحات نے قرون وسطیٰ کے سیفین چکروں کا تو خاتمہ کر دیا، مگر مسلم معاشرے کو تکمیلی خلاء اور اس کے پیدا کردہ انحطاط، انتشار اور زوال سے آج تک نجات حاصل نہیں ہوئی اور نہ تب تک نہیں ہو گی جب تک اس میں پردہ اور تعدد ازواج کے رسم و رواج، قوانین اور نظریات (آئیڈیالوجی) باقی رہیں گے۔ کیونکہ تکمیلی خلاء کے عمل کے پیچھے قانونِ انحطاطِ شخصیت کا عمل کارفرما ہوتا ہے۔ جسے پردہ اور تعدد ازواج کے رسم و رواج اور قوانین اور نظریات پیدا کرتے ہیں اور جو ہر ایک مسلمان مرد اور عورت کے کردار اور شخصیت کے انحطاط اور تخریب کے عمل کو غیر متغیر، ناگزیر اور ناقابل اصلاح بنا دیتے ہیں۔

مسلمان معاشرے کی بنیادی ٹریجڈی پردہ اور تعدد ازواج جیسے خلاف تکمیلی ادارے اور نظریات (آئیڈیالوجی) ہیں۔ اول تو یہ ادارے مسلمان والدین کے تکمیلاتی سمت بندی کے کاموں اور فرائض کی انجام دہی میں مخل ہوتے ہیں اور اس کے عمل کو مخرب کرتے ہیں۔ والدینیت (Parenthood.) محض بندھا ٹکا کام اور لکیر کے فقیر کی طرح رسمی فریضہ نہیں، بلکہ یہ سمجھدارانہ چال چلن اور ذمہ دارانہ برتاؤ اور معاملہ فہمی کا مقتضی ہے۔ درحقیقت معاشرہ اور ماحول جتنے زیادہ تکمیلی ہوں گے، والدین سے اتنا ہی زیادہ تکمیلی سمت بندی کے لئے فرض شناسی، سمجھداری، شعور اور ذمہ داری کا تقاضہ ہو گا۔ ماں باپ اپنے بچوں کے مستقبل کو بناتے ہیں اور اس طرح اپنے معاشرے کا مستقبل بھی بناتے ہیں، خاص طور پر اگر ان کا تعلق اپنے معاشرے کے تکمیلی گروہوں اور افراد یا ایلیت طبقوں سے ہو۔ پردہ دار والدین مسلم

معاشرے اور ملک میں زیادہ تر اکثریت یعنی متوسط اور امیر طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس بنا پر بھی اُن کی معاشری حیثیت اور مقام متعدد اور مختلف طرح کے مسائل، خطرات اور چیلنجوں کے حامل ہوتے ہیں، جن کو انہیں حل کرنا اور مقابلہ کرنا ہے اور اپنی اولاد کو بھی انہیں حل کرنے اور مقابلہ کرنے کے لئے اپنی طرح تیار کرنا ہے۔ مگر جیسا کہ ہم نے اس باب اور گذشتہ باب میں بیان کیا ہے، پردہ اور تعدد ازواج مسلمان والدین کے لئے، خاص طور پر مسلمان ماں کے لئے ایسے حالات، مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں اور اولاد کے کردار اور اذہان کی تکمیلاتی سمت بندی کے اہل نہیں رہتے۔

ان پر ایسی پابندیاں، خوف اور علیحدگیاں، مجبوریاں اور معذوریاں عائد کر دی جاتی ہیں کہ وہ خود بھی غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی فرد بن جاتے ہیں۔ اور اپنے عمل اور مثال سے ایسے ہی اثرات اور ردعمل اپنے بچوں اور نوجوانوں میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاشرے میں ہر نئی نسل ایسے ماحول اور حالات میں پلتی اور بڑی ہوتی ہے جو ان کے ذہن و فکر، عادات اور کردار کو اپنے والدین اور بزرگوں کی نسبت زیادہ غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی بنا دیتے ہیں۔ یہ تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں کی کمی یا تقلیل کا عمل ہے۔

تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں کی کمی کا عمل عورتوں اور لڑکیوں کے ذہن و کردار کی تکمیلی خامیوں اور کمزوریوں سے شروع ہوتا ہے، جو زنانخانے، پردہ اور برقع اور تعدد ازدواج کی بندشوں اور پابندیوں میں زندگی گزارتی ہیں۔ ان پابندیوں اور سختیوں کی وجہ سے وہ مردوں کی باہر کی دنیا کے ہر طرح کے عمل، ردعمل اور باہمی عمل کے مواقعوں اور تجربوں اور معلومات سے محروم رہتی ہیں، جو بالآخر ان کے ذہن و کردار میں غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی عادات، رویے اور رجحانات پیدا کر دیتے ہیں، جن کو ہم نے پردہ سنڈروم (Purdah Syndrome)

کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ قانون انحطاطِ شخصیت کے معاشری عمل کی پہلی اور ابتدائی صورت ہے۔ ایسے ماحول میں پلی ہوئی لڑکیاں جب جوان ہو کر مائیں بنتی ہیں اور پردے اور تعدد ازواج کی قید و بند میں اپنی اولادوں کی پرورش اور تربیت کرتی ہیں، تو وہ اپنی نیکیلی کمزوریوں، خامیوں اور خرابیوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے بچوں کے دل و دماغ میں سرایت کر دیتی ہیں۔ اس طرح ان پردہ دار لڑکوں اور لڑکیوں کی نئی نسل میں اپنی ماؤں اور پردہ دار ماحول اور فضا کے باعث کام اور محنت، کوشش اور صلاحیتوں میں مزید کمی آجاتی ہے۔ یہ دوسری نسل میں شخصیت اور کردار کا زیادہ شدید انحطاط ہے۔ جب یہ نسل جوان اور بالغ ہو کر اپنے بزرگوں کے فرائض، کام کاج اور ذمہ داریوں کو سنبھالتی ہے تو وہ اُن سے مقابلتاً زیادہ نا اہل اور غیر نیکیلی ہوتی ہے، کیونکہ ان پر اپنے ماں باپ کے پردہ سنڈروموں کے علاوہ پردہ سسٹم کے ماحول کا بھی اثرات پڑتے ہیں جو ان میں بھی اپنا سنڈروم اور اس کی کمزوریاں اور خرابیاں پیدا کر رہے ہیں جن کا تجزیہ ہم اگلے باب میں کریں گے۔ یہ اثرات لڑکوں کی نسبت لڑکیوں پر زیادہ شدید اور گہرے ہوتے ہیں۔ بہر حال، دوسری نسل کے لڑکے اور نوجوان جب بالغ اور بزرگ مردوں کے کام اور فرائض سنبھالتے ہیں تو ان کے کردار اور شخصیت کی کچھ نیکیلی بحالی ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ اپنی ہم عصر بہنوں، بیویوں اور دوسری عورتوں کے برعکس زنانخانے اور برقع کی قید و بند سے باہر مردانہ دنیا کے کاموں اور ذمہ داریوں کو انجام دینے لگتے ہیں۔ مگر یہ بحالی بچپن اور نوعمری کی کمزوریوں اور خامیوں کو پوری طرح ختم نہیں کر سکتی۔ لہٰذا دوسری نسل کے مرد بھی اپنے باپوں اور بزرگوں سے مقابلتاً زیادہ غیر نیکیلی اور نا اہل ہوتے ہیں۔ ان حالات میں تیسری نسل اپنی کلی طور پر غیر نیکیلی ماؤں اور جزوی طور پر غیر نیکیلی باپوں اور بزرگوں اور پردہ اور تعدد ازواج کے خاندانی اور معاشری ماحول میں پرورش اور تربیت پاتی ہے جو نہیں اور زیادہ غیر نیکیلی اور نا اہل، بلکہ خلاف نیکیلی بنا دیتے ہیں۔ اس طرح پردہ

سوسائٹی میں ہر نئی نسل انحطاطِ شخصیت و کردار اور تقلیل تکمیل کے عوامل کی دلدل میں زیادہ سے زیادہ دھنستی جاتی ہے۔ تاہم معاشرے میں بعض ایسے خاندان اور گروہ اور طبقے بھی ہوتے ہیں جو اپنی غربت اور ناداری کے باعث یا جدید تہذیبی اور تمدنی اثرات اور ترغیبات کے باعث پردہ سسٹم کے قید و بند سے کم و بیش آزاد ہوتے ہیں۔ ان میں بعض افراد تکمیلی کامیابیاں حاصل کر کے مسلم معاشرے کی کلی انحطاط و زوال کی رفتار کو کچھ کم کر دیتے ہیں۔ یہ ایلیت گروہوں اور طبقوں کی اندرونی گردش ہے، جو نئی مسلم سوسائٹی کے ابتدائی ادوار میں کارفرما ہوتی ہے۔ مگر جب یہ نئے تکمیلی گروہ اور طبقے بھی پردہ اور تعدد ازواج کے رسم و رواج اور طور طریقے اپنا لیتے ہیں، تو اُن کے خاندانوں اور گروہوں میں بھی قانونِ انحطاط شخصیت اور تقلیل تکمیل کے عوامل شروع ہو جاتے ہیں اور اس طرح ایک دو نسلوں کے بعد وہ بھی غیر تکمیلی ایلیت بن جاتے ہیں۔

قرونِ وسطیٰ میں تو یہ عوامل دو تین نسلوں میں ہی سارے مسلم معاشرے کے کلی اور فوری انحطاط، انتشار، زوال اور سقوط کے باعث ہوتے تھے مگر زمانہ جدید میں پردہ سوسائٹی میں بھی انسانی تہذیب و تمدنی اور تعلیم و طرز فکر و عمل نے ایسے تکمیلی اثرات اور آزادیاں پیدا کر دی ہیں جن کی وجہ سے جدید اور ترقی پسند افراد، خاندانوں، گروہوں اور طبقوں میں کچھ حد تک تکمیلی رجحانات کا تسلسل قائم رہتا ہے اور کچھ واجبی سی تکمیلات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ جدید پردہ سوسائٹی میں تکمیلیت اور غیر تکمیلیت کی اس افراط و تفریط کی نوعیت کا تجزیہ ہم اگلے باب میں کریں گے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جدید مسلم معاشرے میں یہ تکمیلاتی نشاۃ ثانیہ بھی زیادہ دیر جاری نہیں رہتی۔ کیونکہ جب تک پردہ اور تعدد ازواج کو قانوناً اور حقیقتاً پوری طرح منسوخ اور ختم نہیں کیا جاتا، ذاتی گروہوں اور طبقوں کو معاشرتاً اثر و رسوخ حاصل رہے گا اور ملک و معاشرے کی زیادہ آبادی اور اکثریت ان اداروں اور آئیڈیالوجی کے مخرب الاخلاق

وکردار اثرات سے متاثر اور مغلوب ہو کر غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی بنتی رہے گی اس طرح ملک و معاشرے پر انحطاط و انتشار جمود اور تنزل طاری رہیں گے، جو زمانہ جدید کے بحرانی ماحول میں اُن کے لئے ہمیشہ مہلک نتائج پیدا کرتے رہیں گے۔ ان حالات میں غیر ملکی حملے اور جارحیت کے بادل بھی منڈلانے لگتے ہیں اور مسلم قوم و ملک کی بقا و سلامتی بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

کیا پردہ سوسائٹی کے انحطاط انگیز عوامل و عواقب کا تدارک ممکن نہیں؟

کیا نسلی سائیکل کے اس تکمیلی خلا کو پُر نہیں کیا جاسکتا؟ کیا قانون انحطاطِ شخصیت اور تقلیل تکمیل کے عوامل کو پردہ اور تعدد ازواج کی حدود میں رہ کر روکا نہیں جاسکتا؟ کیا پردہ سسٹم اور تعدد ازواج کے باوجود مسلم معاشرے، قوم اور تہذیب و تمدن کے انحطاط، انتشار، زوال وسقوط کے رجحانات کو پلٹا نہیں جاسکتا؟ بالفاظ دیگر، کیا مسلمانوں میں ایسی فکری، معاشری، تمدنی اور علمی اور عملی قوتیں نہیں پیدا کی جاسکتیں وہ ایسی نئی نسلیں پیدا کریں جو پردہ اور تعدد ازواج میں رہ کر بھی کلی طور پر تکمیلی ہوں اور ان میں کام اور عمل، محنت و مشقت سعی و عزم، کوشش اور جد و جہد کرنے کی کوئی غیر تکمیلی اور خلاف تکمیلی خرابی، کمزوری اور نقص نہ پیدا ہو اور وہ انسانی دنیا میں پوری طرح باعمل اور باتکمیل ثابت ہوں؟

یہ سوالات کئی لحاظ سے نہایت اہم، مناسب اور ضروری ہیں۔ اولاً جیسا کہ حامیان پردہ اور تعدد ازواج بڑی شد و مد سے دعویٰ کرتے ہیں، تمام انسانی تکمیلات اور کارہائے نمایاں کم و بیش پوری طرح صرف مردانہ قوتوں اور صلاحیتوں کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ ان میں عورتوں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر عورتیں کو پردہ اور تعدد ازواج کی قید و بند میں جکڑے بھی رکھا جائے، تو گھر سے باہر کی دنیا کے مردانہ تکمیلات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ علاوہ ازیں، دس بارہ سال کی عمر کے بعد لڑکے اور نوجوان زنانخانے اور عورتوں کی محدود دنیا سے باہر آجاتے ہیں اور کم از کم تھیوری کے لحاظ سے کاملاً اور حتماً مردانہ کاموں، فرائض اور ذمہ داریوں

میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ تب وہ پردہ سسٹم کے اندرونی اور گھریلو حالات اور اثرات سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اس لئے وہ بظاہر ان غیر تکمیلی اثرات اور ماحول سے ضرور نجات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مزید برآں چونکہ پردہ سوسائٹی میں عورت کو باہر کی مردانہ زندگی سے پوری طرح خارج اور بیدخل کر دیا جاتا ہے اس لئے مرد آزاد اور مخلوط معاشرے کے تمام جنسی اور نسوانی ہیجانات، تحریصات اور ترغیبات سے بھی کاملاً محفوظ و مامون ہوتے ہیں لڑکوں اور نوجوانوں اور بالغ مردوں اور بزرگوں کو اپنی مخصوص مردانہ دنیا میں کسی قسم کی نسوانی جنس کی تحریص اور ترغیب پریشان اور مشتعل نہیں کرتی۔ لہٰذا وہ دل و دماغ اور ذہن و فکر کی پوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ اپنے فرائض، ذمہ داریوں اور تکمیلات کو انجام دے سکتے ہیں۔ پردہ سوسائٹی کی یہ جنسی خوبی ہے کہ اس میں عورت کے جنس کو اس طرح نظروں سے اوجھل رکھا جاتا ہے کہ ان کا وجود بھی نظر نہیں آتا اور اس طرح جنسی انارکی کا کلی طور پر تدارک کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے مرد پورے سکون قلب اور اطمینان کے ساتھ ہر کام اور کمال کو تکمیل کر سکتے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی پردے کے ان فوائد کا ذکر کرتے ہوئے پردہ سوسائٹی کی اس خوبی اور غیر پردہ دار معاشروں پر اس کی فوقیت کو یوں جتاتے ہیں:۔

"بے اعتدالی اور افراط و تفریط کی اس دنیا میں صرف ایک نظام تمدن ایسا ہے جس میں غایت درجہ کا اعتدال و توازن پایا جاتا ہے۔ جس میں فطرت انسانی کے ایک ایک پہلو، حتیٰ کہ نہایت خفی پہلو کی بھی رعایت کی گئی ہے۔ انسان کی جسمانی ساخت اور اس کی حیوانی جبلت اور اس کی انسانی سرشت اور اس کی نفسی خصوصیات، اور اس کے فطری داعیات کے متعلق نہایت مکمل اور تفصیلی علم سے کام لیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ایک چیز کی تخلیق سے فطرت کا جو مقصد ہے اس کو بتمام و کمال اس طریقہ سے پورا کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے مقصد حتیٰ

کہ چھوٹے سے چھوٹے مقصد کو بھی نقصان نہیں پہنچتا۔ اور بالآخر یہ سب مقاصد مل کر اس بڑے مقصد کی تکمیل میں مددگار ہوتے ہیں جو خود انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ اعتدال، یہ توازن، یہ تناسب اتنا مکمل ہے کہ کوئی انسان خود اپنی عقل اور کوشش سے اس کو پیدا کر ہی نہیں سکتا۔[1]

کیا ایسا "مکمل" معاشرہ جس میں تمام جنسی اور نفسیاتی ہیجانات اور تحریکات بداعتدالیوں اور خرابیوں کا مکمل سدباب کر دیا گیا ہو، بچوں کی بچپن میں عورتوں کے ہاتھوں پرورش اور تربیت سے پیدا شدہ غیر تکمیلی کمزوریوں اور نقائص وغیرہ کو بعد ازاں رفع نہیں کر سکتا اور مردانہ صلاحیتوں اور قوتوں کو، جو اصولاً یوں بھی عورتوں کی نفسیات سے برتر اور بے نیاز معلوم ہوتی ہیں۔ باحسن وباکمال وخوبی بردئے کار نہیں لا سکتا؟ بالفاظ دیگر، کیا پردہ دار معاشرے کے لوگ اور گروہ پردہ سسٹم کے امتناعات اور علیحدگیوں سے پیدا شدہ بچپن کے خوف اور خدشات کی عادات اور رویوں کے باوجود ہر طرح کی تکمیلات حاصل نہیں کر سکتے؟ کیا انہیں بڑے ہو کر بچپن کی نفسیات اور کردار سازی سے نجات نہیں مل سکتی؟ ان سوالات کا حل ہم اگلے باب میں بیان کریں گے، جس میں ہم دیکھیں گے کہ وہ لوگ جو بچپن اور لڑکپن میں "گھر کے اندر اور باہر کے پردے" میں پلتے ہیں باہر کی مردانہ زندگی میں کس طرح کا معاشرہ بناتے اور کیسی تکمیلات حاصل کرتے ہیں۔

---

[1] مولانا مودودی "پردہ" صفحات ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ مولانا صاحب کا خیال کوئی نیا تصور نہ تھا۔ ان سے بہت پہلے ایک انگریز مصنف ایڈورڈ ولیم لین نے ۱۸۸۳ء میں یہی خیال اپنی کتاب "قرون وسطیٰ میں عربوں کی سوسائٹی" میں پیش کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے "دونوں جنسوں کی علیحدگی ہر ایک جنس کو اپنے اپنے دائرہ عمل میں اپنے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ آزادانہ ارتباط و اختلاط کے مواقع فراہم کرتی ہے جو مسلمان کی زندگی کو گھر اور گھر سے باہر دونوں طرح کی اعلیٰ ترین خوشیاں میسر کرتی ہے۔"

Edwards William Lane, *Arabian Society in the Middle Ages*, p. 240. Curzon Press, London. 1883. New edition 1971.

باب ششم

پردہ سوسائٹی میں مردانہ زندگی اور اس کی انومی

آسیب زدہ ذہن کی طرح پردہ سوسائٹی میں کوئی اپنا اندرونی اتحاد نہیں ہوتا، بلکہ وہ لاتعداد چھوٹے بڑے قرابتداری گروہوں میں منقسم ہوتی ہے۔ ان میں ہر ایک گروہ ایک مؤثر اور فعال معاشری اکائی ہوتا ہے، جس کی رکنیت پیدائش اور قرابتداری کی بنیاد پر متعین ہوتی ہے۔ تاہم رکنیت کے حقوق اور فائدے وغیرہ صرف مردوں کو ہی پوری طرح حاصل ہوتے ہیں۔ عورتوں کو، خواہ جوان ہوں یا معمر، کوئی حقوق و مراعات نہیں ملتیں، بلکہ وہ تو اپنے قرابتی گروہ کی مالی مقبوضہ تصوّر ہوتی ہیں، بعینہٖ اس طرح جیسے گروہ کے غیر انسانی مقبوضات، مثلاً گائے، بکری، اونٹ وغیرہ، یا زمین اور مال و اسباب وغیرہ۔ یہ قرابتی گروہ یا تو ان کا پیدائشی گروہ ہوتا ہے یا ان کے خاوند یا مالک کا جس کے پاس وہ شادی، خرید، یا اغوا وغیرہ کے ذریعے پہنچتی ہیں۔ عورت کی یہ مال و اسباب جیسی حیثیت پردہ سوسائٹی کی اساسی اور لازمی بنیاد ہے جس پر خاندان اور گرابتی گروہ کی تنظیم قائم ہوتی ہے۔

پردہ سوسائٹی میں خاندان کی تنظیم اور زندگی

پردہ دار خاندان کی تنظیم | پردہ دار مسلم معاشرے میں خاندان کی تنظیم کام اور محنت، تخلیق و تکمیل کے لئے نہیں، بلکہ صرف مردوں کے مفاد غلبے اور برتری اور عورتوں کی محکومی، معذوری اور مقبوضہ پن پر قائم ہوتی ہے۔ بالفاظ

دیگر، پردہ دار خاندان پدر سرداری اصولوں پر قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں عورتوں کے فرائض محض بچے جننا اور پالنا اور اپنے خاوند یا مالک کے لئے امور خانہ داری کا انتظام کرنا ہوتے ہیں، جبکہ مردوں کو گھر کے اندر حکم چلانے اور گھر سے باہر کی دنیا کے تمام کام، امور اور معاملات سپرد ہوتے ہیں۔ پردہ سسٹم مسلمان خاندان کی اس تقسیم کار کا نتیجہ اور جواز ہے۔ حامیان پردہ لکھتے ہیں:-

۱۔ عورت کا دائرہ عمل مرد کے دائرے سے الگ ہو، دونوں کی فطرت اور ذہنی وجسمانی استعداد کے لحاظ سے تمدن کی الگ الگ خدمات ان کے سپرد کی جائیں، اور ان کے تعلقات کی تنظیم اس طور پر کی جائے کہ وہ جائز حدود کے اندر ایک دوسرے کے مددگار رہوں، مگر حدود سے تجاوز کر کے کوئی کسی کے کام میں خلل انداز نہ ہو سکے۔

۲۔ خاندان کے نظم میں مرد کی حیثیت قوّام کی ہو اور گھر کے تمام افراد صاحب خانہ کے تابع رہیں۔

۳۔ عورت اور مرد دونوں کو پورے انسانی حقوق حاصل ہوں، اور دونوں کو ترقی کے بہتر سے بہتر مواقع بہم پہنچائے جائیں، مگر دونوں میں سے کوئی بھی اُن حدود سے تجاوز نہ کر سکے جو معاشرت میں اس کے لئے مقرر کر دی گئی ہیں۔[۱]

مصری عالم، علامہ فرید وجدی اس نظریے (تھیوری) کو زیادہ دھڑلے سے یوں بیان فرماتے ہیں:

"صحیفۂ فطرت" علمی دلائل اور علمائے یورپ کے اقوال بالاعلان دعوئ کر رہے ہیں کہ عورت خواہ کتنی ہی کوشش کرے اور آسمانِ ہفتم کے تارے توڑ لائے مگر جسمانی اور

---

[۱] مولانا ابوالاعلیٰ مودودی "پردہ" ص ۲۵۷-۲۵۸۔

عقلی قوت کی سطح پر مرد کی برابری نہیں کر سکتی۔ عورت کو جس غرض سے دنیا میں مخلوق کیا گیا ہے وہ نسل انسانی کی بقا اور اس کی کثرت رہے اس قدرتی فرض کے لحاظ سے اس امر کی ضرورت نہ تھی کہ عورت کو تمدنی دنیا میں زیادہ بلند کیا جاتا۔ اس کام کے لئے مرد مخلوق کیا گیا اور نامعلوم زمانے سے وہ اپنے فرض کو انجام دے رہا ہے۔ عورت کو وہ قوتیں عطا کی گئیں جو اس کے قدرتی فرض کی انجام دہی میں مدد دیں اور مرد کو جسمانی اور عقلی قویٰ کی وہ طاقت بخشی گئی جو اس کے تمدنی فرائض کی بجاآوری کا ذریعہ ہوں۔ چونکہ عورت کا قدرتی فرض اس امر کے لئے مستلزم ہے کہ مرد کے ماتحت رہ کر اس کی معنوی خاصیّت نشوونما پائے اس لئے عورت پر اسی کی بہتری اور ترقی کے لئے یہ بات واجب کر دی گئی کہ وہ پوری طرح مرد کے زیر اثر رہے۔ یہی وہ اطاعت اور ماتحتی ہے جس کو "اسلام" کے "مجموعہ قوانین" نے ذیل کی دفعہ میں ظاہر کیا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ: عورتیں مردوں کے زیر اثر ہیں اگر عورت مرد کی اس قدرتی اطاعت کو منظور نہیں کریگی تو اس کو مجبوراً منظور کرنا پڑے گا۔ بیرونی زندگی کے جس قدر کاروبار ہیں اُن میں ایک کام بھی ایسا نہیں ہے جس میں عورت مرد کا مقابلہ کر سکے۔ اس خطرناک معرکہ میں غلبہ حاصل کرنے کی پہلی شرط جسمانی قوت، جفاکشی اور مختلف آلام و مصاحب کو برداشت کرنے کی ہمت اور طاقت ہے اور یہی وہ شرط ہے جس سے عورت کا کچکول خالی نظر آیا ہے۔[1]"

یہ ہے پردہ دار خاندان کی تھیوری۔ ہم اس کے ایک پہلو یعنی بچّوں کی پرورش

---

[1] علامہ فرید وجدی "مسلمان عورت" ص۔ ۸۵ تا ۸۷۔

اور تربیت کے فرائض کا مطالعہ اور تجزیہ گذشتہ دو ابواب میں کر چکے ہیں اب ہم اس کے خاندانی نظام کا مسلم معاشرے، خاص طور پر پاکستان کے مسلم معاشرے، پر اثرات کا تجزیہ کریں گے۔ مگر پہلے "قوام" کے تصور پر غور و فکر ضروری ہے۔ کیونکہ اس لفظ کے معنوں کی تبدیلیوں میں دراصل مسلمانوں کی چودہ سو سالہ معاشرتی تاریخ کے تغیرات سمٹ گئے ہیں۔

لفظ قوام کے معنوی تغیرات

قرآن میں لفظ "قوام" خاندانی رشتوں کو "قائم رکھنے والے" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے مطابق مرد کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو ان رشتوں میں خلل ڈالے یا انہیں توڑے۔ بالفاظ دیگر قرآن شوہر کی خاندان کو قائم رکھنے کی صلاحیت کو ایسی اخلاقی اور ارتفاعی قوت تصور کرتا ہے جس کے تحت وہ اپنی برتر جسمانی طاقت کو پیداواری محنت و مشقت اور اپنی بیوی اور بچوں کی اخلاقی اور عملی ترقی اور تکمیل کے لئے صرف کرے، نہ کہ ان کو اپنی قید و بند میں رکھے۔ مگر جب قرون وسطیٰ میں پردہ سسٹم قائم ہو گیا تو قرون وسطائی علمائے دین نے اس لفظ کو موخرالذکر معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ اب مسلمان عورت کی حیثیت اسلام کی مساویانہ تعلیمات کے برعکس نہایت پست، غیر مساویانہ اور محکومانہ ہو گئی تھی۔ اب انہوں نے، جیسا کہ علامہ غلام احمد پرویز لکھتے ہیں لفظ "قوام" سے مراد عورت کا حاکم بلکہ جیلر کے معنے تصور کر لئے[1] کیونکہ اب وہ حرم کی چار دیواری میں مقید کر دی گئی تھی۔ اب مسلمان عورت کی حیثیت باندی غلام جیسی ہو گئی جو مرد کے قبضے میں تصور ہوتی تھی مثلاً شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

"نکاح کا فائدہ بغیر اس بات کے تمام نہیں ہوتا کہ ہر شخص معاونت دائمی پر اپنے آپ کو قائم رکھے اور عورت کی جانب سے اس کی صورت یہ ہے کہ اس کا اپنا اختیار نہ رہے اور یہ بات

---

[1] غلام احمد پرویز، "لغات القرآن" جلد اول۔ دیباچہ۔

درست نہ تھی کہ مرد کے قبضہ سے بھی اس کا اختیار لے لیا جاتا ورنہ طلاق کا دروازہ بند ہو جاتا اور وہ عورت کے ہاتھ میں مقید ہو جاتا جس طرح عورت مرد کے ہاتھ میں مقید ہے اور اصل بات یہ تھی کہ مرد عورتوں پر حاکم رہیں[۱]۔

پس قرونِ وسطائی علماء نے لفظ قوام کی حقیقی معنوں یعنی "قائم رکھنے والے" کو "حاکم" یعنی حکم دینے والے میں بدل دیا اور اس طرح اس کی اخلاقی اور تکمیلی معنویت اور مقصدیت کو اپنے حاکمانہ اور جابرانہ اغراض و مقاصد کے مطابق بنا لیا۔ موجودہ زمانے میں پردہ سسٹم کے حامی بھی قرونِ وسطائی علماء کی تقلید میں مرد کی قوامیت کے معنے اس کی خاندان میں حاکمیت کے معنوں میں لیتے ہیں۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں۔

"خاندان میں مرد کی حیثیت قوام کی ہے، یعنی وہ خاندان کا حاکم ہے محافظ ہے، اخلاق اور معاملات کا نگران ہے، اس کی بیوی اور بچوں پر اس کی اطاعت فرض ہے اور اس پر خاندان کے لئے روزی کمانے اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے[۲]"

اس طرح حامیانِ پردہ و تعددِ ازدواج مرد کو خاندان کا ایسا حاکم، محافظ اور نگران بنا دیتے ہیں جو عورتوں کے اخلاق کی نگرانی تو کرتا ہے، مگر اپنے اخلاق واطوار کی نگرانی نہیں کرتا۔ وہ مرد کی حاکمیت کو قائم کرنے کے شوق میں اپنے قوامیت کے تصور کے تضادات کو بھی بھول جاتے ہیں۔ اول تو وہ یہ قطعی بھول جاتے ہیں کہ قرآن کریم مرد اور عورت کو مساویانہ اور یکساں طور پر تکمیلی بنانے کا حکم دیتا ہے کسب، جزا۔ معاوضہ اور اجر کے الفاظ جو قرآن میں بار بار آئے ہیں، ہر فرد کی کمائی کرنے اور دولت کمانے کی دماغی اور جسمانی محنت و مشقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس کے لئے مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر اپنی اپنی کوشش کرنی ہے۔

۱۔ شاہ ولی اللہ "حجۃ اللہ البالغۃ" جلد دوم۔ ص ۲۷۳

۲۔ مولانا مودودی "پردہ" ص ۲۳۲

پس اسلام کی نظروں میں قوامیت سے مراد روزی کمانے کا ایسا فکر وعمل اور عادات وکردار ہے جو نیکو کاری، دیانتداری، خود ضبطگی، احساس دیگراں اور محنت ومشقت سے حلال کی کمائی میسر کرے۔ ایسا مرد جو اپنی نااہلیت اور دوسری غیر تکمیلی عادات کے باعث کچھ روزی نہیں کماتا یا اتنا نہیں کماتا کہ اپنی بیوی اور بچوں کی کفالت کر سکے یا غیر اخلاقی اور غیر قانونی ذرائع سے روزی کماتا اور آمدنی جمع کرتا ہے، وہ محض "خاندان کے لئے روزی کمانے اور ضروریات زندگی فراہم کرنے" کی بنا پر قوامیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کیا ایسا مرد جو رشوت ستانی، بدکاری اور غیر قانونی اور غیر اخلاقی ذرائع سے حرام کی کمائی اور دولت جمع کرے، اپنے خاندان کا "قوام" کہلا سکتا ہے؟ کیا ایسے مرد کے حکم کو بھی اس کی بیوی یا بیویاں اور بچے بے چوں وچرا مانیں؟ ظاہر ہے کہ حاکمانہ قوامیت کے علمبرداروں نے اس تصور کے ایسے مسائل اور مضمرات پر کبھی غور نہیں کیا۔ دراصل قرون وسطے اور زمانۂ جدید کے روایت پرست علماء نے قرآن کے قوامیت کے تصور کی اخلاقیت کو قطعی نظرانداز کر دیا، اور انہوں نے اس کو مردوں کے پدرسرداری غلبہ اور بالادستی کے معنی پہنا دیئے، جو مردوں کو فراتبداری معاشرے میں حاصل ہوتی ہے۔ مگر انہوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ پدرسردارانہ قوامیت کے تصور سے مسلمانوں کی خاندانی اور معاشری زندگی پر کیا کیا اور کتنے مخرب الاخلاق، مہلک اور غیر تکمیلی اثرات اور نتائج نکلتے ہیں۔ قرون وسطےٰ میں اس حاکمانہ تصور نے مردوں کو شتر بے مہار بنا کر مسلمانوں کی خاندانی زندگی اور سارے معاشرے کو بدترین اخلاقی پستی اور تباہی کے گڑھوں میں دھکیل دیا۔ جیسا کہ ہم نے باب سوم میں بیان کیا ہے۔ زمانہ جدید میں اس حاکمانہ قوامیت کے تصور نے خاندان میں عورتوں میں پردہ سنڈروم کی کمزوریاں اور نااہلیتیں اور بچوں اور نوجوانوں کی پرورش اور تعلیم وتربیت میں تکمیلی خلا اور کردار وشخصیت کے انحطاط کے عوامل وعواقب پیدا کئے، جن کا تجزیہ ہم پچھلے دو ابواب میں کر چکے ہیں۔ اس باب میں ہم اس خلاف تکمیلی تصور کے مسلمانوں کی خاندانی اور معاشری زندگی پر اثرات کا تجزیہ کریں گے۔

پردہ سوسائٹی میں خاندانی زندگی کی اندرونی کیفیت

پاکستان کا ایک نہایت سنگین مسئلہ

پاکستان میں واپڈا کو ہر سال بجلی کی چوری سے کروڑوں روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ یہ بجلی کارخانوں، ملوں، دفتروں دوکانوں اور دوسری پبلک عمارتوں اور مقامات کے علاوہ ایسی پرائیویٹ جگہوں جیسے بنگلے، کوٹھیاں، مکانات، عام آدمیوں کے گھروں اور رہائش گاہوں، سکولوں، کالجوں یونیورسٹیوں اور دوسری درسگاہوں کے ہوسٹلوں وغیرہ میں چوری ہوتی ہے۔ مگر بات صرف بجلی کی ہی نہیں۔ گو ابھی تک کسی نے تخمینہ نہیں لگایا مگر پاکستان میں ہر سال کروڑوں اربوں روپوں کی رقمیں، زمینیں، جائیدادیں، کاریں، بنگلے، مکانات، مال واسباب اور ہزار ہا طرح کی اور چیزیں رشوت، سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری (بلیک مارکیٹ) اشیائے خوردنی میں ملاوٹ، ناقص اور گھٹیا معیار کی مصنوعات اور مال کی تیاری اور خرید و فروخت کے طریقوں سے خورد برد کی جا رہی ہیں۔ جب مرد لوگ، رشوت ستانی بدعنوانی، بد دیانتی، غبن، خیانت اور مفت خوری کے استحصالی طریقوں سے خوب روپیہ حاصل کر اور مال و دولت سمیٹ کر اپنے گھروں اور خاندانوں میں لاتے ہیں تو ان کی ماؤں بیویوں اور بہنوں میں کیوں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ ان کی باز پرس کریں، ان کی اس "غیبی کمائی" کے ذرائع معلوم کریں اور انہیں ایسے کاموں سے باز رکھیں؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ پردہ سوسائٹی کے گھروں، کنبوں اور خاندانوں میں مرد کا حکم چلتا ہے اور اس کی بالادستی ہوتی ہے۔ عورتیں عموماً مردوں کی باہر کی دنیا کی کارروائیوں اور کارستانیوں سے بے خبر ہوتی ہیں یا انہیں مردوں کے گھر سے باہر کے کاموں اور معاملات سے بے خبر بنا کر اور ناقص العقل جتا کر خاموش کیا جاتا ہے یا انہیں ان کی خاص پسند کی چیزیں مثلاً سونے چاندی کے زیورات یا عمدہ اور قیمتی کپڑے دیگر خوش و خرم کر دیا جاتا ہے علاوہ ازیں، پردہ سنڈروم کی ماری ہوئی مسلمان عورتیں یوں بھی کاہل مزاج، تساہل پسند اور لاپرواشخصیتیں ہوتی ہیں جو عموماً مردوں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتی

ہیں اور انہیں جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی ہیں۔ انہیں یوں بھی بچپن ہی سے ایسی دلچسپی اور غور و فکر نہ کرنے کی تلقین اور ایسے لاپرواہیوں کی تربیت دی جاتی ہے اور اگر پھر بھی کوئی نیک بی بی انہیں منع کرنے کی جسارت کرتی رہے تو اسے مرد کے مخصوص ہتھیاروں اور حربوں سے پوری طرح یا ہمیشہ کے لئے خاموش کیا جا سکتا ہے، مثلاً زد و کوب، گالم گلوچ یا اس کی دھمکی، طلاق یا اس کی دھمکی، نان و نفقہ کی بندی یا کمی کرنے کی دھمکی، سوکن کو سر پر لا بٹھانے کا حربہ، گھر کی دوسری عورتوں کے ساتھ ساز باز، جوان کی بداعمالیوں میں حمایتی اور ہمنواہوں اور گھروں کے مختلف اور متعدد طرح کے تکرار اور تنازعوں کے طریقے وغیرہ وغیرہ۔ اب کون سی اللہ کی بندی ایسی ہو گی جو اپنے روٹی کمانے والے اور نان و نفقہ کھلانے والے برتر اور قوی تر مرد سے ایسی در پردہ خانہ جنگی مول لے! پردہ سوسائٹی میں، جہاں مرد عورتوں کے حاکم، محافظ اور ان کے اخلاق و معاملات کے نگران ہوتے ہیں، ایسے اخلاقی محاذ پر لڑنے والی نیک بی بیاں شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہیں۔

مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی، اس کا دوسرا رخ بھی ہے۔ اگر عورتوں میں اتنی جرأت یا سمجھ نہیں یا ان میں پردے اور کثرت ازدواج کی پیدا کردہ کمزوریاں اور مجبوریاں ہیں تو کنبے اور گھر کے مرد کیوں اتنی جرأت نہیں رکھتے کہ اپنے رشوت خور، بجلی چور، چینی چور، آٹا چور، یا "بلیکیے" ذخیرہ اندوز، سمگلنگ یا غیر معیاری مال تیار کرنے والے، یا اس طرح کے دوسرے اور کام چور بھائیوں، رشتہ داروں، قرابتداروں، دوستوں اور ہمسایوں کو جن کے ساتھ وہ دن رات اٹھتے بیٹھتے اور میل ملاقات کرتے رہتے ہیں، ایسے کاموں اور بدعنوانیوں سے منع کریں، ان کا مواخذہ اور محاسبہ کریں اور ان کو تنبیہ کریں؟ کیا انہیں اتنا شعور اور احساس نہیں کہ ان کے رشتہ داروں، دوست و احباب کی بداعمالیوں کے پیدا کردہ کروڑوں اربوں روپوں کے نقصانات ملک و قوم کی تعمیر و ترقی، فلاح و بہبود، خوشحالی، مضبوطی، اتحاد اور استحکام کے لئے کتنے مہلک ثابت ہو رہے ہیں؟ ان سوالات کے ساتھ ہمارے سامنے پردہ سوسائٹی کا قرابتداری نظام نمودار ہوتا ہے۔ اسے ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں مائیکرو سوشل گروہ بندیوں کا یہ نظام مسلمانوں

کو اپنے مائیکرو سوشل مفادات اور وفاداریوں کے تحت بلا روک ٹوک ہر طرح کی لوٹ مار، لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کے لامتناہی چکروں میں مشغول رکھتا تھا جیسا کہ ہم نے ایک گذشتہ باب میں بیان کیا ہے۔ زمانہ جدید میں ان مائیکرو سوشل گروہ بندیوں کے ارکان اپنے خاندانی اور قرابتدارانہ گروہی مفادات اور وفاداریوں کی خاطر اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے غیر اخلاقی، غیر معاشری اور غیر قانونی ذرائع معاش اور تموّل کی پردہ پوشی اور پشت پناہی کرتے ہیں۔ ان میں ماکرو سوشل یا قومی احساسات اور شعور کا فقدان ہوتا ہے۔ وہ غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی چال چلن، کردار اور کارستانیوں کی اعانت اور حمایت پر تیار رہتے ہیں۔ مگر جو بات سب سے زیادہ المناک ہے وہ ان مائیکرو سوشل گروہوں کے ارکان کے اپنے غیر تکمیلی، خلاف تکمیل اور عدم تکمیلی رویوں اور عادات، چال چلن اور کردار، خیالات اور نظریات سے پیدا شدہ غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی حرکات اور اثرات اور نتائج ہیں جو ہمارے ملک میں تکمیلی افراد کے نئے نئے خیالات اور کوششوں کو اور نئی ماکرو سوشل تنظیموں، تحریکوں اداروں اور قوتوں کی کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی کچل دیتے ہیں جن کے عوامل کا تجزیہ ہم اب کریں گے۔

پردہ دار گھر میں میاں بیوی کے تعلقات حاکمانہ تنظیم، مرد کے پدر سرداری غلبے اور برتری اور پردہ سسٹم کی اندرونی اور بیرونی بندشوں، رکاوٹوں، ممانعتوں اور رسم و رواج کے باعث پردہ دار خاندان میں مرد و زن میں کوئی آشنایانہ میل جول اور تعاون نہیں ہوتا۔ مرد گھر کے اندر بہت کم آتا ہے اور عورت گھر سے باہر نہیں جا سکتی۔ لہٰذا دونوں میں زندگی کے معاملات، کام اور تکمیل کے مسائل اور دنیا کے کاروبار کے متعلق باہمی امداد اور تعاون، رفاقت اور اشتراک عمل ممکن نہیں ہوتا۔ درحقیقت پردہ دار خاوند یہ امر اپنے لئے باعث ندامت اور اپنی شان اور رعب کے خلاف تصوّر کرتا ہے کہ گھر اور گھر کے باہر کے معاملات میں وہ اپنی بیوی یا بیویوں سے کوئی مشورہ کرے اور رائے لے

صرف اس لئے ہی نہیں وہ ان کا حاکم ہے اور اس کی اطاعت اُن پر لازم ہے بلکہ بچپن ہی سے یہ خیال اس کے ذہن میں بٹھا دیا جاتا ہے کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ لہٰذا اُن سے مشورہ اور رائے لینا ندامت اور گمراہی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ پردہ سسٹم عورتوں کو بچپن ہی سے گھر کے باہر کی دنیا کے معاملات اور کاموں سے الگ تھلگ اور بے خبر رکھتا ہے۔ اس لئے پردہ دار بیوی اکثر و بیشتر اپنی جہالت اور فرار گزینی کی عادات اور بیرونی دنیا کے خوف اور خدشوں سے بھری ہوئی طبیعت کی وجہ سے اپنے شوہر کو "اللہ میاں کی گائے" معلوم دیتی ہے جسے وہ کسی رائے اور مشورہ دینے کے قابل بھی تصور نہیں کرتا۔ بلکہ اگر اس کا شوہر، خاص کر ایسا شوہر جو تکمیلی خیالات اور ارادے کا مالک ہو، اس سے رائے اور مشورہ لے بھی، تو وہ اس کے لئے سنگ راہ ثابت ہوتی ہے۔ چونکہ گھر میں میاں کے علاوہ دوسرے افراد بھی ہوتے ہیں، مثلاً ساس نندیں وغیرہ، اس لئے گھریلو جھگڑوں کے باعث کارکردگی اور زیادہ کم ہو جاتی ہے اگر دو یا دو سے زیادہ بیویاں ہوں، تو ان کی باہمی رنجشیں، جھگڑے اور رقابتیں اور زیادہ بڑا سنگ راہ ثابت ہوتی ہیں۔ خاوند ایک بیوی کو دوسری کے خلاف استعمال کرتا ہے کیونکہ صرف اسی طرح وہ اُن کو قابو میں رکھ سکتا ہے مگر جب وہ ایک سے رائے اور مشورہ لیتا ہے تو دوسری بیوی یا بیویوں کے غم و غصے اور رقابت کے جذبات بھڑک جاتے ہیں، جو بالآخر اُن کے بچوں کے کردار اور عادات پر اثر انداز ہوتے ہیں بہرحال پردہ سسٹم جتنا زیادہ سخت ہوتا ہے، بیویاں اتنی ہی زیادہ جاہل، ناکارہ اور نااہل ہوتی ہیں، کیونکہ پردہ سنڈروم اتنا ہی زیادہ شدید ہوتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی زندگی اور معاشرے میں پردہ دار بیوی ہمیشہ عضو معطل ثابت ہوتی ہے۔ امورِ خانہ داری میں بھی اس کی نااہلیت اور کاہلی اور گھریلو جھگڑے اور رنجشیں گھر میں بدسلیقگی بدمزگی اور بدنظمی کی فضا طاری کر دیتی ہیں۔ مسلمانوں کی خانگی زندگی کی زبوں حالی کا نقشہ ہم گذشتہ دو ابواب میں کھینچ چکے ہیں۔ یہاں اس کو ایک ہنگرین نو مسلم الحاج ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"ایک مسلمان کا گھر قابل رحم تذبذب اور بے تقینی کا نمونہ ہے اور اس کی زندگی محض اتفاقات کے سہارے چلتی ہے۔ جب اس کے من میں آتا ہے، کام کرتا ہے اور جب اسے تھکاوٹ محسوس ہو، سو جاتا ہے۔ وہ دن یا رات کے کسی حصے میں گہری نیند سو جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور گردوپیش کی زندگی کا شور اس کی نیند میں بالکل مخل نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کی جمالیاتی حس کو اس بات سے ٹھیس لگتی ہے کہ ایک عالیشان محل کے بالکل متصل گندگی کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہیں۔ البتہ اسے روزانہ کام کے لئے پہلے سے طے شدہ پروگرام سے بیشک بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ .... اس کے ساتھ ساتھ ہم مسلمانوں کی گھریلو زندگی کی افسوسناک پسماندگی بھی دیکھتے ہیں (قرون وسطیٰ میں) لباس اور لباس کی لوازم کو نفاست سے تیار کرنے میں یورپی اقوام سے مسلمان کہیں آگے بڑھ گئے تھے، لیکن آج یہ حالت ہے کہ مشرق کے شہر اپنے بھونڈے مکانوں اور کھنڈرات کی طرح کی جھونپڑیوں کے ساتھ ایک ڈراونا منظر پیش کرتے ہیں۔ آپ کو گھروں میں غسل خانے اب بھی ملیں گے، لیکن وہ بہت خستہ حالت میں ہوں گے، جن کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ مشرقی آدمی صفائی کا احساس کھو چکا ہے۔ اس کے کشادہ ملاقاتی کمروں میں جو "کوچ" پڑے ہوئے ملیں گے، ان پر قیمتی کپڑا ضرور منڈھا ہوا ہو گا، لیکن اول تو وہ تار تار ہو چکا ہو گا، اور دوسرے اس کے انتخاب میں کوئی خوش ذوقی نہ ہو گی۔ دیواروں اور فرنیچر کی صفائی نہ ہو گی اور خانہ داری کا طریقہ سطحی اور بے ڈھنگا ہو گا اور پھر فرش پر بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا کھانے کا طریقہ اب اتنا دلکش اور شائستہ نہیں جتنا کبھی پہلے ہوتا تھا۔"[1]

پس مسلمانوں کے گھروں میں عام اور مقررہ روایتی خانگی امور اور کاموں کے

---

[1] الحاج ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس "مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب" ص ۵۷ تا ۵۹۔ مترجمہ پروفیسر محمد سرور سندھ ساگر اکادمی لاہور۔ ۱۹۵۵۔

علاوہ کوئی تکمیلی اور تخلیقی کاموں، اعلیٰ مقاصد اور نصب العینوں کے لئے کوئی ہمت افزا اور موزوں ماحول اور فضا نہیں ہوتی، بلکہ ہر وقت گھریں کاہلی، الکسی، غفلت شعاری، لاپروائی، اور ایک دوسرے کے کاموں اور ارادوں کی مخالفت، خلل اندازی اور رخنہ اندازی کا ماحول طاری رہتا ہے۔ یہ پردہ اور تعدد ازواج کے لازمی اور ناگزیر نتائج ہیں، جو عورتوں میں ذہنی اور کرداری ناپختگی اور ناتجربہ کاری اور علمی اور فکری پس ماندگی اور پست معیاری، مردوں میں غیر ذمہ داری، لاپروائی اور بے راہ روی کے رجحانات پیدا کرتے ہیں اور خاندانی زندگی میں غیر معاشری اور خلاف تکمیلی بُعد اور خلا پیدا کر کے اس کو ایک غیر مربوط اور غیر تکمیلی ادارہ بنا دیتے ہیں جس کے اسباب اور عوامل کا تجزیہ ہم اب کریں گے۔

پردہ دار خاندان کا خلاف تکمیلی نظامِ حیات

پردہ دار خاندان کا نظامِ حیات گھر کے اندر اور گھر سے باہر کے پردے کے اصولوں، رویوں، نظریات اور عقائد پر قائم ہے، جو اسے خلاف تکمیلی نظام بنا دیتے ہیں۔ ہم یہاں ان اصولوں، نظریات اور عقائد مردوں اور عورتوں پر ان کے اثرات کا مختصراً تجزیہ کریں گے:۔

اوّل: پردہ دار خاندان اس خلاف تکمیلی اصول پر قائم ہے کہ مرد فاعل اور عامل ہستی ہے، جب کہ عورت منفعل اور غیر فاعل چیز ہے۔ مرد غالب ہے اور عورت مغلوب و محکوم ہے[1]۔ لہٰذا خاندانی زندگی کے تمام رشتے اور تعلقات، خواہ وہ میاں بیوی کے ہوں یا ماں باپ، بھائی بہن، باپ بیٹی اور ماں بیٹے کے ہوں، مرد کے غلبہ، قدرت اور تحکم اور عورت کی مغلوبیت، تابعداری اور لاچارگی پر قائم ہیں اس کے باعث خاندانی زندگی پر مرد کے رعب داب، ظلم و زیادتی، مارپیٹ کی آزادی اور خوف و ہراس کا ماحول طاری رہتا ہے۔ اسی وجہ سے مسلمان عورتوں میں گھر کی چار دیواری میں بھی حرف

---

[1] علامہ فرید وجدی "مسلمان عورت" ص ۱۳۱، ۶۵، ۷۶، ۸۵ تا ۸۷۔ مولانا مودودی "پردہ" ص ۱۹۲، ۲۱۵، مظہر علی ادیب "پردے میں رہنے دو" ص ۷۳ تا ۷۵، ۷۲ تا ۷۷

وہراس اور گھبراہٹ اور وسوسہ چھایا رہتا ہے، جو ان میں احساس کمتری، ڈر اور بزدلی مکر و فریب اور حیلہ سازی، حقائق اور مشکلات سے فرار اور روپوشی، حق گوئی سے اجتناب، تسامح اور چشم پوشی کی عادات اور رجحانات پیدا کر دیتا ہے، جنہیں ہم نے پردہ سنڈروم کا نام دیا ہے۔ وہ گھر کے اندر اور گھر سے باہر کی دنیا میں ڈری اور سہمی سہمی رہتی ہیں۔[لہ]

دوم: پردہ دار خاندان مرد اور عورت میں عدم اعتماد اور عدم اعتبار کے اصولوں پر قائم ہے۔ پردہ دار مرد اس امر پر یقین نہیں رکھتا کہ عورت بھی ایک اخلاقی ہستی اور شخصیت ہوتی ہے جو اپنے برے بھلے اور نیک و بد میں تمیز کر سکتی ہو۔ بلکہ وہ تو اسے محض جذبات، خواہشات اور ہیجانات کی پوٹلی تصور کرتا ہے جس میں مستقل مزاجی، قوت ارادہ اور قوت فیصلہ، عزم محکم اور ثابت قدمی جیسے اوصاف کا فقدان ہوتا ہے، اس کے برعکس وہ ایسی کمزوروں اور نرم و نازک اور لچک دار ہوتی ہے کہ جس طرف کوئی چاہے اسے موڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اسے پردے کی بندشوں، پابندیوں اور ممانعتوں میں جکڑ کر بے راہ روی اور گمراہی سے روکا جانا ضروری ہے۔ تعدد ازدواجگی کی صورت میں تو پردے کی سختی اور بھی زیادہ ضروری ہوتی ہے کیونکہ سوکنوں کی موجودگی یا امکان سے ہر عورت کے دل میں حسد اور جلاپے کے مارے سرکشی اور نافرمانی کی جذبات بھڑک

لہ۔ مولانا محمد ادریس انصاری میاں بیوی میں زندگی گزارنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے مسلمان بیوی کو خوشامد اور دروغ گوئی کی نصیحت کرتے ہیں:

"کسی وقت کوئی بات ایسی نہ کرو جو اس (میاں) کے مزاج کے خلاف ہو۔ مثلاً اگر وہ دن کو رات بتلائے تو تم بھی دن کو رات کہنے لگو۔ تمہارا قصور ہو یا نہ ہو اور شوہر ہی کا قصور ہو تب بھی تم ہرگز نہ روٹھو اور ہاتھ جوڑ کر اپنا قصور معاف کرانے کو اپنا فخر اور عزت سمجھو۔

"میاں کو اپنے برابر درجہ میں سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔

"اور یہ خوب یاد رکھو کہ مردوں کو خدا نے شیر بنایا ہے۔ دباؤ اور زبردستی سے ہرگز زیر نہیں ہو سکتے۔ ان کے زیر کرنے کی بہت آسان ترکیب خوشامد و تابعداری ہے۔" دیکھئے "مسلمان بیوی" از مولانا محمد ادریس انصاری صفحات ۲۲، ۲۵، ۲۹۔

اٹھتے ہیں۔

سوم: پردے کی پابندیوں، مرد اور عورت کی علیحدگیوں اور ان سے پیدا شدہ عورتوں کے ذہن و نفسیات میں خوف اور فرار گزینی کے رجحانات اور عادات کے باعث مسلمان عورتوں میں ذہنی، کرداری اور فکری ناپختگی، ناتجربہ کاری، لاعلمی اور جہالت کی کیفیات عام ہوتی ہیں۔ وہ دنیا کے معاملات، مسائل اور واقعات سے بے خبر اور نابلد ہوتی ہیں، جو ان میں خوف و فرار گزینی، گھبراہٹ، تشویش سراسیمگی اور اجتناب کی عادات، رویوں اور رجحانات کو مزید بڑھاتی اور شدید تر کر دیتی ہیں۔ وہ ہر نئی چیز اور ہر نئے واقعہ سے گھبرا جاتی ہیں اور ہر نئی بات سے پریشان ہو جاتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنے خاوندوں، بھائیوں، بیٹوں اور عزیزوں کو ہر نئے کام اور مسئلہ سے منع کرتی ہیں اور ہر نئی تکمیل کی مخالفت کرتی ہیں۔

چہارم: پردے اور تعدد ازدواجگی نے مسلمانوں کی خاندانی زندگی کو دو مختلف حصوں میں اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ میاں بیوی کی دنیا ہی الگ الگ ہو گئی ہے سوائے چند بنیادی ضروریات مثلاً حقوق زن و شوئی اور نان و نفقہ کے علاوہ دونوں میں کسی اور کام، عمل اور تکمیل کے لئے کوئی رابطہ، تعلق اور تعاون نہیں ہوتا۔ درحقیقت پردہ سوسائٹی میں عورتوں کی زندگی مردوں کی دنیا سے اس قدر الگ تھلگ ہوتی ہے کہ ان کی ثقافت یا کلچر ہی مختلف ہو جاتی ہے جو مردوں کی وسیع تر اور غالب کلچر کا ایک ادنیٰ مگر کمتر حصہ ہوتی ہے، جسے معاشریات (سوشیالوجی) کی اصطلاح میں "سب کلچر" (Sub-culture) کہا جاتا ہے۔ یہ نسوانی "سب کلچر" ایسی بول چال، الفاظ اور رہن سہن کے طور و طریقوں پر مشتمل ہوتی ہے جو صرف عورتوں اور زنانخانے کی محدود دنیا میں پائے جاتے ہیں اور پردہ سوسائٹی کی ایک خصوصیت ہوتے ہیں۔[1]

---

[1] دیکھئے "نور اللغات" عورتوں کے الفاظ جلد اول ص ۳۲ - جدید ایڈیشن مرتبہ مولوی نور الحسن جنرل پبلیکیشنگ ہاؤس۔ کراچی۔ جولائی ۱۹۵۷ء

مسلمان مردوں کا پردہ سنڈروم

پردہ دار خاندان اور معاشرے کے ان حالات نظریات عقائد اور ماحول کے باعث عورتوں کی طرح مردوں کے ذہن و فکر اور کردار و شخصیت میں بھی ایسی عادات، رویے، اور رجحانات سرایت کر جاتے اور ایسا طرزِ فکر و عمل پیدا ہو جاتا ہے، جو ان کا مخصوص پردہ سنڈروم ہوتا ہے، پردہ دار عورتوں کے سنڈروم کی طرح یہ بھی گچھے دار لازم و ملزوم، عقائد، نظریات، خیالات، عادات، رویوں اور رجحانات کا مجموعہ ہوتا ہے جو ان کو غیر تکمیلی بنا دیتا ہے البتہ ان کی غیر تکمیلیت پردہ عورتوں کی غیر تکمیلیت سے قدرے مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ کیونکہ مردوں کے پردہ سنڈروم کی نوعیت بھی نسوانی پردہ سنڈروم کی نوعیت سے قدرے مختلف اور متضاد عناصر اور عوامل پر مشتمل ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نسوانی پردہ سنڈروم کے نشوونما کی نسبت مردوں کا پردہ سنڈروم دو مختلف اور متضاد ماحولوں اور مرحلوں میں نشوونما پاتا ہے۔ پہلا اور ابتدائی ماحول زنانخانہ اور عورتوں کی محبوس اور محدود دنیا اور پہلا اور ابتدائی عمر مرحلہ پردہ دار ماں کی گود اور پرورش اور تربیت دوسری پردہ دار عورتوں کا اثر و رسوخ ہے جس میں ہر مسلمان بچہ آنکھ کھولتا اور اپنا بچپن گزارتا ہے، جس کا تجزیہ ہم نے گذشتہ باب میں قدرے تفصیل سے کیا ہے۔ لہٰذا وہ قدرتاً اور لازماً اپنی ماں اور دوسری عورتوں کے پردہ سنڈروم سے شعوری غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا ہے۔ پس اس کی ذہن و کردار میں اپنی ماں اور دوسری عورتوں کے خوف اور خدشے، بے ہمتی اور کاہلی، عدم تجسس اور عدم جستجو، کوشش اور سعی سے لاپروائی، پہل اور پیش قدمی سے اجتناب، غیر مہم جوئی، نئے خیالات اور نئے طرز فکر و عمل سے ڈر اور اجتناب، بدسلیقہ پن، بد ترتیبی اور عدم تعاون اور بد تنظیمی عادات اور رجحانات اور فراابتداری گروہوں کی مائیکرو سوشل رویے، تعصبات، نخوت اور تکبر کے جذبات اور خیالات سرایت کر جاتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب مسلمان لڑکا جوان ہو کر پردے

اور زنانخانے کی محدود دنیا سے باہر نکلتا ہے اور مردانہ دنیا میں قدم رکھتا ہے، تب وہ پردے اور زنانخانے کی دنیا کا "حاکم اور محافظ" یا "قوام" بننا شروع ہو جاتا ہے بالفاظ دیگر اب وہ پردے کے جیل خانے سے نکل کر اس کے جیلروں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے اور رواجاً اور جبراً اپنی عورتوں کو پردے کی قید و بند میں رکھتا ہے۔ یہ تبدیلی اس کے پردہ سنڈروم میں متضاد اور مخالفانہ تاثرات اور رجحانات مرتب کرتی ہے اس کے برعکس پردہ دار لڑکی جوان ہو کر کبھی ایسے متضاد اور مخالفانہ محرکات اور تاثرات سے نہیں گزرتی اس لئے لڑکیوں اور عورتوں کے پردہ سنڈروم میں بچپن کے خوف اور خدشے، فرار گزینی اور دوسری کمزوریاں اور خامیاں بدستور باقی رہتی ہیں، جبکہ مردوں کے پردہ سنڈروم میں اس مرحلے کے تجربات اور اثرات سے کچھ تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پردہ اور تعدد ازدواجگی کے نظام حیات میں دونوں جنسوں کے متضاد اور مخالفانہ مقام اور رول ہیں۔ پس دوسرے مرحلے میں پردہ دار مرد اپنی عورتوں پر، خواہ وہ انکی مائیں، بیویاں، بہنیں اور بیٹیاں وغیرہ ہوں، پردہ اور تعدد ازدواجگی کے رسم و رواج، قوانین اور طور و طریقے، پابندیاں اور بندشیں، ممانعتیں اور قیود و بند عائد کرتے ہیں، جس میں پردہ سوسائٹی کی آئیڈیالوجی اور رائے عامہ بھی ان کی پوری پوری اعانت اور حمایت کرتی ہیں[1]۔ جس کا تجزیہ ہم اگلے باب میں کریں گے۔ بہرحال پردہ اور تعدد ازدواجگی کے عائد کرنے والے بن کر وہ اس کے تمام عقائد، نظریات، توہمات، امتناعات اور رویوں وغیرہ کے علمبردار بھی بن جاتے ہیں اور تمام مردانہ برتری، فضیلت اور فوقیت کے خیالات، عقائد اور نظریات وغیرہ کے مردانہ تعصبات، توہمات، فخر و نخوت کے حامل اور پردہ سسٹم اور تعدد ازدواجگی کے تمام مردانہ ظلم و تعدی، زیادتیاں اور ناانصافیوں کو جائز اور

---

[1] علامہ فریدہ جدی لکھتے ہیں "عورتیں اور مرد دو مختلف گروہ ہیں۔ اسلئے ان دونوں کے میدان عمل کو الگ الگ کرکے پردہ کو بیچ میں حد فاصل قرار دیا گیا تاکہ ہر گروہ اپنے میدان عمل ہی میں محدود رہے۔" دیکھئے "مسلمان عورت" ص ۲۱۔

ضروری تصور کرنے لگتے ہیں جن پر مردوں کی برتری اور فوقیت، یا بقول مولانا مودودی، غلبہ اور شدت اور تحکم کا دار و مدار ہے [۱]۔ لہٰذا پردہ دار مرد عورتوں کو حقیر اور ناقص العقل تصور کرتے ہیں، ان کو کام، عمل علم اور فکر کی تمام تکمیلی اور تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں سے عاری قرار دیتے ہیں۔ ان کو پردے اور زنانخانے میں محبوس رکھنے کو اپنی ذاتی اور معاشرتی شان و شوکت کا اظہار اور ان کی گھر سے باہر کی دنیا میں کام، عمل، پیداوار اور تخلیق کی سرگرمیوں اور تکمیلات کی آزادی کو اپنی اور اپنے خاندان کی بے عزتی اور شرم و ندامت تصور کرتے ہیں اور تعدد ازواج اور دوسری مردانہ زیادتیوں اور بدسلوکیوں کو جائز اور ضروری تصور کرتے ہیں، مثلاً بیوی یا بیویوں کی زدوکوب، دوسری شادی کرنا یا اس کی دھمکی دینا، طلاق یا اس کی دھمکی دینا وغیرہ وغیرہ، جو پردہ دار عورتوں کی زندگی اجیرن بنا دیتے ہیں۔ ان ناانصافیوں اور زیادتیوں میں انہیں اپنے خاندان اور قرابتداری گروہوں اور دوست واحباب کی حمایت اور اعانت بھی حاصل ہوتی ہے، جو ان کی مائیکروسوشل تعلقات، مفادات اور وفاداریوں کی بنیاد ہوتی ہیں۔ مگر ان کے علاوہ پردہ سوسائٹی کے قانون، انتظامیہ اور رائے عامہ اور ذرائع ابلاغ بھی اس مردانہ نظام حیات کی تائید اور تحفظ کرتے ہیں۔ بہر حال اُن غیر مساویانہ ماحول اور نظام معاشرہ کے باعث مسلمان مردوں کا پردہ سنڈروم مسلمان عورتوں کے سنڈروم سے مشابہ ہونے کے باوجود مختلف اور مخالفانہ نوعیت کا ہوتا ہے اس صورت حال کے باعث مسلمان مردوں اور عورتوں میں زندگی کے ہر مرحلے اور سطح پر تکمیلی بُعد اور خلا پیدا ہو جاتا ہے۔

[۱] علامہ فرید وجدی اعلان کرتے ہیں "قدرت نے مرد کو عورت پر فوقیت دی۔ عورت کیلئے غلامی ہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ عورت کو اس غلامی سے کبھی نجات نہیں مل سکتی"۔ دیکھئے "مسلمان عورت" ص ۱۰۱۔ مولانا مودودی اپنے مخصوص ٹیڑھے میڑھے طریق فکر سے اس "ذاتی" فوقیت کو یوں بیان کرتے ہیں: "پس زوجین میں سے زوج فاعل کی طبیعت کا اقتضا یہی ہے کہ اس میں غلبہ اور شدت اور تحکم ہو جس کو مردانگی اور رجولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ فعلی پرزے کی حیثیت سے اپنی خدمت بجالانے کیلئے اس کا ایسا ہی ہونا ضروری ہے اس کے برعکس زوج منفعل کی فطرت انفعالیہ کا یہی تقاضا ہے کہ اس میں نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تاثر ہو جسے انوثت یا نسائیت کہا جاتا ہے کیونکہ زوجیت کے انفعالی پہلو میں یہی صفات اس کو کامیاب بنا سکتی ہیں"۔ دیکھئے "پردہ" ص ۲۱۵

مردوں اور عورتوں میں تکمیلی خلا

پردہ سوسائٹی میں عورتوں کی دنیا مردوں کی گھر سے باہر کی مصروفیات اور کام کاج سے اس قدر الگ تھلگ ہوتی ہے کہ وہ دونوں دو مختلف دنیاوں کے بسنے والے بن جاتے ہیں۔ اس فرق اور فاصلے کے باعث مردوں کے کام، تکمیلات، اقدار اور مقاصد وغیرہ عورتوں کی پردہ سنڈروم کی پیدا کردہ ذہنی اور کرداری کمزوریوں اور خامیوں "مثلاً جہالت، لاعلمی، خوف، خدشوں اور فرار گزینی، لاپروائی" وغیرہ کی عادات اور رویوں اور رجحانات کے باعث نہ تو اُن کی سمجھ میں آتے ہیں اور نہ ہی وہ اُن سے کوئی دلچسپی، لگاؤ اور شوق رکھتی ہیں۔ یہ ہم عصر اور ہم نسل افراد کا تکمیلی خلا ہے، جو مسلم معاشری کی بنیادی کمزوری اور خرابی ہے جس کے اثرات سارے معاشرے اور تاریخ کو متاثر کرتے ہیں۔ اس خلا کے باعث مسلمان میاں اور بیوی میں تکمیلی کاموں کارناموں، مقاصد اور نصب العین میں کوئی باہمی فکر و خیال اور جذبات و اقدار اور نہ ہی کوئی باہمی تعاون، معاونت اور اشتراک عمل پیدا ہوتا ہے۔ اس خلے کو میاں بیوی کے جھگڑے، تنازعے اور ناچاقیاں، جو دوسری شادی، طلاق وغیرہ اور ساس بہو کی رنجشیں اور تنازعے مزید وسیع اور گہرا کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی خلا ماں اور بیٹے اور گھر کے دوسرے ارکان میں پایا جاتا ہے۔ ان حالات اور وجوہات کے باعث پردہ دار خاندان اصلاً ایسا منقسم اور غیر مربوط کنبہ بن جاتا ہے جو کام، عمل، پیداوار اور تخلیق کی تکمیلات کی معاشری اکائی نہیں ثابت ہوتا۔ اس میں عورتوں اور مردوں کے پردہ سنڈروموں کے باعث بیوی اپنے میاں کے کاموں اور تکمیلوں میں رفیق و مددگار نہیں ہوتی اور ماں اپنے بیٹے کے کاموں اور ارادوں اور مقاصد میں اپنے خوف اور خدشوں وسوسوں اور وہموں کی وجہ سے مخالفت اور ضد کرتی ہے۔ ان باتوں کا بسا اوقات یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میاں یا بیٹا گھر سے باہر رہتا ہے اور بعض اوقات باہر آوارگی اور عیش و تفریح کرتا رہتا ہے، اور ماں یا بیوی گھر میں بے بس

ولا چار بیٹھی رہتی ہے۔ میاں بیوی اور ماں باپ کے مابین تکمیلی خلیے کا دوسرا نتیجہ ان کے بچوں کے ذہن و کردار کی غیر تکمیلی نشوونما ہے۔ جو اُن کی گود میں پرورش اور تربیت پاتے ہیں، جس کا تجزیہ ہم گذشتہ باب میں کر چکے ہیں۔

اس طرح مسلمان ماؤں اور دوسری عورتوں کی تکمیلی پس ماندگی اور پردہ سنڈروم اور ماں باپ کے مابین تکمیلی خلیے اور غیر ازنباطیت کے باعث نئی اور پرانی نسلوں میں بھی تکمیلی خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، پردہ دار خاندان میں ماں باپ کے مابین تکمیلی خلا نئی نسلوں کے کردار اور شخصیت کا انحطاط اور تخریب کا باعث بن کر تقلیلِ تکمیل کے عمل کو جنم دیتا ہے، جو سارے مسلم معاشرے اور تہذیب و تمدن کو انحطاط اور انتشار کے گرداب میں پھنسا دیتا ہے۔ جیسا کہ یہ گذشتہ زمانوں میں ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے۔

"پردے میں رہنے دو" مردانہ سنڈروم کا واویلا

دور حاضرہ میں پردہ مائیکرو سوسائٹی، اس کا خاندانی نظام اور سارا پردہ سسٹم اور اس کی آئیڈیالوجی غیر پردہ دار معاشروں کی تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں کے اثر و نفوذ اور دباؤ اور پھیلاؤ کے باعث سخت بحران میں مبتلا ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مسلمان معاشرے میں بھی بیداری پھیل رہی ہے۔ آج مسلمان عورت بھی تکمیلی زندگی کے لئے آزادی اور مساوات کی خواہاں ہے اور پردے اور اس کے سارے نظام اور آئیڈیالوجی کو عملی اور فکری طور پر اپنی تنقید اور تردید کا نشانہ بنا رہی ہے۔ مگر جب کوئی مسلمان عورت پردے اور برقعہ کی قید و بند کو توڑ کر گھر سے باہر کی دنیا میں تکمیلی زندگی اختیار کرتی ہے یا اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہے تو حامیان پردہ اور پردہ آئیڈیالوجسٹ بے پردگی، بے حیائی، آوارگی اور جنسی انارکی کا شور و غوغا مچانا شروع کر دیتے ہیں اور "پردے میں رہو" کی قسم کی تلقین و تبلیغ شروع کر دیتے ہیں۔ جو مسلم معاشرے کا جدید مسئلہ ہے۔ مگر اس پر ہم اگلے باب میں

غور کریں گے۔ سردست تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ لاکھوں کروڑوں جوں سال بیٹے جو پردہ دار مائیں ہر سال گھر سے باہر کی دنیا میں بھیجتی ہیں، اُسے کس طرح کی دنیا بناتے ہیں۔ اس کے مسائل اور معاملات کو کس طرح حل کرتے ہیں اور اپنی دنیا اور اپنے دور کی مشکلات اور چیلنجوں کا کیسے مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ مسلمانوں کا قرابتدارانہ معاشرہ حقیقتاً صرف مردوں کا معاشرہ، مردوں کے ذریعے چلتا اور مردوں کے لیئے ہوتا ہے۔ اس میں عورتیں صرف خاندانی پس منظر تک محدود رہتی ہیں۔ گھر سے باہر کی مردانہ دنیا میں نہ تو اُن کی کوئی آواز ہوتی ہے اور نہ کوئی حقوق اور آزادی بلکہ اُن کے "حاکم اور محافظ" انہیں اپنے جنسی اور غیر جنسی، ذاتی اور گروہی اغراض و مقاصد اور مفادات اور تعلقات کی خاطر جدھر چاہتے ہیں ہانکے اور گھسیٹے پھرتے ہیں۔

پردہ سسٹم اور قرابتداری معاشرہ

خاندان میں مرد کے پدر سرداری غلبے، تحکم اور بالادستی نے مسلم معاشرے کو قرابتداری معاشرہ بنا دیا ہے، جس میں ہر شخص کی زندگی کے تمام تعلقات اور مفادات اس کے کام، محنت و مشقت اور تکمیلی صلاحیتوں اور خوبیوں کی بجائے اس کی پیدائش، خاندان، ذات اور گروہی حیثیت کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔ اس کے باعث صرف مرد ہی تکمیلی فرد رہ جاتے ہیں، کیونکہ عورت کو تو صرف خاندان اور قرابتی گروہ کی مقبوضہ شے تصوّر کیا جاتا ہے، جسے کسی قسم کی تکمیلی مرضی اور آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ مگر مرد کی تکمیلات بھی خاندانی اور قرابتداری تعلقات اور مفادات کے تابع ہوتی ہیں۔

پردہ اور تعدد ازواج کے قرابتدارانہ محرکات اور عوامل | **پردہ سسٹم ایسی محدود اور تنگ نظر ذہنیت**

پیدا کرتا ہے جو پردہ دار لوگوں کو، خاص طور پر عورتوں کو، اپنے رشتہ داروں اور قرابتداروں سے پرے دیکھنے نہیں دیتی۔ ماں باپ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں اپنی برادری اور قرابتی گروہ کے اندر ہی کرنے پر مائل رہتے ہیں بلکہ بسا اوقات تو وہ اُن کی شادی اپنے بھائی، بہنوں کی بیٹیوں اور بیٹوں سے کرتے ہیں جو آپس میں اول درجے کے کزن (First degree cousin) ہوتے ہیں۔

"ہندو کی نسبت مسلمان اپنی عام زندگی میں باہر کی صحبت پسندی اور ملنساری کی جانب مائل نہیں ہوتا: اس لئے کہ ہندو اپنی شادیوں کے لئے باہر کی طرف دیکھتا ہے جب کہ مسلمان ممکنہ طور پر اپنی قریب ترین کزن سے شادی کر لیتا ہے بلکہ وہ تو اپنی عمر سے بڑی بیوی کو ترجیح دیتا ہے تاکہ کہیں دور نہ جانا پڑے۔"[1]

اول درجے کے کزنوں اور ذات برادری اور قرابتی گروہوں میں شادیوں کا رواج قرابتداری معاشرے کی اصلی بنیاد ہیں، جس کو کفو کا اصول کہا جاتا ہے بہرحال چچازاد کزنوں کی شادی کا مقصد اقتصادی ہوتا ہے، تاکہ خاندانی زمینیں اور جائیداد خاندان سے باہر نہ جائیں۔ اس طرح اقتصادی عوامل قرابتداری رشتوں اور تعلقات کو خاندانی حدود میں محدود کر کے معاشرے میں قرابتداری نظام کو مستحکم کر دیتے ہیں۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ پردہ سسٹم لوگوں کی بصارت وبصیرت پر "اندھیاری" کا اثر رکھتا ہے، جسے ہم مائیکرو سوشل اثرات کہتے ہیں یہ لوگوں کو شادی بیاہ اور دوسرے تعلقات اور مقاصد کے لئے اپنی ذات برادری، قبیلہ اور خیل اور خاندان سے پرے نہیں دیکھنے دیتا۔ ڈاکٹر فریڈرک بارتھ سوات

---

[1] ایل۔ ایف۔ لڈے برائٹ "پنجاب پریسوڈ" ص ۴۰، (انگریزی میں)

کے پٹھانوں کی اہلیت ذاتوں، یعنی سیدوں اور پختونوں یا زمینداروں میں ذات برادری کے عائلی مفادات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"دونوں غالب اور با اثر گروہوں کے قریبی خاندانوں میں باہمی شادیوں کی زیادہ تناسب کی وجہ چچازاد کزنوں کی سیاسی مقاصد کی شادیاں ہیں جو اُن کے مقامی سیاست کے لئے فائدہ مند تصوّر کی جاتی ہیں۔ مگر زیادہ اہم وجہ پردے کی سخت پابندیاں بھی معلوم ہوتی ہیں[1]"

پردہ سسٹم کے ان مائیکرو شل یا "اندھیاری" اثرات میں تعدد ازدواج کے محرکات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ قرابتداری گروہوں کے متمول اور مقتدر افراد پہلی شادی تو اپنے خاندان یا برادری میں ہی کرتے ہیں، مگر دوسری، تیسری اور زیادہ بیویوں کے لئے وہ اکثر و بیشتر اپنے خاندانی گروہ سے باہر کی عورتیں تلاش کرتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلی بیوی سینئر بیوی تصوّر ہوتی ہے جس کی اولاد رسم و رواج کے مطابق جائیداد وغیرہ میں فائق حقوق و مراعات رکھتی ہے۔ جب کہ دوسری، تیسری اور زیادہ بیویوں کی حیثیت اور حقوق کم ہوتے ہیں، جو بھائیوں میں آئندہ ناچاقیوں، تنازعوں اور دشمنداریوں کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس طرح تعددِ ازدواج کی رسم معاشرے میں انتشار انگیزی کے بیج بو دیتی ہے۔ جو بھائیوں، کزنوں اور دوسرے رشتہ داروں، قرابتداروں اور دوستوں اور حلیفوں تک پھیل جاتی ہے اور مختلف قرابتداری گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آراء کرتی ہے۔

جدید قرابتداری معاشرے کا مردانہ حصّہ

چند جدیدیت پسند خاندانوں اور گروہوں کو چھوڑ کر جو زیادہ تر بڑے بڑے شہروں میں رہتے ہیں، پاکستان کا معتدبہ حصہ روایتی پردہ دار قرابتداری

[1] ڈاکٹر فریڈرک بارتھ "سوات پٹھانوں میں سیاسی قیادت" (انگریزی) ص ۴۰

بنیادوں پر قائم ہے، جو ہمارے ملک کا صدیوں پرانا تمدنی ورثہ ہے اس معاشرے میں زندگی کا سارا نظام مردوں اور گھر کے مردانہ حصوں کے ارد گرد گھومتا ہے۔ ہمارے ملک میں مردانہ حصّہ کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے مثلاً صوبہ سرحد میں اسے حجرہ یا بیٹھک کہتے ہیں، پنجاب میں بیٹھک ڈیرا یا چوپال کہلاتا ہے، سندھ میں اوطاق کہتے ہیں۔ اردو میں اسے مختصراً "مردانہ" کہتے ہیں۔[1] بہر حال مردانے کا نظام سب جگہ دو اصولوں پر قائم ہے۔

اول: مردانے سے عورتوں کا کاملاً انخلا۔ مردانہ خالصتاً مردوں کی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا ہے، جہاں عورت کا کسی صورت میں عمل دخل نہیں ہوتا، کیونکہ عورت کا آنا پردہ سسٹم کے عزت و شرم اور حیثیت اور رسوخ کے تصورات اور عقائد کے منافی ہوتا ہے۔ قرابتداری گروہ کے مردوں کی معاشرتی حیثیت اور عزت کے خلاف ہے کہ ان کی عورتیں مردوں میں آئیں۔ مگر شادی بیاہ اور دوسری تقریبات پر ہر گانے بجانے والی عورتوں وغیرہ کو مردانے میں لانا باعث فخر و افتخار تصوّر کیا جاتا ہے۔

دوم: مردانے کا طرز عمل قرابتدارانہ ہوتا ہے، کیونکہ اس کا مقصد اور منتہا خاندان اور اس کے قرابتی گروہ کے مفادات اور تعلقات کا تحفظ اور فروغ ہے یہ مفادات اور تعلقات قبائلی غارتگری یا زمیندارانہ استحصال یا تجارتی یا سرمایہ دارانہ منافع خوری اور کاروباری فروغ پر مبنی ہوتے ہیں۔

قرابتداری گروہوں کا نظام مسلمانوں کا معاشرہ لاتعداد چھوٹے بڑے قرابتداری گروہوں پر مشتمل ہے۔ اُن میں سب سے چھوٹا مگر بنیادی گروہ روایتی مردانے کا گروہ ہے، جس کا مرکز ڈیرہ، حجرہ، بیٹھک وغیرہ ہوتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو قریب ترین رشتہ داروں، قرابتداروں اور عزیزداروں

---

[1] پاکستان میں مردانوں کی تنظیم، سرگرمیوں اور روزمرہ کی زندگی کے بارے میں دیکھئے۔ فریڈرک بارتھ کی کتاب ہذا ص ۵۰ تا ۵۲۔ ذکیہ ایگر کی کتاب ص ۳۰۔ گزیٹیر آف ویسٹ پاکستان صفحات ۲۹۱ تا ۲۹۲ کراچی ۱۹۶۹۔

پر مشتمل ہوتا ہے یعنی رشتہ دار خاندانوں کے سربراہوں (باپ یا دادا جو زندہ ہو اور اپنی اولاد کو کنٹرول کرتا ہو) اُن کے جواں سال بھائیوں اور بیٹوں، چچیرے کزنوں اور دوسرے مرد رشتہ داروں اور عزیز و اقارب کو، جو اس ڈیرے یا حجرے سے متعلق اور منسلک ہوں یا ہونا چاہیں، پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس قرابتی مرکز میں یہ لوگ اپنے دوستوں، ساتھیوں اور حلیفوں کی آؤ بھگت کرتے ہیں اور اپنا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے خلاف "پارٹیاں" کرتے اور ساز باز کرتے ہیں اور بعض اوقات، جب اس گروہ میں نفاق کا عنصر پھیل جائے، تو وہ ایک دوسرے کے خلاف بھی ساز باز کرتے ہیں جو بالآخر ڈیرے یا حجرے کے دو حصوں میں بٹ جانے پر منتج ہوتا ہے مگر ایسا خاندانی گروہ دو حصوں میں اس وقت تک نہیں بٹتا جب تک اس کا سربراہ (باپ یا دادا) زندہ ہو اور اپنے بیٹوں کو کنٹرول میں رکھتا ہو۔ ہر مردانے میں اس کا سربراہ اور دوسرے ممبر اپنے مفادات اور تعلقات کو بچانے اور بڑھانے کی خاطر دوسرے مردانوں اور گروہوں کے سربراہوں اور ممبروں کے ساتھ ساز باز اور گٹھ جوڑ کرتے رہتے ہیں۔

ڈیرے یا حجرے کا خاندانی گروہ، ابتدائی، اولین اور مقابلتاً منتقل قرابتی گروہ ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد پر اور اس کے ارد گرد باقی تمام وسیع تر قرابتی گروہوں کی تشکیل یا تقسیم اور تفریق ہوتی ہے۔ یہ تشکیل اور تقسیم و تفریق، اتحاد و انشقاق خالص قبائلی معاشرے اور خالص جاگیرداری اور زمینداری معاشرے میں گروہی جوڑ توڑ اور ساز باز کے مختلف محرکات اور عوامل سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اور ان دو انتہائی معاشروں کے درمیان میں نیم قبائلی اور نیم جاگیرداری یا زمینداری نظاموں میں ملے جلے محرکات اور عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان میں صوبہ سرحد اور بلوچستان کے خالص قبائلی علاقوں مثلاً قبائلی ایجنسیوں اور صوبہ پنجاب اور سندھ کے خالص جاگیرداری اور زمینداری علاقوں مثلاً سرگودھا، ملتان

لاڑکانہ، نواب شاہ، حیدرآباد وغیرہ میں تو خالص قبائلی اور خالص جاگیرداری ذات پات کے معاشرے پائے جاتے ہیں۔ مگر ان دو انتہاوں کے درمیان ان سب صوبوں کے متعدد علاقوں اور ضلعوں میں نیم قبائلی اور نیم ذات پات کے گروہوں کی انفرادیت زدہ جوڑ توڑ اور ساز باز کے طور وطریقے پائے جاتے ہیں۔ بہر کیف ڈیروں یا جھروں کے کئی خاندانی گروہ جو ایک ہی جد امجد کی اولاد ہوتے ہیں اور عموماً ایک ہی مردانے کے رکن ہوتے ہیں، ثانوی درجے کا قرابتی گروہ یا خیل اور برادری بناتے ہیں کئی ثانوی گروہ یا خیل جو الگ الگ مردانوں (یعنی ڈیروں یا جھروں) میں مرکوز ہوتے ہیں، مگر اپنے قرابتی مفادات اور ساز باز کی وجہ سے باہمی اتحاد قائم کر لیتے ہیں، ایک ٹولا یا ڈلہ (جیسا کہ پشتو میں کہا جاتا ہے) بنا لیتے ہیں۔ یہ تیسرے درجے کے قرابتی گروہ ہیں۔ یہ گروہ اس وقت تک ہی متحد اور منظم رہتے ہیں جب تک ان کے ارکان اور سرداروں کے قرابتداری مفادات یعنی زر، زن اور زمین کی لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ مفید اور ممکن ہوتی ہے۔ جونہی دوسرے قرابتداری گروہوں کی ساز باز اور اثر ورسوخ سے مقامی حالات اور لوٹ کھسوٹ کے مواقع بدلتے ہیں۔ ان ٹولوں یا ڈلوں میں نفاق اور تنازعے برپا ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے مقامی لیڈروں اور خاندانی سربراہوں اور بزرگوں کی ساز باز اور لڑائی جھگڑوں کے بعد نئے ٹولے یا ڈلے وجود پذیر ہوتے ہیں، تاہم خالص قبائلی معاشرے میں قبائلی سردار اور ملک چھوٹے قرابتی اور خاندانی گروہوں اور ٹولوں کو اپنے کنٹرول میں زیادہ رکھتے ہیں، اور خالص جاگیرداری معاشرے میں بڑے بڑے جاگیردار یا وڈیرے اپنے اپنے علاقوں میں ان مقامی اور چھوٹے گروہوں اور خاندانوں کے سربراہوں کو اپنے کنٹرول اور اثر ورسوخ میں زیادہ آسانی سے رکھتے ہیں، مگر نیم قبائلی اور نیم جاگیرداری علاقوں میں چھوٹے قرابتی اور خاندانی گروہ زیادہ خودمختار ہوتے ہیں جیسا کہ دور حاضرہ کی انفرادیت پسند ماحول میں اب زیادہ تر ہو رہا ہے۔ کئی مقامی برادریاں (جاگیرداری یا نیم جاگیرداری علاقوں میں) یا خیل (قبائلی یا نیم

قبائلی علاقوں میں) جو ایک ہی جد سے ہوں ذات یا قبیلہ بناتے ہیں۔ جو چوتھے اور آخری درجے کا قرابتداری گروہ ہوتا ہے۔ خالص قبائلی معاشرے میں یہ گروہ نسب و نسل کے فرق کو بہت اہمیت دیتا ہے، جبکہ جاگیرداری ذات پات کے معاشرے میں نسب و نسل کے علاوہ کام اور پیشے کے فرق بھی اہم ہو جاتے ہیں۔[1]

بہرصورت، چوتھے درجے کے قرابتی گروہوں میں آبادیاتی پھیلاؤ اور فاصلے واقع ہو جاتے ہیں، جن کی وجہ سے قرابتداری تعلقات اور مفادات بدل جاتے اور کمزور ہو جاتے ہیں یا بدلنے شروع ہو جاتے ہیں دراصل ڈیرے یا جرگے اور قرابتداری جوڑ توڑ کی سیاست اصولاً اور حقیقتاً مقامی مائیکرو سوشل سیاست ہوتی ہے۔ اس میں پردہ سنڈروم اور قرابتدارانہ ضرورت تناسل اور قرابتداری ایلیٹ کے غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی رویے اور رجحانات منتقل الخلط اور انتشار کا باعث بن کر قرابتدارانہ تعلقات اور مفادات کو بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح قرابتداری گروہوں کی جوڑ توڑ، سازشوں اور تبدیلیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، جو ان کی تکمیلی ترقی اور ماکرو سوشل ارتقا کے مانع ہوتا ہے۔ جب تک پردہ اور تعدد ازدواجگی کو قانوناً کلی اور ہمہ گیر طور پر، ختم نہیں کیا جاتے گا، مسلم معاشرے کے ان مائیکرو سوشل انحطاط

---

[1] جیسا کہ ہم نے باب سوم میں بیان کیا، ہندوؤں کے ذات پات کی مائیکرو سوسائٹی نے نسب و نسل اور کام اور پیشوں کے فرق اور اختلافات کو انتہا تک پہنچا کر اپنا مخصوص معاشرہ استوار کیا، مسلمانوں کی تاریخ میں کسی مسلم مائیکرو سوسائٹی نے کبھی ذات پات کی تقسیم اور فرق کی ایسی سخت صورت نہیں اختیار کی۔ کیونکہ مسلم مائیکرو سوسائٹی میں زر زن اور زمین کا استحصال اور استعمال ہمیشہ پردہ اور تعدد ازدواجگی کے قرابتدارانہ تعلقات اور مفادات کے تابع رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے مسلم معاشرہ ان مائیکرو سوشل حدود میں منجمد اور مسدود رہا اور ان تعلقات اور مفادات کے مائیکرو سوشل محرکات اور عوامل سے از خود نجات بھی حاصل نہ کر سکا جیسا کہ یورپ کے معاشرے نے قرون وسطیٰ کے آخری دور میں جاگیرداری نظام سے نجات حاصل کر لی تھی اور جدید ماکرو سوسائٹی بن گیا ہے۔

اور انتشار انگیز عوامل اور محرکات کو ختم نہیں کیا جاسکتا ہے[۱]

قرابتداری گروہوں کے سربراہوں کو پاکستان کے مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، مثلاً خان، ملک، چودھری، سائیں، وڈیرا، سید، شاہ سردار، ارباب، راجہ، نواب، پٹیل، میاں، مرزا وغیرہ[۲]۔

---

۱ قرابتداری معاشروں میں اتفاق اور انشقاق (Fusion and Fission) کے محرکات اور عوامل کا مطالعہ جدید مغربی ماہرین بشریات (Anthropologists) نے اپنے مخصوص سامراجی مقاصد اور مضمرات کے باعث نہایت جامد، غیر متحرکی اور ان سائنٹفک انداز میں کیا ہے۔ اس کی ایک مثال ڈاکٹر فریڈرک بارتھ کی کتاب سوات پٹھانوں میں سیاسی قیادت ہے، دیکھئے ص ۱۱۰ تا ۱۲۶) سائنٹفک اور متحرکی ڈائنمک مشاہدے اور مطالعے کا تقاضا ہے کہ ان مائکرو سوشل محرکات اور عوامل کا محض تجزیہ ہی نہ کیا جائے بلکہ ان عوامل و عواقب کی بھی کھوج لگائی جائے جو قرابتداری معاشرے میں مائیکرو سوشل رجحانات اور تعلقات کو متحرک کرنے سے قاصر ہیں، جن کو بروئے کار لاکر مسلم معاشرے کو ماکرو سوشل بنایا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز فکر د (Approach) صرف ان لوگوں کا ہی ہوسکتا ہے جو مسلم معاشرے کیلئے اسکے صدیوں پرانے مائیکرو سوشل جمود، انحطاط اور انتشار سے نجات کی راہ تلاش کرنا چاہتے ہوں۔

۲ یہ تمام القاب قرون وسطیٰ کے قرابتداری معاشرے کی باقیات ہیں۔ جنوب ایشیائی برصغیر کی تاریخ میں اپنے وقت کے سیفین چکر کے مقتدر اور غالب گروہوں کے سرداروں اور سربراہوں کے لقب ہوتے تھے یا اس چکر کے حکمرانوں نے بطور خطاب عطا کئے تھے۔ جب اس چکر کے خاتمے پر ان گروہوں اور سرداروں کا اقتدار ختم ہوگیا تو یہ القاب ان کے خاندانوں کے مقامی اثر و رسوخ کے باعث رواجاً اور وراثتاً جاری رہے یا دوسرے گروہوں کے سرداروں نے اختیار کر لئے۔ اس طرح بعض اوقات یہ القاب خاندانوں اور افراد میں ان کی مقامی حیثیت یا اثر و رسوخ یا خاندانی لقب کے طور پر باقی رہ گئے، شاید یہ جتلانے کے لئے کہ "پدرم سلطان بود"

اگر ان القاب کا سیفین تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ چودھری، سائیں، راجہ، پٹیل وغیرہ قدیم ہندو قرابتداری معاشرے میں قرابتی گروہوں کے سربراہوں کے لقب ہوتے تھے جو برصغیری مسلمانوں میں مروج ہوگئے، سید، ارباب، شاہ وغیرہ عرب اور ایرانی قبائلی اور جاگیرداری قرابتی گروہوں کے سرداروں کے لقب ہوتے تھے جو مسلمان اپنے ہمراہ اس برصغیر میں لائے مگر قرابتداری معاشرے کے اختتام کے ساتھ مخصوص خاندانوں سے منسوب ہوگئے ہیں۔ میاں اور ملک خاندانِ غلامان سے تعلق خاندان کے سیفین چکروں کے ایلیت گروہوں کے سرداروں کے لقب ہوتے تھے جن کے ساتھ بعد میں وہی سلوک

ڈیرا یا حجرہ پالیٹکس کے مائیکروسوشل محرکات اور عوامل

قرابتداری گروہ، خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، تین مقاصد اور دو باتوں کے لئے ہر وقت بنتے، جھگڑتے اور بدلتے رہتے ہیں یعنی زن، زر اور زمین کا حصول اور اپنی حقیقی یا ظاہری عزت اور شرم کا سوال ان مقاصد اور معاملات کے لئے ہر گروہ کے ارکان اپنے سربراہ یا سردار کی پوری پوری مدد اور معاونت کے لئے تیار رہتے ہیں اور اس کے لئے دوسرے قرابتی گروہوں کی امداد اور حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس غرض سے دو یا زیادہ قرابتداری گروہ متحد ہو کر اپنے مخالف گروہوں سے برسرپیکار بھی ہوتے ہیں جب گروہی سربراہ کو اپنے اور دوسرے گروہوں کی ایسی امداد، معاونت اور اتحاد حاصل ہو جاتا ہے، وہ اپنے گروہ اور علاقے میں بااثر اور طاقتور سربراہ بن جاتا ہے۔ اور اس کا خاندانی اور قرابتی گروہ بھی اپنے مقامی سیاست (پالیٹکس) میں اثرورسوخ اور اہمیت حاصل کر لیتا ہے، بلکہ اس کا ہر ایک رکن عموماً اور سربراہ خصوصاً مقامی طور پر بااثر اور بارسوخ ہیت حاصل کر لیتا ہے، کیونکہ، پنجابی کی مثل کے مصداق "اس کو کئی بازوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔" ایسے قرابتداری حمایت اور معاونت بڑی طاقت ہے، جو بااثر برادری یا خیل یا قبیلے کی مقامی سیاست میں زور اور رسوخ کا ثبوت ہوتی ہے۔ قرابتداری

ہوا جو دوسرے القاب کے ساتھ ہوا یعنی وہ صرف خاندانی لقب بن کر رہ گئے۔ خان کا لقب ترک، منگول اور پٹھان حملہ آور گروہوں نے اس برصغیر میں مروج کیا یہ ان کے قبائلی سرداروں کا لقب ہوتا تھا مگر مرور زمانہ کے ساتھ خاندانی نام کی صورت اختیار کر گیا "مرزا" مغل حکمرانوں نے یہاں متعارف کیا اور انکے زوال کیساتھ عام خاندانی لقب کی طرح استعمال ہونے لگا یہی حال باقی اور القاب کا ہے جو اپنے سنگین چکر کی پیداوار تھے

انگریز سامراجیوں نے اپنے دور اقتدار میں اس قرابتداری القاب کے نظام کا نہایت مضحکہ خیز استعمال کیا انہوں نے "خان صاحب" اور "خان بہادر" جیسی اصطلاحات اختراع کیں، مگر یہ القاب انکی سلطنت کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے تمام مسلمان ممالک میں اس قسم کے قرابتداری قیادت کے لقب او خطاب مروج تھے اور کم و بیش آج بھی رائج ہیں۔ مگر پاکستان کی طرح قرابتداری نظام کی موجودہ انتزاع کے ساتھ یہ القاب بھی خاندانی نام بن رہے ہیں یا مفقود ہو رہے ہیں۔

معاشرے کی مثل ہے کہ" برادری میں بڑا زور ہے" اس مقامی اثر و رسوخ اور اہمیت کو عزت کہتے ہیں جس کو برقرار رکھنے کے لئے بااثر گروہ کا ہر ایک رکن ہر وقت ہر طرح سے تیار رہتا ہے اس جارحانہ متعدی کو" شرم" کہتے ہیں' اگر کوئی رکن اپنے خاندان' برادری وغیرہ کی مقامی عزت یعنی اثر و رسوخ کو قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کرنے کی صلاحیت اور استعداد نہیں رکھتا تو وہ بے شرم بن جاتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں اس کی ناک کٹ جاتی ہے اور اس کی اور اس کے گروہ کی مقامی سیاست میں اثر و رسوخ یا عزت ختم ہونے لگتی ہے۔ اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ زن' زر اور زمین کے حصول کی جدوجہد میں اس کو اور اس کے گروہ کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ تب یہ مطلوبہ اشیا اس کے اور اس کے گروہ کے ہاتھوں سے نکل کر ان کے مخالفین کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگتی ہے۔ ایسے حالات میں ڈیرا یا حجرہ پالٹیکس کی مشینری پوری حرکت میں آجاتی ہے اور قرابتداری گروہوں میں سازشیں ریشہ دوانیاں' ساز باز' جوڑ توڑ اور اتحاد اور نفاق کے عوامل اور محرکات پورے زوروں پر کام کرتے ہیں اور نئے نئے گروہ اور گروہ بندیاں (ٹولے یا دھڑے) وجود میں آجاتی ہیں۔ تب یہ نئی مائیکرو سوشل قوتیں زن' زر اور زمین کی لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ کر کے اس وقت تک کے لئے کم و بیش منتقل صورت اختیار کر لیتی ہیں جب تک عمل تناسل اور قرابتداری لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ کے عمل سے موجودہ قرابتداری گروہوں کی ارکانی اور ایلیٹ قوتوں میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی' جو انہیں زن' زر اور زمین کی مزید لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ پر نہیں ابھارتی۔

قرابتداری گروہوں کی لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ بنیادی طور پر غیر تکیلی خلاف تکیلی اور زمانہ جدید میں عدم تکیلی محرکات اور عوامل پر منحصر ہیں۔ اول تو یہ استحصالی طور وطریقے قطعی غیر تکیلی اور خلاف تکیلی قرابتداری حمایت اور معاونت پر مبنی ہیں۔ قرابتداری کا کوئی سربراہ یا رکن اس معاونت اور حمایت کے وقت اپنے رشتہ دار قرابتدار یا اپنے حلیف یا دوست کے دعویٰ یا مفاد کی اچھائی یا برائی' ضرورت یا

افادیت پر نہیں سوچتا، بلکہ صرف اس کا دعویٰ یا فائدہ ہونے کو کافی سمجھتا ہے خواہ وہ قانون اور اصول کے منافی ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح اس کی نگاہ صرف گروہ کے مفاد تک محدود رہتی ہے۔ لہٰذا قرابتداری معاشرے میں ہر گروہ کا رکن یا سربراہ اپنے گروہ کے دوسرے ارکان یا اپنے ساتھی گروہوں کے ارکان یا حلیف کی مدد کرتا ہے۔ خواہ ان کے مفاد جور و جبر اور ظلم و تشدد پر ہی کیوں نہ مبنی ہوں اس لئے قرابتداری امداد اور حمایت ایسے ممبروں اور حلیفوں اور ساتھیوں کو بھی حاصل ہوتی ہے جو غیر قانونی اور غیر معاشری حرکات کے مرتکب ہوں، بلکہ قانونی طور پر مجرم قرار دے دیئے گئے ہوں۔ اگر ایسے افراد کے خلاف قانونی کارروائی اور مقدمہ دائر کیا جائے، تو ان کے رشتہ دار اور دوست واحباب ان کو قانون کی گرفت سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ اس کے لئے انہیں جھوٹی گواہی اور صفائی، رشوت اور مکر اور فریب، رعب داب اور قتل و غارت جیسے طریقے کیوں نہ اختیار کرنے پڑیں۔ قرابتداری معاشرے کی انومی یا لاقانونیت کی یہ بنیاد اور ابتدا ہوتی ہے۔ جو ابتدائی گروہوں اور خاندانوں کے مائیکرو سوشل زندگی اور مفادات سے شروع ہوتی ہے۔

جدید مسلم مائیکرو سوسائٹی میں تقلیل تکمیل کے عوامل

فاعل مردوں میں تقلیلِ تکمیلیت کے عوامل مسلم قرابتدارانہ معاشرے میں تکمیل کا عمل تو کم و بیش متواتر جاری رہتا ہے جس کے بغیر کوئی معاشرہ قابل حیات دوائی ابل، نہیں ہوتا اور اس کا وجود بھی قائم نہیں رہ سکتا، مگر پردہ اور تعدد ازواجگی کے باعث مسلم معاشرہ شدید تقلیلی عوامل کی خرابیوں اور کمزوریوں کا شکار ہوتا ہے۔ پاکستان کا جدید قرابتدارانہ معاشرہ بھی ابھی شکست و ریخت کے عمل میں مبتلا ہے۔ اس کی ابتدا ان نسلوں سے ہوتی ہے

جو بالغ اور فاعل نسلیں ہوتی ہیں، جو کم و بیش تمامتر مردوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ پردہ سسٹم کے باعث مسلمان عورتیں تو پیداواری اور تخلیقی کاموں اور مواقعوں سے قطعی محروم کردی جاتی ہیں، ماسوا ایسے کمر توڑ مگر ادنیٰ محنت و مشقت کے کاموں اور خدمات سے جو دیہات اور قبائل میں عورت ذات کی قسمت میں لکھی ہوئی ہیں۔ یا ایسے کاموں اور پیشوں سے جو شہروں میں نچلے طبقوں کی عورتیں ایلیٹ طبقوں کے لئے یا اپنے لئے گھروں میں انجام دیتی ہیں۔ لہٰذا پردہ سوسائٹی میں صرف مرد ہی تکمیلی طور پر فاعل افراد ہوتے ہیں۔ اور وہ ہی معاشرے کے "تمام کام" وظائف، فرائض کارنامے اور کمالات حاصل کرتے اور انجام دیتے ہیں اور پیداوار اور تخلیق کے تمام مواقعوں اور سہولتوں سے استفادہ کرتے یا کرسکتے ہیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح پردہ سوسائٹی مردوں کی زندگی میں ایسے حالات، ماحول اور عوامل و محرکات پیدا کردیتی ہے جو انہیں غیر تکمیلی خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی بنادیتے ہیں۔ وہ مختصراً مندرجہ ذیل ہیں:۔

اول: فاعل مردوں کے پردہ سنڈروم کے عوامل و عواقب۔

دوم: قرابتداری گروہوں کا خلاف تکمیلی نظام حیات۔

سوم: پردہ سوسائٹی کی بے اصولی طرز زندگی یا انومی، جو سارے معاشرے، ملک قوم اور ریاستی نظام کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔

فاعل مردوں کے پردہ سنڈروم کے عوامل و عواقب

خاندانی زندگی، بچپن کے اثرات اور قرابتدارانہ ماحول کے باعث

پردہ سوسائٹی میں ایلیٹ طبقوں کے جو آدمی اپنے ہاتھوں سے کام اور محنت کرنا باعث شرم وندامت خیال کرتے ہیں، مگر دوسروں کی محنت اور پیداوار کا تصرف اور استحصال باعثِ عزت و فخر تصور کرتے ہیں۔ وہ اپنا وقت فضول باتوں اور گپ شپ میں گزارتے ہیں یا کوئی سکنڈل چلاتے ہیں، اپنے ساتھیوں اور رفقائے کار کے خلاف چالیں چلتے رہتے ہیں، کسی کی پگڑی اچھالتے اور کسی کی عزت و آبرو اور جان و مال کے خلاف کوئی سازش یا سکیم بناتے رہتے ہیں یا کسی بارسوخ شخص

یا گروہ سے گٹھ جوڑ اور ساز باز یا چاپلوسی اور خوشامد میں مصروف رہتے ہیں۔ دراصل تصنع اوقات، گپ شپ اور جوڑ توڑ پردہ سوسائٹی میں فاعل مردوں کی مخصوص تفریح کے ذرائع ہیں، جو ہر وقت اور ہر جگہ جاری رہتی ہے، خواہ وہ گھر ہوں یا بازار اور دفتر، دکانیں اور کارخانے، سرکاری ادارے یا سکول، کالج اور یونیورسٹیاں۔ ہمارے گاؤنوں اور شہروں میں یہ عام منظر نظر آتا ہے کہ لوگوں کے گروہ کے گروہ چارپائیوں پر لیٹے، یا میز پر بیٹھے، یا زمین پر پاؤں پسارے باتیں کرنے، گپ شپ سننے، چالیں چلنے، عیب جوئی کرنے یا سازش یا سفارش کرنے میں مشغول ہیں مگر کام اور محنت، تعمیر اور تکمیل کی کوئی بات نہیں ہوتی ہماری نجی کام کی مجلسوں اور اجتماعات میں، پبلک انجمنوں اور اداروں میں کارکنوں کے جلسوں میں، سرکاری اور کاروباری میٹنگوں اور کمیٹیوں میں ہر وقت فضول اور بے مقصد گپ شپ اور بے موقع تفریح کی باتیں اور گفتگو تو عام ہوتی ہیں، کھانے اور پینے پلانے کے دور چلتے ہیں لیکن جو بات نہیں ہوتی وہ کام اور تکمیل کی بات ہے جس کا نہ کسی کو خیال آتا ہے اور نہ ہی دوسروں کے تمسخر کا نشانہ بننے کے ڈر کے مارے کوئی اس خیال کو زبان پر لاتا ہے اگر کوئی کام اور تکمیل کی بات کرتا ہے تو وہ ادنیٰ درجوں کے افراد ہوتے ہیں جن میں ابھی تکمیلی صلاحیتیں قوتیں اور توقعات کارفرما ہوتی ہیں۔

اوائل عمر میں زنانخانے اور پردے میں پرورش اور تربیت پانے کی وجہ سے پردہ دار مردوں میں پردہ نشین عورتوں کی طرح خلوت پسندی، علیحدگی پسندی، فرار گزینی، کاہلی اور لاپرواہی اور پہل اور پیش قدمی سے خوف اور اجتناب، عدم مہم جوئی اور عدم اعتمادی کے رجحانات اور عادات پیدا ہو جاتی ہیں، جو بالغ عمر میں پردے اور زنانخانے سے باہر رہنے کے باوجود نہیں مٹتی ہیں۔ اس کی وجہ نہ صرف زنانخانے اور عورتوں کے سنڈروم کے اثرات ہیں جو ان کو ساری عمر متاثر کرتے رہتے ہیں، بلکہ پردہ سوسائٹی کی ذات پات اور قبائلی گروہی زندگی کی علیحدگیاں اور عدم اشتراک اور باہمی تنازعوں، نفرتوں، تعصبات اور تکبر اور نخوت کے جذبات اور رجحانات ہیں۔ یہ اثرات مسلمانوں

کو ہمیشہ چھوٹے چھوٹے گروہوں اور خاندانوں کی محدود مگر مانوس دنیا کے اندر رہنے پر مائل کر دیتے ہیں، جس سے باہر دیکھنے اور تعلقات رکھنے کی جانب وہ جلد تیار نہیں ہوتے، خواہ وہ اُن کا محلہ، گاؤں، شہر یا ملک ہی ہو، کیونکہ اُن کے دل و دماغ پر اپنی مائیکرو سوشل دنیا کے تعصب، خوف اور عداوتوں کے جذبات اور خیالات اس قدر چھائے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ہمسایوں، ہم مذہبوں اور ہموطنوں کو بھی خوف اور خدشے، نفرت اور تعصب اور شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ قبائلی اور نیم قبائلی علاقوں اور دیہات میں تو یہ خوف اور خدشے اور شک اور شبہے اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ لوگ اپنے گھروں اور قرابتدار محلوں کے ارگرد اونچی اونچی دیواریں اور برجیاں بنا کر رہتے ہیں۔ غیر قبائلی دیہات اور علاقوں اور شہروں اور قصبوں میں بھی بعض اوقات ایسی حفاظتی دیواریں اور تدابیر اختیار کی جاتی ہیں[۱]۔
ان مائیکرو سوشل حالات، جذبات اور عادات نے مسلمانوں کے ذہن و کردار کی تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ اول تو یہ خارجی دیواریں اُن کے ذہن و کردار کی داخلی دیواریں بن گئی ہیں۔ ہر شخص اپنی ذہنی نفرتوں، تعصبات اور جذبات کی دیواروں میں بند رہتا ہے اور غیر شخص سے جو اس کا رشتہ دار، قرابتدار دوست یا عزیز یا واقف کار ہی کیوں نہ ہو، ملنے ملانے کو تیار نہیں ہوتا، بلکہ اپنی خاندانی یا قرابتداری برتری اور تعصبات کے باعث میل جول سے احتراز کرتا ہے۔ اسی لئے ہم لوگ ریستوراں یا قہوہ خانوں میں تو جمع ہو جاتے ہیں، جہاں دیکھے بھالے اور مانوس شکلوں کے لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے، مگر ایسی انجمنوں اور

---

[۱] ہم نے باب سوم میں بتایا ہے کہ قرون وسطیٰ میں ایسی حفاظتی دیواریں ہر گھر اور محلے کے اردگرد ہوتی تھیں جو پردہ اور قرابتداری گروہوں کے خوف اور خدشوں کا لازمی نتیجہ تھیں۔ زمانہ جدید میں حکومت کے قوانین، مضبوط انتظامیہ نے کم از کم شہروں اور قصبوں میں قرون وسطائی دیواروں اور فصیلوں کی ضرورت تو ختم کر دی۔ مگر دیہات میں عموماً اور قبائلی علاقوں میں خصوصاً جدید قانون اور انتظامیہ کا ہاتھ ابھی نہیں پہنچا۔

اجتماعات سے احتراز کرتے ہیں۔ جہاں ہر روز نئے نئے لوگوں سے واسطہ پڑے اسی وجہ سے ہمارے ملک میں ایسی انجمنوں، اداروں اور اجتماعات کا رواج بھی بہت کم ہے سوائے ان کے جو زیادہ تر سرکاری سرپرستی میں قائم ہوتے ہیں۔

مگر ان غیر معاشری عادات اور رجحانات کی بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ مسلمان عورتیں اور مرد نئی نئی باتوں، نئے نئے خیالات، نئے نئے طریقوں، نئے نئے ہنروں اور نئے نئے کاموں اور نئے نئے نظریات کو سیکھنے اور حاصل کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ چونکہ غیر مانوس لوگوں اور طور و طریقوں سے خوف اور احتراز کرتے ہیں، اس لئے نئے طرزِ فکر، نئی طرز زندگی اور نئی صلاحیتوں اور قوتوں کو حاصل کرنے پر مائل نہیں ہوتے، جو پردہ مائیکرو سوسائٹی کے غیر ارتباطی ماحول کی لازمی اور ناگزیر غیر تکمیلی سمت بندی کا نتیجہ ہے۔ یہ غیر تکمیلی رجحانات اور سمت بندی مسلمانوں کو پردہ سوسائٹی میں جمائے (embedded) رکھتی ہے۔

پردہ سنڈروم متضاد رجحانات اور عادات پر مشتمل ہوتا ہے۔ خاندانی اور قرابتداری نفرتوں اور تعصبات کے ساتھ اس میں خود غرضی، لالچ اور لوٹ کھسوٹ کے رجحانات بھی پائے جاتے ہیں، کیوں کہ کوئی شخص، خاص طور پر با اثر اور بارسوخ شخص محنت و مشقت اور کام اور تکمیل سے تو روپیہ کمانا اور آمدنی حاصل کرنے کو تو تیار نہیں ہوتا بلکہ اپنے قرابتداری گروہ اور خاندان یا دوست و احباب کی مدد سے مال و دولت جمع کرنے پر آمادہ رہتا ہے۔ اس غیر تکمیلی رجحان کے نتائج ملک و معاشرے میں ہر طرف لا اصولیت یا انومی پھیلا دیتے ہیں۔

قرابتداری گروہوں اور ایلیت کی خلاف تکمیلی طرز زندگی

پاکستان جیسے پردہ دار ملک میں گاؤں، قصبوں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں پردہ دار روایتی معاشرہ زر، زن، مال اور مویشی اور زمینوں کے لئے لوٹ کھسوٹ سے بھرا ہوا ہے۔ ان میں لوگ ہمیشہ اپنے قریب اور دور کے لوگوں، ہمسایوں اور اجنبیوں کے مال و دولت، زمینیں اور جائیداد

کو لوٹنے اور غصب کرنے اور عورتوں، بچوں اور مردوں کی پکڑ دھکڑ میں مصروف
رہتے ہیں یا اپنے دشمنوں اور مخالفوں کی لوٹ کھسوٹ سے بچنے اور مزاحمت
کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ ان حالات میں قرابتداری گروہوں اور ان کے لیڈروں
کی دست برد اور لوٹ کھسوٹ سے بچنے کا واحد طریقہ ایسے قرابتداری گروہ بندی
ہے جو اپنے خاندان کے رشتہ داروں، قرابتداروں، دوستوں اور حلیفوں کی مدد
اور تعاون سے منظم کی جائے۔ اس طرح قرابتداری معاشرے میں گروہ بندی کا
جواب گروہ بندی ہے۔ یہ گروہ بندیاں جنہیں مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے
مثلاً ٹولے، جتھے یا آجکل عموماً "پارٹیاں" چار قسم کے "تعلقات"، مفادات اور روابط
پر قائم ہوتی ہیں: اول، خاندانی اور قرابتی رشتوں اور مفادات، دوم: خاطر مدارات
تحفے تحائف اور مہمان نوازی کے طور و طریقے، سوم: استحصال براہ راست اور
بالواسطہ کے لئے باہمی امداد اور تعاون اور چہارم، مزید استحصال کی توقعات
عزائم اور منصوبے۔

خاندانی اور قرابتی رشتے اور مفادات سب قرابتداری گروہوں کی بنیاد
ہوتے ہیں۔ ان کی ابتدائی صورت خاندانی گروہ ہے۔ یہ گروہ قدرتی گروہ ہے
جو عمل تناسل سے وجود میں آتا ہے اور بڑھتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں
نفاق و انشقاق بھی پیدا ہو جاتا ہے، جسے سربراہ کی قیادت اور مردوں کے مشترکہ مفادات
سے روک کر اتفاق اور اتحاد قائم رکھا جاتا ہے۔ مزید برآں اس ابتدائی قرابتی گروہ کو منظم
اور فاعل رکھنے کے لئے خاندان کی عورتوں اور لڑکیوں کو سخت پابندیوں اور کنٹرول میں
رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ خاندان کے قرابتداری مفادات اور تعلقات کے
حصول میں کام آسکیں۔ اس لئے انہیں اپنی رضا و رغبت کی کوئی آزادی یا حق حاصل
نہیں ہوتا اس مقصد کے لئے پردہ اور تعدد ازدواجگی کے ادارے بہت مفید اور
ضروری رسم و رواج ثابت ہوتے ہیں۔ مسلم مائیکرو سوسائٹی میں ان اداروں اور ان کی
آئیڈیالوجی کے اثر و نفوذ کی یہ بنیادی وجہ ہے۔

دوسری قسم کے رسم و رواج اور طور و طریقے خاندانی گروہ کی نسبت وسیع تر گروہ بندیوں کے لئے ضروری ہیں، کئی خاندانوں اور افراد کو، جن میں خون اور پیدائش کے رشتے کمزور ہو چکے ہیں یا سرے سے موجود ہی نہ ہوں، ایک گروہ بندی میں منسلک اور منظم کرنے کے لئے ان کے ارکان اور خاص طور پر ان کے سربراہوں اور لیڈروں کی خوشنودی اور دلجوئی ضروری ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے قرابتداری سربراہوں اور لیڈروں کے مشترکہ مفادات اور لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ کے مشترکہ استحصال کے طریقوں، منصوبوں اور عزائم کے علاوہ روزمرہ کی خاطر تواضع اور مہمان نوازی کی بھی ضرورت پڑتی ہے جس کی قرابتداری معاشرے میں بیحد قدر و منزلت ہے بلکہ مہمان نوازی اور خاطر تواضع کو قرابتداری معاشرے کی نہایت اہم تمدنی قدر تصور کیا جاتا ہے جو اس معاشرے کی کلچر کا طرہ امتیاز خیال کیا جاتا ہے۔ مگر یہ حقیقتاً بدترین خلاف تکمیلی ذرائع اور طور و طریقوں کا خوشنما نام ہے۔ ان طور و طریقوں میں شادی اور غمی کی رسومات اور تقریبات بھی شامل ہیں۔

شادی اور غمی کی رسومات اور تقریبات

ہر دہ سوسائٹی میں مسلمانوں کی خاندانی گروہ کی تنظیم تکمیلی کاموں، فرائض اور مقاصد کے لئے نہیں بلکہ قرابتدارانہ مقاصد اور مفادات کے حصول کے لئے ہوتی ہے لہٰذا خاندانی زندگی شادی اور غمی کی رسومات کی ادائیگی کے اردگرد گھومتی ہے۔ ہر ایک خاندان اور کنبے کے سب افراد، مرد اور عورتیں، بڑے اور چھوٹے، نوجوان اور بزرگ ساری عمر ان رسومات اور تقریبات کے چکر میں رہتے ہیں۔ ان میں شادی بیاہ اور پیدائش اور موت یا مرگ کی رسومات، تقریبات اور برسیوں وغیرہ کے علاوہ، ختنے اور دوسری قسم کی رسومات اور تقریبات بھی شامل ہیں، جن کا سلسلہ سارے سال جاری رہتا ہے۔ ان موقعوں پر خاندان کے نزدیک اور دور پار کے رشتہ دار اور قرابتدار اور دوست واحباب جمع ہوتے ہیں، اور ہر طرح کی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔[1] لہٰذا گھروں اور کنبوں کے زنانہ

---

[1] فریڈرک بارتھ لکھتا ہے: پیدائش، ختنے، شادی بیاہ اور مرگ کی رسومات اور برسیاں قرابتداری سسٹم کی خاص

اور مردانہ حصوں میں تقریباً ہر روز رشتہ داروں، قرابتداروں، عزیز و اقارب اور دوست واحباب کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کوئی رشتہ دار، کوئی ہمسایہ اور کوئی دوست جس وقت چاہے آٹپکتا ہے اور پھر جتنی دیر اور عرصہ چاہے ٹھہر سکتا ہے۔ بعض رشتہ دار اور قرابتدار تو ایک مرتبہ آکر کئی کئی روز، بلکہ کئی کئی ہفتے واپس جانے کا نام نہیں لیتے۔ لہٰذا گھر کے اندر عورتوں اور بچوں کا اور گھر سے باہر مردوں اور بزرگوں کی آمدورفت کا شور و غوغا برپا رہتا ہے۔ اگر مشترکہ خاندان ہو، تو اس شور و شغب میں چڑچڑا گھر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر قرابتداری محلہ ہو، تو ایسے موقعوں پر ہر طرح کے اضطراب اور ہیجان کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ ہیجان قرابتداری جھگڑوں اور تنازعوں کا شاخسانہ بھی ہوتا ہے۔ ایسے واقعات شادی بیاہ کی بارات اور جہیز اور موت کی تقریبات میں ترکہ یا وراثت کی تقسیم کے موقعوں پر اکثر پیش آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان رسومات اور تقریبات اور خاطر تواضع اور مہمان داری میں اور ان کے پیدا کردہ ہیجانات اور لڑائیوں جھگڑوں کے ماحول میں خاندان کے کسی فرد اور رکن کے لئے روایتی کاموں اور فرائض کے علاوہ کسی نئے کام، مقصد یا نصب العین کے حصول اور تکمیل کے لئے نہ تو وقت اور مہلت نصیب ہوتی ہے، نہ کوئی ترغیب اور تمنا پیدا ہوتی ہے، نہ ہی ماحول اور فضا سازگار ہوتی ہے، نہ ہی کسی کو نئے کاموں، مقاصد اور فرائض اور ذمہ داری کا احساس اور فکر باقی رہتا ہے اور نہ ہی کسی کو بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا خیال رہتا ہے۔

مہمانداری کی توقعات اور اغراض و مقاصد

شادی اور غمی کی رسومات کے علاوہ قرابتداری معاشرے میں مہمانداری کے طور و طریقوں کو خاندانی گروہ سے وسیع تر گروہ بندی کے لئے بنیادی

تقریبات ہوتی ہیں، جو اس معاشرے کی گھریلو زندگی میں ایک اہم واقعہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن میں باپ اور ماں کی طرف کے رشتہ دار اور قرابتدار بڑے اہتمام سے شرکت کرتے ہیں

"سوات پٹھانوں میں سیاسی قیادت" ص ۳۳۔

اہمیت حاصل ہے۔ ہر وہ شخص جو خاندانی گروہ کا رکن نہیں، مہمان کہلاتا ہے۔ وہ عموماً دوسرے قرابتداری گروہ کا رکن یا حلیف یا حمایتی ہوتا ہے (بعض اوقات کوئی اجنبی بھی مہمان بن جاتا ہے جب خاندانی گروہ کا سربراہ یا رکن اس کا دوست ہو یا وہ ساتھی یا گروہ کا دوست ہو یا ایسا افسر ہو جو علاقے کے دورے پر آیا ہو یا وہاں معمور ہو) ایسے اشخاص کی مہمان نوازی اور خاطر مدارات مہمان اور میزبان میں گہرے مراسم قائم کرتی ہے اور احترام اور باہمی تعاون اور خدمت گزاری کی توقعات پیدا کرتی ہے۔ ان توقعات کو "تعلق" کہتے ہیں، زمانہ جدیدہ میں اجنبی یا افسر کے ساتھ ایسے "تعلقات" کو جدید قرابتداری معاشرے میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے، جس کا تجزیہ ہم بعد میں کریں گے۔ بہر حال، ایسی خاطر مدارات ضیافتوں اور مہمانداری کا بڑا مقصد اور فائدہ گروہ سازی ہے، کیونکہ جو لوگ کسی سردار یا سربراہ کے دسترخوان پر کھانا کھا لیں، تو وہ اس کے حلیف اور ساتھی تصور ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح اُن میں باہمی تعاون اور باہمی انحصار کے تعلقات استوار ہو سکتے ہیں۔ اگر خاطر مدارات ہم پلہ طرفین کی جانب سے باہمدگر ہو، تو دونوں میں برابری کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر صرف ایک جانب سے ہی ہو، تو کھانے والا، کھلانے والا سردار یا سربراہ کا حمایتی اور دست نگر تصور ہوتا ہے اور اس کے کنٹرول میں آجاتا ہے۔ اس طرح یہ طریقہ ایسی گروہ بندی میں کنٹرول اور ڈسپلن پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مگر اس کو عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ نئے گروہ کے سربراہ اور دوسرے ارکان اپنی اپنی جائیداد، روپے پیسے اور زمینوں پر بھی سخت کنٹرول رکھیں، مبادا اُن کے نئے ساتھی اور حلیف ان کو خرد برد کرنے یا لوٹ کھسوٹ کی چالیں اور سازشیں شروع نہ کریں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ نئے ساتھیوں اور حلیفوں سے روابط مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لئے اپنے خاندان کی عورتوں اور لواحقین کی شادیاں اُن کے سرداروں یا دوسرے افراد سے کر دی جائیں یا بٹا سٹا کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ، گروہ بندی کو قائم

دوائم رکھنے کے لئے ضرورت مند سردار یا گروہ کو دوسروں کو ہر موقع پر تحفے تحائف نذرانے اور روپے پیسے بھی دینے پڑتے ہیں جن کا سلسلہ جانبین میں متواتر جاری رہتا ہے۔ بہرحال مہمان نوازی، تحفے تحائف شادی اور بٹا سٹا وغیرہ گروہ بندی کے ضروری لوازمات اور قرابتداری معاشرے کے استحصال کے لازمی طریقے ہیں۔ مگر ان کی خلاف تکمیلی نوعیت اور نتائج بھی واضح ہیں۔ ان کے باعث مسلمانوں کے ایلیت گروہوں اور طبقوں میں نام و نمود، نمائش اور ظاہر داری کی عادات کے علاوہ زمینوں اور جانبدار کی لوٹ کھسوٹ اور بربادی ہوتی ہے۔ ان گروہوں اور لیڈروں کو اپنی زمینوں اور جائیداد کو ترقی دینے کا خیال تک نہیں آتا، بلکہ نچلے طبقوں کے استحصال اور لوٹ کھسوٹ سے جو حاصل ہوتا ہے وہ اپنی معاشری حیثیت اور گروہی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے خاطر مدارات اور تعلقات قائم رکھنے پر صرف اور ضائع کر دیا جاتا ہے۔

قرابتداری معاشرے میں اتفاق و انشقاق کے عوامل

قرابتداری گروہوں اور گروہ بندیوں میں خاطر مدارات کے علاوہ جھگڑے، رنجشیں، رقابتیں، تنازعے اور لڑائیاں بھی برپا ہوتی رہتی ہیں، جو ان میں انشقاق اور انتشار کا باعث بنتی ہیں اور گروہوں کے تعلقات اور مفادات میں تبدیلیاں پیدا کرتی اور نئی گروہ بندیوں اور گٹھ جوڑ کا باعث ہوتی ہیں۔ ان رجحانات کے مدنظر، گروہوں اور سرداروں کے لئے باہمی تعلقات، امداد اور تعاون کی ضرورت درپیش آتی ہے تاکہ پرانے گروہوں کو قائم رکھا جائے اور مضبوط بنایا جائے یا نئے گروہ قائم کئے جائیں۔ قرابتداری معاشرے میں گروہی انتشار انگیزی اتنی عام اور آسان چیز ہے کہ خاندانی گروہ بھی جلد یا بدیر اس کا شکار ہو جاتا ہے، خاص طور پر خاندانی سربراہ کی موت کے بعد، جب جائیداد اور ترکہ کی تقسیم کا وقت آتا ہے۔ اس وقت کزن خاص طور پر چچیرے بھائی ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات تو بھائی بھائی

سے لڑ پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردانے ڈیرے، حجرے، بیٹھک، چوپال وغیرہ گروہی مخالفتوں، دشمنیوں اور جھگڑوں کی پرورش گاہ اور مرکز ہوتے ہیں۔ ان میں ہر وقت جوڑ توڑ، ریشہ دوانی، ساز باز، جتھا بندی، دشمنداری اور ہر طرح کی کھینچا تانی کا ماحول اور فضا طاری رہتی ہے۔ غرضیکہ ہمارا اقرابتداری معاشرہ ہر وقت اتفاق و انشقاق کے متضاد عوامل کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ اتفاق و انشقاق کے محرکات اور جذبات کو عزت اور شرم کا نام دیا جاتا ہے۔ عزت سے مراد خاندانی اور گروہی سربراہ اور دوسرے اراکین کی معاشری حیثیت، احترام، اثر و رسوخ اور رعب اور دبدبے کے جذبات اور تعصبات ہے جن سے سربراہی اور گروہی مفادات اور تعلقات برقرار رکھے جاتے ہیں۔ اور ایسے رویوں، حرکات و سکنات، زور و جبر اور غم و غصّے کے جذبات کے اظہار کو شرم کہتے ہیں جو گروہی یا سربراہی مفادات اور تعلقات، معاشری حیثیت یا مقام اور تعصبات کو حقیقتاً یا احتمالاً زک پہنچے، یا ان کو برقرار رکھنے کے لئے خطرہ یا مزاحمت پیدا ہو جائے۔ بہرکیف اتفاق و انشقاق، اتحاد اور انتشار کے تمام گروہی عوامل مسلم معاشرے کو مائیکرو سوشل انحطاط اور انتشار کا شکار بناتے ہیں، جو اس میں قومی یا ماکرو سوشل شعور اور اتحاد پیدا ہونے نہیں دیتے ہیں۔

گروہی اتفاق و انشقاق کے مائیکرو سوشل نتائج

اس کی بنیادی وجہ پردہ اور تعدد ازدواجگی ہے۔ یہ ادارے مسلمانوں کے معاشرے کے ہر طبقے اور ہر گروہ کو دوسرے سے الگ تھلگ رکھتے ہیں اور اُن کے معاشری میل ملاپ، اشتراکِ عمل اور باہمی شرکتِ کار کے مانع ہیں، اُن میں علیحدگی پسندی کے جذبات اور رجحانات کو شدید کرتے ہیں اور منافرت اور تعصب کی دیواریں حائل کر دیتے ہیں، جو ہر گروہ کو زن، زر اور زمین کے مفاد اور مقاصد کے حصول کے لئے دوسروں سے برسرپیکار کرتی ہیں۔ ان گروہی جھگڑوں اور تنازعوں اور جھگڑوں میں وہ زنانخانے کی چار دیواری میں محفوظ و مامون بھی ہوں،

جو ضروری نہیں، تب بھی عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کیا جاتا ہے، یا مار دیا جاتا ہے
یا ہارے ہوئے اور کمزور گروہ کی عورتیں بعض اوقات طاقتور اور بااثر گروہ کے قبضے
میں چلی جاتی ہیں اگر وہ اس سے بھی بچ جائیں، تو گروہوں میں امن چین ہونے کے
بعد اکثر صلح صفائی اور نئی گروہ بندی اور اتحاد کے نتیجہ میں گروہوں کے سردار اور
دوسرے سرکردہ رکان دوسرے گروہ کی عورتوں سے شادی یا بٹا سٹا کر لیتے ہیں۔
اس طرح کچھ عورتیں اپنے مخالف اور دشمن گروہوں یا خاندانوں میں بیاہ یا اغوا کر کے
چلی جاتی ہیں، جہاں اُن کے ساتھ عموماً اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی
بدنصیب عورتوں کے ہاں جو اولاد ہوتی ہے وہ ایسے نامساعد ماحول اور حالات
میں پرورش پاتی ہے جو ان کے دلوں میں خوف اور نفرت، دشمنی اور مخاصمت کے
بیج بو دیتے ہیں۔ اس طرح گروہی دشمنی اور منافرت نئی اور نوخیز نسلوں میں سرایت
کر جاتی ہے۔

- قرابتداری معاشرے میں گروہی تنازعوں، جھگڑوں اور لوٹ مار کا اثر
نوخیز نسلوں اور نوجوانوں پر براہ راست بھی پڑتا ہے۔ وہ بچپن ہی سے گروہی
عداوتوں، مخاصمتوں، تعصبات اور نفرتوں کے ماحول میں پلتے ہیں۔ لہٰذا وہ روز
اول ہی سے اُن کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں۔ طاقتور اور بارسوخ خاندانوں اور
گروہوں کے بچوں اور نوجوانوں میں تو زور و جبر، رعب اور زیادتی، اور تکبر و نخوت
کی عادات پڑ جاتی ہیں، جبکہ کمزور اور بے اثر و رسوخ والے خاندانوں اور گروہوں
کے نوجوانوں میں خوف اور خوشامد، مکر و فریب اور حیلہ سازی کی عادات اور رجحانات
اور رویے راسخ ہو جاتے ہیں، تاکہ طاقتور سے بچ سکیں۔ مگر ہر دو گروہ اپنے نوجوانوں
کو اپنے سے کمزور کو دبانے اور ظلم و زیادتی کرنے کی عادات ڈال دیتے ہیں۔ اسطرح
نوخیز نسلوں کو بدلہ لینے، مار دھاڑ، جوڑ توڑ، اور دھونس اور دھاندلی کرنے کا سبق پہلے
دن ہی سے ملتا ہے۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے اور بالغ ہونے کے بعد وہ ان طور
وطریقوں کے علاوہ کوئی تخلیقی کام اور شوق، مثلاً علم و ہنر یا فن سیکھنے کی طرف راغب

نہیں ہوتے بلکہ ساری عمر اپنے بزرگوں کی طرح خاندانی اور گروہی جھگڑوں اور تنازعوں میں گزار دیتے ہیں۔ ایسے خلاف تکمیلی اثرات پاکستان کے ان گھرانوں اور خاندانوں میں زیادہ شدید اور مستقل ثابت ہوتے ہیں جو اُن علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں جہاں تعدد ازدواجگی کا رواج اور پردہ سسٹم کی پابندی زیادہ سخت ہوتی ہے اور قرابتدارانہ گروہوں کے تنازعے اور جنگ و جدال زیادہ عام ہوتے۔ یہ علاقے قبائلی اور نیم قبائلی اور جاگیردارانہ معاشرے کے علاقے ہوتے ہیں۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ وہ لڑکے اور نوجوان جو ان علاقوں سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آتے ہیں ان کا تعلیمی تکمیلات دوسرے علاقوں کے طالب علموں کی نسبت بہت پست اور خراب ثابت ہوتی ہیں اپنی قدرتی ذہانت اور فراست کے باوجود وہ تحصیل علم میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور امتحانات میں مقابلتاً زیادہ تعداد میں فیل ہوتے ہیں۔ یہی افسوسناک صورتحال ان کی بھی ہوتی ہے جو کسی اور شعبہ حیات، مثلاً سرکاری ملازمت یا نجی کاروبار میں چلے جاتے ہیں۔ الغرض پردہ سوسائٹی کی نئی نسلیں خواہ وہ سخت پردہ دار یا کم پردہ دار ماحول سے آئیں، قرابتدارانہ تعلقات، مفادات اور تعصبات میں ایسی جکڑی ہوتی ہیں کہ اپنے قرابتدارانہ طرز زندگی اور مقاصد کے علاوہ ان کے ذہن و کردار کی سب تکمیلی صلاحیتیں اور توتیں ماؤف اور مفقود ہو جاتی ہیں۔ مگر انکی تکمیلی پس ماندگی اور نااہلیت دراصل ایک قومی سانحہ ہے، کیونکہ اس علمی، فکری اقتصادی اور تمدنی پسماندگی سے ملک و معاشرے میں تکمیلی خلا پیدا ہوتا اور تقلیل تکمیل کا عمل شروع ہو جاتا ہے جو قوم و معاشرے میں انحطاط اور انتشار کا براہ راست سبب بن جاتا ہے۔

قرابتداری گروہوں کا استحصالی نظام حیات

قرابتداری گروہوں کے تعلقات قبائلی لوٹ مار اور جاگیردارانہ لوٹ کھسوٹ کی توقعات پر قائم ہوتے ہیں۔ ان توقعات کی بنا پر ہر گروہ اور اس کا سربراہ اپنے ساتھیوں اور حامیوں کو جمع کرتا اور منظم کرتا ہے۔ دراصل جو سربراہ جتنا زیادہ ایسی توقعات پیدا کرتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کا گروہ بڑا اور مضبوط اور

اس کے ساتھی اور حمایتی وفادار ثابت ہوتے ہیں اور اتنا ہی زیادہ علاقے میں اس کا اثر ورسوخ اور دبدبہ بڑھتا اور پھیلتا ہے اور اس کا گروہ اتنی ہی زیادہ لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ کر سکتا ہے، اور اس کے ارکان اور سربراہ اور دوسرے لیڈر اتنا ہی زیادہ زر، زن اور زمین پر قبضہ مخالفانہ کر سکتے ہیں اور اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے مال و دولت کو اپنے قبضے اور تصرف میں لا سکتے ہیں اور ان کی عورتوں اور بال بچوں کی اتنی ہی زیادہ پکڑ دھکڑ کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ گرد و نواح کے دوسرے گروہ اتنے ہی زیادہ اس کے دشمن بن جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں گروہی جنگ و جدال اور افراتفری اتنی ہی زیادہ شدید اور خونریز ہو جاتی ہے۔ قرون وسطیٰ کے مسلم معاشرے میں تو یہ علاقے حکومت کے ہاتھ سے نکل جاتے تھے اور قبائلی اور جاگیردارانہ باغیوں اور سرکشوں کے تسلط میں چلے جاتے تھے، مگر آجکل کے زمانے میں ایسی گروہی تنازعے اور جھگڑے جدید انتظامیہ اور قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں، جس سے بچنے کے لئے قرابتداری گروہوں کے سربراہ اور لیڈر اپنے مخصوص حربے استعمال کرتے ہیں، جن میں افسروں کی خاطر تواضع رشوت اور سفارش اور گروہی اثر و رسوخ اور رعب داب ڈالنے کے دوسرے ہتھکنڈے شامل ہیں۔ بہر حال جدید مسلم معاشرے میں قرابتدارانہ گروہوں اور سربراہوں کے ہاتھوں قانون کی تخریب کاری اور انتظامیہ کی بدعنوانی اور بگاڑ کی ابتدا ہوتی ہے جو ان کی مقامی جوڑ توڑ اور لوٹ کھسوٹ کی سیاست کو ملکی سیاست اور حکومت کی حدود تک پھیلا دیتی ہے اور سارے ملک و معاشرے کو اپنی بے اصولی پن اور لاقانونیت یا انومی کی لپیٹ میں لے لیتی ہے

مسلم مائیکرو سوسائٹی میں انومی یا لاقانونیت کا اثر و نفوذ

ہماری قرابتدارانہ سوسائٹی میں قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں اور متمول اور مقتدر ایلیٹ کی زندگی مفت خوری اور تساہل انگاری، بدعنوانی اور دھونس اور دھاندلی اور دوسروں کے کاموں میں روڑے اٹکانے اور رخنے ڈالنے

میں گزرتی ہے۔ وہ کمزوروں پر زور و جبر کرتے اور محنت کشوں اور تکمیل گروں کو دبانے اور کچلنے یا مخالفت کرنے میں زندگی گزارتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے معاشرے میں کاہل رہنے والا اور اپنا وقت رائیگاں گزارنے والا شخص جو زندگی کے کام اور فرائض محنت اور مشقت کو قابل نفرین تصور کرے مگر نام و نمود، فضول خرچی اور آؤ بھگت کا مشتاق ہو مثالی شخصیت تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد کوئی کام نہ کرنے اور گھر میں بیکار بیٹھنے اور آرام و عیش کرنا ہوتا ہے۔ وہ کبھی اپنی اہلیت اور اپنی صلاحیتوں اور طبعی استعداد کو بڑھانے کے لئے نئی نئی تیکنیک اور طریقوں نہیں سیکھتا تاکہ تکمیلی ذرائع سے اپنی آمدنی کو بڑھائے اور اپنی آسودگی اور خوشحالی میں اضافہ کرے بلکہ اپنی آمدنی اور دولت بڑھانے کے لئے بدعنوانی اور قرابتدارانہ اثر و رسوخ کے غیر تکمیلی ذرائع استعمال کرنے پر تلا رہتا ہے جنہیں اقربا نوازی، دوست پروری اور جانبداری کے طریقے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُسے اس بات سے بھی بہت نفرت اور غصہ آتا ہے کہ کوئی دوسرا آدمی اپنی محنت و مشقت اور دیانتدارانہ کوشش اور جد و جہد سے دنیا میں نام پائے اور اس طرح اپنے علاقے محکمے یا کاروبار میں اس سے سبقت لے جائے۔ ایسا تکمیل گر مقامی طور پر مشہور اور بارسوخ افراد اور گروہوں کی نفرت اور غصے کا ہدف بن جاتا ہے جس کی تکمیلات اور شہرت کو تباہ و برباد کر کے ہی وہ چین سے بیٹھتے ہیں۔ اس صورت میں تکمیلی شخص اپنے حاسدوں اور مخالفوں کی سازشوں اور شرارتوں سے صرف ایک ہی طرح سے بچ سکتا ہے۔ وہ یہ کہ وہ کبھی اپنے قرابتی گروہ کا سہارا لے یا اپنے علاقے کے کسی طاقتور اور بااثر شخصیت یا گروہ کی مدد لے۔ لیکن یہ سہارا اور امداد اُسے تبھی ہی فراہم کی جاتی ہے جب وہ اپنے نئے طور و طریقے اور جدتیں ترک کر دے اور قرابتداری معاشرے کی پرانی روایتی ڈگر پر آ جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے نئے خیالات، نئے رویوں اور اپنی نئی عادات اور صلاحیتوں نئی طرز زندگی اور نئے طرز فکر کو چھوڑ کر پرانے رسم و رواج اور طور اور طریقے پھر اختیار کر لے۔ اس طرح وہ پھر قرابتدار معاشرے کے

دیرینہ عداوتوں، جھگڑوں اور تنازعوں میں شامل ہو کر قرابتداری خاطر مدارات کرنے، تحفے تحائف بانٹنے، چاپلوسی اور رشوت ستانی اور بارسوخ اور طاقتور افراد اور گروہوں کی خوشامد اور حاشیہ برداری کے پرانے روایتی طریقوں پر چلنے لگ جاتا ہے۔ درحقیقت قرابتداری معاشرے میں کسی شخص کا مقام، حیثیت اور رول اس کے کام، محنت، اہلیت اور تکمیل صلاحیتوں پر نہیں بلکہ اس کے خاندانی حیثیت، قرابتداری تعلقات اور ذات اور قبیلے پر منحصر ہوتا ہے۔

قرابتداری معاشرے میں انفرادی ترقی اور خوشحالی کو بڑھانے کے طریقے بھی غیر تکمیلی ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شخص اپنی آمدنی بڑھانے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے زیادہ محنت اور کوشش، بہتر کام اور کارکردگی کے طریقے اختیار کر کے نہیں بلکہ نمائشی فضول خرچی اور جاگیردارانہ اسراف اور نمود و نمائش کی طرز زندگی گزارتا ہے۔ ان میں عالیشان کوٹھیاں اور بنگلے بنوانا، شادی بیاہ اور جہیز وغیرہ پر بے جا فضول خرچیاں اور بڑی بڑی رقمیں ضائع کرنا اور خوشی اور غمی کی تقریبات اور رسم و رواج پر پانی کی طرح روپے پیسے بہانا اور اپنے مال و دولت کو ضائع کرنا سبھی شامل ہیں۔ شادی بیاہ اور دوسری قرابتدارانہ رسومات اور تقریبات پر سرکاری قوانین اور غیر سرکاری اصلاحی کوششوں کے باوجود (مثلاً جہیز وغیرہ کی رسم کے خلاف قانون اور کوششیں) پاکستانی مسلمانوں میں نام و نمود اور مسرفانہ فضول خرچیاں ایک بدی کا چکر بن گئی ہیں، کیونکہ ان رسومات اور تقریبات کی جڑیں ہمارے قرابتدارانہ اقدار اور معاشرے میں گڑی ہوئی ہیں۔ پس جب لوگ قرابتدارانہ زور و جبر اور دھونس اور دھاندلیوں سے کافی دولت جمع کر لیتے ہیں تو وہ اور زیادہ لوگوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں، اور غیر قانونی اور غیر تکمیلی کاموں کے لئے اور زیادہ تحفے تحائف تقسیم کرتے ہیں، اور زیادہ بدعنوانی اور رشوت ستانی کرتے ہیں اور زیادہ نوازشوں، عنایات اور پاسداری کے تقاضے اور توقعات رکھتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنی شان و شوکت کو بڑھاتے ہیں، اپنے اثر و رسوخ کو پھیلاتے

ہیں، اور سرکاری افسروں اور غیر سرکاری لوگوں، پبلک شخصیتوں اور پرائیویٹ آدمیوں میں اپنے خاندانی، قرابتداری اور دوستانہ تعلقات (کنکشنز) کے سلسلوں کو وسیع سے وسیع تر کرتے ہیں۔ اور پھر ان تعلقات (کنکشنوں) سے حاصل شدہ اثر و رسوخ کو اور زیادہ دولت جمع کرنے، تنخواہ بڑھانے، آمدنی اور غائبی آمدنی میں مزید اضافہ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر اقربا پروری، دوست نوازی اور قرابتداری کی بدعنوانیوں اور رشوت ستانیوں کا چکر کو وسیع تر انداز میں چلاتے ہیں۔ اگر ان بدعنوانیوں اور غیر قانونی باتوں اور طریقوں کی کوئی شخص ممانعت یا روک ٹوک کرے یا قانونی چارہ جوئی یا سزا دے تو وہ انہی طریقوں کو زیادہ سینہ زوری اور جور و جبر سے یا زیادہ رشوت ستانی اور بدعنوانیوں سے خفیہ طور پر یا کھلے بندوں استعمال کر کے اس شخص کی کوششوں کی مزاحمت کر کے انہیں یا اسے ختم کر دیتے ہیں۔ اگر اپنے علاقے میں اُن کا رعب داب قائم ہو تو وہ ان اصلاحی طریقوں کو اپنی شان و شوکت کے خلاف ہتک اور بے عزتی تصور کرتے ہیں اور انہیں اپنے قبائلی زور و جبر اور جاگیردارانہ ظلم و تشدد کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس بدی کے چکر میں رشتہ داری اور قرابتداری سے دولت حاصل ہوتی ہے، دولت سے اثر و رسوخ اور بدعنوانیوں اور رشوت و خیانتوں کے راہ کھلتی ہے، جن سے تعلقات اور اثر و رسوخ وسیع تر ہوتے ہیں، ان سے مزید دولت، شہرت، اعلیٰ حیثیت، بڑے بڑے عہدے اور رتبے حاصل ہوتے ہیں اور پھر ان سے اور زیادہ دولت جمع کی جاتی جس سے اس بدی کے چکر کو پھر وسیع تر پیمانوں پر شروع کیا جاتا ہے مگر اس سے قوم اور ملک معاشرے کی ترقی اور خوشحالی کو جو نقصانِ عظیم ہوتے ہیں ان کا خیال اور شعور ان قبائلی اور جاگیردارانہ گروہوں اور طبقوں کے ارکان اور سرداروں کے ذہن و فکر سے کوسوں دور رہتا ہے۔

قرابتدارانہ پردہ دار مسلم معاشرے میں اخلاقی اور معاشری اقدار کام، عمل اور تکمیل کے قطعی برعکس صورت میں ہوتی ہیں۔ اس میں دیانتداری، محنت و مشقت، تخلیقی

کام، اور فرض شناسی، خود اصلاح اور خود انحصاری کی عادات اور اوصاف کی کوئی قدر و منزلت نہیں، دیانتداری اور ایمانداری کا خیال محض اپنے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں تک محدود ہوتا ہے اور وہ بھی جب وہ ہوشیار اور چوکنے رہیں مگر جب کبھی لوگ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو بلا کسی خوف و احتمال کے دھوکا اور فریب دے سکتے ہیں تو اس سے دریغ نہیں کرتے۔ پردہ دار لوگ غیروں اور اجنبیوں کو جن سے خون اور دوستی وغیرہ کے کوئی رشتے نہ ہوں، دھوکا دینے اور ہر طرح کا فریب، بد دیانتی اور خیانت کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ بلکہ رشتہ داروں اور دوستوں سے بھی اس وقت تک مکر و فریب سے کام نہیں لیتے جب تک گرفت اور پکڑے جانے کا ڈر یا اندیشہ ہوتا ہے۔ پردہ دار مسلم معاشرے میں قانون اور نظم و نسق کو مسخ اور بے اثر بنایا جا سکتا ہے اور رائے عامہ کی آواز کو خاموش کیا جا سکتا ہے۔ اس اخلاقی اور معاشری گمراہی اور ضلالت کی حد یہ ہے کہ ہمارے ایلیت گروہ اور افراد محنت و مشقت سے حلال کی کمائی حاصل کرنے کو تو عار سمجھتے ہیں مگر رشوتیں لے اور دیگر اور بدعنوانیاں کر کے دولت جمع کرنے اور دوسروں کی حلال کی کمائی کو زور و جبر یا حیلے بہانے سے ہتھیانے میں کوئی شرم اور عار محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ اس بات پر فخر کرتے اور عزت تصور کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ہمسائے کے گاڑھے پسینہ کمائی لوٹ لی اور اس کی تکیملات کو تہس نہس کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے گھروں، ڈیروں اور حجروں، ڈرائینگ روموں یا قہوہ خانوں اور کیفے ہاؤسوں میں اور اپنے دوست و احباب کی محفلوں میں اپنے ان کارناموں کو بڑے فخر اور شان سے سناتے ہیں، اور بہت ڈھینگیں مارتے اور شیخی جتلاتے ہیں۔ مگر وہ اس بات پر کبھی فخر نہیں کرتے کہ وہ بھی اُن کی طرح محنت و مشقت کر کے کامیابیاں حاصل کریں۔ اخلاقی اور معاشری اقدار کی یہ ضلالت اور تضحیک ہمارے معاشرے کی مائیکرو سوشل وفاداریوں، وابستگیوں اور مفادات کا نتیجہ ہے جس کے باعث ہم میں پبلک سپرٹ، خدمت خلق، حب الوطنی، احساس دیگراں، دوسروں

کی محنت اور مشقت کے احترام، کام اور تکمیل کی قدر و منزلت جیسی عادات اور رویوں کا فقدان ہو گیا ہے، در اصل مسلمانوں کے ذہن و فکر ان ماگرو سوشل اقدار، احساسات اور رویوں سے بیگانہ ہو جاتے ہیں[1] ایسے ماحول میں جب ان کی بالغ نسلیں چالیس سال کی عمر سے تجاوز کرتی ہیں تو وہ اپنی کاہلی اور غیر تکمیلی زندگی کے باعث اداس نسلیں بن جاتی ہیں جو اپنے گھروں اور گروہوں میں ہر طرح کی نئی تکمیلات کی مخالفت کرتی ہیں۔

قرابتداری قائدین اور سرکاری انتظامیہ مقامی سیاست میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لئے اور اپنے اثر و رسوخ کو پھیلانے کے لئے قرابتداری گروہوں کے قائدین، خصوصاً مقابلتاً زیادہ امیر اور مقتدر یا جاہ پرست نوجوان قائدین اپنے علاقے ضلع یا صوبے کے سرکاری حکام اور منتظمین سے "تعلقات" (کنکشنز[2]) پیدا کرتے ہیں اور بالآخر ملکی سیاست اور حکومت پر چھا جانے

---

[1] مسلم معاشرے کی یہ اخلاقی زبوں حالی کوئی نئی بات نہیں۔ ہم نے پردہ سوسائٹی کی تاریخ کے باب میں اس امر کا تجزیہ کیا ہے: تاہم اس جگہ ہم آج سے ایک ہزار سال پہلے سلاطین غزنی کے دور انحطاط میں مسلمانوں کی جو حالت تھی وہ داتا گنج بخش کے الفاظ میں جو شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب "آب کوثر" میں منقول کئے ہیں یہاں درج کرتے ہیں:

"داتا گنج بخش اس زمانے کی نسبت جب دنیا کے سب سے بڑے بت شکن نے ابھی ابھی اپنا کام پورا کیا تھا لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

"خداوند بزرگ و بلند نے ہمیں اس زمانے میں پیدا کیا ہے جب لوگوں نے حرص و لالچ کا نام شریعت اور تکبر و جاہ و ریاست کی طلب کا نام عزت اور علم ریائے خلق کا نام خوف الٰہی اور دل میں کینہ پوشیدہ رکھنے کا نام حلم، لڑائی جھگڑے کا نام بحث مباحثہ، ہذیان طبع کا نام معرفت، نفسانی باتوں اور دل کی حرکتوں کا نام محبت، خدا کے رستے سے منحرف اور بے دین ہونے کا نام فقر، حق تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نام فنا فی اللہ اور ترک شریعت کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔" دیکھئے "آب کوثر" ص ۹۱ فیروز سنز لاہور ۱۹۵۲ء

[2] (connection) "کنکشن" قرابتداری ماگرو سوسائٹی کی دلچسپ اصطلاح ہے۔ اس کے کئی معنے ہیں اول اس کے معنے قرابتدارانہ

اور کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ حکومت کے قانون ساز اور پالیسی ساز اداروں اور مجالس کو اپنے مائیکرو سوشل مفادات اور مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا قدم سرکاری انتظامیہ اور حکومتی مشینری کو اپنے دائرۂ اثر میں لاتا ہے۔

تعلقات ہیں جو قریبی اور دور پار کے رشتہ داروں میں ہوتے ہیں اور ان کے توسل سے کسی بارسوخ شخص یا افسر سے تعلقات ہوتے ہیں جس سے اپنے حق میں کوئی فائدہ حکم یا فیصلہ وغیرہ حاصل کیا جا سکتا ہے مگر جو قانوناً ناجائز اور ناممکن ہو۔ اس طرح قرابتداری طرز معاشرت کو مقامی تعلقات سے آگے ملک اور قوم کے سیاسی اور حکومتی نظام تک بڑھایا جاتا ہے۔ قرابتداری تعلقات کی طرح یہ بھی ایک قسم کا سودا ہے یا لین دین ہے جو افسر یا بارسوخ شخص میں اور اس کنکشن کے متلاشی کے مابین قائم ہوتا ہے تاکہ افسر اپنے منصبی اختیارات یا اختیاری رائے سے تجاوز کر کے من مانی بے قاعدگی سے سائل یا متلاشی یا اس کے کسی عزیز یا دوست کے حق میں مطلوبہ فائدہ یا فیصلہ یا حکم دے دے۔ پہلی صورت میں "کنکشن" سے اقربا پروری اور دوسری صورت میں دوست پروری یا جانبداری مراد ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں سائل یا فائدے کے متلاشی افسر کو کوئی نقد رقم نہیں دیتا مگر مال یا جنس کی قسم کا تمتع پیش کر سکتا ہے یا پھر بعد میں کوئی رقم یا کوئی اور ٹھوس فائدہ پہنچا سکتا ہے یا افسر کو اپنے علاقے میں قرابتداری مدد یا سہارا بہم پہنچانے کی توقع پیدا کر دیتا ہے۔ یا پھر افسر کو اپنے کسی بارسوخ عزیز یا دوست سے "ادلے کے بدلے" کے اصول کے مطابق کوئی یکساں یا موزوں فائدہ پہنچانے کا وعدہ یا توقع پیدا کر دیتا ہے۔ بہرحال صورت کچھ بھی ہو "کنکشن" قرابتدارانہ تحفے تحائف کے لین دین کا طریقہ ہے جس سے قرابتداری تعلقات کا سلسلہ سرکاری اور غیر سرکاری دائروں تک بڑھایا جاتا ہے "کنکشن" کے دوسرے معنے وہ تحفہ، نذرانہ، بالائی آمدنی یا کوئی ادائیگی پیش کش یا رشوت ہے جو کوئی فائدے کا متلاشی کسی افسر یا بااختیار شخص کو پیش کرتا ہے تاکہ اس سے مطلوبہ فائدہ، حکم یا فیصلہ حاصل ہو جائے۔ یہ کنکشن براہ راست لین دین ہے اور خالص رشوت ستانی اور بدعنوانی کا معاملہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ متمول لوگ ہی ایسا "کنکشن" قائم کر سکتے ہیں درحقیقت یہ ایک طرح کی خفیہ نیلامی ہے۔ راشی افسر صرف اس شخص کی جانبداری کریگا جس نے رشوت کی بولی، سب سے بھاری رقم میں دی ہو جتنی بڑی یا بھاری رشوت اتنی ہی زیادہ بے قاعدگی اور غیر قانونی جانبداری

اپنے مقامی معاملات اور تنازعات میں افسروں اور حکام کی مدد حاصل کرنے کے وہی طریقے ہیں جو قرابتدارانہ معاملات میں استعمال کیے جاتے ہیں، یعنی مہمانداری، خاطر تواضع، تحفے تحائف، غیر قانونی دلجوئی یا مٹھی گرم کرنا، غائبی امداد رشوت، نذرانے وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام بدعنوانیوں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے

"گنکشن" کے تیسرے معنے وہ رسوخ ہے جو فائدے کا متلاشی یا سائل اپنے علاقے میں رکھتا ہے جس کی بنیاد پر وہ افسر کو اپنے علاقے میں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور جس کے بدلے وہ اس سے کوئی ناجائز فائدہ یا غیر قانونی حکم یا فیصلہ کا متمنی ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی تاخیر شدہ سودا بازی ہے اور صرف متمول اور بارسوخ لوگ ہی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ انگریز سامراجیوں نے اپنے دور حکومت میں اس قسم کے "گنکشنوں" سے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔ انگریز افسر جنوبی ایشیائی برصغیر میں قبائلی اور دوسرے قرابتداری گروہوں کے سرداروں جاگیرداروں اور سربراہوں سے ایسا گنکشن یا رابطہ پیدا کر لیتے تھے اور ان کو مختلف طور سے اپنے حاکمانہ اختیارات سے فائدے پہنچایا کرتے تھے جس کے بدلے میں یہ سردار انگریزی سامراجی اقتدار اور حکومت کو اپنے اپنے علاقوں، جاگیروں، نوابیوں، قبیلوں اور گروہوں میں مضبوط اور مستحکم کرنے میں مدد دیتے تھے۔ برصغیر کا ہی کیا ذکر، اس قسم کے "گنکشنوں" سے انگریز، روسی اور دوسرے مغربی سامراجیوں نے دنیائے اسلام کے تقریباً سب ملکوں، قوموں اور قبائل میں اپنا سامراجی اقتدار اور نوآبادیاتی استحصال جما لیا تھا۔

ظاہر ہے کہ "گنکشنوں" کا طریقہ اقربہ پروری اور دوست نوازی کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ یہ ذرائع قبائلی اور جاگیردارانہ ذات پات کے معاشرے کی گروہ بندی اور گروہ سازی کے لئے لازمی اور لابدی ذرائع ہوتے ہیں۔ لیکن زمانہ جدید میں بخاطر مدارات، مہمانداری اور تحفے تحائف وغیرہ کا لین دین قرابتداری معاشرے کی چھوٹی سی دنیا سے نکل کر حکومت اور سیاست کی وسیع دنیا پر پھیل گیا ہے اور اس طرح سارے ملک اور معاشرے میں اپنی لاقانونیت اور بے اصولی پن کو پھیلا دیتا ہے۔ اس معاشرتی مرض یا لومی کا مسلم معاشرہ قرون وسطیٰ میں بھی شکار تھا اور جہاں پر وہ اور تعدد ازدواجگی آج بھی رائج ہیں، وہاں آج بھی شکار ہے۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں "گنکشن" کو مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے، مثلاً پشاور کے علاقے میں اسے "جیک" بھی کہتے ہیں، جو موٹر گاڑیوں کو اوپر اٹھانے کے آلے کا نام ہے اور اس ضمن میں ایسے "تعلقات" کے لیے استعمال کیا گیا جن کی مدد سے افسرانہ اختیارات کا بھاری وزن اٹھا کر اپنے حق میں کوئی فائدہ یا فیصلہ حاصل کیا جائے۔

کہ اپنے تنازعے یا متعدمے یا کوئی اور فائدہ یا ملازمت وغیرہ حق و انصاف اور قانون کی بنیاد پہ حاصل نہ کی جائے، بلکہ اثر و رسوخ، رشوت یا تعلق (کنکشن) کی بنا پر حاصل ہو جائے۔ اس طرح سرکاری اور نیم سرکاری افسروں اور ملازمین کی بدعنوانیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جو بالآخر انتظامیہ اور حکومت کی ساری مشینری کو اوپر سے نیچے تک اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے مگران بدعنوانیاں قرابتداری معاشرے کی کاروائیوں اور طرز زندگی کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ان کے ذریعے قرابتداری گروہوں کے اہم، امیر یا بارسوخ لیڈروں کو انتظامیہ اور حکومت تک رسائی حاصل ہوتی، بلکہ وہ خود حکومت چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح سے قانون کا سرچشمہ مکدر کیا جاتا ہے، حق و انصاف کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور انتظامیہ اور حکومت کو بھی قرابتدارانہ بدعنوانیوں کا وسیلہ بنا لیا جاتا ہے، بہرکیف یہ طریقہ افسروں اور سرکاری ملازمین کو مال و دولت جمع کرنے "غائبی امداد" لینے اور جلد امیر بننے" کے مواقع فراہم کرتا ہے اور قرابتداری سرداروں اور سربراہوں کو اپنی زمینوں، مال و دولت زر و سیم کو بڑھانے میں مدد دیتا ہے جس سے ان کا اثر و رسوخ بڑھتا اور پھیلتا ہے اور انہیں حکومتی اور سیاسی دنیا میں بلند پروازی کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

پردہ سوسائٹی کی نومی کے قومی اور بین الاقوامی اثرات اور عواقب

پاکستان کے قیام نے برصغیری مسلمانوں کو نہ صرف برطانوی سامراجیت کے مائیکرو سوشل جمود سے نجات دلائی، بلکہ اپنی نئی مملکت میں ایک نئے ماکرو سوشل نظام حیات تعمیر کرنے کا عظیم اور لاثانی موقع بھی پیش کیا، تاکہ ہم اپنے معاشرے اور ملک کو پردہ اور تعدد ازواجگی کی تمام قرون وسطائی مائیکرو سوشل علیحدگیوں اور قرابتدارانہ انحطاط انتشار سے پاک کر کے ایک نئی، متحد، مضبوط، خوشحال اور جدید قوم، معاشرہ اور ملک بنا سکیں۔ بانی پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح کو مسلمانان پاکستان کے ان مسائل

اوران مائیکرو سوشل عوامل و عواقب کا پورا پورا علم تھا۔ چنانچہ پاکستان کی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی پہلی تقریر میں، جو انہوں نے ۱۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں کی، اس میں فرمایا :۔

"آپ سب اس طرح مل کر کام اور محنت کیجئے کہ آپ میں ہر ایک یکساں حقوق، مراعات اور فرائض کے ساتھ اس نئی مملکت کا اول اور آخر شہری ہو، خواہ اس کا تعلق کسی فرقے، ذات، رنگ اور مذہب سے ہو۔ میں اس ضرورت پر زیادہ زور نہیں دے سکتا، مگر ہمیں اس سپرٹ کے ساتھ کام شروع کر دینا چاہیئے اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ اکثریت اور اقلیت کی جماعتوں کی سب درشتیاں مٹ جائیں گی ..... آپ کا تعلق کسی مذہب، ذات یا فرقے سے ہو، اس سے نئی مملکت کو کوئی سروکار نہیں۔ ہم اپنی نئی مملکت کی ابتدا اس بنیادی اصول سے کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک مملکت کے شہری ہیں اور وہ بھی برابر کے شہری ..... میرے خیال میں اب ہمیں اس اصول کو اپنا نصب العین بنا لینا چاہیئے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ نہ ہندو، ہندو رہے گا اور نہ مسلمان، مسلمان، مذہبی معنوں میں نہیں کیونکہ مذہب ہر فرد کا شخصی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی معنوں میں، اس مملکت کے شہریوں کی حیثیت سے[۱]"

بابائے قوم نے ۲۱۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکے میں عوام کے سامنے ایک تقریر میں فرمایا :

"اب آپ ایک قوم ہیں۔ آپ نے ایک خطہ زمین اپنے لئے کاٹ لیا ہے، ایک وسیع خطہ۔ یہ آپ کا اپنا ہے۔ یہ کسی پنجابی، سندھی پٹھان یا بنگالی کا نہیں، یہ آپ سب کا ہے[۲]"

یہ پاکستان کا عظیم المیہ ہے کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے بابائے قوم کو ہماری

ــــــــــــــــــــــــ

[۱] Constituent Assembly of Pakistan Debates, Vol. I. No. 2. pp, 18-20

لوزائیدہ مملکت اور قوم کی راہنمائی سے اس قدر جلد محروم کر دیا۔ اس المیہ نے پاکستان میں اُن مائیکرو سوشل انحطاط و انتشار کے عوامل اور قوتوں کو برطانوی سامراجیت کے عائد کردہ جمود میں بدستور جاری رکھنے کے مواقع فراہم کر دیئے، جن کی تفصیل میں جانے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ وہ صاف عیاں ہیں۔ ہم یہاں پردہ سوسائٹی کی الزمی کے قومی اور بین الاقوامی اثرات اور عواقب کا تجزیہ کریں گے۔

پاکستانی قوم کے ماکروسوشل التزامات

قوم لوگوں کا ماکروسوشل گروہ ہوتا ہے جس میں تمام مائیکرو سوشل مفادات اور تعلقات کی گروہ بندیاں، علیحدگیاں، وفاداریاں اور وابستگیاں مٹ جاتی ہیں اور ان کی جگہ ساری قوم اور ملک کی ترقی، خوشحالی، فلاح و بہبود، اتحاد و استحکام، بقاو سلامتی کے ماکرو سوشل مفادات اور نظریات کو ہر فرد اور گروہ کی وفاداری اور وابستگی کا تقدم، تقدس اور غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ قومی زندگی کا نظام قومی کردار یعنی ماکرو سوشل عادات، رویوں، اقدار اور جذبات، مثلاً قانون کا احترام قانون کی پابندی اور تکمیلی عادات اور رویوں کی اولیت، وغیرہ پر قائم ہوتا ہے جن کا مقصد قومی زندگی میں پیداواری اور تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کا تسلسل اس طرح قائم کرنا ہوتا ہے کہ کوئی مائیکرو سوشل مفادات، تعلقات، وفاداریوں اور وابستگیوں کی گروہ بندیاں وجود میں نہ آ سکیں۔ بالفاظ دیگر، ہر شخص اور گروہ اپنی قوتوں صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق تکمیل کا عمل اس طرح جاری رکھے کہ کسی مفاد اور مقصد کی خاطر کوئی علیحدگی پسندانہ مائیکرو سوشل گروہ بندی، وفاداری اور وابستگی قائم نہ کرے جس سے وسیع تر قومی ترقی، خوشحالی، فلاح و بہبود اتحاد و استحکام کو نقصان پہنچے اور اس کی مجموعی سلامتی اور بقا معرض خطر میں پڑ جائے۔ انسانی زندگی میں ایسی مائیکرو سوشل گروہ بندیاں صرف دو صورتوں

میں پیدا ہوتی ہیں، اول، عمل تناسل سے اور دوم، عمل معاش کی وجہ سے۔ یہ دونوں عمل خاندانی اور قرابتداری گروہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے معاشرے میں اس گروہ بندی نے پردہ دار تعدد ازدواجی خاندانی نظام کی صورت اختیار کر لی ہے پردہ سوسائٹی کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں مردوں نے اپنی عورتوں کو تمام حقوق اور آزادی سے محروم کر کے اپنی مقبوضہ بنا کر اپنے رشتہ داروں، قرابتداروں، دوستوں اور حلیفوں کی ایسی چھوٹی چھوٹی گروہ بندیاں قائم کر لی ہیں جن کے مفادات اور مقاصد کے حصول میں وہ تمام وسیع تر معاشری مفادات اور مقاصد، قوانین اور قاعدوں اصولوں اور طریقوں کو قربان کر دیتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ہماری قوم کو برطانوی سامراجیت کی منجمد کردہ جاگیردارانہ اور قبائلی مائیکرو سوسائٹی میں تبدیل کرنے کے لئے جو مسائل درپیش ہوئے وہ مختصراً یہ ہیں۔

اوّل۔ پردہ اور کثرت ازدواج کو قانوناً منسوخ کر کے عورت کو مرد کے مساویانہ حقوق اور آزادی دینا اور اس غرض سے یک زوجگی اور طلاق کے مساویانہ حقوق کو قانوناً نافذ کرنا۔

دوم۔ قوم میں ماکرو سوشل طرز فکر اور طرز حیات کے فروغ کے لئے تعلیم اور جدید علوم و فنون کی تحقیق و تبلیغ کے لئے نئی تکمیلی قوتوں کو منظم کرنا۔

سوم: علماء اور دوسرے اہل علم کے غیر تکمیلی (جو خود تو کوئی تکمیل نہ حاصل کریں مگر صرف روایتی اور رواجی طریق، خیال اور پیداوار کی حمایت کریں) خلاف تکمیلی (جو دوسروں کی تکمیلات کی اس لئے مخالفت کریں کہ نئی تکمیلات ان کے اپنے خیالات، نظریات یا طرز زندگی کے خلاف ہوں) اور عدم تکمیلی (جو غیر اقوام کی تکمیلات سے غافل اور لاپرواہ ہوں اور اس وجہ سے ان تکمیلات کو اپنانے کی مخالفت کریں کہ ان کے خیال میں پاکستان ان تکمیلات کے لئے نہیں قائم ہوا) خیالات، نظریات، تصورات، فلسفوں اور عقائد کی تردید اور مخالفت میں نئے نظریات

تصورات، عقائد اور فلسفے کو فروغ دینا۔

چہارم: ملک میں آئین کے لحاظ سے مکمل اور کلی جمہوریت کا قیام جس میں (۱) بالغ رائے دہی کے حق پر حکومت کی تشکیل ہو اور (۲) آزادی رائے و خیال، آزادی تقریر، آزادی تحریر، آزادی اجتماع اور آزادی تنظیم ہر فرد کو حاصل ہوں۔

پنجم: سوشلزم کا نفاذ، سوشلزم ایسی تکمیلی ماکرو سوسائٹی قائم کرتا ہے جس میں کلی، ہمہ گیر، مساویانہ اور لامحدود تکمیلات کی راہیں کھلتی ہیں۔ سوشلزم ایسا نظام معاشرت و معیشت ہے جس میں ہر شخص کو، خواہ مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا غریب ادنیٰ ہو یا اعلیٰ پیداواری اور تخلیقی تکمیل گری کے مساویانہ حقوق اور مواقع ملیں کسی فرد کے لئے حسب و نسب جنس رنگ اور نسلیت، دولت، رتبہ، اثر و رسوخ خاندان، ذات پات یا قبیلہ، فرقہ اور مذہب مقام یا حیثیت وغیرہ کسی وجہ یا حالت میں بھی تکمیلیت کے دروازے نہ بند ہوں، اور نہ ہی کسی فرد کو کسی وجہ یا حالت میں غیر تکمیلی مفت خوری اور استحصالی زندگی گزارنے کا حق حاصل ہوتا ہو۔

قائد اعظم کے بے وقت انتقال سے ہمارے معاشرے اور قوم کی ماکرو سوشل تشکیل اور ترقی کے عمل کو سخت دھکا لگا اور ہمارے پر وہ دار قرابتدارانہ طرز زندگی کے روایتی مائیکرو سوشل گروہوں اور گروہ بندیوں کے رجحانات اور قوتوں کو پھر کھلی چھٹی مل گئی۔ اس طرح ہمارے نوزائیدہ ملک اور مملکت میں جاگیردارانہ اور قبائلی مائیکرو سوشل گروہوں کو پھر وہی اپنی روایتی چھینا جھپٹی اور لوٹ کھسوٹ کا موقع ہاتھ آگیا جو تحریک پاکستان کے ماکرو سوشل جذبے کے تحت دب گیا تھا جاگیردارانہ اور قبائلی ایلیت نے پہلے متروکہ جائیدادوں کے الاٹمنٹوں، پھر تجارتی پرمٹوں اور بعد میں امریکی اور دوسری غیر ملکی اقتصادی امداد کے لائسنسوں وغیرہ سے کنبہ پروری اور دوست نوازی کے طور و طریقوں کو بروئے کار لاکر جلد امیر بننے اور دولت جمع کرنی شروع کردی، جن کو ایوبی دور حکومت میں "اقتصادی ترقیات"

کا گمراہ کن نام دیا گیا۔ تاہم یہ سب کچھ بالآخر ۱۹۶۸ء کے ملک بھر کے عوامی احتجاج میں تہ و بالا ہوگیا۔ مگر اس ملکی احتجاج کی آڑ[1] لے کر پاکستان کے نئے اور پرانے سامراجی اور مہا سامراجی دشمنوں نے مشرقی پاکستان کا المیہ برپا کر دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس المیہ کے بعد باقیماندہ ملک میں نئی سیاسی قوتیں بیدار اور برسراقتدار آ گئی ہیں جنہیں ہماری مائیکرو سوسائٹی کی اندرونی کمزوریوں کا احساس اور ہماری قوم و ملک کو ماکرو سوشل بنانے کا علم و شعور ہے۔ اگر یہ نئی قوتیں اپنے انقلابی مقاصد اور نصب العین میں کامیاب ہو گئیں تو پاکستانی معاشرہ صحیح اور کلی طور پر ماکرو سوشل تکمیلی معاشرہ بن جائیگا اس کی شرط اول تمام غیر تکمیلی اور عدم تکمیلی مائیکرو سوشل تعلقات، نظریات (آئیڈیالوجی) اور رجحانات کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے کی ضرورت ہے، جو پاکستانی عورت کے پورے، مکمل اور مساویانہ حقوق اور آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔

پاکستان کا غیر تکمیلی سوشل سپکٹرم (Social Spectrum)

ہم یہاں جاگیرداری اور قبائلی گروہوں اور اُن کے سرداروں اور لیڈروں کی بدعنوانیوں اور ملک دشمن عزائم کے تجزئے کو ختم کرتے ہیں اور ان وجوہات پر غور کرتے ہیں کہ یہ تخریب کاریاں اور انتشار پسندیاں کیوں مسلم مائیکرو سوسائٹی میں واقع ہوتی ہیں؟ اس کی دو وجہ ہیں۔ اول، مسلم اہلیت گروہوں کا غیر تکمیلی ذہنی اور کرداری سنڈروم اور دوم مائیکرو سوشل انتشار اور انحطاط کے رجحانات اور اثرات ہیں جو پردہ سسٹم مسلم سوسائٹی میں پیدا کرتا ہے اور اسے اس قدر کمزور اور قابل انتشار بنا دیتا ہے بالفاظ دیگر یہ اثرات اور رجحانات پردہ دار مسلم معاشرے کی انومی کے نتائج ہیں۔

---

[1] اس "آڑ" کا تجزیہ ہم ذرا بعد میں کرینگے۔ یہاں اتنا ہی کہنا ضروری ہے کہ یہ طریقہ نئی اور پرانی سامراجیت اور مہا سامراجیت کی نئی تشکیل اور صورت ہے جو دنیائے انسانی کی مائیکرو سوسائٹیوں کے اپنے اندرونی خلفشار اور انتشار اور انحطاط کی بنا پر ان پر سامراجیوں اور مہا سامراجیوں کے اقتدار، غلبہ اور استحصال کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

پردہ سنڈروم کے عواقب

پہلے ہم غیر تکمیلی سنڈروم پر غور کریں گے۔ یہ سنڈروم ان غیر تکمیلی خرابیوں، کمزوریوں، عادات اور رویوں اور رجحانات کا گچھا ہے جو گھر اور گھر سے باہر پردہ ماحول کی کاہلی، مفت خوری اور لاپرواہی کی پیداوار ہے۔ اس سے مسلمانوں میں غیر تکمیلی کردار اور شخصیت پیدا ہو جاتی ہے، دراصل آرام طلب، تساہل پسند، روایتی پردہ دار معاشرے میں اس قسم کی شخصیت بہت پسندیدہ اور ہر دلعزیز متصور ہوتی ہے۔ روایت پسند مسلمانوں میں ایسے آدمی کو بہت ناپسند کیا جاتا ہے جو ہر وقت اور تادم حیات کام اور محنت، عمل اور تکمیل کے لئے کوشاں ہو اور زندگی کے کسی بھی شعبے، مثلاً روزی کمانے، علم و فن کی تحقیق، سائنسی ذوق و شوق یا تمدنی کامیابیوں کے لئے سرگرم عمل رہتا ہو۔ وہ نئے خیالات کو سوچنے، نئی چیزوں کو ایجاد اور نئے طریقوں کو اختیار کرنے کو بدعت گردانتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے معاشرے میں کام اور تکمیل کے معیار متواتر گرتے رہتے ہیں۔ ایک پاکستانی ماہر نفسیات، پروفیسر مغنی، پاکستانی قومی کردار کی غیر تکمیلی حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"راقم الحروف کو اس خیال کی تحریک دینے والی چیز اپنے طلبأ اور شرکائے کار کے تجربات اور دوسرے لوگوں سے رسمی اور غیر رسمی تعلقات اور خود اپنا ذہنی مشاہدات سے حاصل ہوئی ہے۔ یہ سب بتلاتے ہیں کہ پاکستانیوں میں من حیث القوم تکمیل کی ترغیب موثر اور قوی نہیں ہے۔ تکمیلی معاشروں کی نسبت ہر میدانِ عمل میں ہماری کارکردگی اور عمدگی کے معیار بہت پست ہیں، اور اس سے بھی افسوسناک امر یہ ہے کہ وہ مزید گر رہے ہیں۔ یہ عقیدہ بالکل ختم ہو رہا ہے کہ کامیابی یا ناکامیابی ہر شخص کی اپنی محنت و مشقت اور لیاقت پر منحصر ہے باعمل مقصدیت جو ہر معاشرے کی ترقی کے لئے لازمی ہے مٹ رہی ہے۔ مختصر یہ کہ ہمارے لوگوں میں چند قابل احترام مستثنات

کو چھوڑ کر تکمیلی محرکات اور مقاصد کا فقدان ہے۔"

انسانی زندگی اور معاشرہ وسعت پذیر میل جول اور باہمی عمل اور اشتراک عمل کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ ہر میل جول، باہمی عمل اور اشتراکِ عمل ایسی نئی عادات خیالات اور رجحانات پیدا کرتا ہے جن سے میل جول اور باہمی عمل اور اشتراک عمل کا دائرہ وسیع تر اور سطح بلند تر ہو جاتا ہے۔ ہر نیا دائرہ اشتراکِ عمل اور نئے خیالات، عادات، رویے اور رجحان کو جنم دیتا ہے، جو اور نئے تعلقات اور گروہ کو جنم دیتے ہیں جو دائرۂ اشتراکِ عمل کو اور وسیع تر کرتے ہیں۔ زندگی اور معاشرے میں مرد اور عورت کے میل جول، باہمی عمل اور اشتراکِ عمل مرد اور مرد یا عورت اور عورت کے میل جول اور باہمی عمل اور اشتراک کی نسبت وسعت پذیری میں زیادہ موثر اور قابل حیات رِوائی ایبل) ہوتے ہیں، کیونکہ یہ معاشرے کی تشکیل و ترقی میں زیادہ موثر، زیادہ محرک اور زیادہ قابل حیات ثابت ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ ایسے خاندانی نظام و قوانین پر مبنی ہوں جو عورت کی تکمیلی زندگی کی مساوات اور آزادی کو قطعاً محدود نہ کریں۔ انسانی معاشرہ ہمیشہ دو جنسی عمل ہے اس کے تمام کام اور تکمیلات، کارنامے اور کمالات مرد اور عورت کے غیر مشروط تعاون اور باہمی عمل و اشتراک کے مرہون منت ہیں۔ مردوں کے تنہا کمالات اور کارنامے سطحِ آب پر لکیروں کی طرح ہیں جو چند لمحوں کے بعد مٹ جاتی ہیں۔ وہی کام اور کمالات مستقل اثر پذیر اور پائیدار ہوتے ہیں جو مردوں نے ہر مقام، اور ہر سطح پر عورتوں کے لامحدود تعاون، شرکت اور باہمی عمل سے حاصل کئے ہوں۔ صرف قبائلی اور جاگیردارانہ فرمانبرداری معاشروں میں مرد عورتوں کے تعاون اور اشتراک کے بغیر کام اور کمالات حاصل کرتے ہیں، مگر ان میں کوئی پائیداری اور استقلال نہیں ہوتا ہے، کیونکہ وہ نسلی خلا اور تقلیل تکمیل کے عوامل کے باعث ان میں کام اور تکمیل

۱ـ *The Pakistan Psychological Studies*, Vol. 1.1. p. 1969. Peshawar

کے معیار گرنے لگتے ہیں، جن کی تلافی کے لئے مرد قرابتدارانہ لوٹ مار اور لوٹ کھسوٹ کو تیز تر کر دیتے ہیں، جو معاشرے کو انحطاط و انتشار کا شکار بنا دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ پردہ سسٹم اور ذات پات اور خیل و قبیلے کی قرابتدارانہ علیحدگیاں مسلمانوں کے کردار اور ذہن کی ترقی اور ارتقا میں حائل ہیں۔ ہمارے معاشرے میں پردہ دار عورتوں کی طرح مرد بھی اپنے قرابتدارانہ اور مقامی تعصبات اور زبوں میں محصور، اپنے طرز فکر اور طرز زندگی میں تنگ اور کوتاہ نظر ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہیں "اتنی ہی تنگ ہوتی ہیں جتنی وہ جگہ جہاں وہ رہتے ہیں" اس تنگ خیالی اور کوتاہ نظری کا لازمی نتیجہ ہے کہ وسیع تر قومی مفادات، تعلقات اور مقاصد سے لاپروائی اور لاتعلقی ہماری قومی زندگی اور کردار کی نمایاں خصوصیت بن گئی ہیں۔

اس غیر تکمیلی عادات اور کردار کے نتیجے ظاہر ہیں۔ ہمارے گھروں، محلوں، گاؤں اور شہروں کا روزمرہ کا ماحول ایسا ہو تا کہ کوئی نیا مقصد یا پلان، کوئی نیا پروگرام جو انسانی اور قدرتی پیداواری قوتوں کا بہتر استفادہ کرے، سائنس اور ٹیکنالوجی کی کوئی نئی دریافت اور ایجاد اور کوئی نیا خیال یا منصوبہ، کوئی نیا نصب العین اور عزم و ارادہ ہمارے ذہن و فکر میں نہیں آتا۔ صرف سابقہ تکمیلات کے جمع شدہ اثاثہ کی لگاتار تباہی اور بربادی اور نئے تکمیلی افراد اور گروہوں کو دبانے اور کچلنے کا لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمینیں تباہ ہوتی رہتی ہیں، ان کی پیداواری قوت گھٹتی رہتی ہے۔ صنعت و حرفت کے آلات اور ذرائع برباد ہوتے رہتے ہیں تجارت کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے کارخانے کم ہو جاتے ہیں اور لوگ نئے کام کاج اور کاروبار شروع کرنے سے گھبراتے ہیں۔ درحقیقت مسلمانوں کا پردہ دار قرابتداری معاشرہ قدرت کی قوتوں کی تسخیر کے لئے نہیں بلکہ انسان کی انسان کے خلاف دشمنی اور مخاصمت کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ جو کچھ دوسرے پیدا کریں اس کی لوٹ مار اور استحصال ہو سکے۔ اس لئے یہ معاشرہ ہر طرف اور ہر شخص میں خوف و ہراس، ناامیدی

اور پژمردگی بے یقینی اور بداعتمادی پیدا کرتا ہے۔ اس میں صرف مفت خور کاہل اور استحصالی افراد اور گروہ ہی پھولتے پھلتے ہیں اور ایسے ہی لوگ ان افراد اور گروہوں کے سردار، سربراہ اور لیڈر بنتے ہیں۔ اس خلاف تکمیلی صورت حال کا تکمیلی اذہان اور افراد پر نہایت مہلک اثر پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں میں سائنس اور علم کے لئے کوئی جستجو نہیں ہوتی، انہیں نئے طرز فکر اور نئی طرز زندگی کی تجربات کا کوئی شوق نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ہمارے تکمیلی افراد اور طبقوں، مثلاً ڈاکٹروں، حکیموں، انجینئروں، استادوں پروفیسروں، قانون دانوں، منیجروں، منتظمین، فنکاروں، سائنسدانوں اور دوسرے اہل پیشہ اور اہل علم و فن کی صلاحیتیں اور اہلیتیں محض سطحی اور محدود سی رہتی ہیں۔ جب گرد و نواح میں ہر طرف خوف اور بداعتمادی پھیلی ہو، جب کسی کو کو اپنی تعمیر اور تکمیل کی پائیداری کا یقین نہ ہو، جب تحسین و تعریف کا معیار رشتہ داری، قرابتداری اور دوستی ہو، جب ہر شخص کے کام اور تکمیل کو جتھابند اور دھڑے بند افراد اور گروہوں کی سازشوں، حملوں اور تباہ کاری کا خوف اور خدشہ لاحق ہو، جب کاہل اور لاپروا افراد کو صرف رشتہ داری قرابتداری اور دوستی کی بنا پر نوازشوں اور کرم فرمائیوں سے نوازا جائے

جب سارا ماحول اقربہ پروری، دوست نوازی اور جانبداری کے تصورات اور تعصبات سے رچا ہوا ہو اور جب پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں مفت خور اور تساہل پسند افراد اور گروہوں کی قدردانی اور کام اور تکمیل حاصل کرنے والوں کی ناقدری اور سرزنش ہو، تو باہمی ارتباط اور اختلاط، باہمی عمل اور حوصلہ مندی کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں جن میں نئے ذہن، نئے افکار و خیالات نئے تصورات اور نظریات جنم نہیں لیتے ہیں اور نئی امیدیں، نئے ارادے، نئے منصوبے، نئے نصب العین، نئے پلان اور نئے پروجیکٹ لوگوں کے ذہنوں اور خیالوں کو ابھارتے اور متحرک نہیں کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے لوگوں

کے ذہن اور مزاج پر ایسے فرا تبدارانہ اور جانبدارانہ مخصوص اور رقابتوں، جھگڑوں اور تنازعوں سے مضمحل اور مکدر ہو جاتے ہیں جو ہمارے گھروں اور محلوں، دفتروں اور کاروباری اداروں، درسگاہوں اور تجربہ گاہوں، دکانوں، بازاروں، کارخانوں اور آرام و تفریح کے مقامات اور جگہوں پر ہر وقت برپا ہوتے رہتے ہیں ان کے باعث وہ تکمیلی ترغیبات اور تحریکیں اور ذہن و فکر کی وہ سمت بندی اور قوت غور اور توجہ کی یکسوئی میسر نہیں ہوتی جو ہر کام اور ارادے کی تکمیل کا پہلا قدم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہمارے ہاں تکیلی افراد کا کام اور تکمیلی، محنت اور فرض کی انجام دہی کی طرف محض سطحی، سرسری اور مالی لگاؤ اور واسطہ ہوتا ہے۔ ہم میں علم برائے علم کا شوق نہیں ہوتا اور کام برائے کام کی لگن نہیں ہوتی۔

اس غیر تکیلی صورتحال سے دوہرا نقصان اور ڈبل خسارہ ہے: ایک طرف تو گذشتہ وقتوں اور سابقہ نسلوں کی تکمیلات کا اساسہ ختم ہوتا جاتا ہے اور دوسری طرف نئے تکمیلی افرادِ کی انمول اور گرانبہا صلاحیتیں، قوتیں، قابلیتیں اور اہلیتیں بن کھلے مرجھا جاتی ہیں۔ صرف ماکروسوشل ماحول میں ہی تکمیلی اقدار، رویوں اور طرز فکر اور طرز زندگی کا ہر طرف چرچہ اور غلبہ ہوگا، اور غیر تکیلی افراد اور گروہوں کے استحصال اور تباہ کاری سے نجات حاصل ہوگی۔ ایسا ماحول صرف ماکروسوشل حکومت، نظم و نسق، قانون اور تعلیم و تدریس اور آئیڈیالوجی کی قوتیں ہی پیدا کر سکتی ہیں۔

الکسی اور بیگانگی کا ماحول

پاکستانی مسلمانوں کے ذہن اور کردار، بصیرت اور عادات کی اس تنگ نظری کا اثر تکیلی افراد کے نشوونما اور قوم کے ارتقا پر پڑتا ہے مسلم معاشرے میں عموماً مخصوص طرح کی تکمیلات ہی ممکن ہیں۔ جدت پسند، مہم جو تکیلی شخص روایتی گروہوں سے الگ تھلگ اور بیگانہ ہو جاتا ہے، جسے اپنے فرا تبداری گروہوں سے کوئی حوصلہ افزائی نہیں ملتی تکہ غیر فرا تبدارانہ کاموں، دلچسپیوں میں حصہ لے سکے، کیونکہ ایسے غیر فرا تبدارانہ اور رضا کارانہ گروہ

موجود ہی نہیں ہوتے۔ پاکستانی سوسائٹی میں ایسی انجمنوں، اداروں اور اجتماعات کا سوائے چند بڑے بڑے شہروں کے فقدان ہے جو غیر قرابتداری نوعیت کے ہوں، اور جو ہر شخص کو اپنے محدود قرابتی گروہوں سے باہر نکال کر پبلک اور قومی معاملات اور مسائل، دلچسپیوں اور کاموں میں تکمیل کے لئے آمادہ کریں۔ چند سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے علاوہ رضاکارانہ اداروں کا قطعی فقدان ہے۔ اور اگر کوئی ایسا ادارہ قائم بھی کر دیا جاتا ہے، خواہ سرکاری یا غیر سرکاری تحریک پر، تو اس کی رکنیت محدود، کارگزاری محدود اور اس کی زندگی چند روزہ ہوتی ہے۔ یہی حشر ایسے رسالوں اور اخباروں اور مطبوعات کا ہوتا ہے، جو صحیح معنوں میں علم و فن کی تحقیق اور ترویج کا کام کرتے ہوں۔ پاکستان کے قیام سے پہلے غیر مسلموں کے مسابقہ کے باعث چند ادارے اور انجمنیں قائم تھیں اور رسائل وغیرہ شائع ہوتے تھے، مگر بعد میں یہ ادارے اور رسالے تکمیلی ممبروں کی کمی اور ضروری سرمایہ کی نایابی کے باعث رفتہ رفتہ معدوم ہو گئے۔ یہی حشر ان اداروں اور انجمنوں کا ہوتا ہے جو ادبی یا علمی اور سائنسی مسائل کی تحقیق اور ترویج یا تمدنی فنی، رفاہ عامہ، یا انسانی دوستی یا ہمدردی اور تفریحی یا ورزشی اغراض و مقاصد کے لئے قائم کئے جائیں۔ ان غیر قرابتدارانہ پبلک اور رضاکارانہ انجمنوں اور اداروں، رسائل وغیرہ کے فقدان کے باعث نئے تکمیلی افراد کو غیر قرابتدارانہ معاملات اور مسائل میں شرکت کرنے کے مواقع، ترغیب اور تحریک نہیں ملتی اور وہ مایوس ہو کر دل برداشتہ ہو جاتے ہیں اور ان کا ذوق و شوق، کام کی لگن اور تکمیل کی تمنا ختم ہو جاتی ہیں اس لئے سارے مسلم معاشرے پر ذہنی بے حسی، فکری بیزاری، جمود اور الکسی کی فضا طاری رہتی ہے۔ نتیجۃً ایسے اشخاص پھر اپنے قرابتدارانہ گروہوں اور مقامی معاملات میں مشغول اور مصروف ہو جاتے ہیں اور ملک و قوم کے وسیع تر مسائل اور معاملات سے لاپروا اور بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی محدود اور تنگ نظر ماحول کی دنیا سے باہر نہیں نکلتے اور قومی شعور نہیں پیدا کر سکتے۔ لہٰذا کوئی

شخص قوم و ملک سے وفاداری اور حب الوطنی کے جذبات سے سرشار نہیں ہوتا یہ دوہری بیگانگی ہے۔ ایسے تکمیلی افراد اپنے پرانے روایتی قرابتداری معاشرے سے دل برداشتہ اور بیزار تو ہو ہی جاتے ہیں مگر یہ ماحول انہیں اپنے نئے ارادوں اغراض ومقاصد، تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل کے خیال سے بھی دل برداشتہ اور بیزار کر دیتا ہے۔ اور ان میں احساس محرومی اور بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں ملک و قوم کی تکمیلی قوتیں کمزور اور منتشر ہو کر زائل ہو جاتی ہیں۔ بلکہ مسلم معاشرہ بھی مائیکرو سوشل بنیادوں سے مرتفع ہو کر ماکرو سوشل بنیادوں پہ استوار نہیں ہو پاتا۔ اس سے ہمارے معاشرے میں "تذبذب، دل برداشتگی، بیزاری، بے مقصدیت اور عدم وابستگی اور انومی کے احساسات اور ردعمل پیدا ہوتے ہیں، جو ایسا مایوس کن اور انامس ماحول پیدا کرتے ہیں جس میں تکمیلی افراد کے کاموں اور تکمیلات کی راہوں میں غیر تکمیلی لوگ اور لیڈر اپنے قرابتدارانہ زعم اور زور کے سہارے رخنے ڈالتے ہیں اور پریشانی اور مخالفت کی فضا پیدا کر دیتے ہیں ایسی انومی کے ماحول میں یا تو تکمیلی افراد لاپرواہ اور بددل ہو کر اپنے کام اور تکمیل کا خیال ترک کر دیتے ہیں یا وہ اپنے غیر تکمیلی حاسدوں کی قرابتدارانہ ریشہ دوانیوں، رخنہ اندازیوں مخالفتوں اور ماحول کی بے حسی اور غیر تکمیلی حالات اور مجبوریوں کے ہاتھوں تنگ آکر غیر ممالک کی راہ لیتے ہیں جہاں تکمیلات یا روزگار کے وافر مواقع میسر ہوتے ہیں اس وجہ سے ملک سے تکمیلی افراد مثلاً ڈاکٹروں، انجنیروں، سائنسدانوں، عالموں اور ماہرین کا فرار یا دماغی نکاسی کا عمل شروع ہو جاتا ہے، جو پاکستان جیسے پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ ملک کے لئے بہت مہنگا سودا ثابت ہوتا ہے اور ان کی پسماندگی اور غیر تکمیلی بدحالی کا بہت بڑا سبب ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ملک کے معاشری سپکٹرم میں غیر تکمیلی لوگوں کی بہتات اور غلبہ طاری ہو جاتا ہے جو ہمارے ملک کے ہر شعبہ حیات میں پایا جاتا ہے۔

ہماری درسگاہوں میں تکمیلی ترغیبات ذوق اور سمت بندی کا فقدان

سکولوں اور کالج اور یونیورسٹیوں میں طلباء کی اپنے فرائض سے غفلت شعاری اور لاپرواہی کا تجزیہ ہم گذشتہ باب میں کر چکے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ امتحان میں پاس ہونے اور ڈپلومے اور ڈگریاں لینے کو ہی مقدم گردانتے ہیں اور اس کے لئے ہر طرح کی بدعنوانی اور شرارت پر آمادہ رہتے ہیں۔ مگر اساتذہ کا معیار علم اور فضیلت بھی بہت پست اور انحطاط پذیر ہو گیا ہے۔ ہمارے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں اور دوسری درسگاہیں تعلیم و تدریس کے مراکز اور علم و ہنر کی ترقی اور تحقیق کے ادارے ہونے کی بجائے فکری اور دماغی انحطاط، کاہلی اور تساہل انگیزی کے مرکز بن گئے ہیں، جہاں استاد اور شاگرد دونوں پڑھنے پڑھانے کی بجائے داخلے کی سفارشوں یا اپنی ملازمتوں، تنخواہوں یا عہدوں کی ترقی یا دوسرے مطالبات کے لئے اپنی گروہی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں لگے رہتے ہیں اور ان کے لئے وہ ذات پات، قبیلہ اور زبان، علاقہ اور مقام کی بنا پر اقربہ پروری، جانبداری، دوست نوازی اور دوسری بدعنوانیوں کے طریقوں کو خوب کام میں لاتے ہیں مگر اپنے تعلیمی، علمی اور تحقیقاتی فرائض سے قطعی غافل رہتے ہیں یا انہیں نہایت سرسری اور سطحی طور پر انجام دیتے ہیں۔

پبلک اور پرائیویٹ ادارے

کاہلی، لاپرواہی، نافرض شناسی، بیماری کے بہانے سے کام چوری، اور زیادہ محنتی، سنجیدہ اور فرض شناس کارکنوں کے خلاف رخنہ اندازی اور ریشہ دوانیاں تمام دفتروں اور اداروں میں پائی جاتی ہیں، خواہ وہ پرائیویٹ ہوں یا پبلک۔ البتہ یہاں زندگی کی کش مکش زیادہ شدید ہے اور گروہی عداوتیں اور مخاصمتیں زیادہ تیز اور گہری جڑیں رکھتی ہیں۔ ایسا افسر یا کلرک یا کوئی اور کارندہ جو اپنے کام اور فرض کو دیانتداری، ایمانداری، محنت و مشقت اور کارکردگی سے سرانجام دیتا ہے اپنے بددیانت، ناکارے اور نافرض شناس ساتھیوں اور افسران بالا کی سازشوں اور حملوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔ اسے

دی کیا جاتا ہے، اس کے کام میں رخنے ڈالے جاتے ہیں، اور جلد یا بدیر کسی بہلنے یا حیلے سے اس کا تبادلہ یا عہدہ گھٹا دیا جاتا ہے یا اُسے برخاست کر دیا جاتا ہے۔ یا استعفا دینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ صرف ایسے لوگوں کو برداشت کیا جاتا ہے جن کو مضبوط اقربا پرورانہ یا جانبدارانہ سہارا حاصل ہو یا خود رشوت ستانی اور بدعنوانی اور دوسری بدچلنیوں اور بداطواریوں سے اپنی اور دوسروں کی مدد کرتے ہوں لہٰذا ہماری افسرانہ دنیا میں فرائض سے غفلت، بدعنوانی، رشوت ستانی، بے ایمانی چاپلوسی، خوشامد اور ناکارکردگی کا عام رواج ہے۔ ایسے ماحول میں جو شخص کچھ کام اور تکمیل حاصل کرنا چاہتا ہے جلد دل برگشتہ اور لاپروا ہو کر خود بھی ویسا ہی بن جاتا ہے۔ ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد[1]

ایسی ہی تصویر گاؤں میں اور زرعی کاموں نظر آتی ہے۔ کوئی کاشت کار یا زمیندار جو اپنے کھیت یا فارم پر ترقی پسندانہ طور سے کاشت کرنا چاہتا ہے، اپنی پیداوار بڑھانا چاہتا یا نئے اور سائنٹفک آلات اور طریقے اختیار کرنا چاہتا ہے فوراً اپنے گرد و نواح کے مفت خور مگر بارسوخ اشخاص کی مخالفت اور دشمنی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ جلد ہی وہ اور اس کے نئے آلات اور طریقے ٹھٹھہ مخول اور مخاصمت کے ہدف بن جاتے ہیں۔ اس کی فصلوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے، اسکے مویشیوں کو اور اس کے آلات اور اوزاروں کو چوری کرایا جاتا ہے اور اسے اور اس کے خاندان اور متعلقین کو تنگ کیا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے طور و طریقوں کو ترک کر دے یا گاؤں چھوڑ کر چلا جائے یا اپنے قرابتداری گروہ کے رشتہ داروں اور احباب کا سہارا تلاش کرے، جو اُسے صرف روایتی طور و طریقوں کو پھر اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پس پرانے طریقوں، رسم و رواج اور نظریات کی اندھی تقلید کی جاتی ہے۔ چند سال قبل پشاور کے قریب ایک گاؤں میں لوگوں کی عادات رویوں اور زرعی معلومات کا سروے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ زرعی معلومات اور اصلاح شدہ طریقوں کے بارے میں گاؤں کے لوگ اپنے قرابتداری گروہوں سے مثلاً

---

[1] - عارف حسین "پاکستان اس کی آئیڈیالوجی اور خارجہ پالیسی" ص ۱۶۴

اپنے حجرے کے اجتماع، قبیلے اور اپنے جتھے اور دھڑے کے ارکان سے تعلق رکھنے اور مشورہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں[1]

یہی صورتحال تجارتی اور صنعتی جگہوں، مثلاً دکانوں، کارخانوں، ورکشاپوں ملوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے اگرچہ یہ ادارے اور کارخانے ترقی یافتہ ممالک کی درآمد شدہ ٹیکنالوجی اور مشینری پر چلتے ہیں اور بظاہر ان کا انتظام اور کاروبار بھی جدید طریقوں اور تکنیکوں کے مطابق ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ بھی ابھی تک وہی پرانے فرسودہ ڈیلوں، نظریوں اور طور وطریقوں اور تعلقات سے بھرے ہوئے ہیں، وہ بھی ابھی تک وہی پرانے ذات پات کی تفریقوں، قبائلی منافرتوں، اقربا پروری اور جانبداری کے امراض میں مبتلا ہیں جو ہمارے گاؤں اور پس ماندہ علاقوں میں عام پائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں کراچی کے ایک خواتین کے جریدے میں شکایت کی گئی کہ:

> "بہت افسوس ہوتا ہے جب ہم اخباروں کے اشتہاری حصوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسے اشتہارات ملتے ہیں، مثلاً "ضرورت ہے ایک اثنا عشریہ سیکرٹری کی" یا "ایک بڑی اور مشہور فرم کو ایک جواں سال احمدی منیجر مطلوب ہے" یا "ضرورت ہے ایک سنی ٹیوٹر کی ایک جواں طالب علم کو پڑھانے کے لئے" اور اس قسم کے مختلف اشتہارات جو اس افسوسناک حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ذات پات اور فرقہ پرستی کی پلیگ تیزی سے پھیل رہی ہے[2]"

---

[1] عنایت اللہ، بہتر زرعی طریقوں کے فروغ کا ایک مطالعہ ص ۶۶۔ ویسٹ پاکستان اکیڈمی برائے دیہی ترقی پشاور ۱۹۶۲ء۔

[2] *Women's World*, Karachi. Vol. 14, Issue No. 1. Special Anniversary Number, 1971.

اقتصادی اخلاق کا تضاد

درحقیقت ہمارے اقتصادی اور معاشی تعلقات اور کاروبار ابھی بھی قرابتدارانہ پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے پردہ دار معاشرے کے لوگ زمانۂ جدید کی ماکروسوشل اقتصادی زندگی کے غیر قرابتدارانہ اقدار، تعلقات اور طریقے نہیں اپنا سکتے۔ دراصل قرابتدارانہ مائیکروسوسائٹی میں دو طرح کے تجارتی اور اقتصادی اقدار اور اخلاق ملتے ہیں۔ ایک اپنے رشتہ داروں، قرابتداروں، دوستوں اور حلیفوں کے لئے جن سے لوگ دیانتداری سے لین دین کرنے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور دوسرا، غیر قرابتی ہمسایوں اور اجنبیوں کے لئے، جن سے وہ فریب، بددیانتی اور دھوکا دہی کے طریقے اختیار کرنے کو تیار رہتے ہیں[ط]۔ اس وجہ سے پردہ سوسائٹی کے لوگوں میں تکنیکی اوصاف اور کردار کی بھی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی، مثلاً ایسے تکنیکی اوصاف کی جیسے کارکردگی، محنت و مشقت کی زندگی کی عزت، کام کی اعلیٰ معیاری، پابندیٔ وقت دیانتداری، وعدے اور سمجھوتے کی پابندی اور پاسداری، باقاعدگی، بچت اور کفایت شعاری، دور اندیشی یا مستقبل کے لئے تیاری، روپے پیسے کا صحیح تصرف اور فضول خرچی سے اجتناب، معاشی تنظیم کے اصولوں کا نفوذ اور پابندی۔ پردہ سوسائٹی کے قرابتدارانہ گروہی رویے، پابندیاں اور مفادات ایسی خامیاں اور رکاوٹیں ہیں جو قومی یا ماکروسوشل معیشت کی نشوونما میں حائل رہتی ہیں۔ مثلاً پردے کی پابندیاں قومی معیشت کو اپنی آدھی آبادی کی پیداواری اور تخلیقی قوتوں سے محروم کر دیتی ہیں جب وہ مردوں کی اقتصادی قوتوں اور صلاحیتوں کو گروہی مفادات کے انتشار اور انحطاط میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ دراصل پردہ مائیکروسوسائٹی میں اقتصادی تعلقات اور مفادات مسلمانوں کے قرابتدارانہ گروہی مفادات اور تعلقات اور گروہی وفاداریوں اور وابستگیوں کے تابع ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے پردہ دار مسلمان غیر تکنیکی، خلاف تکنیکی اور عدم تکنیکی طریقے اور ذرائع آمدنی اور پیداوار کو اختیار کرنے میں کوئی تامل

[ط] دیکھئے ڈیوڈ سی مکلیلینڈ "تکنیکی معاشرہ" ص ۱۹۴ تا ۱۹۵

نہیں کرتے' مثلاً اشیائے خوردنی میں ملاوٹ' گھٹیا اور ناقص کوالٹی کا مال اور مصنوعات کی تیاری اور فروخت' ذخیرہ اندوزی' سمگلنگ' غیر ملکی مصنوعات کو پاکستانی مصنوعات پر ترجیح دینا' غیر ملکی مال اور مصنوعات کی تعریف کرنا اور پاکستانی مال اور مصنوعات کو خراب اور گھٹیا سمجھنا' اور پاکستانی مصنوعات پر "میڈ اِن جاپان" یا "میڈ اِن انگلینڈ" کی قسم کا مارکہ لگانا وغیرہ۔ یہ سب ہماری خلافِ تکمیلی اور عدم تکمیلی عادات' نظریات اور رویے ہیں جو ہماری قرابتدارانہ مائیکرو سوسائٹی کا نتیجہ ہیں۔ اس میں کام' محنت' عمل اور تنظیم کی تکمیلات اور کوششوں کا فقدان ہوتا ہے کیونکہ اقتصادی اہلیت گروہوں اور طبقوں کا مطمح نظر تساہل پسندانہ مفت خوری' بدعنوانی اور استحصال ہوتا ہے۔

غلاظت کے ڈھیر

پردہ دار مسلمانوں کی ذہنی کوتاہ نظری اور تساہل پسندانہ عادات زندگی کے ہر شعبے میں اپنے اثرات دکھاتی ہیں۔ خواہ وہ معاشی اور اقتصادی زندگی ہو' یا تمدنی اور سیاسی یا شہری اور مجلسی۔ مثال کے طور پر یہ تساہل پسندی' سہل انگاری اور لاپروائی کوڑا کرکٹ اور غلاظت کے اُن ڈھیروں سے عیاں ہے جو ہمارے شہروں' قصبوں اور گاؤں کی گلی کوچوں' سڑکوں' بازاروں اور ہر پبلک اور پرائیویٹ مقامات پر چاروں طرف پڑے نظر آتے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ غلاظت کے یہ ڈھیر قیام پاکستان کے بعد ہر سال متواتر بڑھ رہے ہیں اور پھیل رہے ہیں۔ یہ دلیل کہ آبادی بڑھنے کے باعث ایسا ہو رہا ہے غلط ہے' کیونکہ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ان ہاتھوں کی تعداد بھی تو بڑھتی ہے جو اس غلاظت کے ڈھیروں کو صاف کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے گھروں اور محلوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ گلبرگ اور سیٹلائٹ ٹاؤنوں جیسی نئی آبادیوں کے علاوہ' تمام پرانے رہائشی علاقے اور مکانات غفلت اور شکستہ حالی کے شکار ہیں۔ ان کا چونا یا پلستر گر رہا ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر کبھی پینٹ یا وارنش نہیں ہوا' گھر میں کئی موسموں بلکہ کئی سال سے سفیدی نہیں ہوئی

اور بعض کی تو دیواریں بھی ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ یہ حالت روپیہ پیسے یا راج مزدور کی کمی سے نہیں، کیونکہ یہ مکان امیر اور متوسط طبقے کے جاگیرداروں، زمین داروں، تاجروں، سوداگروں، کارخانہ داروں، دکانداروں، ملازمت پیشہ اور دوسرے آسودہ حال لوگوں کے ہوتے ہیں اور ان میں آدمیوں اور نوکروں، جوانوں اور بزرگوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ عجب بات ہے کہ غیر قوموں کی طرح مسلمانوں میں کوئی ایسی رسم یا رواج نہیں کہ عید بقر عید یا موسم بہار کے آغاز میں یا کسی اور موسم اور موقع پر سال میں ایک یا دو مرتبہ گھر کے سب لوگ، بڑے اور چھوٹے بزرگ اور بچے، مرد اور عورت، لڑکے اور لڑکیاں مل کر سارے گھر کی جھاڑ پونچھ اور صفائی اور ستھرائی کریں۔ یہی حال پبلک عمارتوں، پارکوں، دکانوں اور بازاروں وغیرہ کا ہے۔ ان میں بعض میں تو لوٹ کھسوٹ کے نشان بھی دکھائی دیتے ہیں، مثلاً بجلی کے تار یا فٹنگ وغیرہ غائب ہوں گے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے لوگوں میں شہریائی یا مدنی حس، پبلک پراپرٹی، دوسروں کی جائیداد کا خیال اور صفائی اور ڈسپلین کی عادات کی کمی ہے[1]

مسلمانوں کا ذہنی وفکری خلو اور قحط الرجال

پردہ سسٹم کے پیدا کردہ انحطاط شخصیت و کردار، مسلمانوں میں خواہ وہ سخت پردہ دار ہوں یا نیم پردہ دار، ذہنی اور فکری خلو کا سبب بن گیا ہے۔ علم و فکر کی دنیا کئی لحاظ سے لاثانی ہوتی ہے۔ مال و دولت بغیر محنت و مشقت اور دیانتدارانہ کام سے بھی جمع کیا جا سکتا ہے سیاست اچھے یا برے

---

[1] مسلمانوں کے گھروں اور در و دیوار کی خستہ حالی کوئی نئی بات نہیں جیسا کہ ہم نے ایک گذشتہ باب میں بتایا، یہ حالت اور بھی زیادہ ہولناک پیمانوں پر قرون وسطیٰ کے انحطاط پذیر ادوار میں پائی جاتی تھی جب مسلمانوں کے شہر کے شہر اور دیہات کے دیہات تباہ و ویران حال ہو جاتے تھے اور وسیع علاقے بنجر اور بیابان بن جاتے تھے برطانوی عہد کے زمانے میں برصغیر میں ہر کوئی مسلمانوں کے گھروں اور محلوں کی تباہ حالی کا دردناک منظر خود دیکھ سکتا تھا جب زیادہ سرگرم اور نکیلی ہندو بڑی تیزی سے نئے نئے گھر اور مکان، کوٹھیاں اور بنگلے، محلے اور ٹاؤن آباد کر رہے تھے، جنہیں وہ خالص

طریقوں اور خود غرضانہ مقاصد کے لئے چلائی جا سکتی ہے۔ مگر علم و فکر ایسے ذرائع سے نہیں حاصل ہو سکتے۔ سائنس و فن، علم و فلسفہ اور ٹیکنالوجی میں علمی، عقلی اور فکری تکمیلات کسی نقلی یا جعلی طریقوں سے، گول مول شماریات سے، یا کسی غیر ملکی استاد کی مہربانیوں سے حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ ان کے حصول کے لئے انتھک محنت، لگاتار کام اور لگن، پوری تندہی اور غور و فکر، بے لوث ذوق و شوق اور کوشش پیہم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہی اوصاف اور صلاحتیں ہیں جن سے مسلمانوں کے دانشور اور عالم طبقے تہی دست ہوتے ہیں۔

ہماری مراد وہ عام قسم کے دانشور، عالم اور تعلیم یافتہ لوگ نہیں، جو جدید تعلیم و تدریس نے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں جدید دنیائے اسلام میں پیدا کر دیئے ہیں اس لحاظ سے عہد جدید کے ابتدائی دور یعنی اٹھارویں صدی کی نسبت جب قرون وسطائی مسلم معاشرے کا آخری زمانہ تھا اور قانونِ تقلیلِ تکمیل و انحطاط نے اس معاشرے کو علم و فضل کے تحت الثریٰ تک پہنچا دیا تھا آجکل کی مسلم دنیا میں بہت بڑی تعداد میں مصنف، مفکر، سائنسدان، ڈاکٹر، انجنیئر، فنکار، اساتذہ، وکلاء، جج، سیاستدان اور دوسرے تکمیل گر پیدا کئے ہیں۔ اگر ہم اپنے ماضی سے مقابلہ کریں تو یہ کچھ کم تکمیلیت کا ثبوت نہیں۔ بیسویں صدی کے مسلم دانشور اور اہل علم و فضل انیسویں صدی کے علماء و فضلا سے زیادہ تکمیلی ہیں اور اٹھارویں صدی کے علماء فضلاء سے تو بدرجہا آگے ہیں۔

لیکن ابھی ہماری علمی و فکری تکمیلات اور تخلیقات وہ نہیں جو ایک تکمیلی اور ڈائنمک معاشرے میں ہوتی ہیں۔ علمی، فنی، سائنسی اور فکری میدانوں میں ابھی ہم ترقی یافتہ ممالک

ہندو نی نام مثلاً کرشن نگر، نانک پورہ، گاندھی نگر وغیرہ نام دے رہے تھے، مسلمانوں کے گھر اور حویلیاں محلے اور بستیاں اور گاؤں ٹوٹ پھوٹ اور تباہ حال ہو رہے تھے یا پھر بک کر غیر مسلموں کے ہاتھوں میں چلے جا رہے تھے وجہ یہی مسلم ملیت کی کاہلی، سستی، لاپرائی، غفلت شعاری، کام اور محنت کی عادات کی کمی، صفائی اور شہریاتی حس کا فقدان تھا یہی حالت مسلمانوں کے سب ملکوں میں پائی جاتی تھی اور اب بھی پائی جاتی ہے سوائے اُن شہروں اور علاقوں کے جو جدید اثرات اور محرکات کے تحت تعمیر ہو رہے ہیں۔

اور اقوام کی جدید کمالات سے کئی لحاظ سے صدیوں پیچھے ہیں۔ سب سے زیادہ سنگین نقص یہ ہے کہ ہماری تمام علمی، سائنسی، فنی اور فکری تکمیلات مانگی تانگی چیزیں ہیں۔ سائنس آرٹ، فلسفہ، ٹیکنالوجی اور علمیت میں ہماری تمام ترقیات مغربی ممالک سے عاریتاً حاصل کی ہیں۔ وہ سب نقل ہیں اور وہ بھی بہت سطحی اور سرسری قسم کی نقل۔ صنعت و حرفت تجارت اور زراعت میں ہماری اقتصادی ترقیات کی طرح، ہماری علمی اور فکری سائنسی اور فنی تکمیلات مغربی ترقیات کا عکس ہیں اور وہ بھی اکثر بہت فرسودہ۔ ہمارے ہاں یہ تکمیلات اس وقت پہنچتی ہیں جب مغرب کے ممالک اُن سے بہت آگے نکل چکتے ہیں۔ ہماری کوئی تکمیل ہماری اپنی کوشش اور غور و فکر کی آزادانہ، خود مختارانہ ابتدائی ما حصل نہیں ہوتی۔ دنیائے اسلام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کسی مسلم ملک یا قوم نے ایک بھی عظیم مفکر، فلسفی، سائنسدان، مصنف، موجد یا آرٹسٹ آج تک پیدا نہیں کیا۔ علاوہ ازیں، پاکستان میں ذہنی، علمی اور عقلی انحطاط ایک دو نسل پہلے کی نسبت آج زیادہ شدید ہے اور یہ انحطاط روز بروز بڑھ رہا ہے مثال کے طور پر، پاکستان کی مختصر تاریخ میں ہم نے علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے پائے کا ایک بھی فلسفی نہیں پیدا کیا۔ ایک اور مثال موجودہ پاکستانی اہل علم و دانش کی فکری اور تخلیقی ضعف اور فقدان کو ظاہر کرتی ہے۔ ۱۹۷۲ء میں برطانیہ میں چوبیس ہزار چھ سو چون نئی کتابیں شائع ہوئیں، جبکہ اس کی آبادی تقریباً پانچ کروڑ افراد تھی اسی مدت میں پاکستان میں تقریباً سات سو نئی کتابیں شائع ہوئی، پاکستان کی آبادی ۶ کروڑ ہے، یعنی برطانیہ سے تقریباً ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ ان کتابوں میں اردو، انگریزی فارسی، پشتو اور دوسری علاقائی زبانوں کی کتابیں سب شامل تھیں[۱]۔ اگر ہم اپنی تخلیقی اور علمی پیداوار کو برطانوی معیار سے ناپیں تو مقدار کے لحاظ ہی سے ہماری علمی اور فکری تکمیل انگلستان کی تکمیل کا محض پچاسواں حصہ ہے۔ عجب بات یہ ہے کہ جب ہمارے ملک میں ہر سال جتنے مصنف ہوتے ہیں، انگلستان میں ہمارے سے کم آبادی ہونے کے باوجود اتنے ہی نئے لوگ تصنیف و تالیف کی میدان میں ہر سال بڑھ جاتے ہیں یہی

---

[۱] اکشن لسٹ۔ پاکستان ۱۹۷۳۔ امریکن لائبریریز سنٹر کراچی ۱۹۷۴ء۔ برطانیہ ایئر بک ۱۹۷۲ء

حالت دنیا کے باقی تمام مسلم اقوام کی ہے۔ قوم کی عظمت اس کے مفکرین اور مصنفین پر منحصر ہوتی ہے قوم اتنی ہی عظیم ہوتی ہے جتنا اس کی علمی و فکری تکمیلات[۱]۔ مگر ساری دنیا کے مسلمان اقوام علم و فضل، سائنس اور فن میں نہایت پس ماندہ اور پست مقام رکھتے ہیں۔[۲] اگرچہ مسلمانان

---

[۱] یہ موازنہ صرف تعداد کے لحاظ سے ہے۔ اگر یہ نفس مضمون کی خوبی اور نوعیت کی بنا پر کیا جائے تو نہایت افسوسناک نتائج سامنے آئینگے جو مسلمانوں کی ذہنی علمی اور فکری خلو کو واضح طور پر آشکارہ کریں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن و فکر کی کاوشیں اور تکمیلات انہی معاشری عوامل اور اثرات کے تابع ہوتی ہیں جیسے انسان کی باقی تمام دوسری تکمیلات۔ مسلمان عالم، مصنف اور مفکرین، سائنسدان اور فلسفی بھی اور تکمیل گروں کی طرح، اپنے معاشرے اور ماحول کی علیحدگیوں اور پابندیوں کے خوف اور خدشوں، اندیشوں اور نفرتوں، تعصبات اور امتناعات اور ممانعتوں سے اس قدر متاثر، معذور اور مجبور ہیں کہ ان کا ذہن و عقل و فکر ان بلندیوں اور عظمتوں تک نہیں پہنچ سکتے جو ان کے فکر و خیال کی آزاد اور بے لاگ عمل پیرائی کا متقضی ہوتی ہے اور جو ان کے معاشرہ اور زندگی کے حالات اور واقعات کے چیلنج متقضی ہیں اس کے برعکس ہمارے اہل علم و فن، سائنس و فلسفہ نے آسان راستہ ڈھونڈ لیا ہے یعنی مغرب کی کورانہ بلکہ غلامانہ تقلید جسے وہ اپنی علمی و فکری کاوشوں کا کمال اور معراج تصور کرتے ہیں۔ مگر دراصل یہ معراج نہیں شراب اور خود فریبی ہے، کوئی مغربی اور غیر ملکی عالم اور مفکر، خواہ وہ کتنی ہی عظیم شخصیت اور علمیت کا مالک کیوں نہ ہو، ہمارے مسائل اور معاملات، ہماری ضروریات اور تقاضوں کا حل نہیں پیش کر سکتا یہ فریضہ ہمیں خود ہی پورا کرنا پڑیگا، یا پھر قوم و ملک کو ہماری علمی اور فکری تخلیقی خلو کے نتائج بھی بھگتنے پڑینگے دنیائے انسانی میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا سوائے انکی جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں بہر حال عظیم مفکرین، علما، فلسفی اور سائنسدان بھی کوئی اوتار نہیں ہوتے جو آسمان سے بلند خیالی کی سند لیکر نیچے اترتے ہوں بلکہ وہ بھی دوسرے تکمیل گروں کی طرح اپنے معاشرے کی انہی تضاد و مخالفت اور تردید و تنقید کی دنیا کے نشیب و فراز میں پل کر

[۲] اپنے عظیم نظریات، دریافتوں، ایجادات اور خیالات تک پہنچے ہیں جن سے تکمیلی معاشرہ ان کو دوچار کرتا ہے۔ جب معاشرہ ہی تکمیلی نہ ہو تو اس کے اہل علم و فضل بھی نہیں ہونگے۔ ایسے لوگوں کا علمی و فکری معیار عالمی معیار سے بہت گھٹیا اور پست ہوگا بہر حال علم و فکر کی دنیا میں تضاد و تکمیل کی "مثل" کچھ ایسی ہوتی ہے کہ "اگر سو پھول اگیں تو بہار دکھاتے ہیں، لیکن اگر ایک ہی پھول ہو تو غذا کی کمی سے مرجھا جاتا ہے (مصنف[۱])" پاکستانی قومیت ابھی ایسی زبردست قوت نہیں بنی، جو افراد کی وفاداریوں کو اپنے فرقوں اور علاقوں سے بالاتر ہو کر قوم و ملک سے وابستہ کر دے"۔ عارف حسین: پاکستان: اس کی آئیڈیالوجی اور خارجہ پالیسی، ص ۳۳ (انگریزی میں)

عالم کی آبادی دنیا کی کل آبادی میں دوسرے نمبر پر ہے۔ مگر یہ کتنے اچنبے اور افسوس کا مقام ہے کہ اس عظیم آبادی نے آج تک ایک بھی ایسا مفکر، سائنسدان یا مصنف نہیں پیدا کیا جسے نوبل انعام ملا ہو، جبکہ قلیل آبادی والے اہل یہود نے کئی نوبل انعام یافتہ شخصیتیں پیدا کی ہیں۔

قومی شعور اور اتحاد کا فقدان قرابتداری مسلم معاشرہ بنیادی طور پر غیر متحد معاشرہ ہوتا ہے۔ اس میں متعدد قرابتداری گروہ یعنی چھوٹی اور بڑی ذاتیں اور برادریاں، خیل اور قبیلے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تو رہتے ہیں، مگر ان کے مابین آزادانہ اور بلا روک ٹوک اشتراک عمل، باہمی عمل اور تعلقات نہیں ہوتے سوائے مفت خورانہ استحصال اور مخاصمت کے، بلکہ ہر ایک گروہ اپنے اپنے گاؤں علاقوں اور محلوں میں الگ الگ زندگی گزارتا ہے۔ وہ خود کفیل معاشری اکائی ہوتا ہے۔ اس کی عورتوں کی گروہ کے اندر ہی شادی کردی جاتی ہیں، اگر وہ گروہ سے باہر جاتی ہیں تو اکثر وبیشتر فروخت یا اغوا کر کے لے جائی جاتی ہیں۔ ایسے خود کفیل، خود مرکوز اور خود محدود قرابتداری گروہ اپنی مائیکرو سوشل علیحدگیوں کے باعث مسلم قوم کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ دیتے ہیں، جن میں تعاون، باہمی عمل، باہمی میل جول اور ارتباط و اختلاط بہت کم ہوتے ہیں اس وجہ سے قرابتدارانہ مسلم قوم میں قومی شعور بہت کم ہوتا ہے یہ علیحدگیاں ذات پات کے معاشرے کی نسبت قبائلی معاشرے یا علاقوں میں زیادہ گہری اور ناقابل عبور ہوتی ہیں۔ حدیدیت پسند افراد میں بھی مائیکرو سوشل مفادات کا حس اور وفاداریاں اتنی قوی ہوتی ہیں کہ وہ ماکرو سوشل یا قومی انداز میں کم ہی سوچتے ہیں۔ اس کا ثبوت مسلم معاشرے میں رضا کارانہ اور خود منتخب کردہ انجمنوں، اداروں اور تنظیموں کی کمی ہے۔ لوگوں کا خیال اور رجحان اپنے خاندانی اور قرابتی گروہوں ہی سے وابستہ رہتا ہے۔ اس ذہنی اور نفسیاتی حد بندی کے باعث مسلمانوں میں پبلک سپرٹ اور دوسروں سے ہمدردی کا مادہ کم ہوتا ہے۔ اس محدود ذہنیت اور تفکر کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان لوگ وسیع تر معاشرے کے مفادات اور وفاداریوں سے عاری

ہونے کے باعث وہ عادات اور رویے بھی نہیں سیکھتے جو غیروں کی جان و مال حقوق اور شخصیت کا احترام کی تلقین کرتے ہیں اس لئے وہ دوسروں کا مال چھیننے اور لوٹنے کو تیار رہتے ہیں اس کے برعکس ماکرو سوشل زندگی میں جہاں مختلف مزاجوں، طبیعتوں، مختلف خیالات اور نظریات، کردار اور عادات کے لوگوں کے ساتھ میل جول پیدا کرنا ہوتا ہے، تو ایسے افراد کو خود ضبطگی اور ڈسپلین کی عادات پیدا ہوتی ہیں اور لوگ بھی متعد، ہوشیار، چوکنے، چوکس رہنے کے عادی رہتے ہیں۔ اس کے برعکس مائیکرو سوسائٹی میں مفاد اور وفاداری میں اس قدر فرق اور فاصلے ہوتے ہیں کہ ہر شخص دوسرے کو اپنا دشمن تصوّر کرتا ہے، اس لئے گریزاں رہتا ہے۔ قتل و غارت کے لئے تو تیار رہتا ہے مگر تعمیری تعاون اور باہمی امداد سے گریز کرتا ہے یہ وجہ ہے کہ اس معاشرے میں انومی یا لاقانونیت کا زور ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں کوئی ایسی غیر قرابتدارانہ انجمن یا ادارہ پنپ نہیں سکتا۔ اگر قائم بھی کر لیا جائے تو بے آب و ہوا کے پودوں کی طرح جلد مرجھا کر ختم ہو جائیگا یہ حشر ہماری ادبی، علمی، تمدنی انجمنوں اور کلبوں، سائنسی اور تحقیقاتی اداروں اور تنظیموں کا ہوتا ہے۔ اور ہمارے معاشرے میں یہی حشر خدمت خلق، رفاہ عامہ اور انسان دوستی کی انجمنوں، اداروں اور تنظیموں کا ہوتا ہے۔

انحطاط پذیر، انتشار زدہ اور شکست و ریخت میں مبتلا مسلم معاشرہ زمانہ جدید میں ایسے ماکرو سوشل معاشروں، تہذیبوں اور تمدنوں سے متصادم ہے جو نہ صرف متحد، مستحکم اور مضبوط ہیں بلکہ توسیع پسند اور مستقبل کی تیاریوں میں مصروف بھی ہیں۔ ان میں مغرب کا سامراجی معاشرہ اپنے توسیع پسندانہ عزائم اور منصوبوں میں پیش قدمی کرنے اور پہل میں پیش پیش ہے۔ تاریخ اسلام کا ایک امریکی مورخ لکھتا ہے:-

> "اہل مغرب حال کو مستقبل پر قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ہم اپنے لئے اچھی زندگی کی بجائے اپنی آنے والی نسلوں کے لئے اچھی زندگی کے خواستگار ہیں۔ ہم تغیّر و ترقی کی اہم اقدار کو تسلیم کرتے ہیں، کیوں کہ ہمیں جمود سے گھبراہٹ ہوتی ہے اور اسے ہم نہ صرف

موت کے مترادف خیال کرتے ہیں بلکہ ہمارے ایک اور صرف ایک فریضے سے دھوکا دہی بھی تصور کرتے ہیں، وہ ہے اپنی نسلیت کا فروغ۔ زندگی کا ایسا تصور نئے حالات سے لگاتار مطابقت کا متقضی ہے اگرچہ کاملیت کا ہمارا آخری نصب العین بدستور غیر متزلزل رہتا ہے، لیکن عہد حاضر کے معاون نصب العین، جو بذات خود حتمی مقاصد کی بجائے انکے ذرائع حصول ہیں، ہمیں متواتر نئی سمت بندی پر مجبور کرتے رہتے ہیں ہم دل ہارے بغیر متواتر جدوجہد کئے جاتے ہیں اور ہمیں زندگی کا سچا اطمینان تب ملتا ہے جب اپنی ترقی پذیر جدوجہد میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم جیت گئے اگر ہم نے اس جدوجہد کو کافی عرصے جاری رکھی[۱]"

دنیا بھر میں مسلمانوں کو توسیع پسند، انقلاب انگیز اور جارحانہ قوموں، معاشروں اور تہذیبوں کا سامنا ہے۔ مگر پردہ اور کثرت ازدواجی معاشرے نے ان کی مدافعت کی قوتوں کو کمزور اور ان کی انفرادی صلاحیتوں کو ماؤف اور ان کی قومی صلاحیتوں کو منتشر کر دیا ہے۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ پردہ سسٹم نے ان میں ایسا فرا نتبدارانہ تفریق و تقسیم پیدا کی ہے کہ ان قومی یک جہتی اور اشتراک عمل کے معیار اور باہمی عمل کے طور طریقوں کی ہم آہنگی کا فقدان ہے۔ یہ مسلمان لوگوں اور معاشرے کی اخلاقی اور معاشری الومی کے سنگین نتائج ہیں، جو مسلمانوں میں رجعت پسندی اور تنگ نظری پیدا کرتے ہیں۔

مسلمانان عالم کی قابل نوآبادی حالت

پردہ دار مسلم معاشرہ اپنی انحطاط پذیری اور تفیل تکمیل کے باعث مسلم ممالک کو توسیع پسندانہ قوموں اور معاشروں کے لئے قابل نوآبادی بنا دیتا ہے۔ اس عمل کی ابتدا غیر مسلموں کی مسلم ممالک میں تجارت اور صنعت و حرفت پر قبضے سے ہوتی ہے۔ یہ پرانا

---

[۱] جارج فون گرونے بادم "قرون وسطائی اسلام" ص ۳۴۶ (انگریزی میں) یونیورسٹی آف شکاگو پریس۔ شکاگو۔ ۱۹۵۳ء۔

مظہر ہے۔ اسلام اولیٰ کے مسلمان تجارت اور صنعت وحرفت میں بھی اتنے ہی شوق
سے حصہ لیتے تھے جتنے حکومت، حکمرانی، نظم ونسق، علوم وفنون کی ترقی وترویج میں
کرتے تھے، مگر جب خلافت عباسیہ کے زوال سے پردہ اور کثرت ازدواج ا
کنیز داشتگی نے قرون وسطائی مسلمانوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کو مفلوج کرنا شر
کیا تو عیسائی، یہودی اور دوسرے غیر مسلم اقوام کے تاجروں، دکانداروں، ساہوکاروں
اور سوداگروں نے مسلم تاجروں، سوداگروں اور کاریگروں کو تجارت اور صنعت وحرفت
کے میدانوں سے باہر دھکیلنا شروع کر دیا۔ لہٰذا جب قرون وسطیٰ کے مسلم معاشرے
سسیفین چکر شروع ہوئے تو مملوک مصر، اور قسطنطنیہ کی سلطنت عثمانیہ سے ہند
کی سلطنت مغلیہ تک ہر ایک مسلم مملکت اور بادشاہت میں مسلمان تاجر، سوداگر او
کاریگر اپنے غیر مسلم رقیبوں کے ہاتھوں شکست کھاتے رہے، جس کی وجہ سے سلطنت
عثمانیہ میں عیسائی، یونانی اور یہودی "ملتوں" کو صنعت اور تجارت پر غلبہ حاصل
ہو گیا اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت ہندو بنیا، مہاجن اور ساہوکار جاتیوں
کی کھل کھیل ہو گئی۔ اس وجہ سے مسلم جاگیردارانہ معاشرے میں یہ غیر تکنیکی خیال عام
ہو گیا کہ مسلمانوں کے لئے تجارت اور صنعت ممنوع اور معیوب پیشے ہیں، کیونکہ
یہ صرف غیر مسلموں کے کام ہیں۔ یہ خیال حالیہ وقتوں تک قائم رہا۔ اس کی وجہ سے
برطانوی ہند میں مسلمانوں کا تجارت اور صنعت، بنکاری وغیرہ سے اخراج اس
قدر شدید اور واضح ہو گیا کہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، ہندوؤں کی ان پیشوں
اور ذرائع پیداوار میں اجارہ داری قائم ہو گئی۔ یہی عمل آج تک متعدد مسلم
ممالک میں جاری ہے، مثلاً فلسطین میں یہودیوں کو ہر اقتصادی پیشے اور کاروبار
میں اس قدر فوقیت اور سبقت حاصل ہو گئی کہ فلسطین کی آبادی کے قلیل حصہ ہونے کے
باوجود انہوں نے بالآخر ۱۹۴۸ء میں اس پر قبضہ جما لیا اور اسے اسرائیل بنا لیا۔ اس
عمل کی ابتدائی صورت کئی اور عرب ممالک، ایران، افغانستان اور ملایا میں آج بھی
دیکھی جا سکتی ہے، جہاں امریکیوں، یورپین اور یہودیوں کے علاوہ ہندو، یہودی اور

دوسری غیر مسلم تاجر، صنعت کار اور سوداگر روز افزوں ترقی کر رہے ہیں۔ مگر ہر ملک میں مختلف انداز ے اور پیمانے سے۔ مثلاً افغانستان، اور بنگلہ دیش میں اور مسلم ممالک کی نسبت ان کی تعداد زیادہ ہے اور پہلے کے نسبت تیزی سے بڑھ رہی ہے جوان مسلم قوموں کی غیر تکمیلی پس ماندگی کا بین ثبوت ہے۔

تاہم دور حاضرہ کے مسلم اقوام اور ممالک کی قابل نو آبادیت ایک نیا عمل ہے۔ یہ قرون وسطائی اسلام کے سیفین چکروں سے مختلف ہے، جن میں جب کوئی مسلم مملکت اور بادشاہت خانہ بدوش قبائلی حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئی تھی تو اس کی خاک سے کوئی نئی مسلم مملکت یا بادشاہت جنم لے لیتی تھی۔ عروج و زوال کے ان چکروں میں صرف حکمران خاندان اور حکمران طبقوں اور ان کے متعلقین گروہ نیست و نابود ہو جاتے تھے، مگر عام مسلمان لوگ اور ان کا قرابتداری معاشرہ مجموعی طور پر باقی رہتے تھے۔ زمانہ جدید میں مسلمان ممالک اور قوموں کا قابل نو آبادیت کا عمل صرف حکمران طبقوں کو ہی ختم نہیں کرتا بلکہ سارے مسلم ملک اور قوم کو تباہ و برباد کرتا ہے اور اس طرح کسی نئی یا پرانی سامراجی یا مہاسامراجی طاقت کے غلبے، تسلط، قبضے استحصال اور نو آبادیت کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔

مسلمانوں کے قابل نو آبادیت کا عمل انیسویں صدی میں ترکستان کی مسلم قوموں کی روسی سامراجیت کے ہاتھوں تاخت و تاراج سے شروع ہوا۔ جو موجودہ زمانے میں روسی معاشری سامراجیت کے زیر تسلط روسی نو آبادیاں بن گئیں۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں کئی نئے اور پرانے سامراجی اور امریکی مہاسامراجی قوتیں دنیائے اسلام کے دوسرے ممالک میں سرگرم عمل ہیں۔ مسلمانوں کی قابل نو آبادیت کا عمل کا ایک پہلو مسلم قوموں اور ممالک کی اپنی اندرونی انتشار اور انحطاط پذیری کے عوامل میں پنہاں ہے۔ ان میں تقلیل تکمیل کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے جو پردہ اور تعدد ازدواجی کے پیدا کردہ قانون انحطاطِ شخصیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی ہر طرح کی تکمیلی قوتیں اور صلاحیتیں ماؤف اور مفلوج ہو جاتی ہیں اور غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور

عدم تکمیلی رجحانات اور کمزوریاں سارے معاشرے اور قوم پر طاری ہو جاتی ہیں۔ ہر طرح کے تکمیلی افراد اور قائدین کی کمی اور فقدان شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایسی گروہی مائیکرو سوشل تعصبات، نظریات اور نفرتیں اور دشمنیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جن سے قومی شعور اور قومی اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ قبائلی اور قرابتداری اور جاگیردارانہ مفادات گروہی فرقہ پرست اور جماعتی وفاداریاں اور سازشیں بڑھ جاتی ہیں۔ اہل علم و فکر اور دانشور طبقوں میں اتنی علمی، عقلی اور فکری صلاحیت نہیں رہتی کہ قوم و ملک کے اتحاد اور قومی شعور کو نئی آئیڈیالوجی اور نظریات کی بنا پر متحد اور مستحکم کر سکیں۔ ایسے حالات میں حکومتی قیادت بھی اپنے غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی قوانین اور حکمت عملیوں اور رجعت پسندانہ طرز حکومت سے ملک کی تباہی اور بربادی کے اسباب پیدا کر دیتی ہے۔

ان حالات میں نئی اور پرانی علاقائی اور عالمی سامراجی طاقتیں قابل نو آبادی مسلم ملک اور قوم میں اپنے سامراجی اور نو آبادیاتی عزائم کو بروئے کار لانا شروع کر دیتی ہیں وہ قبائلی اور جاگیردارانہ گروہوں کے سرداروں اور سربراہوں کو سرکشی اور بغاوت پر اکسانا شروع کرتی ہیں۔ انتشار زدہ مائیکرو سوسائٹی میں کئی ایسے قبائلی سردار اور جاگیردار سربراہ اور سیاسی اور پارٹی لیڈر ہوتے ہیں جو اپنے مائیکرو سوشل مفادات اور تعصبات، باہمی دشمنیوں اور عداوتوں کی بنا پر غیر ملکی سامراجیوں اور مہا سامراجیوں کی پٹھو اور آلۂ کار بننے کو تیار ہو جاتے ہیں اور ان کے ہمراز اور ہمنوا بن کر ملک اور قوم میں مختلف نعروں اور نظریات کے ذریعے نفاق اور فساد پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ عین اس وقت سامراجی اور مہا سامراجی اپنے نو آبادیاتی عزائم اور مقاصد کے تحت جدید ذرائع ابلاغ مثلاً ریڈیو اور ٹی۔ وی نشریات اخبارات اور رسائل سے زبردست پروپیگنڈا شروع کر دیتے ہیں اور قومیتوں کی جنگ آزادی، ترقی اور دوسرے دلفریب نعروں اور نظریات کے ذریعے قابل نو آبادی ملک اور قوم میں اور عالمی رائے عامہ کو اس کی تباہی اور بربادی کو بنی نوع انسان

کے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ قرار دے دیتے ہیں۔ کوئی ایسا مسلم ملک اور قوم نہیں (اور یہی حال تمام غیر مسلم ممالک اور اقوام کا بھی ہے) جو زبان، نسل، تمدن، فرقہ یا مذہب کے لحاظ سے یکساں ہو۔ لہٰذا سامراجی اور مہاسامراجی پروپیگنڈے کو ان لسانی، نسلیاتی، تمدنی اور مذہبی اور فرقہ پرستانہ مخالفتوں اور فرقوں کو بھڑکا کر قبائلی، قرابتداری اور جاگیردارانہ ذات پات کی روایتی دشمنیوں اور عداوتوں اور طبقاتی کشمکش کو بروئے کار لاکر ملک اور قوم میں بغاوت اور خانہ جنگی برپا کر دیتے ہیں اور نئے یا پرانے سامراجی اور مہاسامراجی طاقتوں کے لئے جارحیت، حملہ اور غلبہ کی راہ کھول دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مفتوح اور مغلوب ملک اور قوم کو اپنی نوآبادیاتی استحصال لوٹ مار، غارتگری اور بربادی کا شکار بنا لیتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے عرب فلسطین کو بھارت اریٹیریا اور فلپائن کے مسلمان لوگوں کو اور جموں وکشمیر اور بنگلہ دیش کو اپنی نوآبادیاں بنالیا ہے۔ مگر ان حالات کو بدلا بھی جاسکتا ہے۔ جب ان محکوم اور مظلوم ملکوں اور لوگوں میں تعدد ازدواجگی اور پردہ سوسائٹی کا ملاً ختم کر دیا جائے گا۔ اور مسلمان عورت بھی معاشرے میں مردوں کے برابر کام، عمل، جدوجہد، تخلیق اور تکمیل کے مساوی اور پورے حقوق اور آزادی کی حامل ہو جائے گی جو ان مسلمان قوموں اور لوگوں کو متحد اور تکمیلی ماکرو سوسائٹی بناویں گی، تو پھر وہ اپنے چھوٹے اور بڑے اور نئے اور پرانے سامراجی اور مہاسامراجی غاصبوں سے مکمل قومی آزادی اور نجات حاصل کرلیں گے جیسا کہ قبرص کی ترک قوم نے اپنے توسیع پسندانہ سامراجی اور مہاسامراجی دشمنوں، اور غاصبوں کے خلاف اپنی کامیاب جدوجہد سے ثابت کر دکھایا ہے۔

بابِ ہفتم

پردہ آئیڈیالوجی اور مسلمانوں کی ذہنی اور فکری اپاہجی

ہر معاشرے اور تہذیب و تمدن کی اصلیت کسی اور چیز سے اتنی عیاں نہیں ہوتی جتنی اس میں عورت کی حیثیت اور کردار سے۔ زمانۂ جدید کے تمام معاشروں اور تہذیبوں میں، صرف مسلمانوں کا روایتی معاشرہ ہی ایسا ہے جو عورتوں کی حیثیت اور کردار کو سب سے زیادہ پست کرتا ہے۔ یہ حالت پردہ اور تعدد ازواجگی کے رسم و رواج، قانون اور آئیڈیالوجی نے پیدا کی ہے۔ اسلام مرد و زن میں مساوات اور عورتوں کی معاشری زندگی میں شرکت اور شمولیت کی آزادی کا علمبردار ہے۔ قرآن مجید دونوں جنسوں کے مساویانہ حقوق اور ذمہ داریوں کی تاکید اور ہدایت کرتا ہے (۳۳ : ۳۵) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "عورتیں مردوں کی توامی نصف ہیں"[1]۔ مگر، جیسا کہ ہم نے باب سوم میں وضاحت کی ہے جب خلافت عباسیہ کا دور انحطاط میں پردہ، تعدد ازواجگی اور کنیز داشتگی کا رواج عام ہوا تو مسلمانوں نے اسلام کا عظیم پیغام فراموش کر دیا اور معاشرے میں مسلمان عورت کی حیثیت اور مقام پست اور اس کا رول محدود اور اس کی زندگی پردے اور برقع میں محبوس و مسدود ہو گئی۔ یہ حالت کم و بیش پاکستان جیسے کئی مسلم ممالک اور اقوام میں آج تک قائم ہے تاہم موجودہ زمانہ میں مسلمان ایسے مسائل، معاملات اور چیلنجوں سے دوچار ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ان کو مسلمان عورت کی معاشری حیثیت اور کردار کو قرون اولیٰ کے اسلام کے عدل و انصاف مساوات اور آزادی کے اصولوں پر سارے مسلمان معاشرے

ا؎ M. Pickthall, *Cultural side of Islam*, p. 144. Sh. Mohd. Ashraf, Lahore, 1972.

کو پھر تعمیر کرنا ہوگا۔ مگر عین اس وجہ سے تعدد ازدواجگی اور پردے کے جواز میں رجعت پسند حامی اسلام اور جدید علوم کی تشریحات کی بنا پر دلائل اور نظریات پیش کرتے ہیں جن کو ہم نے پردہ آئیڈیالوجی کہا ہے تاکہ اس طرح کے خیالات اور نظریات کی مخالفت اور تردید کی جائے جو مسلمان عورت اور معاشرے کو جدید تکمیلات اور تقاضوں سے ہمکنار کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔ یوں تو پردہ اور تعدد ازدواجگی مسلمانوں میں صدیوں سے مروج ہیں، مگر زمانہ جدید کے ہمہ گیر چیلنج نے اُن کے حامیوں اور عاملین کو عقل و دلیل سے جائز قرار دینے پر مجبور کیا ہے۔ اس طرح پردہ آئیڈیالوجی کے مویدین اور شارحین (پردہ آئیڈیالوجسٹ) نے پردہ دار لوگوں کے عام خیالات، رویوں اور تعصبات کو عقل و دلیل اور علم و سائنس کا سہارا دینے کی کوشش کی ہے۔

پردہ آئیڈیالوجی کی ابتدا اس سوال سے ہوتی ہے کہ عورت کیا ہے؟ ہم بھی اسی سوال سے اس آئیڈیالوجی پر غور و فکر کریں گے۔

پردہ آئیڈیالوجی کے بنیادی نظریات

جنس، جنسی فرق اور دونوں انسانی جنسوں کے تعلقات ایسے موضوع ہیں جو ہمیشہ سے انسان کی عام دلچسپی اور عقلی و فکری کاوشوں کے موضوع رہے ہیں۔ یہ نہ صرف متعدد اور متضاد جذبات اور حرکات و سکنات کے محرک ہیں، بلکہ یہ لاتعداد اور متضاد و متحارب نظریات، خیالات اور طرز فکر و عمل کے بھی محرک ہوتے ہیں۔ ان میں پردہ آئیڈیالوجی ایک انتہائی اور مخصوص طرز فکر و عمل ہے۔ عورت کے بارے میں پردہ آئیڈیالوجسٹوں کے بنیادی نظریات اور عقائد کو ہم ذیل میں مختصراً بیان کرتے ہیں:

اوّل: عورت مرد سے کمتر اور حقیر تر جنس ہے۔

دوم: عورت غیر اخلاقی شخصیت ہے۔

سوم: عورت حیاتیاتی المیہ ہے۔

چہارم: عورت غیر تکمیلی ہستی ہے۔

"فعل" اور عورت کی کمتری

عقل و دلیل کے دعووں کے باوجود، ہر ایک آئیڈیالوجی کے طرزِ فکر و استدلال میں ایک نقص ہوتا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور کائنات کی لامحدود دعوامل و محرکات، قوتوں اور وسعتوں کو ایک دو الفاظ اور خیالات کے الٹ پھیر میں محدود اور بند کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ پر دہ آئیڈیالوجسٹوں نے بھی عورت کو مرد کی نسبت کمتر، ادنیٰ اور حقیر جنس ثابت کرنے کے لئے "فعل" کے تصور کا سہارا لیا، جس کو وہ نہایت محدود معنوں میں متصوّر کرتے ہیں، یعنی صرف جنسی فعل کو "فعل" تصور کرتے ہیں۔ اس خیال کو وہ "زوجیّت" کہتے ہیں۔ مولانا مودودی اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اب اس پر غور کیجیے کہ زوجیّت کیا شے ہے۔ زوجیّت میں اصل یہ ہے کہ ایک شے میں فعل ہو اور دوسری شے میں قبول و انفعال۔ ایک شے میں تاثیر ہو اور دوسری شے میں تاثر۔ ایک شے میں عاقدیّت ہو اور دوسری شے میں منعقدیّت۔ یہی عقد و انعقاد، اور فعل و انفعال، اور تاثیر و تاثر اور فاعلیت و قابلیّت کا تعلق دو چیزوں کے درمیان زوجیّت کا تعلق ہے۔ اسی تعلق سے تمام ترکیبات واقع ہوتی ہیں اور انہی ترکیبات سے عالمِ خلق کا سارا کارخانہ چلتا ہے۔ کائنات میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب اپنے اپنے طبقہ میں زوج زوج اور جوڑ جوڑ پیدا ہوئی ہیں، اور ہر دو زوجین کے درمیان اصلی و اساسی حیثیّت سے زوجیّت کا یہی تعلق پایا جاتا ہے کہ ایک فاعل اور دوسرا قابل و منفعل"

ساری کائنات بسیط میں جنس ہی جنس دیکھ کر مولانا موصوف جنسِ نر کے "فعل" کی فضیلت کی یوں تشریح کرتے ہیں:۔

"فعل اپنی ذات میں قبول و انفعال پر بہر حال ایک طرح کی فضیلت رکھتا ہے۔ یہ فضیلت اس معنی میں نہیں ہے کہ فعل میں عزّت ہو اور

۱۔ مودودی "پردہ" ص ۲۱۲

اور انفعال اس کے مقابلہ میں ذلیل ہو۔ بلکہ یہ فضیلت دراصل غلبہ اور قوت اور اثر کے معنی میں ہے۔ جو شے کسی دوسری شے پر فعل کرتی ہے وہ اسی وجہ سے تو کرتی ہے کہ وہ اس پر غالب ہے، اس کے مقابلہ میں طاقتور ہے، اور اس پر اثر کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ اور جو شے اس کے فعل کو قبول کرتی اور اس سے منفعل ہوتی ہے اس کے قبول و انفعال کی وجہ یہی تو ہے کہ وہ مغلوب ہے، اس کے مقابلہ میں کمزور ہے اور متاثر ہونے کی استعداد رکھتی ہے۔ جس طرح وقوع فعل کے لئے فاعل اور منفعل دونوں کا وجود یکساں ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فاعل میں غلبہ اور قوت تاثیر ہو اور منفعل میں مغلوبیت اور قبول اثر کی استعداد۔ کیونکہ اگر دونوں قوت میں یکساں ہوں اور کسی کو کسی پر غلبہ حاصل نہ ہو تو ان میں سے کوئی کسی کا اثر قبول نہ کرے گا اور سرے سے فعل واقع ہی نہ ہو گا۔"[1]

زوج فاعل کے "فعل" کی فضیلت کی محض تشریح کو ناکافی سمجھتے ہوئے مولانا صاحب کو اس کی میکانیزم کی برکات سمجھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حیاتیات کی دنیا چھوڑ کر وہ غیر جاندار دنیا میں چلے گئے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"اگر کپڑے میں بھی سختی ہو جو سوئی میں ہے تو سینے کا فعل پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر زمین میں وہ نرمی نہ ہو جس کی وجہ سے وہ کدال اور ہل کا غلبہ قبول کرتی ہے تو زراعت اور تعمیر ناممکن ہو جائے۔ غرض دنیا میں جتنے افعال واقع ہوئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی واقع نہیں ہو سکتا اگر ایک فاعل کے مقابلہ میں ایک منفعل نہ ہو اور منفعل میں فاعل کے اثر سے مغلوب ہونے کی صلاحیت نہ ہو"[2]

---

[1] مودودی "پردہ" ص ۲۱۴

[2] ایضاً ص ۲۱۴

اپنے کائناتی شعور کی مدد سے مولانا صاحب نے ایک اور جست لگائی اور غیر حیاتیاتی "زوجین" یعنی "مٹر، سوئی کدال اور ہل اور" مسٹر" کپڑا اور زمین کی" طبیعت" کے اوصاف اور خصائل بیان کرنے شروع کر دیئے جو ان کی رائے میں ان کو متصف کرتے ہیں۔

"پس زوجین میں سے زوج فاعل کی طبیعت کا اقتضاء یہی ہے کہ اس میں غلبہ اور شدت اور تحکم ہو جس کو مردانگی اور رجولیت سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ فعلی پرزے کی حیثیت سے اپنی خدمت بجا لانے کے لئے اس کا ایسا ہی ہونا ضروری ہے۔ اس کے برعکس زوج منفعل کی فطرت انفعالیہ کا یہی تقاضا ہے کہ اس میں نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تاثر ہو، جسے انوثت یا نسائیت کہا جاتا ہے کیونکہ زوجیت کے انفعالی پہلو میں یہی صفات اس کو کامیاب بنا سکتی ہیں"[1]

اس طرح مولانا صاحب" زوجین" اور" طبیعت" کے ذو معنوں کے سہارے اپنی کائناتی پرواز کے بعد انسان کی ذہن و کردار کی دنیا کی زمین پر اترتے ہیں تو فوراً ان لوگوں کو تنبیہ فرماتے ہیں جو اُن کی رائے اور طرز استدلال سے منکر اور معترض ہونے کی جسارت کریں، کیونکہ ان کی رائے میں ان مردانہ اور نسوانی" طبیعتوں" کی افراط و تفریط کی صورت میں نہ صرف مردانہ" فضیلت" ہی خطرے میں پڑ جائے گی، بلکہ انسانی" فطرت" اور "طبیعت" کے معنی ہی بدل جائیں گے۔ لہٰذا مولانا صاحب خبردار کرتے ہیں کہ:

"جو لوگ اس راز کو نہیں جانتے وہ یا تو فاعل کی ذاتی فضیلت کو عزت کا ہم معنی سمجھ کر منفعل کو بالذات ذلیل قرار دے بیٹھتے ہیں یا پھر سرے سے اس فضیلت کا انکار کر کے منفعل میں بھی وہی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو فاعل میں ہونی چاہئیں۔ لیکن جس انجنیئر نے ان دونوں پرزوں کو بنایا ہے۔ وہ ان کو مشین میں اس طور پر نصب کرتا ہے کہ عزت میں دونوں یکساں اور تربیت و عنایت میں دونوں برابر، مگر

---

[1] مودودی" پردہ" ص ۲۱۵

فعل و انفعال کی طبیعت جس غالبیّت و مغلوبیّت کی مقتضی ہے وہی اُن میں پیدا ہو، تاکہ وہ تزویج کے منشا کو پورا کر سکیں، نہ یہ کہ دونوں ایسے پتھر بن جائیں جو ٹکرا تو سکتے ہیں مگر آپس میں کوئی امتزاج اور کوئی ترکیب قبول نہیں کر سکتے۔"[1]

"پتھر بن جانے کے خدشے کے سہارے مولانا مودودی نے چوتھی جست لگائی بلکہ قلابازی کھائی اور انسانی معاشرے کی "زمین" پر اترے اور اس "زمین" پر فسق و فجار کے پیش نظر جو "زوجین" اس دنیا میں پھیلا سکتے ہیں، گروہ انسانی کے "فطری" فرق کی بنا پر دونوں صنفوں میں پردے کی دیواریں کھڑی کر کے "صالح تمدن" استوار کیا۔[2] جس کا تجزیہ ہم گذشتہ ابواب میں قدرے تفصیل سے کر چکے ہیں۔ یہاں ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ یہ ذو معنیت اور ایک مضمون اور موضوع کے مطالب کو دوسرے میں استعمال کر کے خاص طور پر "فطرت" یا "قدرت" کے معنوں میں الٹ پھیر کیوں کی جاتی ہے اور مرد کے "غلبہ اور شدت اور تحکم" کا کیا مقصد ہے اور عورت کی "نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تاثر" کا استفادہ اور تمتع کے لئے پردہ آئیڈیالوجی کیا معنے رکھتی ہے؟

عورت اور مرد کا "قدرتی" فرق اور مرد کی فوقیت

پردہ سسٹم کے مصری آئیڈیالوجسٹ علامہ فرید وجدی، عورت کی کمتری کو ایسی "قدرتی" حقیقت قرار دیتے ہیں جو نہ صرف مرد کی فوقیت اور برتری کو ثابت کرتی ہے بلکہ عورت کو پردے کی غلامی میں ہمیشہ کے لئے بند کر دیتی ہے۔ علامہ صاحب کا تحکمانہ قول فیصل ہے:۔

"قدرت نے مرد کو عورت پر فوقیت دی۔ عورت کے لئے غلامی ہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ عورت کو اس غلامی سے کبھی نجات نہیں مل سکتی۔ "قدرت" دنیا کی آسائش اور انتظام پر نظر رکھتی ہے۔ ہماری تمہاری راؤں

---

[1] مودودی "پردہ" ۲۱۵-۲۱۶

[2] ایضاً ۱۹۰

پر نظر نہیں رکھتی۔ وہ تمہاری رائے کی تابع ہو کر کیوں عورت کو مستقل اور آزاد کر دے؟ جبکہ اس کا استقلال دنیا کے لئے اور دنیا کے تمدن کے لئے ایک خوفناک بربادی ہو۔ اس لئے فضول شور وغل سے دست بردار ہو کر غور اور فکر کی نظر ڈالو۔ دیکھو کہ نظام تمدّن میں عورتوں کو کیا مرتبہ دیا گیا ہے؟ دنیا کس درجے ان کی محتاج ہے؟ اور کس امر میں محتاج ہے خود مردوں کے فرائض کیا ہیں؟ دنیا میں اس وقت تک عورتوں کو کہاں تک تمدّن میں شریک کیا گیا؟ اور اب کہاں تک شریک ہیں پھر جو کچھ علم وعقل کا فیصلہ ہو اس پر شاکر ہو کر بیٹھ رہو، کیونکہ قدرت کے قانون میں تغیر ممکن نہیں۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا[1]"

عورت کا حیاتیاتی المیہ یا اس کی غیر اخلاقی فطرت

پدر سردارانہ معاشرے میں عورت کے جسم اور جنس کی خصوصیات اور اختلافات نے مرد کو عجیب عجیب خیالات، توہمات اور تعصبات کے اظہار کے مواقع فراہم کئے ہیں، جن میں اپنی برتری اور فوقیت اور فضیلت کے دعوے نمایاں مقام رکھتے ہیں، جن کی بنا پر مسلمانوں میں پردہ سسٹم اور آئیڈیالوجی کی بنیاد پڑی، مگر یہ صرف جدید پردہ آئیڈیالوجسٹوں کا ہی کمال ہے کہ وہ "خالص علمی تحقیق اور سائنٹفک مشاہدات و تجربات" کی بنا پر عورت کی جنسی اور جسمانی خصوصیات اور اختلافات کو اس کا "حیاتیاتی المیہ" قرار دیتے ہیں۔ تاہم یہ اُن کے اپنے ذہن و فکر کی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک سویٹ مصنف سے مانگا ہوا ہے اور مردوں کے صدیوں پرانے خیالات اور توہمات پر مبنی ہے، جسے مولانا مودودی نے علم و حکمت کے محکمات کا درجہ دے دیا: اس کے مطابق ۔

اوّل: عورت ایک دائمی مریضہ ہے، جو اپنے جنسی اور جسمانی عوامل و عوارض یعنی حیض، حمل، زچگی اور رضاعت کے باعث تقریباً ساری عمر مریض اور معذور رہتی ہے۔

[1] فرید وجدی "مسلمان عورت" ص ۱۷

دوم: انہی عوامل وعوارض کی وجہ سے عورت کمزور، منفعل یا غیر محرک متلون مزاج اور ناپائیدار ذہن و کردار کی مالک ہوتی ہے، جس سے کوئی کام یا عمل یا تکمیل مستقل مزاجی ثابت قدمی اور متواتر انتھک محنت و مشقت سے انجام دینے کی صلاحیت اور طاقت متوقع نہیں کی جا سکتی۔ عورت ایسی غیر اعتباری، لاچار اور معذور و مجبور ہستی ہے کہ وہ اپنے نیک و بد اور اچھے اور برُے کی تمیز بھی نہیں کر سکتی۔ اس لئے اُسے ہر وقت ایسے نگران، حاکم اور محافظ کی ضرورت ہے[1] جو اُسے اپنے" غلبہ اور شدت اور تحکم" سے راہ راست پر رکھے کیونکہ وہ فطرتاً اور اصالتاً غیر اخلاقی ہستی ہے۔

اس کے برعکس، اپنے جسم اور جنس کی نوعیت کی بنا پہ مرد کو ایسی فضیلت اور فوقیت حاصل ہے جو اسے عمل و فکر کی کامل آزادی اور قوت عطا کرتی ہے:۔

اوّل، مرد عورت کی نسبت جسماناً زیادہ قوی، مضبوط اور طاقتور ہوتا ہے،

دوم: اس کے جنس کا کوئی محرک ایسا نہیں جو اس کی آزادی عمل و فکر کو محدود اور معذور کرے۔ مرد ایک ساعت کے لئے عورت سے مل کر ہمیشہ کے لئے اس سے اور اس ملاقات کی ذمہ داری سے الگ ہو سکتا ہے[2]۔ بلکہ" بقائے نوع کی خدمت میں تخم ریزی کے سوا اور کوئی کام مرد کے سپرد نہیں کیا گیا[3]"

سوم: مرد ذہن و فکر، عقل اور دماغ، فہم و فراست اور ذہانت و بصیرت میں عورت سے برتر اور فائق ہے۔ جبکہ عورت میں جذبات اور احساسات کا ہیجان اس قدر زیادہ ہے کہ وہ عقلی دائرے میں اور زیادہ ناکام ہو گئی ہے[4]۔ لہٰذا" عورتوں کے عقلی قوے مرد کے قوے سے بدرجہا ضعیف ہیں دماغ جو قوئے عقلیہ کا اصلی مرکز ہے۔ جب اس کا یہ حال ہے (یعنی سائز میں چھوٹا ہے) تو پھر عورتوں کا یہ دل گردہ کہاں کہ وہ مردوں کی برابری

---

[1] مودودی "پردہ" ص ۲۳۲

[2] ایضاً ص ۱۴۷

[3] ایضاً ص ۱۸۹

[4] علامہ فرید وجدی "مسلمان عورت" ص ۵۱

کا دعویٰ کر سکیں۔[1] پس مرد ہی وہ فردِ کامل ہے جو ہر طرح کی تکمیلی صلاحیتوں اور قوتوں کا حامل ہے اور اس لئے وہ ہی اخلاقی ہستی ہوتا ہے۔

بہرحال، پردہ آئیڈیالوجی کے بنیادی عقائد اور نظریات کی بنا پر ساری انسانی زندگی اور معاشرے کو دو دائرۂ جات میں تقسیم کر کے عورت کو صرف بچے جننے اور پالنے اور گھر کے کاموں کے لئے مخصوص اور محبوس کر دیا گیا اور جنس فاعل کو گھر اور گھر سے باہر کی تمام ذمہ داریوں، فرائض اور کام اور کمالات ودیعت کر دیئے گئے ہیں۔ اگر کوئی اس آئیڈیالوجی اور اس تقسیم پر اعتراض اور تنقید کرے، تو اس کے جواز میں نہ صرف قدرت کے اٹل اور لاتغیر قوانین کا حوالہ دیا جاتا ہے، بلکہ بتایا جاتا ہے کہ

"حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے تمام علوم اس تقسیم کی طرف اشارہ کر رہے ہیں"[2]

پردہ آئیڈیالوجی کی تنقید

اگر پھر بھی کوئی شخص جنس نسوانی کے جسم وجان، عقل وبصیرت، فہم وفراست اور ذہن وفکر کی مبینہ کمزوری، کمتری، لاچاری اور اخلاقی نقائص کی اس آئیڈیالوجی پر معترض ہو اور عورت کی آزادی اور مرد وزن کی مساوات اور برابری کا حامی ہو، تو مولانا مودودی اس پدرسرانہ فلسفے کا سب سے بھاری ڈنڈا گھما کر اسے چیلنج کرتے ہیں کہ کوئی "ایک" بھی ایسی عورت بتاؤ جو ان بڑے آدمیوں اور عظیم ہستیوں کی ہمسر ہو جن سے تاریخ انسانی بھری ہوئی ہے؟ کیا کسی "ایک" عورت نے بھی ایسے عظیم کارنامے اور کمالات حاصل کئے ہیں جو مرد ارسطو سے لیکر آج تک تکمیل کرتے رہے ہیں؟[3]

۱۹۷۳ میں مصری عورتوں کے ایک اجتماع کے سامنے اپنی تقریر میں عرب جمہوریہ لیبیا کے صدر قذافی، عورتوں کی کمزوری اور کمتری کے اعتراض پر اعتراض کرتے ہوئے دریافت

---

[1] علامہ فرید وجدی، "مسلمان عورت" ص ۴۹

[2] "پردہ" ص ۱۹۴

[3] "پردہ" ص ۱۹۳

کرتے ہیں کہ کیا کوئی حاملہ عورت مرد کی طرح آسمان کی بلندیوں سے پیراشوٹ چھلانگ لگا سکتی ہے؟

یہ ہے عورت کے بارے میں پردہ آئیڈیالوجی کا لب لباب۔ اس کا تجزیہ اور تنقید کرنے سے پہلے ہم اس کے چند بنیادی مفروضات اور معاشری محرکات پر غور کریں گے۔

پردہ آئیڈیالوجی کے بنیادی مفروضات کی معاشریات

جدید پردہ آئیڈیالوجی تین بنیادی مفروضات پر مبنی ہے: غلبہ یا طاقت، قدرت یا فطرت اور فوقیت یا برتری ان کی بنیاد پر اس آئیڈیالوجی کے موئیدین اور شارحین اور پردہ اور تعدد ازدواجگی کے عاملین اپنے تمام دلائل اور جواز پیش کرتے ہیں۔

سوسائٹی اور آئیڈیالوجی

انسانی خیال و فکر اپنے وقت اور معاشرے کے حالات اور ماحول، اقدار اور اقتضات، ضروریات اور محرکات کے نظام کے تابع ہوتے ہیں، وہ ہی اُن کو پیدا کرتے اور ان کی صورت متعین کرتے ہیں۔ بہرحال یہ خیالات و افکار اپنے وقت اور معاشرے کی سمت بندی کے باعث اس کی آئیڈیالوجی بن جاتے ہیں، اور معاشری زندگی اور طرزِ حیات کے تعلقات، مفادات اور محرکات کی بنیاد بھی بن جاتے ہیں۔ اس طرح لوگ ویسی ہی زندگی اور طرزِ معاشر رکھتے ہیں، جیسے خیالات اور عقائد ان کی آئیڈیالوجی ظاہر کرتی اور متحرک کرتی ہے۔

یہ آئیڈیالوجی اور سوسائٹی کا بنیادی رابطہ ہے، جو عام خیالات سے لیکر نہایت مجرد اور نادر خیالات اور عقائد تک خیال اور عمل، طرزِ فکر اور طرزِ زندگی کو مربوط اور متحرک کرتا ہے۔ مگر اس رابطے کے دوپہلوؤں یعنی آئیڈیالوجی اور سوسائٹی، خیال اور عمل کے اپنے اپنے عوامل اور رجحانات ہوتے ہیں، جو ایک دوسرے کو متاثر اور تشکیل و تدوین کرتے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے اس حقیقت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ کہ وقت اور معاشرہ ہمیشہ ہر طرح کے فکر و خیال

کی سمت بندی کرتے ہیں[1]۔ مگر یہ سمت بندی اس رابطے کے تضاد اور تصادم کے ذریعے وجود پذیر ہوتی ہے۔ جو انسانی زندگی اور معاشرے کی ابدی ضرورت یعنی ضرورت تکمیل متعین کرتی ہے۔ مگر ضرورت تکمیل بھی اپنی افراط و تفریط کے تضاد میں مبتلا ہوتی ہے، کیونکہ انسانی زندگی اور معاشرہ خود اپنی افراط و تفریط کے تضادات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس لئے انسانی فکر ہمیشہ دو حصوں یا صورتوں میں بٹا ہوتا ہے۔ ایک حصہ وہ جو زندگی اور معاشرے کی سابقہ تکمیلات، تعلقات اور نظام کی عکاسی کرتا ہے اور اس کو قائم و دائم رکھنا چاہتا ہے، خواہ وہ تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں اور خوبیوں کے حامل رہے ہوں یا نہیں۔ ایسا طرز فکر رجعت پسند اور ماضی پرست ہو جاتا ہے۔ دوسرا طرز فکر انسانی زندگی اور معاشرے میں نئی ابھرتی ہوئی قوتوں اور رجحانات کو تلاش کرتا ہے، اس لئے تکمیل اور ترقی کی جانب سمت بند ہوتا ہے۔ ایسا طرز فکر ترقی پسندانہ تکمیلی اور مستقبل پذیرانہ ہوتا ہے پہلے طرز فکر میں آئیڈیالوجی اور اس کے مفروضات، نظریات، عقائد اور تصورات پر زور ہوتا ہے، خواہ وہ تکمیلی رہے ہوں یا نہیں۔ دوسرے طرز فکر میں زندگی اور معاشرے کی ترقی، بقا، سلامتی، خوشحالی، اصلاح اور پیش رفتگی پر زور ہوتا ہے، اس لئے وہ ہمیشہ تکمیلی اور پیش بین ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ انسانی تاریخ کے ماقبل تاریخ اور ازمنہ قدیم میں مرد نے اپنی مقابلتاً زیادہ جسمانی زور اور قوت کی بنا پر ایسے آلات، ہتھیاروں اور اوزار میں مہارت حاصل کر لی جن سے اس نے قدرت کے زرعی اور دوسرے وسائل اور پیداوار پر قابو حاصل کر

---

[1] اس حقیقت کو معاشری سائنسدانوں نے عرصے سے تسلیم کیا ہوا ہے۔ فرانس کا ایک مشہور سوشیالوجسٹ ایمیل دورخیم لکھتا ہے۔ "ہم نے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ خیالات حتیٰ کہ ایسے مجرد اور ملحقہ خیالات جیسے زمان و مکان کے تصورات کس طرح اپنی تاریخ اور ارتقا کے ہر لمحے پر اپنے وقت کے معاشری نظام سے گہرا ربط اور انسلاک رکھتے ہیں یہی طریق تحقیق ہمیں یہ سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا کہ علت و معلول کی توجیہ، مادہ اور جوہر کے تصورات اور منطق و استدلال کی مختلف صورتیں کس طرح بنتی ہیں۔"

لیا اور اپنی مخالف قوتوں، خواہ وہ حیوان ہوں یا انسانی گروہ، پر غلبہ حاصل کر لیا۔ ان قدیمی تکمیلات نے انسانی معاشرے میں پہلا معاشری انقلاب برپا کر دیا، جس نے عورت کو بھی مرد کا محکوم، محتاج اور غلام بنا دیا، کیونکہ وہ اپنی جنسی اور جسمانی کمزوری اور مجبوریوں کے باعث اس وقت کے آلات، ہتھیاروں اور اوزاروں کے استعمال میں مرد کا تکمیلی مقابلہ اور ہمسری نہیں کر سکتی تھی۔ اس طرح مرد کے جسم کی ہمہ وقت کارکردگی اور صلاحیت اور ہمہ وقت تکمیلیت کی خوبیوں نے اس کو عورت پر معاشری سبقت، فوقیت اور غلبہ عطا کر دیا۔ یہ مرد کا پدر سرداری غلبہ تھا، جس نے مردوں کی بڑھتی ہوئی تکمیلات کی بنا پر تاریخ انسانی میں گوناگوں معاشروں کو جنم دیا۔ مگر پدر سرداری غلبہ کے باعث یہ تمام معاشرے قرابتدارانہ معاشرے تھے اور کم و بیش آج بھی ہیں، خواہ وہ قبائلی نظام یا جاگیردارانہ ذات پات کے نظام پر مبنی ہوں۔ بہر حال ان قرابتدارانہ معاشروں نے پردہ سسٹم اور پردہ آئیڈیالوجی کو جنم دیا، جو عورت کی محکومی اور محتاجی کی انتہائی صورت ہے جو دنیا کے مختلف پدر سردارانہ معاشروں میں صرف قرون وسطائی مسلم معاشرے میں ہی صورت پذیر ہوئی، جیسا کہ ہم نے باب سوم میں بیان کیا ہے۔

ان قرابتدارانہ معاشروں میں اہلیت افراد اور گروہوں کے لئے تکمیل کے طریقے صرف لوٹ مار، غارتگری، براہ راست استحصال اور زور و جبر اور ظلم و تشدد ہوتے تھے، جن سے وہ اپنی مردانہ قوت اور خصوصیات کی بنا پر دولت و اقتدار حاصل کرتے تھے۔ اور عورتوں کو بھی اپنے غلبے، قبضے اور تصرف میں رکھ کر اپنی ضرورت تناسل کو اپنی ضرورت تکمیل کے تابع کر دیتے تھے۔ پس یہ معاشرے مرد اور عورت کی تقسیم اور بقول مولانا مودودی مرد کے "غلبے اور شدت اور تحکم" پر قائم تھے۔ مگر موجودہ زمانے میں ان معاشروں کے یہ طور و طریقے خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی بن گئے۔ تاہم پردہ آئیڈیالوجسٹ اس نظام حیات کو "قدرتی" قرار دیکر "قائم و دائم رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ان قبائلی اور جاگیردارانہ طور و طریقوں اور طرز معاشرت کو "مردانگی" اور "رجولیت" سے تعبیر کرتے ہیں اور مردانہ "غلبہ اور شدت اور تحکم" کو فطرت انسانی کے عین

مطابق گردانتے ہیں۔ اور مردوں کی "برتری اور فضیلت" کو جدید سائنس، علم و حکمت، کے "محکمات"[1] کہہ کر اس قبائلی اور جاگیردارانہ طرزِ فکر و عمل کو "اسلامی" قرار دیتے ہیں۔ مگر اس آئیڈیالوجی کے پیچھے جو خوف اور اندیشے کام کر رہے ہیں وہ جدید مسلمان عورت کی تکمیلی صلاحیتوں، قوتوں اور رجحانات کے خوف ہیں۔ یہ خدشے بھی کارفرما ہیں کہ جدید مسلمان معاشرہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے "تعاون" "اشتراکِ عمل" شرکت و شمولیت اور مساوات کے تعلقات کی بنیادوں پر استوار ہو کر ایک نیا، طاقتور، خوشحال اور ترقی پسند تکمیلی معاشرہ نہ بن جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب مسلمان عورت بھی پوری طرح تکمیلی بن جائے گی تو وہ نہ صرف مردانہ "غلبے اور شدت اور تحکم" کے ظلم و زیادتیوں کو ختم کر دے گی، بلکہ پردہ اور تعدد ازواجگی کے نظام کو ختم کر کے یک زوجگی کا نظام قائم کر دے گی، جو مرد و زن کی مساوات کی اصل بنیاد ہے۔

گذشتہ زمانوں میں تکمیلی معاشرہ چند تکمیلی افراد، اور اہلیت گروہوں اور طبقوں کے سہارے قائم ہوتا تھا، کیونکہ ان وقتوں میں تکمیل چند لوگوں کی اجارہ داری ہوتی تھی مگر جدید معاشرہ اپنے سارے ممبروں، گروہوں اور طبقوں کی تکمیلات کا محتاج ہے۔ عورتیں جو ہر معاشرے کا نصف ہوتی ہیں۔ خود تکمیلی بن کر سارے معاشرے کو اپنے عمل و مثال سے اور ثانیاً نسلی سائیکل کے عمل کے باعث تکمیلی عورتیں ہر آنے والی نئی نسل کو تکمیلی بنا دیتی ہیں، کیونکہ سارے افراد اور قوم ان کی اولاد

---

[1] امیل دورخیم کہتا ہے کہ انسانی زندگی میں غلبہ اور بالادستی اور محکومی اور مغلوبیت کے تصورات معاشرتی تعلقات نے پیدا کئے ہوتے ہیں اور پھر انسان قدرت کے مظاہر اور قوتوں کی تعبیر ان تصورات کی روشنی میں کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "یہ معاشرہ ہوتا ہے جو لوگوں کو برتروں اور کمتروں میں حکم دینے والے آقاؤں اور حکم ماننے والے نوکروں اور محکوموں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ معاشرہ ہوتا ہے جو اول الذکر میں ایسی خاصیت پیدا کر دیتا ہے جو ان کے احکام کو موثر اور قابلِ قبول بنا دیتا ہے اور اس خاصیت کو "طاقت" میں بدل دیتا ہے لہٰذا پہلی طاقتیں جن کا انسانی ذہن کو ادراک اور خیال ہوا وہ تھیں جنہیں معاشروں نے اپنے آپ کو منظم کرنے کے عمل میں قائم کیا اور پھر انسان نے ان طاقتوں کے تصور کے مطابق طبیعی دنیا کی طاقتوں کو بھی متصور کیا۔ دیکھئے "تھیوریز آف سوسائٹی" از ٹالکوٹ پارسن وغیرہ ص ۱۰۶۹۔

ہوتی ہے جس نے اُن کی گود میں پرورش اور تربیت پائی ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ خاموش مگر مستقل اور ہمہ گیر انقلاب جو کیلی مسلمان عورتیں بھی اپنے معاشرے میں برپا کر دیں گی۔

پردہ آئیڈیالوجسٹ اور فطرت کے معنے

پردہ آئیڈیالوجسٹوں نے جہاں علم و فکر کی اور لغزشیں اور ٹھوکریں کھائی ہیں وہاں وہ فطرت کی فطرت کے سمجھنے میں بھی کھاتے ہیں، قدرت یا فطرت کی اصطلاح نے ہمارے علماء کو جن میں بیشتر اکثریت تعدد ازواجگی اور پردہ سسٹم اور آئیڈیالوجی کی علمبردار رہی ہے، ہمیشہ غلطاں پیچاں رکھا ہے ان کی پریشانی اس وقت شروع ہوئی جب انیسویں صدی کے اواخر میں سر سیّد احمد خان نے قدرت (نیچر) کا مشاہدے، تجربے اور عقل کی بنا پر سمجھنے کا نظریہ پیش کیا، کیونکہ اس سے اُن کے قدرت کے متعلق تمام مفروضات اور تصورات کا ہیولیٰ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا برصغیری علماء کا معتبر حصہ اُن کے خلاف صف آرا ہو گیا اور انہیں "نیچری" کہہ کر اُن کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرنے شروع کر دیئے۔ مگر سر سیّد کے کچھ عرصے بعد مولانا شبلی نعمانی نے "قدرت" کے لفظ کو علماء کے دائروں میں پھر مروج کیا اور ان کی پیروی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جدید یورپ سے متاثر مصری علماء کے اتباع اور قدیم پنتھی فلسفے کے پرچارک ہندو پنڈتوں کی تقلید کرتے ہوئے فطرت کو راہ حق کی تلاش اور دین و دھرم کا ابدی راستہ قرار دیکر اس لفظ کو علماء میں پھر قابل قبول بنا دیا۔ مگر اس قلابازی سے ہمارے علماء قدرت کے معنے اور مفہوم کے سمجھنے میں آگے بڑھنے کی بجائے کئی صدیاں پیچھے جا پڑے۔ آج وہ اس کو ان معنوں اور مفہوم میں نہیں سمجھتے جن میں اسے جدید سائنس اور فلسفے کی دریافتوں اور انکشافات کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس معنوں میں تصور کرتے ہیں جن میں قرون وسطائی یورپ کے عیسائی علماء اور پادری مثلاً ٹھامس اکیونس، تصور کیا کرتے تھے۔ وہ قوانین قدرت کو اٹل اور غیر متغیر نوامیس اور عوامل سمجھتے ہیں اور قدرت کو ایک جامد اور ساکن اور معتدل نظام تصور کرتے ہیں چنانچہ

مولانا مودودی ان کی تقلید میں لکھتے ہیں کہ پردہ سسٹم قدرت (فطرت) کے ایسے قوانین ونوامیس پر قائم ہوتا ہے جو صنفی میلان کو افراط و تفریط سے روک کر توسط و اعتدال کی حالت پر قائم کرتا ہے اور ایسا معتدل اور صالح معاشرہ قائم ہوجاتا ہے جو "فطرت" کا منشا ہے:۔

"اجتماعی زندگی کا نظام ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ ایک طرف غیر معتدل (ابنارمل) ہیجان و تحریک کے اُن تمام اسباب کو روک دے جن کو انسان خود اپنے ارادے اور اپنی لذت پرستی سے پیدا کرتا ہے اور دوسری طرف فطری (نارمل) ہیجانات کی تسکین و تشفی کے لئے ایسا راستہ کھول دے جو خود منشائے فطرت کے مطابق ہو"

"اب یہ سوال خود بخود ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کا منشا کیا ہے؟ کیا اس معاملہ میں ہم کو بالکل تاریکی میں چھوڑ دیا گیا ہے کہ آنکھیں بند کرکے ہم جس چیز پر چاہیں ہاتھ رکھ دیں اور وہی فطرت کا منشاء قرار پا جائے؟ یا نوامیس فطرت پر غور کرنے سے ہم منشاء فطرت تک پہنچ سکتے ہیں؟ شاید بہت سے لوگ صورت اوّل ہی کے قائل ہیں اور اسی لئے وہ نوامیس فطرت پر نظر کئے بغیر ہی کیف ما اتفق جس چیز کو چاہتے ہیں، منشاء فطرت کہہ دیتے ہیں۔ لیکن ایک محقق جب حقیقت کی جستجو کے لئے نکلتا ہے تو چند ہی قدم چل کر اُسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا فطرت آپ ہی اپنے منشاء کی طرف صاف صاف انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہی ہے"[1]

پس پردہ آئیڈیالوجسٹوں کی نظر میں "قدرت ایسا جامد و ساکن، اٹل اور لامتغیر نظام ہے جو ایک طرح کا ذات پات کا معاشرہ قائم کرتا ہے، جس میں ہندوؤں کے چار ذاتی معاشرے کے برعکس، دو ذاتوں کا نظام ہوتا ہے۔ ان میں

---

[1] "پردہ" ص ۱۴۴ - ۱۴۵!

ایک ذات توغالب اور حاکم مردوں کی ہے اور دوسری مغلوب اور محکوم عورتوں کی۔ قوانین قدرت یا نوامیس فطرت عورتوں کو اپنے مالکوں اور آقاؤں کی محکومی کے ایسے نظام میں جکڑ دیتے ہیں جو اس "فعل" پر استوار ہوا ہے جو ایک فریق کے غلبے، شدت اور تحکم اور دوسرے فریق کی نرمی، نزاکت اور قبولیت کا پیدا کردہ ہے۔

قدرت کیا ہے؟

قدرت (فطرت) "تغیر" کا لامتناہی سلسلہ ہے، جو متواتر ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلتا رہتا ہے مگر ہر حالت میں قدرت ہی رہتا ہے۔ "تغیر" کے واقع ہونے سے پہلی حالت بھی قدرت تھی، وقوع پذیر حالت بھی قدرت ہے۔ اور واقعہ یا تغیر کے بعد کی حالت بھی قدرت ہوگی۔ لہٰذا قدرت تمام تغیراتی عوامل، مظاہر، واقعات اور ان کے باہمی اثر اندازیوں اور افراط و تفریط کے سلسلوں کو کہتے ہیں۔ یہ سب قدرت کی جدلیات ہیں ان میں تضاد بھی ہے اور تسلسل بھی، وقوع پذیری بھی ہے اور ظہور پذیری بھی۔ افراط بھی ہے اور تفریط بھی۔ مگر قدرت کے تمام واقعات، عوامل، مظاہر اور تغیرات کی وقوع پذیری اور ظہور پذیری کا اپنا تسلسل یا سلسلہ ہوتا ہے، جسے قوانین قدرت کہتے ہیں۔ جو اپنے مخصوص حالات میں وقوع پذیر یا ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جب تک یہ حالت باقی رہتی ہے تو قدرت کے عوامل اور مظاہرات کا واقعاتی اور ظہور پذیر سلسلہ یا قانون بھی قائم رہتا ہے مگر جب یہ حالات یا حالت جزواً یا کلیتاً بدل جاتی ہے، تو یہ تسلسل بھی اس حد تک جزوی یا کلی طور پر بدل جاتا ہے۔ لہٰذا قوانین قدرت اس وقت تک ہی قائم و دائم ہیں جب تک ان کا واقعاتی نظام جاری و ساری ہے۔ اس لئے ان میں بذات خود کوئی ثبات ابدیت یا اٹل پن نہیں پایا جاتا۔ وہ سب وقت یعنی واقعاتی تغیر اور تسلسل کے تابع ہیں۔ پس جب تغیراتی اور واقعاتی حالات بدلتے ہیں تو قدرت بھی نیا روپ دھار لیتی ہے، مگر پھر بھی وہ قدرت رہتی ہے اور اس کے جزوی یا کلی طور پر نئے عوامل، مظاہرات، قوتیں اور واقعات کے سلسلے اور

تسلسل نئے قوانین قدرت بن جاتے ہیں. مگر چونکہ یہ بھی قدرت کے عوامل، مظاہر اور قوتوں کے باہمی اثراندازی، باہمی وقوع پذیری اور ظہور پذیری. کی حالت میں ہوتے ہیں، اس لئے اُن میں اور سابقہ عوامل اور مظاہرات اور قوانین میں سوائے ایک فرق کے، باقی کوئی اور فرق نہیں ہوتا. یہ فرق ان عوامل، مظاہرات اور قوتوں کی اندرونی اور باہمی تشکیل اور صورت کا فرق ہے، جسے وقت کہتے ہیں. مگر اپنی ہر بدلتی ہوئی حالت میں قدرت اور وقت ایک ہی چیز کے دو رُخ ہوتے ہیں. قدرت عمل اور تغیر کا نام ہے اور وقت اُن کی وقوع پذیری اور ظہور پذیری کا نام ہے. یہ غیر ذی جان قدرت کے عوامل، مظاہرات و تغیرات اور واقعات ہیں، یعنی کل کائنات منفی ذی جان ہستیاں.

قدرت اور زندگی

غیر ذی جان قدرت میں خاص حالتوں کے تحت ایک ایسا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے جس میں بعض قدرتی عوامل، مظاہر قوتوں اور تغیرات کے تسلسل کا معینہ حدود میں اس طرح اعادہ ہوتا ہے کہ ضروری قدرتی عوامل اور قوتیں وغیرہ کو حاصل کر کے مقدار میں بڑھ جائے اور نشو و نما کرے اور اس عمل کو باقی رکھے. اس اعادہ پذیر عمل کو جان اور اس کی معینہ حد بندی کو جسم اور اس کے جاری رہنے کو زندگی کہتے ہیں. جان اور جسم کے تعلق سے جو مخصوص صورت بنتی ہے اُسے ذی جان یا جاندار ہستی کہتے ہیں، جو وائرس اور بکٹیریہ اور پودوں اور جانوروں سے لیکر انسان تک لاتعداد صورتوں اور شکلوں میں ملتی ہے. جانداروں کے جسم اور جان میں ایسے متضاد عوامل اور قوتیں اور مظاہر اور تغیرات بھی پائے جاتے ہیں جو اُن کے زندہ رہنے کے عمل کو ختم کر دیتے ہیں، جسے موت کہتے ہیں. ہر ایک ذی جان کا یہ خاصہ ہے کہ وہ قدرت کے اُن عوامل، مظاہر، تغیرات اور قوتوں، حالات اور حالتوں کی تلاش کرتا ہے جن میں وہ زندہ رہ سکتا ہے اور جو اس کی جان اور جسم کے اپنے عوامل، قوتوں، صلاحیتوں تغیرات اور حالتوں کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ضروری اور مددگار ثابت ہوتے ہیں اور اُن قدرتی عوامل، مظاہر، تغیرات اور قوتوں اور حالتوں کو اپنے جسم و جان پر اثرانداز ہونے

سے روکتا ہے جو اس کے جسم و جان کے اپنے عوامل، تغیرات، مظاہر اور قوتوں اور حالتوں کو برقرار رکھنے میں مخل ہوں یا خراب کریں یا کم کریں۔ یہ زندگی کی جدلیات ہے، جو قدرت کے عوامل اور مظاہرات وغیرہ کی وقوع پذیری اور اثر پذیری کے عوامل نے ذی جان کے جسم و جان کے اندر اور باہر قائم کر دی ہے۔ ان اندرونی اور بیرونی عوامل کے اثرات اور محرکات سے ذی جان اپنی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے اُن قدرتی حالات اور ذرائع کی تلاش کرتا ہے جن کو اپنے اندر ڈال کر یعنی کھا کر یا اور ایسے حالات تلاش کرتا ہے جس میں اس کی جان اور جسم، محفوظ رہیں زندہ رہتا ہے، مگر اس کی تلاش اور مزاحمت کی قوتیں اور اثرات جسم اور جان کی قوتوں کے اعادے کو خاص مدت تک ہی قائم رکھ سکتے ہیں اور پھر کم ہو کر ختم ہو جاتی ہیں، جس کو قدرتی موت کہتے ہیں۔ اس مدت کو جب تک ذی جان کی زندگی باقی رہی اس کی عمر کہتے ہیں، جو زیست و موت کی منفی اور مثبت حالات اور تغیرات اور عوامل کی وقوع پذیری کا دوران یا مدت ہے۔ اس مدت کے دوران ذی جان قدرت کے عوامل، مظاہر، تغیرات اور قوتوں اور حالات سے خوراک اور حفاظت مطابقت اور موافقت تلاش کر کے اپنی جسم و جان کو باقی رکھتا ہے۔ مطابقت اور موافقت کی تگ و دو کے مختلف عوامل میں جنس بھی ایک مفید اور معاون ہوتا ہے خاص طور پر اعلیٰ ذی جانوں میں، جن کے جسم زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔ جنس ذی جان کو دو صورتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک نر اور دوسرا مادہ، تاکہ عمل تناسل سے نئی نسلوں کے جسم و جان میں نئی روح اور تازہ دم پھونک دیا جائے، اور اُن میں زندگی کی تلاش کی قوتوں میں اضافہ اور فروغ پیدا کر دے۔ اس سے دونوں نر اور مادہ جنس نئے ذی جان میں جسم و جان کی قوتوں اور صلاحیتوں کا تعین کرتے ہیں۔ اعلیٰ جانوروں میں یعنی دودھ پلانے والے جانوروں میں، چونکہ بچہ مادہ کے رحم میں کچھ مدت نشو و نما پاتا ہے، جبکہ ادنیٰ جانوروں میں دونوں نر اور مادہ اپنے انڈے قدرت کے بیرونی حالات میں دیتے ہیں اور بچے کی دیکھ بھال نہیں کرتے، اس لئے اعلیٰ جانوروں میں عمل تناسل زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ ادنے جانوروں میں نر اور مادہ دونوں کوئی بھی اپنے بچوں کی دیکھ بھال نہیں کرتے، بلکہ قدرت

میں کسی مناسب جگہ تخم ریزی کے بعد اُن کی پیدائش سے بھی لاتعلق رہتے ہیں۔ اعلیٰ جانوروں میں پرندوں میں زیادہ تر نر اور مادہ دونوں اپنے بچوں کو انڈے سی کر نکالنے میں اور اُن کی پرورش اور پرواز وغیرہ کی تربیت میں تعاون کرتے ہیں۔ اس لئے اُن میں نر اور مادہ اکثر جوڑے جوڑے رہتے ہیں۔ جب تک بچے اپنی خوراک خود تلاش کرنے اور اپنی حفاظت خود کرنے کے لائق نہیں ہو جاتے اور اڑنا یا چلنا نہیں سیکھ جاتے، نر اور مادہ کا جوڑا اُن کو اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ مگر چند دنوں یا ہفتوں کے بعد جب اُن کے بچے اتنے بڑے ہو جاتے ہیں کہ اپنی نوع کی خوراک اور حفاظت تلاش کرنے کے لائق ہو جاتے ہیں، تو وہ اپنے "ماں باپ" سے الگ ہو جاتے ہیں اور بعض انواع میں نر اور مادہ بھی بچے دینے کی اگلی موسم تک الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ پرندوں کی دنیا کے اُن حرکات اعمال اور تعلقات کو ہمیں کس طرح بھی انسان نما انداز میں تشریح اور تاویل نہیں کرنی چاہیئے، جیسے بعض شائقین کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کا جوڑے جوڑے کی صورت میں رہنا انسان کے جوڑے جوڑے رہنے سے یا اُن کا بچوں کی پرورش اور تربیت میں نر اور مادہ کا تعاون انسان کی حالت سے کوئی بنیادی مشابہت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اُن کے عوامل اور محرکات غیر شعوری جبلتوں پر مبنی ہیں، جبکہ انسان میں جو عوامل اور محرکات کارفرما ہیں وہ لاشعوری اور شعوری ہوتے ہیں۔ اعلیٰ جانوروں میں دودھ پلانے والے جانوروں میں نر اور مادہ کا تناسلی رول اکثر انواع میں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ نر کا رول محض تخم ریزی تک محدود رہتا ہے، جس کے بعد وہ نہ تو مادہ ہی سے کوئی تعلق رکھتا ہے اور نہ ہی اس بچے سے جو مادہ کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نر اور مادہ کے جنسی تخموں سے مل کر جو جنین یا مضغہ بنتا ہے وہ مادہ کے رحم میں اس کے خون سے پرورش پا کر اپنی میعاد حمل کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اور پیدائش کے بعد بھی یہ بچہ اپنی ماں کے دودھ اور بچاؤ اور تربیت میں پلتا ہے، حتیٰ کہ چند مہینوں یا ایک دو سال کے بعد اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ اپنی نوع کی خوراک اور حفاظت خود تلاش کر سکے اور پھر اپنی ماں سے الگ ہو جاتا ہے۔ ماں پر ابتدائی انحصار کی وجہ

سے دودھ پلانے والے جانوروں میں ایک نیا رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ اُن کی غول پسندی یا گروہ کی صورت میں زندگی گزارتا ہے۔ یہ غول یا گروہ زیادہ تر بچے دینے والی مائیں، اُن کے دودھ پینے والے بچے اور جوان مادوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بعض گروہوں یا غولوں میں جوان نر بھی ساتھ رہتے ہیں اور حفاظت اور تخم ریزی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مگر ایسی انواع بھی ہیں جن کے جوان نر مادوں کے غول سے الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں مگر تزوجی موسم میں مادوں کے غول میں آجاتے ہیں اور اکثر اپنے رقیب نروں کو لڑ کر بھگا دینے کے بعد تزوجی رابطہ قائم کرتے ہیں، جس کے بعد پھر الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں۔ دودھ پلانے والے جانوروں میں اس نوع کی طرز زندگی بھی انسان کی طرز زندگی سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی۔ کیونکہ انسان غول پسندی سے بڑھ کر معاشرت پسند جانور ہے۔ علاوہ ازیں اس کے نر والا عمل تزوج اور مادہ والا عمل تناسل موسموں کا پابند نہیں۔ اس لحاظ سے انسان دودھ پلانے والے جانوروں کی مختلف انواع و اقسام میں صرف بندروں اور بن مانسوں سے کچھ مشابہت رکھتا ہے۔ اُن کے غول نر اور مادہ اور بچوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور نر کا عمل تزوج اور مادہ کا عمل تناسل سال کی ہر موسم میں جاری رہتے ہیں۔ مگر غول پسندی کے باوجود بندر اور بن مانس میل جول اور ارتباط کے وہ وسائل اور ذرائع اور ذہن و شعور کے وہ عوامل اور قوتیں اور صلاحتیں نہیں رکھتے جو انسان کو حاصل ہیں۔ اس لئے وہ انسان کی طرح نہ تو ہمہ گیر معاشرتی ارتباط و اختلاط کے اہل ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنی غولیت تشکیل کرنے، بنانے، بدلنے اور ترقی دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

انسان، معاشرہ اور قدرت

معاشرہ انسان کی زندگی کا تشکیلی عمل ہے جس میں اس کے ارکان اپنی انفرادی اور اجتماعی ضروریات کو تکمیل کرنے کے لئے موزوں، ضروری، مفید اور سازگار حالات اور مواقع پیدا کرتے ہیں۔ مگر اسی عمل اور ماحول کے اندر اور باہر ایسے انفرادی اور اجتماعی عوامل اور محرکات بھی ہوتے ہیں جو اس کے مخالف اور متضاد تشکیل کے لئے سرگرم عمل و تخیل ہوتے ہیں جو معاشرے کے

اپنے اندرونی حالات اور عوامل اور اس کے بیرونی معاشروں کے اپنے اندرونی حالات اور عوامل پیدا کرتے ہیں۔ ان کی ضروریات، خواہشات، رجحانات، مفادات اور تعلقات کی تکمیل قدرت کے عوامل، مظاہر، قوتوں اور قوانین کے ذریعے اور وسیلے سے حاصل یا پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے، جو معاشرے کے ارکان اپنے علم و عقل، فن اور صلاحیتوں سے معلوم کر کے بروئے کار لاتے اور استفادہ کرتے ہیں، مگر اسی طرح معاشرے کے مخالف قوتیں بھی قدرت کے وسائل و ذرائع کو معلوم اور منظم کر کے اس کے خلاف صف آرا ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس تضاد اور مخالفت سے معاشرہ متواتر بدلتا اور نئی نئی صورتیں اختیار کرتا ہے، مگر ان متضاد اور مخالف قوتوں اور عوامل میں وہی معاشرتی نظام قائم و دائم رہتا ہے جو قدرت کے عوامل، مظاہر اور قوانین کی قوتوں، وسائل اور ذرائع کو اپنے ارکان کی انفرادی اور اجتماعی قوتوں، صلاحیتوں اور رجحانات سے انسانی ضروریات، مفادات اور تعلقات کی تکمیل کو زیادہ مؤثر، بہتر، زیادہ خوشحال اور حیات پرور تشکیل اور تنظیم عطا کرتا اور برقرار رکھتا ہے۔ معاشرے کے اس تشکیلی اور تکمیلی عمل میں نسلی سائیکل کے عمل کے باعث اس کے مردوں اور عورتوں کے جنسی تناسلی تعلقات، مفادات، محرکات اور عوامل فیصلہ کن رول ادا کرتے ہیں غیر انسانی جانداروں میں جنس خالصتاً قدرتی عمل ہے۔ ان کے عمل تناسل میں نر اور مادہ کی تخم ریزی قطعی قدرتی عوامل و عواقب کی حامل ہے جو صرف نوع اور نسل کو جاری رکھنے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ لہٰذا ان جانداروں میں تخم ریزی کا جنسی فعل قطعی لا اخلاقی اور لا ذمہ دارانہ نوعیت کا ہوتا ہے مگر انسانی زندگی میں عمل تناسل قطعی مختلف نوعیت کا ہوتا ہے، جس پر جانوروں اور دوسرے جانداروں کی تخم ریزی کے عمل کو منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا مودودی کے طرز استدلال اور منطق کی بڑی غلطی یہی ہے کہ انہوں نے غیر ذی شعور جانوروں کے جنسی فعل کی نوعیت کو انسان پر منطبق کر دیا اور یہ فیصلہ دے دیا کہ جنسی فعل کا ایک فریق جانوروں کے جنسی فعل والی لاتعلقی اور غیر ذمہ دارانہ چال چلن اختیار کر سکتا ہے، کیونکہ عمل تناسل میں تخم ریزی کے ساتھ ہی اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے جبکہ اس عمل کا سارا بوجھ فریق ثانی پر پڑتا ہے، مگر حقیقت مولانا صاحب کی اس

تاویل و تشریح سے کوسوں دور ہے۔ بیشک مرد اپنے خوابوں کی لاشعوریت میں تو اپنے جنسی رول کی غیر ذمہ داری اور معاشرتی لاتعلقی کا اظہار کر سکتا ہے مگر معاشرتی زندگی میں ایسے غیر ذمہ دارانہ اور لاتعلق چال چلن کو قائم رکھنے کے لئے مرد کو اپنی "مردانگی" "رجولیت" اور "قوامیت" کے تصورات، نظریات اور رسم و رواج اور تعلقات وغیرہ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ دراصل یہ طرز استدلال اور طرز عمل اس معاشرے اور آئیڈیالوجی کی ترجمانی کرتا ہے جس میں عورت کو غیر اخلاقی ہستی تصور کیا جاتا ہے جس کی زندگی اور ہستی کا جواز محض مرد کے لئے عمل تناسل کا ذریعہ اور آلہ ہے تاکہ وہ اس سے بچے پیدا کر کے اپنے خاندانی اور قرابتداری مفادات اور تعلقات کو قائم و دائم رکھے۔

بہرحال، مرد اور عورت کے جنسی اور غیر جنسی اختلافات اور تعلقات کی نوعیت اور ان کی تاویل و تشریح ہر شخص اپنے معاشرے کی تکمیلی اور تشکیلی صورتحال کو قائم و دائم رکھنے یا اصلاح اور بہتر بنانے کے مفروضات اور تقاضوں اور محرکات، محکمات، اور نظریات کے مطابق کرتا ہے، جو اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ مرد اور عورت اپنے جنسی اور غیر جنسی تعلقات اور چال چلن کو کیا صورت دیتے ہیں۔ لہٰذا انسانی جنسول میں محض حیاتیاتی عوامل تلاش کرنا اور اُن کو "قدرتی" یا "فطری" قرار دینا بالکل غلط خیال اور غلط طرز استدلال ہے، کیوں کہ انسان کے تمام قدرتی محرکات، عوامل، ور رجحانات کو معاشرے نے اپنے تہذیبی اور تمدنی تکمیلات کے ذریعے ایسی خاندانی، معاشرتی اور نظریاتی تشکیل دیدی ہوتی ہے جن میں مرد اور عورتیں عمل پیرا ہوتے ہیں۔

"فطرت کا منشا" فطرت خواہ کائناتی ہو یا انسانی، خارجی ہو یا داخلی، تغیرات اور تضادات کا ایسا سلسلہ ہے جس کے عوامل، مظاہر اور قوتوں وغیرہ کو انسان اپنے کام اور محنت اور عمل و تکمیل کے لامتناہی کوششوں اور جدوجہد سے ہی معلوم کر سکتا ہے جن سے اُسے فطرت (قدرت) کے متعلق نت نئی معلومات، انکشافات

نظریات، خیالات، تصورات اور عقائد وغیرہ حاصل ہوتے ہیں۔ مگر انسانی زندگی اور معاشرے کے اپنے تضادات، محرکات اور عوامل کے باعث یہ خیالات، معلومات اور عقائد وغیرہ تعصبات، توہمات، غلط معلومات اور مغالطے اور متشابہات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ تبدیلی اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ مزید انفرادی اور اجتماعی تحقیق و تجزیہ، تلاش اور کوشش، محنت و مشقت، کام اور عمل اور تکمیل سے انسانی زندگی معاشرے اور فطرت کے عوامل، قوتوں، مظاہر اور قوانین کو دریافت اور معلوم کیا جائے اور نئے علم و حکمت، عقل و استدلال کی روشنی میں سابقہ خیالات، رویوں، معلومات نتائج اور نظریات کی تطہیر اور تصحیح کی جائے اور صحیح اور سچے خیالات، نظریات اور عقائد کو فروغ دی جائے۔ یہ تکمیلی عمل ہر سطح اور ہر صورت میں اتنا ہی لامتناہی ہے جتنا قدرت کے تغیراتی عوامل اور تضادات وغیرہ۔ لہٰذا چند قدم چل کر "فطرت کا منشا" معلوم ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فطرت کا منشا وہی ہوتا ہے جو انسان کا تکمیلی منشا ہو۔ مگر یہ منشا اسی وقت تک تکمیلی رہتا ہے جب وہ انسانی زندگی اور معاشرے کی ترقی، خوشحالی، بہتری، بقا اور سلامتی کے لئے انسان اور قدرت کی تمام قوتوں، وسائل، ذرائع اور عوامل و مظاہر کو بلا کسی مفروضہ یا نظریاتی تقسیم اور حد بندی کے بروئے کار لائے۔

ہر آئیڈیالوجی کا مجموعی طور پر اور اس کے نظریات، عقائد، تصورات اور خیالات وغیرہ کا جزوی طور پر امتحان اور آزمائش انفرادی اور معاشرتی عمل تکمیل کے تجربوں اور تاریخ سے یا عقل و استدلال کے ایسے تجزیہ اور تحقیق میں ملتا ہے جو انسانی زندگی اور معاشرے کے آنے والے واقعات اور تغیرات کی ایسی پیش بینی اور پیشگوئی کریں جو نظریاتی اور معاشرتی مفروضات اور محکمات سے بالاتر ہو کر حقیقت و صداقت کے متلاشی ہوں اور جو علم و حکمت اور انسانی زندگی اور معاشرے کی ترقی اور فلاح و بہبود کی تلاش میں سطحی اور اٹل نظریات، توقعات اور طریقوں کے متمنی نہ ہوں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مرد اور عورت کے جنسی اختلاف قدرتی حقائق نہیں؟ اگر ہیں، تو کیا مرد اور عورت کی زندگی اور فرائض میں تقسیم اور حدبندی قدرتی نہیں؟ کیا اس قدرتی فرق کی روشنی میں عورت کے لئے وہی آزادی فکر و عمل ممکن ہو سکتی ہے جو قدرتاً مرد کو حاصل ہے؟ لہٰذا کیا عمل و تکمیل میں عورت مرد کے مساوی اور برابر ہو سکتی ہے؟

مردوں اور عورتوں کے اختلافات کی نوعیت

مرد اور عورت کے جسم جنس، ذہن و نفس، عادات و کردار کے اختلافات کا مطالعہ زمانۂ جدید میں سائنٹفک مشاہدے، تجربے، غور و خوض اور تحقیق کا موضوع بن گیا ہے۔ عضویات (فزیالوجی) اناٹومی، حیاتیات اور نفسیات اور عمرانیات کے علوم دونوں جنسوں میں متعدد فرق بیان کرتے ہیں اور ہر نئے مشاہدے، تجربے اور تحقیق نے ان اختلافات کی فہرست میں اضافہ کیا ہے۔ یہ جنسی جدلیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ مگر ہم یہاں ان اختلاف کا ذکر مختصر الفاظ میں کریں گے۔ ہمارا مقصد ان کی نوعیت واضح کرنا ہے نہ کہ اُن کی فہرست بیان کرنا، جو کبھی بھی مکمل نہیں ہوگی۔

عام طور پر مردوں کی نسبت عورتیں قد میں چھوٹی، کم مسکولر اور جسمانی طاقت میں کمزور ہوتی ہیں۔ مرد عورتوں کی نسبت زیادہ جارحیت پسند اور خود اعادی ہوتے ہیں، یعنی وہ پہل کرنے میں تیز اور دعویٰ جتلانے میں جلدباز ہوتے ہیں۔ وہ جنسی رقابت میں غصہ کا اور عورت غم کا زیادہ اظہار کرتی ہے بالفاظ دیگر، مردوں کے جذبات کے اظہار کا رجحان زیادہ تر خارجی اور عورتوں کا داخلی ہوتا ہے۔ عقل و فراست میں عورتیں مردوں کے برابر ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس کا اظہار وہ قدرے مختلف انداز میں کرتی ہیں۔ مردوں کا زیادہ رجحان حساب و ریاضی، مشینوں اور چیزوں کی جوڑ توڑ کی طرف ہوتا ہے، جبکہ عورتوں کا میلان

طبع زیادہ تر میل ملاپ، انسانی تعلقات کی قدردانی، اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بک دستی کی جانب ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر، مرد زیادہ تر بڑے پیمانے پر کام کرنے میں طاق ہوتے ہیں اور عورتیں عموماً چھوٹے پیمانے پر کام کرنے کی طرف مائل ہوتی ہیں مرد ہاتھ پاؤں کو زیادہ استعمال کرنے کا رجحان رکھتے ہیں، جبکہ عورتیں انگلیوں کا استعمال کرنے کا میلان رکھتی ہیں۔ بہت حد تک مرد اپنی خودی کی طرف سمت بند رہتے ہیں، جبکہ عورتیں میں احساس وخیال دیگراں زیادہ ہوتا ہے۔ عورتیں زیادہ اضطراری، زیادہ جذباتی، زود متاثر، زود رنج ہوتی ہیں۔ وہ مردوں کی نسبت زیادہ معاملہ فہم، ہمدرد، مطابقت پذیر اور روایت پرست ہوتی ہیں۔ اُن میں کام کا بوجھ برداشت کرنے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، وہ زیادہ محنتی ہوتی ہیں اور مردوں کی نسبت انجام کاری اور انصرام کی زیادہ صلاحیّت رکھتی ہیں، جبکہ مردوں میں تھوڑے عرصے کے لئے اپنی طاقت اور قوت کھپانے اور سخت محنت ومشقت کرنے کی صلاحیّت زیادہ ہوتی ہے اور اس کے بعد انہیں آرام اور قوت یابی کے لئے کچھ مدت درکار ہوتی ہے۔ عورتوں کی نسبت مرد مجرد سوچ وبچار یا خیال انگیزی کی زیادہ صلاحیّت رکھتے ہیں، اس لئے عورتوں کی نسبت مردوں میں غیر معمولی ذہانت اور عظیم لوگ زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے مردوں میں عورتوں کی نسبت احمقوں اور پاگلوں کا تناسب بھی زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ ان میں پاگل پن، جنون اور ضعف عقل کے واردات زیادہ ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں، مردوں میں جرائم پیشہ، شرابی، نشہ باز، اور خودکشی کرنے والوں کی تعداد بھی مقابلتاً زیادہ ہوتی ہے۔ بہرحال مرد انفرادیت پسندی، خودرائی، سرکشی اور طمع کی جانب زیادہ میلان رکھتے ہیں۔ مشہور فرانسی وجودیّت پسند فلسفی خاتون، سیمون دوبووار لکھتی ہے:

"عورت مرد کی نسبت کمزور ہوتی ہے۔ وہ مسکولر (muscular) طاقت کم رکھتی ہے۔ اس کے خون میں سرخ خون کے کارپسلز کم ہوتے ہیں۔ اس کے پھیپھڑوں کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ وہ مقابلتاً آہستہ دوڑتی ہے،

اور کم وزن اٹھا سکتی ہے۔ وہ مرد کا مشکل ہی سے کسی سپورٹ میں مقابلہ کر سکتی ہے اور مار کٹائی میں بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ان تمام کمزوریوں کے علاوہ' اس میں متلون مزاجی اپنے پر کنٹرول کی کمی' اور اپنی جنسی فزیالوجی اور تناسلی فرائض کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ یہ سب حقائق ہیں۔ لہٰذا دنیا پر اس کی گرفت زیادہ محدود ہے۔ اس میں مختلف منصوبوں اور پراجیکٹوں کی انجام دہی کی صلاحیت کے لئے استقلال اور ثابت قدمی کی کمی ہے۔ بالفاظ دیگر' اس کی انفرادی زندگی مرد کی نسبت کم وافر ہوتی ہے[1]

یہ ناقابل تردید حقائق ہیں' جنہیں ہمارے پر وہ آئیڈیالوجسٹ "فطرت" یا "قدرت" کا نام دیتے ہیں۔ مگر کام اور تکمیل کے لئے انسانی صلاحیتوں کا تعین انسان کی حیاتیات نہیں بلکہ اس کا معاشری اور تاریخی ترقی کا تکمیلی عمل کرتا ہے۔ جس میں وہ پیدا ہوتا ہے' یعنی اس معاشرے' تہذیب و تمدن کی اپنے خاص وقت اور دور میں سائنس و فنون اور ٹیکنالوجی اور صنعتی ترقی اور پیش رفتگی متعین کرتی ہیں۔ یہ صورتحال کبھی ساکن نہیں رہتی' بلکہ اپنے ماضی اور حال کے مقابلے میں اور ساری دنیائے انسانی کی معاشری اور تاریخی صورتحال کے لحاظ سے ہر وقت بدلتی رہتی ہے۔ تاہم پر دہ آئیڈیالوجسٹ اور مفکرین کا خیال ہے کہ انسانی صلاحیتوں کی صورت غیر متغیر اور ساکن رہتی ہے' جس کے باعث مردوں اور عورتوں کے فرائض اور فنکشنز رول اور کردار اپنے جاگیردارانہ ماضی میں جو مخصوص اور معین صورت اختیار کر چکے تھے وہی ہمیشہ مقرر اور معین رہیں گے اور رہنے چاہئیں۔ اسی وجہ سے یہ لوگ انسانی زندگی کے بارے میں رجعت پسند رویہ رکھتے ہیں اور ان مراعات اور مفادات کو جو قبائلی اور جاگیردارانہ ایلیت نے حاصل کئے تھے' ان کی حمایت کرتے ہیں اور

---

[1] Simone de Beauvoir, *A History of Sex*, p. 56.
New English Library, London.

مسلم معاشرے کو گذشتہ زمانوں کی تخریب اور انحطاط و تنزل و انتشار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں جیسا کہ ہمارے معاشرے کے اندرونی اور بیرونی دشمن بھی چاہتے ہیں۔

بادی النظر میں جنسی اختلافات مردوں اور عورتوں کو نہ صرف دو مختلف بلکہ مخالف ہستیاں بنا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں فرق ہوتا ہے وہاں مخالفت اور مخاصمت بھی ہو سکتی ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق کو زیر لانے اور غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ مخالف فریق کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کر بیٹھے جو غالب فریق کے مفاد یا مقصد کے خلاف ہو۔ یہ حاکم و محکوم، آقا اور غلام مالک اور نوکر کے تعلقات کی نوعیت ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا مرد اور عورت کے فرق اور اختلافات بھی ایسی نوعیت کے حامل ہیں؟ کیا یہ فرق عورت اور مرد کو زندگی کے معاملے میں دو مختلف اور متضاد دائرے حیات میں رکھتے ہیں جن میں سوائے حیاتیاتی زن و شوئی تعلقات کے علاوہ اور تعلقات ناممکن ہوتے ہیں؟

ان سوالات کے حل تلاش کرنے کے لئے ہمیں انسانی زندگی کی حیاتیاتی حقیقت یعنی انسانی جسم کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ انسانی جسم کام، عمل، محنت اور تکمیل کا آلہ ہے یہ ایک ذریعہ ہے جس سے ہم اپنی دنیا پر قابو اور کنٹرول حاصل کرتے ہیں، یعنی تسخیر فطرت یا تسخیر کائنات کرتے ہیں۔ اس تسخیر ہی سے ہر فرد اپنی زندگی کو بہتر، زیادہ خوشحال اور خوشگوار اور زیادہ مؤثر اور کارگر بناتا ہے۔ مگر محض ایک فرد انسانی کا جسم یہ کام اور تکمیلات حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کو دوسرے انسانوں کے تعاون اور اشتراک عمل کی ضرورت ہے اور ایسے آلات اور اوزاروں کی ضرورت ہے جن سے یہ مقاصد تکمیل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کی جدلیاتی صورتحال ہے یعنی زندگی کا عمل اختلافی عمل ہے جس میں ہر فرد ایسے دوسرے فرد کے مدمقابل ہے جو کسی لحاظ سے مختلف ہے اور ایسے ذرائع اور آلات کا محتاج ہے جو اس کا مقصد کلی طور سے حاصل نہیں کر سکتے، خواہ وہ کتنے ہی کامل کیوں

نہ ہوں۔ یہ تمام فرق، اختلافات اور خامیاں اور نقائص زندگی کی جدلیات اور ارتقا کا لازمی حصہ ہیں۔ ان کے باہمی عمل، ردعمل، تغیر اور تبدیلی سے زندگی بنتی ہے، کام سرانجام کیے جاتے ہیں، تکمیلات حاصل ہوتی ہیں اور زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ یہ جدلیاتی عمل حیاتیاتی یا جنسی سطح پر بھی اور معاشری اور تاریخی سطحوں پر بھی سرگرم عمل رہتا ہے۔

دنیائے انسانی میدانِ عمل و تکمیل ہے۔ انسانی زندگی جدلیاتی عمل اور ایک محرک مظہر ہے۔ یہ فرد اور دنیا کے باہمی عمل کا نام ہے، نہ کہ کوئی ساکن، جامد اور غیر متغیر تعلق۔ اپنی زندگی کے ہر لمحے اور ہر سطح اور حالت میں فرد اپنے آپ کو اور اپنی دنیا اور ماحول کو بنایا بگاڑ رہا ہے۔ اگر وہ کچھ نہیں کرے گا اور اردو کی مثل کے مصداق، ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا، تو دوسرے افراد ایسا کچھ کرتے رہیں گے جو اس کے خلاف جاتے گا، کیونکہ خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں، وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ اس کی دنیا اور ماحول کو اس کے خلاف بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ صرف اس کا عمل اور ردِّعمل ہی دوسروں کی حرکات وسکنات سے مل کر اور متاثر ہو کر سب کے لئے قابل حیات دنیا اور ماحول بنا سکتا ہے۔ پس اپنے عمل سے ہر شخص نہ صرف اپنی فرد ا یا مستقبل کو بلکہ اپنے گروہ اور معاشرے اور اپنے لوگوں اور قوم کے مستقبل کو بناتا ہے۔ اگر وہ عمل سے عاری اور تکمیل سے قاصر ہے تو وہ نہ صرف اپنی فردا ہی نہیں بگاڑتا، بلکہ اپنے گروہ، قوم اور معاشرے کے مستقبل کو بھی بگاڑتا ہے۔ بالفاظ دیگر، انسانی دنیا گذشتہ تکمیلات یا ماضی کا مٹتا ہوا سلسلہ ہے، جسے حال میں عمل و تکمیل سے بھر پور کرنے اور بہتر بنانے کی ضرورت ہے، تاکہ ایک بہتر وافر اور بھرپور حقیقت بن کر مستقبل کی طرف بڑھے۔ یہ تکمیلی افراد کا معاشری اور تاریخی رول ہے، ہر شخص وہی ہوتا ہے جس کا اس نے ارادہ کیا، ویسا ہی ہوتا ہے جیسا وہ چاہتا ہے، وہی کرتا ہے جس کا اس نے منصوبہ بنایا اور خواب دیکھے اور تکمیل کئے۔

اس لحاظ سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں اخلاقی ہستیاں ہیں

دونوں انسان ہیں۔ دونوں زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں یکساں اور مساویانہ جزا و سزا کے متحمل ہوتے ہیں، یکساں راحت تسکین اور رنج و غم سے متاثر ہوتے ہیں۔ جنس بھی زندگی کی جدلیات کا حصہ ہے اور بذاتِ خود بھی جدلیاتی عمل ہے۔ دونوں جنس اس عمل کے دو یکساں اور مساوی یا مساوی القوی عوامل ہیں، جن کے باہمی عمل سے زندگی کی افزائش ہوتی ہے، جس میں کسی ایک جنس کو دوسرے پر کوئی برتری، فوقیت یا غلبہ حاصل نہیں۔ دونوں منفرد، مختلف اور متضاد صورت اور تشکیل کے حامل ہیں، جو اُن کے حیات افروز جدلیاتی عمل کی لازمی اور ضروری صورت ہے۔ مرد اور عورت کے تمام جنسی فرق خواہ وہ جسمانی ہوں یا نفسیاتی، جنسی جدلیات میں یکساں، مساویانہ اور معاون حیثیت رکھتے ہیں۔

انسانی دنیا اور معاشرہ حیاتیاتی جبلتوں کی دنیا نہیں بلکہ معاشری اور تاریخی عوامل کی دنیا ہے۔ یہ ارادے اور عزم، انتخاب اور منصوبے، سکیم اور پراجیکٹ کی دنیا ہے، خواہ وہ مرد کے ارادے اور عزم، فیصلے اور منصوبے ہوں ہوں یا عورت کے۔ دونوں اپنی دنیا کے بنانے اور تغیر کرنے کے وعدے ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں سوائے اُن کے جو ان کے معاشرے، تہذیب و تمدن، اور آئیڈیالوجی نے منفرد اور متعین کئے ہوں اور معاشری ارتقاو تاریخ نے عائد کئے ہوں۔ مگر یہ فرق عمل و تکمیل سے مٹائے جا سکتے ہیں۔ تکمیل تغیر اور ماورائیت کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ دنیا میں کوئی چیز اور حالت ایسی نہیں جو مرد اور عورت اپنی انفرادی اور اجتماعی، باہمی اور مشترکہ پسند اور انتخاب سے، عزم و ارادے سے، کام اور محنت سے، کوشش اور جدوجہد سے اور عمل و تکمیل کی لگن اور وابستگی سے تبدیل نہیں کر سکتے۔ مسئلہ صرف انفرادی اور اجتماعی تعاون اور تنظیم کا ہے، جسمانی، ذہنی یا دماغی صلاحیتوں کی کمی یا فرق کا سوال نہیں۔

پس اگر عورت کو کام، عمل اور تکمیل کے نااہل تصور کیا جاتا ہے تو یہ اس کے جسم جنس اور حیاتیات کے باعث نہیں۔ بلکہ اس کے معاشرے اور آئیڈیالوجی کے

باعث ہے جس میں وہ پیدا ہوئی اور پلی اور بڑی ہوئی۔ یہ عورت کا حیاتیاتی المیہ نہیں بلکہ معاشریاتی اور نظریاتی المیہ ہے جو صرف عورت کا ہی معاملہ نہیں رہتا، بلکہ اس کے معاشرے، قوم اور ملک کا بھی المیہ بن جاتا ہے۔

ہم اس وسیع تر المیہ کے نقشے میں پردہ آئیڈیالوجی کے نظریات اور عقائد کا تجزیہ کریں گے۔

اوّل: عورت کی کمتری کا سوال

پردہ آئیڈیالوجی کے مقدمہ میں عورتوں کے خلاف سب سے بڑا الزام اُن کے جسم و ذہن کی کمزوری اُن میں عقل و فراست کی کمی اور اُن کی کام، عمل اور تکمیل کی صلاحیتوں، استطاعت اور استعداد کا فقدان ہے جس نے انہیں مردوں کے مقابلے میں نہ صرف کمزور بلکہ کمتر جنس بنا دیا ہے۔ یہ الزام پدر سرداری معاشرے میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال سے لگایا جا رہا ہے، جس کو اس قدر اور اس طرح دہرایا گیا کہ افترا اور اتہام بن گیا اور مردوں کے غلبے، فوقیت اور فضیلت کا جواز خیال کیا گیا، مگر زمانہ جدید میں تکنیکی انقلاب نے عورتوں کی آزادی اور مساوات کی تحریکوں کو جنم دیکر اس اتہام کو احتجاج کی صورت دے دی۔ جدید پردہ آئیڈیالوجی اس احتجاج کی شدید ترین صورت ہے۔ بعض مردوں کی طرح، پردہ سسٹم کے حامی اور آئیڈیالوجسٹ جب عورتوں کی آزادی اور مساوات کے مطالبے کے پیش نظر مردوں کے غلبہ اور تکمیلی اجارہ داری کی دیواریں گرتی ہوئی دیکھتے ہیں تو نسوانی کمتری کے نظریئے کی تائید میں جدید سائنسوں اور علوم کو مدد کیلئے پکارتے ہیں اور سائنسی اعداد و شمار اور ناپ تول کے ذریعے عورت کے جسم اور جنس کی کمزوریاں، خامیاں اور کمیاں بیان کرنے لگتے ہیں۔ اُن کے دلائل مختصراً مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) جسمانی کمزوریاں

(۲) جنسی مجبوریاں

(۳) نفسیاتی ناہمواریاں
(۴) عقلی نقائص اور بلادت
(۵) مردانہ فعل کی فضیلت

جسمانی کمزوریاں پردہ آئیڈیالوجسٹوں کے مطابق عورت کے جسم کے تمام اعضاء سر سے پیر تک مرد کے اعضاء سے مختلف ہی نہیں بلکہ ادنیٰ اور کمزور بھی ہیں۔ علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں:

"درحقیقت عورت کی جسمانی ترکیب قریب قریب بچے کی جسمانی ترکیب کے واقع ہوئی ہے۔ بچے کا قاعدہ ہے کہ اگر رنج اور افسوس کا واقعہ پیش آئے تو فوراً رونے لگتا ہے اور اگر کوئی خوشی کی بات ہو تو بے اختیار ہو کر اچھلنے کودنے لگتا ہے۔ قریب قریب یہی حال عورت کا ہے"[1]

پس عورت جذبات سے جلد متاثر ہو جاتی ہے اور عقل تک کو کھو دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں استقلال اور ثابت قدمی نہیں ہوتی۔ عورت کا قلب مرد کے قلب سے چھوٹا، اس کا تنفس زیادہ تیز، اس کے عضویاتی عمل زیادہ سرعت انگیز ہوتا ہے۔ یہ اختلافات مرد اور عورت تک ہی محدود نہیں، بلکہ حیوانات اور نباتات کے تمام نر اور مادہ میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً عود، خرما اور کیلہ کے نر اور مادہ درختوں میں نر درخت کو مادہ درخت پر طبعی قوت کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ پس ثابت ہوا کہ

"خود فطرت نے جسم و دماغ تقسیم کرتے ہوئے عورتوں کو مرد سے کم حصہ بخشا۔ جو دلائل (یہاں) پیش کئے گئے ہیں اگر ثبوت دعویٰ کے لئے کافی نہ سمجھے جائیں تو ابھی اور بیسیوں اختلاف دکھلائے جا سکتے ہیں"[2]

---

[1] "مسلمان عورت" ص ۳۷
[2] ایضاً ص ۴۸

جسم کے ان اختلافات اور کمزوریوں کی بنا پر پردے کے حامیوں نے عورت کو کمزور اور معذور ہستی قرار دیا ہے۔

یہ ہیں اس طرزِ استدلال اور فلسفے کے نتائج جو قدرت کو ایک ساکن اور جامد نظام تصور کرتے ہیں جس کی تمام قوتیں اور عوامل ایک گردش کے مانند ازل سے ابد تک ایک ہی ڈگر پر چلتے رہیں گے۔ مگر یہ فلسفۂ قدرت غیر حقیقی اور قرونِ وسطائی ہے۔ قدرت صرف انسانی علم و عقل کی ماحصل ہوتی ہے۔ چونکہ اس کی وسعتیں اتنی لامحدود اور بیکراں ہیں کہ انسانی علم و عقل کبھی اُن کی انتہا اور حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے مگر یہ صورتحال انسانی زندگی کی جدلیاتی کیفیت کے عین مطابق ہے جو اس امر کی مقتضی ہے کہ انسان اپنی کوشش، محنت و مشقت، عمل و تکمیل اور علم و عقل کی تگ و دو اور تلاش سے قدرت کے عوامل، قوتوں اور حالتوں کو دریافت کرے، اور اس کے مظاہر اور تغیرات کے تسلسل اور باقاعدگیوں کو معلوم کرے، جنہیں قوانین قدرت کہتے ہیں۔ اس طرح انسان اپنی عملی علمی اور عقلی تکمیلات سے قدرت کے وسائل اور ذرائع اور قوتوں پر عبور اور قابو حاصل کر لیتا ہے، مگر یہ عبور اور قابو انسانی زندگی اور معاشرے میں اپنے دور کی مخصوص نظام اور تشکیل سے حاصل ہوتا ہے۔ در اصل انسانی تکمیل اور معاشری تشکیل ایک ہی عمل کے دو رخ ہیں اور متواتر ایک دوسرے کو متاثر کرتے اور ترقی دیتے ہیں۔ جب معاشرے کی تکمیلی قوتیں بڑھ جاتی ہیں تو معاشرے کی نئی تشکیل جنم لیتی ہے اور جب معاشرے کی نئی تشکیل وجود پذیر ہو جاتی ہے تو وہ نئی تکمیلی قوتوں کو جنم دیتی ہے اور قدرت کے نئے نئے قوانین، نئے نئے نوامیس، نئے نئے وسائل اور ذرائع اور نئے نئے عوامل اور قوتیں دریافت اور معلوم کر لیتی ہیں، جو نئی تکمیلات اور نئی معاشری تشکیل و تنظیم کے مقتضی ہوتی ہیں۔ پس معاشری نظام بھی کوئی جامد اور ساکن حالت نہیں، بلکہ انسانی زندگی اور معاشرہ تکمیلی صلاحیتوں اور قوتوں، نئی دریافتوں، ایجادات اور انکشافات کی ترقی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور قدرت کے متعلق نظریات اور تاویلات اور تشریحات بھی بدلتی رہتی ہیں جیسا

کہ ہم نے اوپر کہا' فطرت کا منشا وہی ہوتا ہے' جو انسان کا تکمیلی منشا ہو۔ تاہم جب معاشرے میں تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں کا فقدان پیدا ہو جائے' تو علم و عقل کی ترقی رُوک جاتی ہے اور انسانی زندگی اور معاشرے میں ہر طرف جمود' انحطاط اور تنزل کے بادل چھا جاتے ہیں اور انسان کا ذہن و فکر خیالی اور تصوراتی اور نظریاتی خلاؤں میں کھو جاتے ہیں جو اتنے ہی غیر حقیقی اور غیر قدرتی ہوتے ہیں جتنی اُن کی روبہ تنزل زندگی اور معاشرہ بہر حال ایک ترقی پسند تکمیلی معاشرے میں جو ہر دور میں اور ہر وقت علم و عقل سائنس اور ٹکنالوجی' اقتصادی اور معاشرتی تنظیم اور عمل کی نئی نئی قوتوں، صلاحیتوں اور نئے نئے امکانات اور ممکنات سے سرشار ہو رہا ہے' وہ ان ترقیوں کے ساتھ ساتھ ہر وقت بدلتا اور بڑھتا رہتا ہے اور اس کی تنظیم و تشکیل بھی زیادہ سے زیادہ تکمیلی اور ماکرو سوشل ہوتی جاتی ہے' جن میں اس کے تمام ارکان یعنی مردوں اور عورتوں کے تعلقات اور وظائف' حقوق اور فرائض' مقام اور حیثیت' کردار اور شخصیت رول اور حصے بدلتے رہتے ہیں' وہ قدرت اور معاشرے اور اپنی زندگی کو نئے نئے زاویوں سے دیکھتے ہیں اور وہ نئی عادات' نئے رویوں' نئے رجحانات' نئی امیدوں' نئی توقعات نئی صلاحیتوں' نئی قوتوں اور نئے کردار اور شخصیتوں کے حامل ہو جاتے ہیں۔ اور نئے مفادات' نئے منصوبوں' نئے طور و طریقوں' نئے اوزاروں' نئے آلات' نئی تکنیکوں' نئے فلسفوں' نئی آیڈیالوجی اور نئی تہذیب و تمدن' تکمیل اور تعمیر کرتے ہیں' ترقی اور تکمیل کے یہ راستے اتنے ہی لمبے اور لامتناہی ہیں جتنے انسانی زندگی اور قدرت کی وسعتیں اور پنہائیاں۔

مگر سوال یہ ہے کہ جب انسان کی زندگی اور معاشرے میں سب کچھ بدلتا ہے تو کیا عورت ہی ایک ایسی ہستی ہے یا اس کی ہی "فطرت" کچھ ایسی ہے کہ نہ بدلے؟

عورت کے جسم کی کمزوری مرد کے غلبہ اور برتری کے خوابوں کا تصور ہے جو ایسا معاشرہ پیدا کرتا ہے جس میں مرد کو ہی عمل اور تکمیل کی آزادی اور اجارہ داری حاصل ہو' خواہ یہ معاشرہ قبائلی ہو' یا جاگیر دارانہ یا سرمایہ دارانہ۔ ان سب قسم کے

معاشروں میں ایسے اہلیت گروہوں اور طبقوں کو معاشرے میں اقتصادی، تمدنی، سیاسی اور نظریاتی غلبہ اور تسلط حاصل ہوتا ہے اور معاشرے کی تشکیل اور تنظیم ایسی ہوتی ہے کہ رجعت پسند اور ماضی پرست اہل علم و فکر پرانی تکمیلی قوتوں اور طریقوں کی غیر تکمیلی حالت میں بدل جانے کو نہیں سمجھ سکتے مگر نئی تکمیلی قوتوں اور گروہوں کے ماکرو سوشل رجحان کو کچلنے کے لئے "قدرت کے مفروضات کا سہارا لیتے ہیں، جو درحقیقت اُن کی عادت اور معاشری حیثیت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

عورت مرد سے جنسی لحاظ سے مختلف ہستی ہے، انسانی زندگی میں اس کی اہمیت اور مقام دو فرائض (فنکشنز) کے حامل ہیں: تکمیلی کام اور عمل اور تناسلی فریضہ۔ یہ معاشرے کی تنظیم اور تشکیل فیصلہ کرتی ہے کہ وہ عورت کے لئے ان دو فرائض کو کس طرح انجام دینے کے مواقع اور ماحول پیدا کرے گی اور معاشرہ اس بات کا فیصلہ اپنی تکمیلی قوتوں اور صلاحیتوں کی ضروریات کے مطابق کرتا ہے۔ یہ ضروریات عورت اور مرد کی جسمانی اور جنسی فرق کے مطابق اُن کے تعلقات اور حیثیت کا تعین کرتی ہیں۔ گذشتہ زمانوں میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک انسانی تکمیلی ذرائع اور وسائل "تکنیک اور طور وطریقوں کی نوعیت ایسی تھی جس نے عورت کی جسمانی کمزوری اور جنسی مجبوری کے باعث مردوں کی تکمیلی فوقیت، برتری اور اجارہ داری قائم کر دی تھی۔ مردوں کو تمام پیداواری اور تخلیقی عمل و تکمیل کے میدانوں میں عورت پر سبقت اور فوقیت حاصل ہو گئی۔ لہٰذا ساری معاشری اور خاندانی زندگی اور آئیڈیالوجی کا ڈھانچہ مردانہ برتری غلبے اور فوقیت اور فضیلت کی بنیادوں پر استوار ہوا، جس پر مرد کی جنسی ضرورت نے مہر ثبت کر دی، یعنی اس نے عورت کو صرف اپنے گروہی اور اقتدارانہ ضروریات کے تابع کر دیا۔ مردوں کے پدر سرانہ غلبہ اور فوقیت کو اس کی قدرتی مردانگی اور رجولیت اور عورت کی جسمانی اور جنسی نرمی، نزاکت اور لطافت کو قدرتی قرار دیکر دونوں کی معاشری تعلق اور مقام کو غلبہ اور مغلوبیت، برتری اور کمتری، حاکمیت اور محکومیت، اثر و تاثر، فاعلیت اور انفعلیت کی قدرتی اور اٹل حقیقتیں قرار

دے دیا۔۔۔اور عورت کی اس محکومی، لاچاری، محتاجی اور مظلومی کو ناقابل تغیر اور ناقابل اصلاح اور ترقی قرار دے دیا۔

مگر تکنیکی عمل جس نے گذشتہ زمانوں میں مردانہ برتری اور فضیلت کو معاشری حقیقت بنا دیا تھا، ہمارے تصورات اور نظریات کا تابع نہیں ہوتا۔ اس عمل نے ایسی پیداواری اور تخلیقی قوتوں، صلاحیتوں اور مواقع اور ماحول پیدا کر دیئے ہیں جس نے پدرسرانہ معاشری تقسیم اور تعلقات کا سارا نظام درہم برہم کر دیا ہے زمانہ جدید میں اب ایسے آلات، اوزار، طور وطریقے اور تکنیک ایجاد اور دریافت ہو گئے ہیں جو عورتوں کو بھی ہر طرح کے تکنیکی کاموں اور فرائض میں مساویانہ مواقع اور ماحول مہیا کرتے ہیں۔

تاہم یہ تبدیلی اور ترقی مسلمانوں کے پردہ سوسائٹی میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مردانہ برتری اور فضیلت کے تصورات اور نظریات ان کے ذہن وفکر پر مسلط ہیں، جو پردہ آئیڈیالوجیوں اور پردہ سوسائٹی کے قبائلی، جاگیردار اور سرمایہ دار اہلیت گروہوں اور طبقوں کے گٹھ جوڑ سے قائم ہیں۔

عورت کی جنسی اور نفسیاتی اختلاف کے نظریات

پردہ آئیڈیالوجی میں عورت کی محکومی، کمتری، محتاجی اور معذوری کے لئے جو دلائل براہان قاطع تصور کئے جاتے ہیں وہ اس کی جنسی فرائض و فنکشنز ہیں۔ ان کی بنا پر مولانا مودودی نے، ایک سویٹ مفکر کی تقلید میں عورت کو ایک حیاتیاتی المیہ سے تعبیر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اپنی جنسی فزیالوجی کے عوامل اور فرائض، یعنی حیض، حمل، وضع حمل اور رضاعت کے باعث عورت اپنی زندگی میں ہر ماہ اور ہر سال بار بار اور بسا اوقات کئی کئی سال متواتر بیمار اور نیم بیمار رہتی ہے یہ حالت اس کے مزاج، طبیعت، ذہن ونفسیات، کردار اور عادات اور ساری شخصیت اور زندگی کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ ذرا سے اشتعال پر وہ اپنے جذبات اور مزاج کا توازن کھو بیٹھتی ہے اور غضب و غم دکھ اور درد سے مغلوب ہو کر دیوانی

سی ہو جاتی ہے اور وحشیانہ اور احمقانہ حرکات کر بیٹھتی ہے۔ ان ایام کی پریشانیوں اور مجبوریوں سے اس کی قوتِ کارکردگی عام حالات کی بہ نسبت آدھی بلکہ اس سے بھی کم رہ جاتی ہے[1]۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جو "خالص تحقیق اور سائنٹفک مشاہدات و تجربات[2]" سے ثابت ہیں، جو مرد اور عورت کی "فطری نامساوات" کی نشاندہی کرتی ہیں[3]۔"

عورت کا المیہ (ٹریجڈی) حیاتیاتی یا فطری نہیں، بلکہ معاشرتی اور نظریاتی ہے کوئی "قانونِ قدرت" ایسا نہیں جو عورت کو مرد کے مقابلے میں کمتر، گھٹیا اور ادنیٰ بناتا ہو، لیکن ایسے بیشمار رسوم و رواج، امتناعات اور ممانعتیں، عقائد و نظریات توہمات اور تعصبات، میتھ (   ) اور قوانین، ادارے، تنظیمیں اور تحریکیں ہیں جو اُسے معاشرۃً اور حقیقتاً اور واقعتاً مرد سے ادنیٰ، کمتر اور حقیر اور گھٹیا بنا دیتی ہیں۔ وہ ایسی قسم کی خاندانی زندگی، ہمسایہ داری، تعلیم و تربیت میں پرورش پاتی ہے اور ایسے عزیز و اقارب، دوست و احباب اور واقف اور ناواقف لوگوں سے واسطہ اور معاملات سے دوچار ہوتی ہے اور اس قسم کی رایوں اور رویوں، چال چلن اور سلوک اور ماحول و فضا میں جنم لیتی، پلتی اور زندگی گزارتی ہے جو اُسے مرد کے مقابلے میں کمتر، گھٹیا، حقیر، بے وقعت اور بے حیثیت بنا دیتے ہیں۔ یہی وہ تجربات اور مشاہدات (   ) جو اس کی عادات اور جذبات، کردار اور مزاج، طبیعت اور شخصیت کو بناتے ہیں، نہ کہ وہ "سائنسی" یا "علمی" "مشاہدات اور تجربات (   ) ہیں جنہیں پردہ آئیڈیالوجسٹ اپنے خیالات اور تعصبات کی تاویل اور تشریح میں پیش کرتے ہیں۔

دونوں جنسوں میں ہمیشہ ایک طرح کی طبقاتی جنگ جاری رہتی ہے۔ کیوں کہ

---

[1] مودودی "پردہ" ص ۱۸۲ تا ۱۹۰۔

[2] ایضاً ص ۱۹۶۔

[3] ایضاً ص ۲۰۵۔

یہ کشمکش بھی غالب اور مغلوب حاکم اور محکوم' آزاد اور غلام اور جابر اور مجبور فریقین کی جنگ ہے۔ تاہم یہ عموماً اور اکثر خاموش' خفیہ اور در پردہ طریقوں اور انداز میں لڑی جاتی ہے' کیونکہ اس کا مقصد اور منتہیٰ' عام طبقاتی جنگ کے برعکس' کسی فریق کو نیست و نابود کرنا نہیں ہوتا' بلکہ کمزور اور مجبور فریق پر غالب اور طاقتور فریق کی محکومی اور مغلوبیت اور تابعیت مسلط کرنا ہے تاکہ ایسا نظام حیات قائم کیا جائے جس میں غالب اور برتر فریق کے مقاصد اور منصوبوں کی تکمیل ممکن ہو۔ اس جنسی جنگ کا آغاز ازمنہ قدیم میں اس وقت ہوا جب مرد کو تکمیلی برتری حاصل ہوئی' اور پدر سرداری' قبائلی معاشرہ وجود میں آیا' جو مسلمانوں کی تاریخ میں پردہ سوسائٹی اور آئیڈیالوجی کی صورت میں انتہا کو پہنچ گیا۔ اس سوسائٹی اور آئیڈیالوجی میں عورت کو ایک آزاد' خود مختار اور تکمیلی فرد اور شخصیت نہیں تصور کیا جاتا ہے' بلکہ وہ اپنے پیدائشی خاندان اور گروہ اور اپنے خاوند اور اس کے خاندانی اور گروہ کی مقبوضہ اور قابل خرید و فروخت مال تصور ہوتی ہے۔[1] جیسے ایک

---

[1] اردو' فارسی اور مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں ایسے الفاظ اور محاورے بکثرت ملتے ہیں جو قبائلی اور جاگیردارانہ معاشروں کے جابرانہ "عائلی" تعلقات کی آج بھی عکاسی کرتے ہیں۔ درحقیقت ہماری سب زبانیں ہماری تاریخ کے سنگین گردشوں کے کباڑ خانے ہیں جو ایسے الفاظ' محاوروں اور اصطلاحات سے بھرے ہوئے ہیں جو ان زمانوں میں معاشری حقیقت کی ترجمانی کرتے تھے۔ مثلاً اردو اور فارسی کا لفظ "خصم" قبائلی دور کی یادگار ہے' جب مرد اپنی "بیویاں" دوسرے قبائل یا گروہوں سے جنگ و جدال سے یا شبخون مار کے حاصل کرتے تھے۔ چونکہ یہ عورتیں "دشمنوں" کے قبضے میں آجاتی تھیں' اس لئے اپنے "شوہروں" کو خصم یعنی دشمن کہتی تھیں جس پر ان کے مردوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ غیر قبیلے کی پکڑی ہوئی عورتیں ہوتی تھیں جنہیں بیوی کا درجہ دیگر اپنے قبیلے کی عورتوں کے برابر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کئی نسلوں کے بعد کثرت استعمال سے یہ لفظ "شوہر" کے مترادف ہو گیا۔ اسی طرح اردو کے الفاظ "خاوند" "مالک" اور "میاں" جاگیردارانہ معاشرے کی یادگار ہیں' جس میں مرد عورتوں کے اسی طرح "خاوند" "مالک" اور "میاں" ہوتے تھے جس طرح وہ اپنی زمینوں پر قابض ہوتے تھے۔ ان گزرے ہوئے معاشروں کی چیرہ دستیاں اور ناانصافیاں آج بھی لفظی اور حقیقی طور پر ہمارے ہاں موجود ہیں' کیونکہ پردہ سسٹم اور تعدد ازدواج انکو قائم و دائم رکھتے ہیں۔

خاندان سے دوسرے خاندان یا ایک گروہ سے دوسرے گروہ کے پاس شادی یا فروخت یا اغوا اور پکڑ دھکڑ کے ذریعے منتقل کر دیا جاتا ہے۔[1]

درحقیقت ہمارے قبائلی علاقوں میں "شادی" کے معنی ہی لڑکی یا عورت کی خرید و فروخت تصور کئے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں، لڑکیوں اور عورتوں کا اغوا، اور پکڑ دھکڑ قرون وسطائی بردہ فروشی کے انداز میں آج بھی پاکستان میں جاری ہے، اگرچہ جدید حالات کے باعث قدرے محدود پیمانوں پر اور خفیہ طریقوں سے۔

ان غیر انسانی طریقوں اور حالات کی کئی وجوہات ہیں۔ اوّل، عورت کی آزادی اور حقوق کے معاملے میں مسلم معاشرے میں رائے عامہ بہت کمزور، لاتعلق اور حتیٰ کہ سنگدل واقع ہوئی ہے دوم، محافظان قانون اور نظم و نسق عورتوں کو قانونی تحفظ نہیں فراہم کرتے، اس لئے کہ پردہ آئیڈیالوجی کے قائل ہونے کی وجہ سے وہ بطور قانون سازان ایسے قوانین و قواعد نہیں وضع کرتے جن سے عورتوں کی عزت و آبرو، جان اور حقوق کا تحفظ ہو اور کچھ اس لئے کہ بطور محافظان نظم و نسق وہ رشوت خور اور بدعنوان ہوتے ہیں یا خود اخلاقی طور پر یعنی مائیکرو سوشل طور پر پردہ آئیڈیالوجی کے وسیع اثر و نفوذ نے ہر شخص کی اخلاقی شعور اور ضمیر کو مائیکرو سوشل بنا دیا ہے یعنی نیک و بد کی تمیز کرنے کی صلاحیتوں کو اپنے مائیکرو سوشل گروہ کے مفادات اور وفاداریوں سے وابستہ کر دیا ہے اور قومی یا ماکرو سوشل مفادات اور وفاداریوں سے غافل بنا دیا ہے اس وجہ سے مسلمان عموماً کسی غیر شخص، خاص طور پر غیر عورت کی حفاظت اور حمایت سے احتراز کرتے ہیں۔ وہ عورت کو ایک انسانی شخصیت نہیں تصور کرتے، جسے حقوق اور آزادیاں حاصل ہوں۔ بلکہ وہ اُسے ایسی چیز تصور کرتے ہیں جسے کھلے بندوں اغوا کیا جا سکتا ہے، پکڑا دھکڑا کی جا سکتی ہے یا کوئی بد اطوار اور بدمعاش اس سے چھیڑ خانی کر سکتا ہے اور اسے گزند پہنچا سکتا ہے، بلکہ بعض اوقات اور بعض مقامات پر تو آزاد پھرتی ہوئی عورت کو تنگ کرنا اور لعنت و ملامت کرنا ثواب دارین تصور کیا جاتا ہے جسے حاصل کرنے کے درپے بعض وقت اس کے اپنے رشتہ دار مثلاً باپ، بھائی یا خاوند بھی پیش پیش ہوتے ہیں

[1] مثال کے طور پر، عورتوں اور لڑکیوں کی خرید و فروخت پاکستان کے قبائلی اور جاگیردارانہ علاقوں میں جہاں قرون وسطائی معاشرہ اب بھی روایتی صورت میں قائم ہے، ایک باقاعدہ ادارے کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ یہی حال متعدد مسلم ممالک کا ہے مثال کے طور پر بلوچستان میں ولور کی رسم اور دوسرے صوبوں میں اس سے ملتی جلتی رسم و رواج پائے جاتے ہیں۔ دیکھئے شاہد حسین رزاقی، "پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج" صفحات ۱۶۴ تا ۱۶۶ اور جا بجا)

چونکہ مسلم مائیکرو سوسائٹی میں عورت مالِ خرید و فروخت تصور کی جاتی ہے، اسلئے ہر اقتصادی شے کی طرح اس کی بھی قدرِ استعمال اور قدرِ تبادلہ ہوتی ہے۔ قدرِ استعمال

کیونکہ، جیسا کہ ہم نے اوپر کہا، پردہ سوسائٹی خالصتاً مردانہ سوسائٹی ہے جس میں گھومنے پھرنے، سیر تفریح کرنے اور پبلک کام کاج کرنے کی آزادیاں اور حقوق اور تحفظات مردوں اور صرف مردوں کو حاصل ہیں۔ یہ تو امن و امان کے زمانے کی باتیں ہیں۔ بدامنی کے زمانے میں، مثلاً فسادات، بغاوت اور عام گڑبڑ کے وقتوں میں یہ غیر انسانی بداطواریاں اور بدسلوکیاں بدرجہا تم بڑھائی جا سکتی ہیں، کیونکہ ایسے وقتوں میں عورتوں کی پکڑ دھکڑ، آبرو ریزی اور اغوا گردی میں ہر بدکار اور بدمعاش کو اپنے خاندانی، قرابتداری اور سیاسی گروہ بندیوں کی حمایت اور امداد حاصل ہوتی ہے جو ان غیر انسانی افعال کو اپنی "آزادی کی جنگ" تصور کرتے ہیں، جیسا کہ غیر منقسم پاکستان میں "بنگلہ دیشیوں" کی قومی آزادی کے وقت کیا گیا تھا۔ درحقیقت، پردہ اور تعدد ازدواجی سسٹم اور آئیڈیالوجی مسلمانوں کو اس قدر مخرب اخلاق اور خراب کر دیتے ہیں کہ وہ جنسی عورتوں پر جہاں ہاتھ ڈالنے کو تیار رہتے ہیں، کیونکہ اس معاشرے اور اس آئیڈیالوجی کے لازمی نتائج یہ ہیں۔

(i) عورتوں کی بے انتہا تذلیل اور تحقیر۔ (ii) ان کے حقوق اور آزادیوں کے احترام کا فقدان۔

(iii) عورتوں کو اپنی حیاتیاتی فرائض کے لئے اپنی رضامندی کی آزادی سے محرومی۔

(iv) مسلمان مردوں کے شادی اور طلاق کے حقوق اور اختیارات پر قانونی ممانعتوں کی عدم موجودگی۔

(v) مسلم معاشرے میں عورتوں کیلئے کام، عمل اور تکمیل کی آزادی اور مواقعوں کا فقدان۔

(vi) مسلم معاشرے میں مرد و زن کے تعلقات عام برتاؤ اور سلوک میں مردوں کی اکثر و بیشتر زور و جبر کے طریقوں اور رویوں سے اپنا مفاد حاصل کرنیکا رجحان اور استعمال پائے جاتے ہیں اور عورتوں کے لئے خاموشی، عاجزی، فروتنی اور ظلم و زیادتی کو برداشت کرنیکی تلقین ہوتی ہے۔ ان تعلقات اور میل جول میں مرد محبت کا دل موہنے کی بجائے ہمیشہ زبردستی اور بالادستی کی راہ اختیار کرتا ہے

(vii) مسلم معاشرے کی بنیادی طور پر مائل بہ انتشار حالت جو اس کے قرابتدارانہ گروہوں کی قبیلوں، ذاتوں اور برادریوں کی موجودگی اور متوازیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باعث مسلم معاشرہ قومی یگانگت اتحاد اور استحکام نہیں حاصل کر سکتا، بلکہ ہمیشہ انتشار اور ابتری، بدنظمی اور بدامنی کی طرف منتج ہوتا ہے

تو اس کی جنس ہے، جس کے لئے اس کا خاوند یا خریدار یا اغوا کرنے والا اُسے حاصل کرتا ہے، مگر اس کی "قدر تبادلہ" اُن فائدوں پر مشتمل ہیں جو اُن دو خاندانی گروہوں کو حاصل ہوتے ہیں، جن کے ہاں وہ پیدا ہوئی اور شادی یا خرید کر پہنچی (صرف اغوا کرنے والا مال مسروقہ کی طرح دوسرے فریق کو کوئی فائدہ نہیں دیتا) "قدر تبادلہ کا تعین عام" مارکیٹ" کے حالات کرتے ہیں۔ اگر کسی جگہ یا وقت "قابل شادی" لڑکیوں اور عورتوں کی سپلائی بڑھ جائے، تو دلہن کی قیمت یا نیوتا کم ہو جاتا ہے، ورنہ سپلائی کی کمی یا مانگ کی زیادتی سے اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ مگر چونکہ ہر ایک قرابتداری معاشرے میں اس قیمت کا تعین کبھی "خالص مارکیٹ" کے حالات میں نہیں ہوتا، اس لئے قدر تبادلہ کے تعین میں ایسے پہلوؤں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے مثلاً، جہیز، جائداد، یا دونوں فریقین میں کسی ایک یا دونوں کا اثر و رسوخ، یا "کنکشن" (تعلقات) وغیرہ جو دلہن اپنے خاوند اور اس کے خاندانی گروہ کے لئے لاتی ہے یا اپنے پیدائشی گروہ کو پہنچا سکتی ہے۔ یہ ہے وہ "قانون قدرت" جس پر جنس نسوانی کی کمتری اور محکومی کی آئیڈیالوجی اور معاشرہ قائم ہیں۔ مگر یہ "قدرت (فطرت) کا قانون نہیں"، بلکہ قبائلیت اور جاگیرداریت کا قانون ہے جس سے آج بھی مسلمان عورت آزاد نہیں ہوئی اور جس کی آزادی اور انصاف و عدل کی تحریک کی مخالفت میں پردہ آئیڈیالوجسٹ اپنی علمیت کے قلابے ملاتے رہتے ہیں اور جس کے قبائلی، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ حاکموں اور محافظوں کے مظالم اور زیادتیوں کی پردہ پوشی کے لئے اپنی عقل و استدلال کے تمام حربے کام میں لاتے ہیں۔

جو بالآخر فسادات، بغاوت اور خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ہمارے ملک کی مختصر تاریخ میں ایسے حالات اور واقعات اسی طرح پائے جاتے ہیں جیسے قرون وسطائی مسلم حکومتوں اور سلطنتوں میں پائے جاتے تھے۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مسلم مائیکرو سوسائٹی کس قدر کم بدلی ہے۔ تب یہ سینیٹین چکروں کو جنم دیتی تھی اور اب سامراجیوں اور مہاسامراجیوں کی سازشوں، انتشار انگیزیوں، جارحیت اور استحصال کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔

مگر جب تکمیلی معاشرہ وجود میں آتا ہے اور عورت کو کام، عمل، تخلیق اور تکمیل کا آزاد ماحول اور پورے اور مساویانہ مواقع ملتے ہیں تو اس کے جسمانی اور جنسی کمزوریوں اور مجبوریوں کے قصے بھی فرسودہ اور لایعنی کہانیاں بن جاتے ہیں، جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے۔

کیا عورت ناقص العقل ہے؟

کمتری کے اتہام میں عورت کی ناقص العقلی کا الزام بھی بہت قدیم مگر سنگین ترین ہے۔

ظاہر ہے کہ جیسے عورت مرد کے مقابلے میں جسم میں اوسطاً چھوٹی ہوتی ہے، اسی طرح اس کا سر بھی مقابلتاً چھوٹا ہوتا ہے۔ مگر سوال ظاہر کا نہیں بلکہ باطن کا ہے، سر کے سائز کا نہیں بلکہ ذہن و عقل، ادراک و فہم کا ہے۔ لیکن ظاہر و باطن کا دھوکا دماغ اور ذہن کے معاملہ میں بہت گمراہ کن ہوتا ہے، کیونکہ عقل و ادراک ظاہری کی نسبت باطل ہیں جن کو ناپ تول کے پیمانوں سے نہیں جانچا جا سکتا۔ تاہم یہی طریقِ استدلال کا سہارا لے کر علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں:۔

"قوت ادراک کا اصلی مرکز انسان میں "بھیجا" ہے۔ اسی کی کمی اور زیادتی اور ضعف و قوت پر ادراک کی تیزی اور سستی کا دارومدار ہے۔ لیکن جب علم سائی کولوجیا یعنی علم النفس بالتجارب کے تجارب کو پیش نظر رکھ کر ہم غور کرتے ہیں، تو اس میں بھی عورت ضعیف تر ثابت ہوتی ہے۔ علمِ مذکور نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے بھیجے اور مرد کے بھیجے میں مادۃً اور شکلاً سخت اختلاف ہے۔ مرد کے بھیجے کے وزن کا اوسط عورت کے بھیجے سے سو ڈرام زیادہ ہے[1]۔"

اس فرق پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد اضافہ کرتے ہیں:۔

"مصنف نے دماغی اختلاف پر بحث کرتے ہوئے دماغ کے وزن اور مخ کے اختلاف پر قصداً یا سہواً توجہ نہیں کی، حالانکہ عورتوں کے

---

[1] "مسلمان عورت" ص ۴۲

اصلی ضعف کی بنا اسی اختلاف پر ہے، دماغ کے وزن کا اختلاف ہم آگے چل کر دکھلائیں گے۔ لیکن بھیجے کی بحث میں مینخ کے اختلاف کو جگہ دینی ضروری ہے۔ اصطلاحِ تشریح میں دماغ میں آخری پچھ (مینخ) کہتے ہیں۔ مرد کے دماغ میں بھیجے کے ساتھ مینخ کی نسبت (۱) اور ۸/۱ کی ثابت ہوئی ہے۔ مگر عورتوں کے دماغ میں زیادہ سے زیادہ (۱) اور (۱/۴) کی نسبت ہوتی ہے۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ مینخ دماغ کے ان اجزا میں سے ہے جن کی مقدار کی زیادتی پر عقل اور فکر کی تیزی اور عمدگی کا دار و مدار ہے[۱]۔"

علامہ وجدی مزید لکھتے ہیں:

"فزیالوجی کا یہ مسلم اصول ہے کہ انسان کی عقلی قوت و ضعف کا سرچشمہ دماغ ہے۔ احمقوں اور بیوقوفوں کا دماغ مشاہیر عقلا کے دماغ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو لوگ زندگی میں احمق اور لایعقل مشہور تھے جب اُن کے دماغ کو وزن کیا گیا تو تیس اوقیہ سے کسی حالت میں زیادہ ثابت نہیں ہوا۔ لیکن جن لوگوں کی عقل کی تیزی، ذہن کی سرعت، خیال کی بلندی عام طور پر مسلم تھی اُنکے دماغ تولے گئے تو ساٹھ اوقیہ سے بھی وزن میں متجاوز ثابت ہوئے۔ یہی قوائے عقلیہ کا سرچشمہ ہے جس میں مرد کا پلہ عورت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط عام طور پر ۴۹½ اوقیہ ہے اور عورت کے دماغ کا وزن صرف ۴۴.... کیا یہ اختلاف اس امر کا بہترین ثبوت نہیں ہے کہ عورتوں کے عقلی قوے مرد کے قوے سے بدرجہا ضعیف ہیں۔ دماغ جو قوائے عقلیہ کا اصلی مرکز ہے۔ جب اس کا یہ حال ہے تو پھر عورتوں کا یہ دل گردہ کہاں کہ وہ مردوں کی برابری

۱؎ "مسلمان عورت" ص ۴۲-۴۳-

کا دعویٰ کر سکیں۔[1]"

اپنا قول فیصل دیتے ہوئے علامہ موصوف کہتے ہیں :۔

"حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت کا جسمانی اور دماغی اختلاف ایک طبعی اختلاف ہے۔ جس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ فرض کر لو کہ تشریح (اناٹومی) اور فزیالوجی کی یہ تمام دقیق بحث سر سے پیر تک غلط ہی ہے۔ یہ بھی تسلیم کر لو کہ اگر اختلاف پایا بھی جاتا ہے تو صرف اسی حد تک جس تک خارجی اثرات نے عورتوں کو ضعیف کر دیا ہے لیکن اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ حیوانات اور نباتات کی طبعی حالت بھی اسی اختلاف کی صاف شہادت دے رہی ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں تک کیمسٹری کی علمی تحقیقات اور تجارب نے پتہ لگایا ہے، جمادات بھی اس اختلاف سے محفوظ نہیں۔ عود خرما، کیلہ کے درختوں میں جہاں نر اور مادہ کا امتیاز ثابت ہوا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ نر درخت کو مادہ درخت پر طبعی قوت کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔[2]"

عورتوں کی کم عقلی اور بلادت کو ثابت کرنے کا دوسرا طریقہ اُن کے جنسی وظائف اور عوامل کے اثرات کا مطالعہ ہے جو حیض، حمل، وضع حمل اور رضاعت کے ایام میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان سے نہ صرف اُن کے جسمانی اور عضلاتی قوتوں اور صلاحیتوں میں خلل اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے، بلکہ اُن کی ذہانت اور قوت فکر اور قوت متخیلہ بھی متاثر ہوتی ہیں۔ ان میں غور و فکر اور خیالات کو مرکوز کرنے کی طاقت بھی کم ہو جاتی ہے۔[3]

---

[1] "مسلمان عورت" ص ۴۹۔

[2] ایضاً ص ۴۷-۴۸۔

[3] مولانا مودودی "پردہ" ص ۱۸۳ - ۱۹۱۔

"یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مرد اور عورت جسم، ذہن اور نفسیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ اور یہ کہ عورت جسماً وعقلاً مرد سے کمزور تر ہے۔ قدرت نے اپنی کمال حکمت سے جسم، ذہن اور نفسیات کے اس بنیادی فرق کے پیش نظر مردوں اور عورتوں کے دوائرِ عمل بھی الگ الگ مقرر کئے ہیں۔ جن کے لئے وہ فطرتاً موزوں ہیں۔ اب اس بات کو ہر شخص تسلیم کریگا کہ عورتوں کو اُن کے فطری دائرہ عمل سے باہر نکال کر مردوں کے دائرۂ عمل میں لا داخل کرنا دوسرے لفظوں میں عورتوں کو وہ اُمور یا وہ فرائض سونپنا جن سے عہدہ برآ ہونے یا جن کو انجام دینے کی قدرتاً ان میں جسمانی وعقلی صلاحیت اور قابلیت موجود نہیں ہے ان کے لئے بدترین قید اسیری اور غلامی ہے، ان کے ساتھ سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔ اور ان کی حقیقی ترقی کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔"[1]

پردہ آئیڈیالوجسٹوں کے ان دلائل اور طرز استدلال سے ظاہر ہے کہ انہوں نے انسانی جنس کی جدلیات کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ مرد اور عورت عقل و فکر، ذہن اور سوچ میں یکساں اور مساوی ہیں مگر اُن کے طرز فکر اور اظہار میں ہمیشہ اور ابدی فرق رہے گا۔ اس ابدی فرق کے باوجود اُن میں مردوں سے عقل، فکر، ذہن اور سوچ کی قوتوں اور صلاحیتوں میں سرِ مو فرق نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن ایک ہے، مگر اس کے جسمانی ظہور دو ہیں۔ انسانی ذہن کی ایک ظہور پذیری مرد کے طریق فکر و عقل میں ہوتی ہے اور دوسری عورت کے طریق فکر و عقل میں ہوتی ہے۔ اور دونوں طریق فکر و عقل انسانی زندگی کے ارتقاء، بقا اور سلامتی کے لئے یکساں اور مساویانہ طور پر ضروری ہیں۔ مگر جب یہ ظہورات معاشری عمل میں آتے ہیں تو مرد کو اپنے معاشری غلبہ، تسلط اور بالادستی کے باعث عورت کا طریق فکر

---

[1] مظہر علی ادیب "پردے میں رہنے دو" ص ۶۳-۶۴ مکتبہ الخیر۔ ۴۰ اردو بازار، لاہور۔ فروری ۱۹۷۴

دعقل ناقص گھٹیا اور ناقابل احترام وعزت نظر آتا ہے۔ اس لئے وہ عورت کے خلاف ناقص العقل' یا مختلف العقل کا فتویٰ دیکر اُسے پردہ اور زنانخانے میں بند کرنے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ چونکہ اس کے معاشرے اور تاریخ میں ایسی تکمیلاتی ارتقا اور فضا ہوتی ہے جس میں فتویٰ اور فیصلے کو تائید اور حمایت حاصل ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے اس لئے اس کو مرد معاشری ادارے' رسوم و رواج' نظریات اور عقائد اور آئیڈیالوجی اور قانون اور حکومت کی صورت بھی دے دیتے ہیں۔ اور اس قید و بند کو عورت کی حقیقی آزادی اور ترقی کا فتویٰ بھی قرار دیدیتے ہیں۔

ابتدائی سوال یہ ہے کہ عقل کیا چیز ہوتی ہے؟ عقل کے معنے ہیں ایسا طرز استدلال اور قوت فیصلہ جو اس طرح اپنے مقصد کو حاصل کرے کہ سوچنے والے شخص کے حقیقی فائدے اور اچھائی میں ہو۔ یہ حقیقت محض خیالی بھی ہو سکتی ہے اور واقعیت پسند بھی۔ بہرحال ہر دو صورتوں میں سوچنے والا شخص اپنے فائدے اور اچھائی کے لئے عمل کرتا ہے اور اپنی عقل اور سمجھ بوجھ کے مطابق انکی تلاش کرتا ہے۔ اس تلاش میں نہ صرف اس کے مشاہدے اور تجربے بڑھتے ہیں، بلکہ اس کے سابقہ مشاہدے اور تجربے جو اس کے حافظے' علم اور عقل میں شعوری' نیم شعوری اور لاشعوری طور پہ موجود ہیں سب بروئے کار آتے ہیں اور تبدیل ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے فائدے اور اچھائی کی نوعیت بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ مگر ایک تبدیلی نہیں ہوتی اور وہ ہے سوچنے والے کی اپنے علم' عقل اور شعور کے مطابق اس کا حقیقی فائدہ اور اچھائی یا بھلائی' جس کا وہ متلاشی ہے۔ جو بدل جانے کے بعد اس کی بصیرت و بصارت میں اب زیادہ حقیقی بن گئی ہے۔ لہٰذا وہ اس کی تلاش میں زیادہ جستجو اور زیادہ لگن کے ساتھ سرگرم عمل ہوتا ہے، حتیٰ کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کر لیتا ہے یا تکمیل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

عورت اور مرد کی عقلوں میں جو فرق ہے وہ ان کی جنسی فطرت (حیاتیات) تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت نے پیدا کیا ہے۔ عورت اور مرد کا زندگی کے

کاموں اور فرائض میں رول قدرے مختلف ہونے کی وجہ ان کی جنسی اناٹومی اور فزیالوجی کے مختلف عوامل اور ان سے پیدا شدہ نفسیاتی محرکات اور عوامل کے اختلافات ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ عقل یعنی اپنے فائدے کے لئے قدرے مختلف طرز فکر اور استدلال سے سوچتے ہیں۔ اس فرق کو اُن کی تہذیب و تمدن جس میں وہ پیدا ہوتے اور پلتے ہیں، مختلف رول عطا کر کے حقیقتاً مختلف بنا دیتے ہیں اور ماں باپ اور خاندانی زندگی میں جو تربیت اور سلوک بچے اور بچی، لڑکے اور لڑکی سے کیا جاتا ہے وہ اُن کی ذہن و کردار کی نشو و نما اور تشکیل میں بھی فرق پیدا کر دیتے ہیں بالفرض اگر تہذیب، تمدن اور تربیت اور سلوک بچہ اور بچی، لڑکا اور لڑکی اور مرد اور عورت کے لئے قطعی یکساں اور مساویانہ بھی ہو جائے، جو مستقبل قریب میں ممکن نظر نہیں آتا تو بھی مرد اور عورت کے قدرتی فرق کبھی -

نہیں سکتے۔ اس لئے عورت اور مرد اپنی سوچ، فکر اور استدلال میں مختلف رہیں گے۔ یہ فرق درحقیقت انسانی زندگی کی سلامتی اور بقا کا محافظ ہے۔ اس کے باوجود پدرسرداری معاشرے میں مرد کی برتری، فوقیت اور فضیلت کی مساویانہ اور منصفانہ معاشرے میں گنجائش نہیں۔ کیونکہ اپنے فرق کے باوجود عورت کی عقل و ادراک، فہم و فراست مرد کی عقل و فراست، فہم و ادراک کے برابر ہوتی ہے یہ صرف پدرسرداری معاشرے نے ان کی قدرتی فرق کو معاشرتی تفریق بنا کر ایک کو دوسرے پر فوقیت اور فضیلت کا تصور پیش کیا ہے۔ مگر جتنا معاشرہ فعال اور تکمیلی بنتا ہے، اتنا ہی یہ غیر قدرتی اور مصنوعی فرق مٹتے جاتے ہیں اور ایسا معاشرہ وجود میں آتا جاتا ہے۔ ایسا معاشرہ مساویانہ دو جنسی معاشرہ ہوگا۔ جس میں مرد اور عورت ہر میدان عمل و تکمیل میں رفیق کار ہوں گے۔

دوم: عورت اور کام کا مسئلہ

حامیانِ پردہ کا ذہنی اور فکری غلو

پردہ آئیڈیالوجی کا بنیادی نظریہ اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ عورتیں اپنی جسمانی اور جنسی کمزوریوں اور مجبوریوں کے باعث کام، عمل اور تکمیل کے نااہل ہوتی ہیں۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں:۔

"صرف یہی نہیں کہ عورت پر بیرونِ خانہ کی ذمہ داریاں ڈالنا ظلم ہے، بلکہ درحقیقت وہ ان مردانہ خدمات کو انجام دینے کی پوری طرح اہل بھی نہیں ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ان کاموں کے لئے وہی کارکن موزوں ہو سکتے ہیں جن کی قوتِ کارکردگی پائیدار ہو، جو مسلسل اور علی الدوام اپنے فرائض کو یکساں اہلیت کے ساتھ انجام دے سکتے ہوں، اور جن کی دماغی و جسمانی قوتوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہو۔ لیکن جن کارکنوں پر ہمیشہ ہر مہینہ ایک کافی مدّت کے لئے عدمِ اہلیت یا کمی اہلیت کے دورے پڑتے رہیں، اور جن کی قوتِ کارکردگی بار بار معیارِ مطلوب سے گھٹ جایا کرے، وہ کس طرح ان ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکتے ہیں؟ اُس فوج یا اُس بحری بیڑے کی حالت کا اندازہ کیجئے جو عورتوں پر مشتمل ہو اور جس میں عین موقع کارزار پر کئی فی صدی تو ایام ماہواری کی وجہ سے نیم بیکار ہو رہی ہوں، ایک اچھی خاصی تعداد زچگی کی حالت میں بستروں پر پڑی ہو، اور ایک معتدبہ جماعت حاملہ ہونے کی وجہ سے ناقابلِ کار ہو رہی ہو۔ فوج کی مثال کو آپ کہہ دینگے کہ یہ زیادہ سخت قسم کے فرائض سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر پولیس، عدالت، انتظامی محکمے، سفارتی خدمات ریلوے، صنعت و حرفت اور تجارت کے کام، ان میں سے کس کی

ذمہ داریاں ایسی ہیں جو مسلسل قابلِ اعتماد کارکردگی کی اہلیت نہ چاہتی ہوں؟ پس جو لوگ عورتوں سے مردانہ کام لینا چاہتے ہیں، ان کا مطلب شاید یہ ہے کہ یا تو سب عورتوں کو نا عورت بنا کر نسلِ انسانی کا خاتمہ کر دیا جائے، یا یہ کہ ان میں سے چند فیصدی لازماً نا عورت بننے کی سزا کے لئے منتخب کی جاتی رہیں یا یہ کہ تمام معاملاتِ تمدن کے لئے اہلیت کا معیار بالعموم گھٹا دیا جائے۔[1]

پردہ آئیڈیالوجسٹ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ عورت کی یہ تکیلی صورتحال ہر لحاظ سے بدل رہی ہے۔ اگر کوئی چیز نہیں بدلی وہ پردے کے حامی اور آئیڈیالوجسٹ ہیں جو شدید ذہنی و فکری، علمی اور عقلی غلو کے شکار ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ آج بھی مسلم معاشرہ اور عورت اسی ماحول اور صورتحال سے دوچار ہے جیسا کہ وہ قرونِ وسطیٰ میں ہوتے تھے۔ انہیں اس حقیقت کا کوئی علم نہیں کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی اور جدید معاشری تنظیم اور تعاون نے ایسی قوتیں، صلاحیتیں اور حالات پیدا کر دیئے ہیں جو عورت کو بھی کام، عمل اور تکمیل کے تمام مواقع پیش کر رہے ہیں اور اس کے لئے آزادی اور مساوات کی سب راہیں کھول رہے ہیں۔

عورت کے جنسی اور جسمانی تکالیف اور مجبوریوں کو کسی طرح بھی کم تصوّر نہ کرتے ہوئے، یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نوعیت اور شدت کا بیشتر دار و مدار ان معاشری اور نفسیاتی حالات پر ہوتا ہے جن میں عورتیں رہتی ہیں، پردہ سوسائٹی جیسا معاشرہ بذاتِ خود ہی عورتوں کے لئے ایک عظیم المیہ اور ان کی مصائب اور تکالیف کا بنیادی سبب ہوتا ہے۔ ایسا معاشرہ عورت کے فطری وظائف اور عوامل کو اپنی معاشری امتناعات اور تعصبات کے ذریعے بڑھا کر اور شدید کر کے وبالِ جان بنا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر حیض کوئی پُراسرار یا مریضانہ حالت نہیں بلکہ نسوانی جسم کا

---

[1] "پردہ" ص ۱۹۱۔ نیز دیکھئے مظہر علی ادیب "پردے میں رہنے دو" ص ۲۱۔

نارمل اور صحت مند عمل ہے مگر وہ نفسیاتی پیچیدگیاں جو عورت کو ایام ماہواری میں پیش آتی ہیں اس کے معاشرے کی اس صورت حال نے پیدا کی ہوتی ہیں جو عورت میں خوف، خدشے اور مشکلات اور مصائب کے وسوسوں اور تشویش پیدا کرتی ہیں۔ جو پردہ سوسائٹی جیسے تنگ و تاریک ماحول اور گھٹن میں بہت شدید ہو جاتے ہیں۔

"یہ حقیقت ہے کہ اگر عورت کی حیاتیاتی حالت اس کے لئے رکاوٹ ثابت ہو تو اس کی وجہ عورت کی عام صورت حال ہوتی ہے۔ عصبی اور رگ پٹھوں کی کمزوری، بشرطیکہ وہ مریضانہ نہ ہو جائے عورت کو کسی پیشے کو اختیار کرنے میں مانع نہیں ہوتی۔ مہینے میں ایک دو روز کی شکایت، گو کہ تکلیف دہ ہوتی ہے، مگر کسی طرح بھی رکاوٹ نہیں بنتی۔ بلاشبہ بہت سی عورتیں اس تکلیف کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتی ہیں، خاص طور پر وہ عورتیں جن کے لئے یہ ماہواری "لعنت" بہت زیادہ دقت طلب تصور ہوتی ہے: یعنی وحشی عورتیں، ٹورسٹ اور سیاسی عورتیں، رقاصائیں اور وزنی کام کرنے والی عورتیں زیادہ تر پیشے اس قدر طاقت کے متقضی نہیں جتنی عورت صرف کر سکتی ہے ط"

آزاد اور مساویانہ معاشرے میں عورت کو کام، عمل اور تکمیل کے اتنے لامحدود مواقع اور گنجائش حاصل ہو گی کہ وہ اپنی حیاتیاتی مجبوریوں اور عوامل کو ان کے مطابق ڈھال لے گی۔ ایسے حالات میں وہ ان حالتوں سے نہ گھبرائے گی۔ اور نہ ہی کمزوری محسوس کرے گی۔

"جنسا مساویانہ معاشرے میں عورت حیض کو سن بلوغت کو پہنچنے کا صرف ایک مخصوص طریقہ تصور کریگی۔ انسانی جسم میں، خواہ

ط Simone de Beauvoir, *The Second Sex*, p 65-66.

Four Saquare Books Ltd., London. 1961.

مردوں کا ہو یا عورتوں کا، بہت سی ناگوار قسم کی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے، لیکن ان سے باآسانی مطابقت حاصل کر لی جاتی ہے کیونکہ وہ سب کو یکساں طور پر پیش آتی ہیں، اس لئے کسی کے لئے نقص نہیں خیال کی جاتیں۔ ماہواری نوعمر لڑکی میں ہول اور خوف پیدا کرتی ہے کیونکہ وہ اُسے بظاہر اً گھٹیا اور ناقص درجے میں ڈال دیتی ہے۔ انسانی برادری سے اخراج کا یہ احساس اس پر بہت گراں گزرتا ہے، تاہم اپنے خون بہتے ہوئے جسم پر اس کا ناز باقی ہے اگر وہ اپنے انسان ہونے کے فخر کو نہ کھودے۔ اور اگر وہ اس فخر کو باقی رکھنے میں کامیاب ہو جائے، تو وہ اپنے جسم کی توہین کو بھی بہت کم شدت سے محسوس کریگی۔ بہرحال وہ نوجوان لڑکی جو اپنے لئے ورزش اور سپورٹس معاشری، علمی، فکری اور روحانی کاموں اور میدانوں میں برتری اور سبقت کے راستے نکال لے گی وہ اپنے جنسی تخصص کو اپنے جسم کا نقص نہیں تصور کرے گی، بلکہ باآسانی اس پر حاوی ہو جائے گی۔ ؎

پس عورت کا "حیاتیاتی المیہ" اس کے جنس اور جسم کے باعث نہیں بلکہ اس معاشری نظام کی وجہ سے ہوتا ہے جو اُسے کمتر، ادنیٰ، ناقص اور گھٹیا ہستی قرار دیتا ہے اور اس کے لئے کام، عمل اور تکمیل کے تمام راستے مسدود کر دیتا ہے۔

عورتوں کے حیاتیاتی وظائف میں سب سے زیادہ تکلیف دہ فریضے حمل اور وضع حمل ہیں۔ یہ اُن کے لئے جسمانی اور نفسیاتی اور انفرادی اور معاشری لحاظ سے درد، کرب اور دکھ اور تکلیف کا دور ہوتے ہیں۔ مگر ان ایام میں بھی فیصلہ کن امر اس معاشرے پر منحصر ہے جس میں وہ رہتی ہیں۔ بالفاظ دیگر، درد اور تکلیف کے یہ ایام اُن کے جسم کی دقتوں اور حالتوں پر ہی نہیں، بلکہ اُن تمدنی زندگی، رہن سہن کے طریقوں اور معاشری تعلقات اور نظریات وغیرہ پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ انہیں کس قدر درد اور تکلیف سے واسطہ پڑے۔ اس ضمن میں پردہ سوسائٹی کا ماحول اور

؎ Ibid. p. 50

پردہ آئیڈیالوجی کے نظریات اور امتناعات ان ایام کی درد اور تکلیف میں ہر طرح اضافہ کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس ماحول میں میاں بیوی کے تعلقات ساس سسر نندیں اور دوسرے عزیز و اقارب اور گرد و نواح کے لوگوں کی باتوں، رویوں، سلوک اور عادات و کردار، حاملہ عورتوں کی تکالیف میں کمی اور امداد کرنے کی بجائے بسا اوقات شدت اور اذیت بڑھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پردہ سوسائٹی عورتوں کو بچپن ہی سے ایسے حالات میں رکھتی ہے کہ وہ اپنے فطری وظائف کی انجام دہی کے لئے جسمانی اور نفسیاتی طور پر نشو و نما نہیں پاتی ہیں، کیونکہ انہیں کھیل کود، ورزش اور صحت مند سرگرمیوں سے منع کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، ایسا معاشرہ جو عورت کے حیاتیاتی وظائف اور ضروریات کے مدنظر تشکیل کیا جائے، اس کی شادی اور خاندانی زندگی کو اس طرح منظم کیا جاتا ہے جس میں وہ حمل اور وضع حمل کی تکالیف پر عبور حاصل کر لیتی ہے، جس میں اس کے شوہر سے تعلقات اور اس کی اپنی توقعات اور رضا و رغبت کو پوری آزادی اور مساویانہ حیثیت اور اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

مگر معاملہ صرف عورت کی انفرادی صورت حال کا ہی نہیں، بلکہ معاشری حالات اور جدید طریقوں اور سہولتوں کا بھی ہے۔ زمانہ جدید میں معاشری حالات اور طبی اور سائنسی امداد ماں بننے والی عورت کی قدرتی تکالیف کو بہت کم کر رہی ہیں۔ ایک طرف تو جدید علوم و فنون، خاص طور پر جدید علم طب، حیاتیات اور ٹیکنالوجی، اور دوسری طرف جدید ترقی پسند معاشرے کے آزادی اور مساوات کے نظریات، حالات اور ترقیات، عورت کی ان تکالیف، مشکلات، زحمتوں اور لاچاریوں کی نوعیت یکسر بدل رہے ہیں۔ اس لحاظ سے موجودہ زمانہ تاریخ انسانی کے تمام ادوار اور زمانوں سے مختلف ہے۔ خواہ پردہ آئیڈیالوجسٹ عورت کے "حیاتیاتی المیہ" کا کتنا ہی چرچہ کریں، موجودہ زمانہ عورت کی حیاتیاتی صورت حال میں متواتر بدل رہا ہے۔ ترقی پسند معاشرہ عورتوں کو کام، عمل اور تکمیل کے زیادہ سے زیادہ مواقع اور سہولتیں فراہم کرتا ہے۔ انہیں گھر سے باہر کی زندگی میں شرکت

کرنے کے زیادہ صحت مندانہ سرگرمیاں اور مشغلے پیش کرتا ہے۔ انہیں زیادہ آسودگی اور آرام و تفریح کے مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ گھر اور خاندان کے تعلقات کو زیادہ عادلانہ، معقول، شائستہ اور انسانیت پرور بناتا ہے اور انہیں تعلیم و تربیت اور علم و فضل صحت اور خوشی کے زیادہ مواقع پیش کرتا ہے۔ ایک گائینکولوجسٹ لکھتی ہے کہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال عورتیں جاہل اور ان پڑھ عورتوں کی نسبت حمل اور وضع حمل کی تکالیف اور دردوں کو بہتر طور سے سمجھتی ہیں اور اپنی کوششوں اور قوت ارادی سے ان پر بہتر طور سے قابو حاصل کر سکتی ہیں[1]۔

پردہ آئیڈیالوجسٹوں کے مطابق

رضاعت یا نوزائیدہ بچے کو دودھ پلانے اور پالنے پوسنے کے ایام کے فرائض عورت کو گھر سے باہر کے کاموں، معاملات اور فرائض میں شرکت کرنے اور انجام دینے کے نااہل بناتے ہیں۔ ان کے مطابق گھر میں محبوس ماں ہی بچوں کو صحیح اور صالح تربیت اور تعلیم دے سکتی ہے، مگر بچے کو ان اصولوں کے مطابق پرورش کرنے سے وہی نتائج نکلیں گے جن کا ذکر اور تجزیہ ہم گذشتہ ابواب میں کر چکے ہیں۔ دراصل پردہ آئیڈیالوجسٹ انسانی زندگی اور معاشرے کی محرکیت اور جدلیت کی اب پ سے بھی ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے گذشتہ ابواب میں تجزیہ کیا ہے ایک عورت، بطور پردے والی ماں کے، اپنی جہالت، خوف اور خدشوں، اپنی تشویش اور وسوسوں، اپنی گریز اور فرار کی عادات، المختصر، اپنے پردہ سنڈروم کی تمام انحطاطیت، جو اس کی قید و بند زندگی نے اس میں پیدا کر دیئے ہیں، اور کچھ بھی اپنے ننھے منھے بچوں کے دل میں نہیں ڈالتی۔ صرف ایک اچھی ماں جو سرگرم، فاعل اور تکمیلی زندگی گزارتی ہے اور گھر اور گھر سے باہر کے کام اور فرائض، مشغلے اور پیشے سرانجام دیتی ہے، پرورش اور تربیت کے فرائض کو بخوبی اور اچھی طرح سرانجام دے سکتی ہے۔ صرف باعمل اور باتکمیل عورت ہی اپنی ماں پن کے فرائض اور

---

[1] Sheila Kitzinger, *The Experience of Childbirth*, p. 12. Penguin Books 1967.

ذمہ داریوں اور صلاحیتوں کو صحیح اور کامل طور پر بروئے کار لاسکتی ہے۔ سیمون دو بووار اس کے بارے میں نہایت خوبصورت انداز میں لکھتی ہے:۔

"لوگ عورتوں سے نفرت و حقارت کے عام رویوں اور ماڈل کے احترام کے احساسات کو آسانی سے یکجا کر لینے میں نہایت چابک دستی اور مکر و فریب سے کام لیتے ہیں۔ یہ عجب بات ہے کہ ایک طرف تو عورت کو پبلک میں حصہ لینے سے منع کیا جائے، اس کو مردانہ کریئروں (پیشوں) سے روکا جائے، کام اور کوشش کے تمام میدانوں سے نا اہل قرار دے دیا جائے اور پھر اس کو تمام ذمہ داریوں میں سب سے زیادہ نازک اور اہم ترین ذمہ داری سپرد کر دی جائے، یعنی ایک انسانی ہستی کو ڈھالنے کا فرض بہت سے ایسے رسم و رواج، اور تہذیب و تمدن ہیں جن میں تعلیم و تربیت، تمدن، ذمہ داریاں اور کام کاج سے جو مردوں کا حق تصور ہوتے ہیں، عورتوں کو محروم رکھا جاتا ہے، مگر پھر ننھے منھے بچے بلا تامل اُن کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں جیسے بچپن میں کھلونے دیئے جاتے تھے تاکہ ہم عمر لڑکوں سے کمتری کا ازالہ ہو سکے"[1]

سوم: عورتوں کی اعلیٰ تکمیلی صلاحیتوں کا مسئلہ

اس کے ساتھ ہم پردہ آئیڈیالوجی کے سب سے بڑے مسئلے پر آتے ہیں۔ یہ عورتوں کی تکمیلی صلاحیتوں اور تکمیلی شخصیت کا مسئلہ ہے۔ پردہ سسٹم کے حامی عام طور پر اور پردہ آئیڈیالوجسٹ خاص طور پر بڑی شدو مد، بلکہ غیض و غضب کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ عورت میں اعلیٰ تکمیلی صلاحیتیں فطری اور قطعی طور پر مفقود ہوتی ہیں۔ اس کے جواز میں وہ نہ صرف عورت کے جسمانی اور جنسی صورت حال، بلکہ اس کی ذہنی اور عقلی نقائص

---

1. Simone de Beauvoir, *The Second Sex*, p. 233.

اور خامیاں اور تاریخی شواہد کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔

تکمیل کا آغاز کام سے ہوتا ہے اور اس کی انتہا کمال پر ختم ہوتی ہے۔ کام کے لئے متواتر اور انتھک محنت و مشقت، کوشش اور جد و جہد کی ضرورت ہے، مگر مگر کمال کے لئے لہو پانی ایک کرنے کے علاوہ عقل و فراست، جدت و ندرت فکر و تخیل کی بلند پروازی اور ادراک و وجدان کی بھی ضرورت ہے۔ حامیان پردہ عموماً اور پردہ آئیڈیالوجسٹ خصوصاً عورت کو تکمیل کی یہ تمام خوبیوں، صلاحیتوں اور اوصاف سے عاری تصور کرتے ہیں، وہ عورت کی جسمانی اور ذہنی، عقلی اور فکری نشوونما میں ان اعلیٰ اوصاف اور صلاحیتوں کا فطرتاً اور حقیقتاً فقدان پاتے ہیں۔ وہ عورت کو ادھورا انسان تصوّر کرتے ہیں جو مرد کی اعانت اور سہارے ہی سے کچھ حد تک انسان بن سکتی ہے، مگر انسان کامل تو ہرگز نہیں۔ بالفاظ دیگر، عورت میں ماورائیت کی نہ تو صلاحیت ہے اور نہ خوبی، جو مرد کا طرۂ امتیاز ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود
میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود [1]

---

[1] علامہ اقبال "ضرب کلیم"۔ مشہور جرمن فلسفی نٹشے بھی جس سے علامہ اقبال بہت متاثر تھے، عورت کو فطرتاً اور لازماً ایک محکوم اور مجبور ہستی تصور کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ عورت کے مسئلے کو بھی "ایشیائی" طریقے سے حل کرنا چاہیئے یعنی عورت کو مال مقبوضہ اور ذاتی ملکیت تصور کرنا چاہیئے جو صرف مرد کی خدمت کرنے اور اس کا سہارا لینے کیلئے پیدا کی گئی ہے ہر سمجھدار شخص کو عورتوں پر مردوں کی فضیلت کے "ایشیائی" تصور کی معقولیت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ قدیم یونانیوں نے بھی اس نظریئے کو قبول کر لیا تھا۔ ان میں یہ نظریہ ہومر کے وقت سے پریکلیز کے وقت برابر بڑھتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ یونانی کلچر بھی بڑھتا رہا۔ یہ ہے ترقی کا وہ حیرت انگیز، قابل قبول، لازمی اور منطقی راستہ جو تمام انسانیت کا راستہ ہے۔ کاش ہم اہل مغرب بھی اس پر کاربند ہو سکیں۔" بحوالہ Otto Weininger, *Sex and Character*, p. 342. London. 1906.

اگر عورت کی جسمانی اور جنسی کمزوریوں اور مجبوریوں اور تکمیلی اور تخلیقی نااہلیت اور فقدان کے باوجود یہ کہا جائے کہ عورت میں بھی اصولاً مرد جیسی اعلیٰ تکمیلی خوبیاں اور قوتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں تو پھر تاریخ انسانی کی شہادت کو کیا کیا جائے؟ مولانا مودودی عورت اور مرد کی مساوات کے دعویٰ کے جواب میں پدر سرداری منطق کی قدیم ترین دلیل اور شدید ترین وار کرتے ہوئے اعتراض کرتے ہیں:۔

"تم غریب عورتوں کو اس پہلو میں مرد کے مقابلے پر لاتے ہو جس میں وہ کمزور ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ عورتیں ہمیشہ مردوں سے کمتر رہیں گی۔ تم خواہ کتنی ہی تدبیریں کرلو، ممکن نہیں ہے کہ عورتوں کی صنف سے ارسطو، ابن سینا، کانٹ، ہیگل، خیام، شکسپیر، سکندر، نپولین، صلاح الدین، نظام الملک طوسی اور بسمارک کی ٹکر کا ایک فرد بھی پیدا ہو سکے۔[ل]"

ان کوائف و شواہد کے علاوہ عورت کی ذات میں کئی ایسی خامیاں اور کمزوریاں نظر آتی ہیں جو اسے مرد کے مقابلے میں عظیم ہستی (   ) پیدا کرنے سے قاصر معلوم دیتی ہیں اول یہ کہ عورت کیوں اپنے میں ایسی خودی اور انفرادیت اور فعالیت پیدا کرتی جو مرد ہمیشہ ہر زمانے میں پیدا کرتے رہے ہیں؟ وہ کیوں اپنی خودی کو اتنی بلند نہیں کرتی کہ مرد تو کیا خدا بھی اس سے پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟" وہ کیوں ایسی منفعل، انحصار پسند، بچگانہ، لامتغیر اور ناپختہ ہستی

جرمن مصنف اوٹو وائیگر جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے اپنی کتاب میں بارہا اس نظریے کی تکرار کرتا ہے کہ عورت میں عقل و فراست، استدلال و فہم اور سائنس، فلسفہ اور آرٹ کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ تو محض جنس خالص ہے جو ہر وقت عمل تناسل، مباشرت، شادی اور بچوں کے خیال میں رہتی ہے اور مرد کی اعلیٰ ذاتی فضیلت کے کبھی قریب بھی نہیں آسکتی بلکہ اعلیٰ ترین عورت بھی ادنیٰ ترین مرد کے پاسنگ نہیں ہوتی وہ اس قدر گھٹیا ہوتی ہے کہ دونوں میں مقابلہ اور مشابہت ناممکن ہے۔" ایضاً ص ۲۵۲۔

ل۔ "پردہ" ص ۱۹۳۔

ہے کہ فعل و عمل میں مرد اور بچے کے درمیان کی مخلوق دکھائی دیتی ہے جس کے باعث نسوانیت کے معنے ہی انفعالیت، انحصار پسندی اور ناقص العقلی ہو کر رہ گئے ہیں؟ کیوں عورتیں مردوں کی طرح تکمیل کی ضرورت، لگن اور شوق کو محسوس نہیں کرتیں؟ وہ کیوں صرف بچے جننے میں ہی اطمینان اور منتہیٰ حیات خیال کرتی ہیں اور کیوں سائنس اور فلسفے، ادب اور آرٹ، علوم و فنون اور صنعت و حرفت کے کاموں اور مہموں، اور نئی ایجادات اور انکشافات میں ذوق و شوق نہیں رکھتیں؟ ایسے کیوں ہے کہ جبکہ ہر آدمی کچھ نہ کچھ بننا چاہتا ہے؟ عورت صرف "گھر والی" بننے کے علاوہ کچھ اور "نہیں بننا چاہتی؟ ایسے کیوں ہے کہ جبکہ ہر مرد دنیا میں کوئی نہ کوئی مقام حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر عورت صرف گھر کی ہو کر رہنے پہ قانع ہو جاتی ہے؟ اگر یہی اس کی فطرت ہے تو کیا اس کے مقدر میں بے حسی اور بے مغزی نہیں لکھی ہوئی؟ کیا وہ ایسی انگور کی بیل نہیں، جو ابدالآباد تک صرف تحکم پسند اور تنآور مرد کے سہارے زندہ رہے گی اور اگر یہی اس کی فطرت ہے تو کیا پردہ آئیڈیالوجی، وہ آئیڈیالوجی جو مردانہ اور زنانہ زندگی اور معاشرے کو دو حصوں میں منقسم کرتی ہے، قدرت کے قانون کی حامل نہیں ہے؟

آزادیٔ نسواں نہایت دقت طلب اور دشوار کام ہے جسے ایک طرف مردوں کے صدیوں پرانے غلبے، برتری اور لاپروائی کی روایات، اور دوسری طرف عورتوں کے احساس کمتری، محکومی اور محرومی کے جذبات کے خلاف روپذیر ہونا ہے، جو معاشری کاموں، پیشوں، ہنروں اور تکمیلات سے بیدخل رکھنے سے عورت میں پیدا ہو گئے ہیں۔ ان مردانہ روایات اور غلبے نے، جن کی انتہائی صورت پردہ سسٹم اور پردہ آئیڈیالوجی ہیں، ایسے تعصبات اور ممانعتوں اور مناہیوں کی فضا اور رائے عامہ پیدا کر دی ہیں جن میں عورتوں کا بیرونِ خانہ کاموں اور تکمیلات کے خلاف شدید مخالفت اور مخاصمت پائی جاتی ہے، اُن کو ہر طرح کے معاشری عمل اور اشتراک سے منع کیا جاتا ہے اور اُن کی تکمیلی صلاحیتوں اور خوبیوں کو گہری حقارت سے دیکھا جاتا

ہے۔ لہٰذا عورت کے لئے صرف گھریلو زندگی اور نسوانی کاموں اور مشغلوں کے علاوہ اور کچھ کرنے کو نہیں ہوتا۔ بلکہ اس مخالفانہ معاشری اور تاریخی ماحول اور معاشری فضا اور رائے عامہ کی حقارت انگیز سلوک نے عورت کے لئے تخلیقیت اور ماورائیت کی تمام راہیں مسدود اور ممنوع کر دی ہیں۔ مارگریٹ میڈ، امریکی ماہر بشریات، لکھتی ہے:

"ہر ایک معلوم شدہ انسانی معاشرے میں مرد کی ضرورت تکمیل گری کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر ایک کلچر نے اپنے اپنے انداز میں، ایسی صورتیں پیدا کی ہیں جن میں مردوں کو اپنی حس مردانیت کو مسخ کئے بغیر اپنے تعمیری کاموں میں تسلی و تشفی حاصل ہو جاتی ہے بہت کم تمدنوں کو ایسی راہیں ملی ہیں جن میں عورتوں کو وہ تخلیقی بے قراری ملے جس سے انہیں بچے جننے کے علاوہ دوسری تسکین حاصل ہوتی ہو۔"

صرف زمانہ جدید میں وہ حالات، ماحول اور رجحانات رونما ہو رہے ہیں۔ جب مردوں کے پدرسردارانہ غلبے اور بالادستی میں ہر طور و طرح سے فرق پڑ رہا ہے۔ اور زیادہ مساویانہ اور آزادانہ معاشری حالات اور رجحانات پیدا ہو رہے ہیں جن میں عورتیں کام و محنت، سعی اور کوشش اور کمال کے ہر میدان اور شعبے میں زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر تکمیلات حاصل کر رہی ہیں اور ان تکمیلات میں تعداد اور معیار دونوں لحاظ سے تکمیلی امیج اور ترقی ہو رہی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کام انسان کے لئے حیاتیاتی ضرورت ہے۔ یعنی کام اور محنت کئے بغیر انسان زندہ اور خوشحال نہیں رہ سکتا۔ مگر انسانی زندگی اور معاشرے کو اس طرح منظم بھی کیا جا سکتا ہے جس میں بعض جماعت، گروہ یا طبقے خود کام اور محنت کرنے کی بجائے دوسرے گروہوں، جماعتوں اور طبقوں کے کام، محنت اور مشقت پر آرام و آرائش بلکہ عیش و عشرت کر سکیں۔ عورت ایسی انسانی مہنو سے

جس کا تاریخ انسانی میں مردوں نے سب سے پہلے اپنے آرام و آسائش، بلکہ عیش و عشرت کے لئے استحصال کرنا شروع کیا۔ خاندانی گروہ اور معاشرے کو اس طرح سے منظم کیا گیا کہ خاندان اور معاشرے میں مردوں کا پدر سرداری غلبہ اور حکم قائم ہو گیا، جس کی انتہائی صورت مسلمانوں میں پردہ سوسائٹی کی صورت میں رونما ہوئی۔ چونکہ عورت بیک وقت دو صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے، یعنی محنت و مشقت کی صلاحیت جس میں وہ مرد سے مشابہ ہے اور تناسل یعنی بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت، جس میں وہ مرد سے مختلف ہے، لہٰذا ہر پدر سرداری معاشرے میں اس کا دوہرا استحصال ہوتا رہا ہے۔ اس وجہ سے جس معاشرے میں مردوں کا غلبہ، تحکم، بالادستی اور زور و جبر جتنا زیادہ ہو گا اتنی ہی عورت اس دوہرے استحصال کی چکی میں پستی رہے گی۔ قرون وسطیٰ کے مسلمان معاشرے میں مسلمان عورت کی ایسی دوہری درگت کا ماجرا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، مگر جدید معاشرے نے کام اور محنت کرنے والے طبقوں اور گروہوں کے استحصال کی صورت حال کو عموماً اور عورت کے دوہرے استحصال کی صورت حال کو خصوصاً بتدریج تبدیل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس معاشرے کا آغاز تقریباً چار پانچ سو سال سے یورپ میں شروع ہوا اور اب تقریباً سارے کرہ ارض پر پھیلا گیا ہے۔

جدید ترقی پسند معاشرے میں کام اور تکمیل کی نوعیت میں انقلاب انگیز فرق آ گیا ہے۔ اب زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں کام اور محنت کے لئے زور اور قوت کے علاوہ علم و بصیرت کی بھی ضرورت ہے، جس کو انگریزی میں "نو ہاؤ" کہتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات اور انکشافات ہر طرح کے کام اور محنت، عمل اور تکمیل کو علم و بصیرت، عقل و ادراک کا مرہون منت بنا رہی ہیں۔ لہٰذا صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت، انتظامیہ اور حکومت، تعلیم و تدریس، تحقیق و ترقی کے ہر کام اور کاروبار میں ایسے

لوگوں اور کارکنوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ جیسے عورتیں، جن میں جسمانی زور اور طاقت تو کم ہے، مگر علم و بصیرت کی تحصیل و تربیت کے بعد وہ بھی ان کاموں اور شعبوں میں کام اور روزگار حاصل کر سکتی ہیں۔ یہ تبدیلی ہر ایسے ملک اور قوم میں واقع ہو رہی ہے جہاں عورتوں کو پردہ اور تعدد ازواج کی پابندیوں میں نہیں رکھا جاتا ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز سے اُن مسلمان ممالک اور اقوام میں بھی ایسی عورتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو اپنی تعلیم و تربیت اور علم و بصیرت کی بنا پر زیادہ سے زیادہ اور نئے سے نئے کام اور تکمیلات حاصل کر رہی ہیں۔

مثال کے طور پر ترکی میں جہاں پردہ اور تعدد ازواج سب سے پہلے منسوخ ہوئے، ترک عورتیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہر شعبے اور میدان میں تکمیلات حاصل کر رہی ہیں۔ عام پیشہ ورانہ کاموں مثلاً کارخانوں، دفتروں، فارموں میں مزدوروں اور کارکنوں، کلرکوں، سٹینوگرافروں، ٹائپسٹوں کے علاوہ، ترک عورتیں بڑھتی ہوئی تعداد میں استانیاں، نرسیں، پروفیسر، ڈاکٹر، سائنسدان، محقق، آرٹسٹ، مصنف، عالم، صحافی، انجنیئر وغیرہ بن رہی ہیں، یہ تکمیلی عورتیں، خاص طور پر ادیب، مصنف، سائنسدان، مفکر، دانشور اور آرٹسٹ ترکی کے ملک اور قوم میں انقلاب برپا کر رہی ہیں۔ تکمیلی عورتیں ہونے کے باعث وہ نہ صرف اپنے وطن کی پیداواری قوتوں اور خوشحالی میں اضافہ کر رہی ہیں، بلکہ مائیں ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اولاد یعنی نئی نسلوں کو تکمیلات کی جانب سمت بندی اور ترغیب بھی دیتی ہیں۔[1] جب پردہ اور تعددِ ازواج کو ترکی میں منسوخ ہوئے پچاس سال کے قریب ہوئے ہیں جب سے ترکی میں ہر نئی نسل پہلی نسل سے زیادہ تکمیلی بن رہی ہے۔ اس طرح ترکی میں مسلمان معاشرے کا صدیوں پرانے انحطاط و زوال کے چکر اور رجحانات کا سلسلہ ختم ہو کر، اب ترقی اور پیش رفتگی کا قانون رائج ہو گیا

ط[1] Nuri Eren, *Turkey, Today and Tomorrow*, pp. 180-84.

ہے۔ یہی صورت حال اُن تمام مسلم ممالک میں ہے جہاں پردہ اور تعددِ ازدواج کے مخرب الاخلاق ادارے ختم کر دیئے گئے ہیں۔

درحقیقت، زمانہ جدید میں ایک قابلِ ذکر تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ جو عورتیں باعمل اور باتکمیل زندگی اختیار کرتی ہیں وہ اپنی جسمانی اور جنسی مشکلات پر قابو حاصل کر لیتی ہیں۔ مگر ان کی یہ کامیابی اور بھی زیادہ آسان اور مؤثر ثابت ہوتی ہے جب معاشرہ بھی اُن کی ان کوششوں اور محنت و مشقت میں حقوق و قوانین کے ذریعے ان کی مدد اور معاونت کرتا ہے، خواہ یہ مدد اور اعانت زچہ خانے میں ہو یا کام اور تکمیل کے میدانوں یا شعبوں میں ہو۔ اگرچہ دنیائے انسانی میں ابھی تک کوئی معاشرہ وجود میں نہیں آیا جس میں مرد و زن کو حقوق اور قانون کی نظر میں کلی اور کامل اور قطعی مساوات حاصل ہو گئی ہو، تاہم ایک نئی قسم کی عورت ضرور وجود میں آ گئی ہے جو کام اور زچگی یعنی نسائیت اور تکمیلیت کے دوسرے فرائض کو سرانجام دے رہی ہیں۔ ان نئی عورتوں کے لئے حمل اور جسم نسوانی کے دوسرے عوامل کام اور تکمیل میں مانع اور مخل... نہیں ہوتے۔ اس طرح جدید عورت ہر طرح کے بیرونِ خانہ کام، کارنامے اور کمالات حاصل کر رہی ہے۔

جدید عورت کی تخلیقی تکمیل گری

زمانہ جدید کی سب سے زیادہ عظیم اور قابل ذکر تبدیلی جدید عورت کی تخلیقی تکمیل گری ہے، جو پردہ اور پدرسرداری غلبے کی آئیڈیالوجی کی تردید اور تکذیب کا مکمل اور واضح ثبوت ہے۔ پردے کے حامیوں اور آئیڈیالوجسٹوں کے بہانگ دہل دعووں کے باوجود، کام اور محنت تو عورت ہر دور اور ہر زمانے میں گھر کے اندر اور گھر سے باہر کرتی رہی ہے۔ مگر یہ کام محض گھریلو اور کمر توڑ قسم کے جسمانی محنت اور مشقت کی نوعیت کے ہوتے تھے جیسا کہ پاکستانی معاشرے اور دوسرے مسلم ممالک میں اب بھی ہوتے ہیں۔ لیکن زمانہ جدید میں عورتیں بھی علوم و فنون، آرٹ

اور ادب، سائنس اور فلسفے، سیاست اور حکومت، حتیٰ کہ دفاع اور جنگ کے میدانوں میں بھی ویسی ہی تکمیلات اور کارنامے حاصل کر رہی ہیں جو صدیوں سے مردوں کی اجارہ داری اور اُن کے ذہن و فکر کا طرّۂ امتیاز تصوّر کئے جاتے تھے اور جو حامیانِ پردہ اور پردہ آئیڈیا جیسٹوں مردوں کی برتری اور فوقیت کا بیّن ثبوت قرار دیتے ہیں۔ مادام کیوری اور ان کی بیٹی ایرین نے طبیعات میں وہ کمالات حاصل کئے ہیں جو مرد حاصل کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، موجودہ صدی کے آغاز سے جب نوبل انعامات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو مختلف علوم و فنون میں متعدد خواتین نے اس بین الاقوامی انعامی کو حاصل کر کے ابدی شہرت پائی ہے۔ اُن میں گرٹی کوری نے فزیالوجی اور طب میں، ۱۹۴۷ء میں ماریا جیوپرٹ مائر نے طبیعات میں ۱۹۶۳ء میں، ڈورتھی ہوجکن نے ۱۹۶۴ء میں کیمسٹری میں اور سیلمہ لاگروف نے ۱۹۰۹ میں، گرازیہ ڈیلڈا نے ۱۹۲۶ میں، سگرڈ انڈسٹ نے ۱۹۲۸ میں، پرل بک نے ۱۹۳۸ء میں اور گبریلہ مسلٹرل نے ۱۹۴۵ میں ادب میں نوبل انعامات حاصل کئے۔

مگر جیسے مسلمان مرد تخلیقی تکمیل گری اور بین الاقوامی نوبل انعامات کے زمرے میں تہی دست ثابت ہوئے، اسی طرح مسلمان عورتیں تخلیقی تکمیلات میں خالی ہاتھ نظر آتی ہیں۔ اس ضمن میں ترکی جیسے مسلم ملک بھی جہاں پردہ اور تعددِ ازدواج تقریباً ایک نسل سے منسوخ کر دیئے گئے تھے، شمار ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذہنی دماغی اور عقلی تکمیل گری محض پردہ اور تعددِ ازدواجگی کے خاتمے کے ساتھ ہی شروع نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ پردہ اور تعددِ ازدواج کے معاشرتی کرداری، اخلاقی اور تمدنی اثرات تپ دق جیسے موروثی امراض کی طرح دو تین نسلوں تک باقی رہتے ہیں معمولی تکمیلات تو فوراً ہی شروع ہو جاتی ہیں، مگر تخلیقی اور جدت پسند تکمیلات اس وقت تک شروع نہیں ہوتیں جب تک ایک دو نسلوں میں پردے کے پیدا کردہ اثرات زائل نہ ہو جائیں اور معاشرے سے کردار و شخصیت کے انحطاط اور تقلیل تکمیل کے اثرات اور عوامل و عواقب

کلی طور پر رفع نہ ہو جائیں۔

پردہ سسٹم کا خاتمہ اور عورتوں کی تکمیل گری کے مسائل

پاکستان اور تقریباً سب مسلم ممالک میں پردہ ختم ہو رہا ہے اور مسلمان عورتوں میں تعلیم اور ملازمت اور معاشری زندگی میں آزادانہ شرکت اور شمولیت کے رجحان بڑھ رہے ہیں، مگر ان "تبدیلیوں سے کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ پردے کے حامیوں اور آئیڈیالوجسٹوں کے خیال میں ان تبدیلیوں کا مقصد عورت سے یہ کہنا ہے کہ :-

"تو وہ ساری مصیبتیں بھی برداشت کر جو فطرت نے تیرے اوپر ڈالی ہیں اور پھر ہمارے ساتھ آکر روزی کمانے کی مشقتیں بھی اٹھا، زاوں ہماری سوسائٹی میں آکر ہمارا دل بھی بہلا اور ہمارے لئے عیش و مسرت اور لطف و لذت کے سامان بھی فراہم کر؟"[1]

پردے کے خاتمے کا یہ نظریہ نہایت سطحی، غیر سنجیدہ اور بعید العقل ہے، پردے اور تعدد ازدواجی کو ترک کرنے کا بنیادی محرک یہ ہے کہ عورت بھی انسان ہے اور بحیثیت انسان اس کو بھی کام، عمل اور تکمیل کے علاوہ آرام و راحت، سکون و اطمینان، خوشی اور آسودگی، صحت اور تندرستی کے وہی اور ویسے ہی آزادانہ مواقع اور مساویانہ حقوق اور سہولتیں میسر ہونی چاہئیں جو مرد کو حاصل ہیں، تاکہ مرد اور عورت دونوں اپنے اشتراک عمل اور تعاون سے ملک، قوم اور معاشرے کی ترقی، خوشحالی، استحکام اور بقا و سلامتی کے تقاضوں، منصوبوں اور مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔ چونکہ عورت کی جنسی نوعیت ایسی ہے کہ اس کے کام، عمل اور تکمیل کے حقوق اور مواقع سے مرد کی جنسی زندگی پر اثر پڑتا ہے، مگر اس کا حل مرد کے پدرسرادانہ غلبے، تحکم، فوقیت اور تکمیلی اجارہ داری سے اور عورت کو کام، عمل اور تکمیل کے حقوق اور مواقع سے محروم کر کے گھر اور پردے میں بند کرنے سے نہیں تلاش کرنا چاہیئے،

---

[1] مودودی "پردہ" ص ۱۹۰-

جیسا کہ پردہ سوسائٹی میں صدیوں سے کیا جاتا ہے' بلکہ مرد کی جنسی زندگی کو ایسے منضبط اور مربوط کرنے سے حاصل کیا جائے جس میں عورت کے کام' عمل اور تکمیل' تعلیم اور ملازمت اور پیداواری اور تخلیقی مشاغل کی آزادی اور مساویانہ حقوق اور مواقع کا پوری طرح تحفظ ہو. درحقیقت مسلمان عورت کی آزادی اور مساوات کا مطالبہ اس معاشرتی قانون کی عبارت ہے کہ مسلم معاشرے اور خاندانی زندگی میں مرد کا غلبہ' برتری اور فوقیت جتنی زیادہ کم ہوگی' عورت اتنی ہی زیادہ تکمیلی بنے گی اور جتنی زیادہ عورت تکمیلی بنے گی' بچوں اور مردوں کے ذہن و کردار اتنے ہی زیادہ تکمیلات کی جانب سے سمت بند ہوں گے اور مسلم معاشرہ اتنا ہی زیادہ تکمیلی بنے گا. ایک آزاد خود مختار' خود انحصار تکمیلی عورت اپنے کام' عمل' تخلیق اور تکمیل سے ایسا معاشرتی ماحول پیدا کر دیتی ہے جو اخلاقی پند و نصائح کے دس واعظوں یا کتابوں کی نسبت قوم' ملک اور معاشرے کو کام' عمل' تنظیم نو اور تخلیق کی تکمیلات کی جانب سمت بند کرتا ہے. علاوہ ازیں' مسلمان عورت کی آزادی اور مساویانہ حیثیت اس کی جنسی نسوانی ذمہ داریوں' یعنی ضرورت تناسل کے فرائض کو اتنا ہی زیادہ انسانی بنا دے' جواب تک مرد کے پدرسردارانہ غلبے' تحکم' بالادستی اور افضلیت کے نظریات' روایات اور عادات نے حیوانی بنا رکھے ہیں. بالفاظ دیگر' تکمیلی عورت بچہ اپنی مجبوری' لاچارگی اور محتاجی کے باعث نہیں' بلکہ میاں بیوی کے پیار و محبت کی بنا پر اور اپنی آزادانہ اور مساویانہ رضا و رغبت' خوشی اور فیصلے سے پیدا کرے گی.

بہرحال' جب مسلمان عورتیں پردے اور زنانخانے کی محدود اور مسدود دنیا کو ترک کر کے کام' ملازمت' عملی زندگی' تخلیق اور تکمیل کی دنیا میں قدم رکھتی ہے تو انہیں کئی طرح کے مسائل اور مشکلات پیش آتی ہیں' جن میں جنسی آوارگی اور انتشار کے بڑھنے کا امکان یا احتمال بھی شامل ہے. لہٰذا پردے اور تعدد ازدواجگی کو صحیح اور کامل طور پر ختم کرنے کے لئے چند ابتدائی اور بنیادی شرائط اور اقدام ضروری ہیں تاکہ اس عظیم تبدیلی سے قوم' ملک اور معاشرے کو کاملاً اور کلیتاً تکمیلی اور ترقی

پسند بنایا جائے :۔

اوّل :۔ تعدد ازدواج کو قانوناً منسوخ کر کے حکومت، انتظامیہ اور عدلیہ یک زوجگی کے قانون کو بلا استثنا سختی سے نافذ کریں۔ اس سے معاشری زندگی ماکروشول بن جائے گی اور قومی شعور پیدا ہو گا۔

دوم :۔ مردوں اور عورتوں کو طلاق (خلع) کے مساویانہ حقوق دیئے جائیں اور مرد کو آسانی سے طلاق دینے کے حق سے قطعی محروم کر دیا جائے۔ تاہم طلاق کا حصول مرد و زن دونوں کے لئے یکساں طور پر مشکل بنایا جائے۔

سوم :۔ عورت کی جنسی صورتحال کے باعث طلاق کی ایسی صورتوں میں جو مرد کے ظلم و زیادتی، بدسلوکی یا دوسری شادی کی خواہش کی وجہ سے عائد ہوا ہو، تو مطلقہ عورت کو اپنے سابق شوہر کی آمدنی سے معاوضے کا حق بھی حاصل ہو گا۔ معاوضہ کی رقم اس صورت میں اور بھی زیادہ ہو گی جب اس کے ایسے بچے ہوں جو اس شوہر سے پیدا ہوئے ہیں، کیونکہ ان کی پرورش کا حق ماں کو ہی حاصل ہو گا۔

چہارم :۔ مردوں اور عورتوں کے پردہ سنڈروموں کو کلی طور پر ختم کرنے کے لئے پردہ آئیڈیالوجی کے تمام نظریات، تصورات، عادات اور رویوں اور رایوں کے خلاف حکومت اور انتظامیہ کے علاوہ، قوم اور اہل علم و فکر کی تمام ذرائع ابلاغ اور فکری و علمی قوتوں اور صلاحیتوں کو منظم کر کے بروئے کار لایا جائے۔

پنجم :۔ عورت کے نسوانی فرائض، وظائف اور ضروریات کے پیش نظر ملک اور معاشرے میں ہر طرح کے ایسے اداروں اور انتظامات، حالات اور سہولتیں فراہم کی جائیں جو عورتوں کی صحت، تندرستی، آرام و سکون، آسائش اور راحت کے تمام مواقع اور آسانیاں پیدا کریں۔

یک زوجگی، میاں بیوی کی محبت اور ضرورت تکمیل میں بہت گہرا تعلق ہے۔ جب یک زوجگی قانوناً غیر مشروط، قطعی اور بلا استثنا نوعیت کی ہوتی ہے تو یہ میاں بیوی میں بھروسہ اور باہمی اعتماد کی فضا پیدا کر دیتی ہے

جس میں مرد وزن کی محبت کا نازک پودا پھل پھول سکتا ہے، مگر یہ محبت صرف آزاد ماحول میں ممکن ہوتی ہے اور مساویانہ ماحول میں پروان چڑھتی ہے چونکہ انسانی تعلقات ہر وقت منقطع ہو جانے کے امکان اور احتمال سے دوچار رہتے ہیں، اس لئے اس بھروسے اور اعتماد کی فضا کو قانون اور معاشری رائے کے سہارے اور اعانت سے مزید تقویت پہنچتی ہے، ورنہ دو دلوں کا میل کسی قانون اور رائے کا محتاج نہیں ہوتا۔

عمل تناسل کے لئے ضروری نہیں کہ میاں بیوی میں محبت اور پیار ہو، یہی وجہ ہے کہ قبل ابتدارانہ مائیکرو سوسائٹیوں میں شادی کے تصور میں میاں بیوی کی محبت کی نہ ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی اس کی کوئی گنجائش اور توقع کی جاتی ہے۔ مگر غیر قبل ابتدارانہ ماکرو سوسائٹی میں محبت کے بغیر شادی کا نازک رشتہ قائم نہیں رہ سکتا، کیونکہ ماکرو سوسائٹی کے قیام و دوام کے لئے قوم و ملک کی ہمہ گیر اور ہنگامہ خیز ترقی پسندانہ زندگی میں ہر وقت ہر جگہ اور ہر سطح پر تکمیلات کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا تکمیل کے لامتناہی تسلسل کے لئے ضروری ہے کہ میاں بیوی دونوں تکمیلی ہوں، تاکہ تکمیلوں کے حصول میں ایک فریق دوسرے کی باشعور اور پورے اعتماد اور اعتبار کے ساتھ اعانت اور تعاون کر سکے، جو صرف دونوں میں محبت و پیار کے رشتے میں ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں بحیثیت ماں باپ کے، دونوں اپنے بچوں کے ذہن و کردار، عادات اور شخصیت کی نشوونما اور تربیت اور تشکیل کو بھی تکمیل کی جانب سمت بند کر سکتے ہیں جب دونوں میں محبت و پیار اور باہمی اعتماد اور بھروسہ ہو۔

میاں بیوی کی محبت محض جنسی جذبہ نہیں، بلکہ مزاج اور طبیعت، عادات و خیالات اور ذوق و شوق کی ہم آہنگی اور مواقفیت پر بھی مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ جذبات کے علاوہ عقل و شعور اور علم و آگاہی کی محتاج ہے اس لئے محبت کو تکمیلی بنا کر ہی قائم و دائم رکھا جا سکتا ہے۔ اگر تکمیلات کا سرچشمہ خشک ہو جائے، تو میاں بیوی کی محبت بھی ان کے تخلیقی، تجدیدی اور ماورائی ارادوں، تمناؤں، خیالوں اور خوابوں

میں باہمی رفاقت اور ہمکاری سے محروم ہو کر محض جنسی خواہشات تک محدود رہ جائے گی، جو بذات خود ایک عارضی کیفیت ہوتی ہے۔ لہٰذا میاں بیوی کی محبت کو ایسے ماحول اور معاشرے کی ضرورت ہے جو اس کو تکمیلات کے لامتناہی سلسلے کے ذریعے ہمیشہ ہری بھری رکھے۔

اس لئے پردہ آئیڈیالوجی کا یہ نظریہ کہ "مردانہ" کاموں اور پیشوں کو اختیار کرنے اور "مردانہ" کمالات حاصل کرنے سے "عورت"، ناعورت بن جاتے گی۔ لاعلمی اور جہالت پر مبنی ہے[1]۔ دراصل عورت جتنی زیادہ تکمیلی کردار اور شخصیت کی مالک ہوگی، اتنی ہی زیادہ اس کی نسوانی خوبیاں اور خصوصیات اجاگر ہوں گی اور وہ اتنی ہی زیادہ "عورت" بنے گی اور بحیثیت بیوی اور ماں کے وہ اتنا ہی زیادہ نسوانی وظائف اور فرائض بہتر اور زیادہ کارکردانہ طور سے انجام دینے کے اہل ہوگی۔

کام، عمل اور کمالات خواہ معمولی ہوں یا غیر معمولی، عام ہوں یا اعلیٰ، پیداواری ہوں یا تخلیقی، عورتوں کے لئے اُن کے حصول و تکمیل کی چند شرائط ہیں، جو مردوں اور عورتوں کی تکمیل گری کے بنیادی اختلاف، یعنی دونوں کے جنسی اختلاف اور جدلیات کے باعث معاشراً ضروری اور لازمی ہیں۔ ان اختلافات اور جدلیات کی وجہ سے عورت کے لئے آزادی اور مساوات کے معنے مختلف ہو جاتے ہیں۔ عورتوں کی تکمیل گری مردوں کی تکمیل گری کی نسبت نفسیاتی، کرداری اور نظریاتی اور معاشری عوامل و عواقب کی زیادہ اثر قبول کرتی ہے، لہٰذا عورت کی تکمیل گری اس وقت شروع نہیں ہوگی جب وہ پردہ اور زنانخانے سے باہر آجائے، بلکہ اس وقت شروع ہوگی۔ جب مردوں کا پردہ سنڈروم ختم ہو جائے گا یعنی جب معاشرہ کلی طور پر پردہ اور تعددازدواجگی کے تمام رسم ورواج، نظریات اور خیالات پابندیوں اور رویوں، ممانعتوں اور مناہیوں سے کامل طور پر آزاد ہو جائے گا عورت کے لحاظ سے اس آزادی اور مساوات کے معیار کی شرائط یہ ہیں۔

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۹۱

اول، شادی کے معاملے میں لڑکی یا عورت اپنا شوہر خود اپنی پسند سے تلاش کرے ماں باپ، بھائی اور سرپرست (اگر ہو) اس کو اپنی رائے اور مشورہ دے سکتے ہیں، مگر مجبور نہیں کر سکتے، کیونکہ اس معاملے میں اس کے فیصلے کی آزادی پر کسی کو کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ لہٰذا کوئی عورت (لڑکی) کسی شخص کی مقبوضہ یا ملکیت متصور نہیں ہوگی خواہ وہ اسکا شوہر یا اسکے خاندان کا کوئی اور فرد ہی کیوں نہ ہو۔ میاں بیوی کے تعلقات باہمی رضا و رغبت اور پیار و محبت پر قائم ہوں گے، حتیٰ کہ زن و شوئی تعلقات میں بھی بیوی کی مرضی اور خوشی فیصلہ کن حیثیت کی مالک ہوگی، کیوں کہ اپنے بارے میں اس کی اپنی رضا و رغبت کی آزادی اور مساوات پر کبھی اور کسی صورت میں بھی کوئی حد یا قدغن عائد نہیں ہوگی۔ اگر وہ ان تعلقات سے انکار کرے اور میاں اس کی دلجوئی نہ کر سکے، تب بھی وہ طاقت، زبردستی یا "غلبہ اور شدت اور تحکم" استعمال کرنے کا مجاز نہیں ہوگا، بلکہ زیادہ لگن سے اس کی دلجوئی اور پیار و محبت کی راہ ہی اختیار کریگا۔ لیکن اگر وہ یہ راہ اختیار نہ کرنا چاہے تو طلاق کی قانونی چارہ جوئی کی راہ اختیار کر سکتا ہے۔ مگر کسی صورت میں بھی وہ مردانہ "غلبہ اور شدت اور تحکم" کے طریقے اختیار نہیں کر سکتا، جواب صرف جاگیرداری اور قبائلی آثار قدیمہ کے میوزیم میں ہی نظر آنے چاہئیں۔ انسانی زندگی، تعلقات اور معاشرے میں اُن کے لئے اب کوئی گنجائش نہیں۔ دوسری شرط ہے کہ کوئی مرد کسی عورت سے کسی قسم کا تعلق، خواہ وہ انفرادی، معاشری، جنسی یا غیر جنسی کسی نوعیت کا ہو، اس کی اپنی مرضی رضامندی، اجازت اور آزادی کے بغیر قائم نہ کر سکے اور نہ قائم رکھ سکے گا۔ تیسرے، کوئی مرد خواہ وہ اس کا قریب ترین رشتہ دار یا شوہر ہی کیوں نہ ہو، اس کی رضا و رغبت، مرضی، آزادی اور فیصلہ پر کوئی اختیار نہ رکھے وہ اس کو سمجھا سکتا ہے، نصیحت رائے اور نیک تلقین کر سکتا ہے، مگر ہر کام، عمل اور تکمیل میں آخری فیصلہ عورت کی اپنی مرضی اور خوشی اور پوری آزادی

کے مطابق ہوگا۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ معاشرے کے تمام ماکرو سوشل ادارے یعنی حکومت، قانون، انتظامیہ، عدلیہ اور رائے عامہ اور ابلاغ عامہ کی ایجنسیاں اور ایجنسیں پردہ اور تعدد ازواجگی کے تمام رسم و رواج، رویوں اور نظریات اور طور و طریقوں اور مائیکرو سوشل طرز زندگی، مثلاً جاگیرداری، قبائلیت، ذات پات اور برادری وغیرہ کے خلاف نہ صرف زبردست پروپیگنڈا مہم چلائیں، بلکہ قانون، انتظامیہ اور ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع کو حرکت میں لاکر عورت کی آزادی اور مرد و زن کی مساوات کو قانونی، نظریاتی اور معاشرتی طور پر حقیقت بنادیں عورت کی آزادی اور تکمیل گری کی ابتداء عورت کے احترام اور عزت نفس سے ہوتی ہے۔ مگر اس کے بغیر کوئی معاشرہ بھی صحیح اور حتمی طور پر انحطاط شخصیت اور تقلیل تکمیل کے عوامل و عواقب سے نجات نہیں حاصل کرسکتا۔

پردہ ترک کرنے پر مردوں اور عورتوں اور لڑکوں اور لڑکیوں میں آزادانہ میل ملاپ اور باہمی عمل کے مواقع بڑھتے ہیں، جن کے باعث جنسی آوارگی اور بے راہ روی اور منفی انتشار کے پھیلنے کا احتمال بھی بڑھتا ہے، جس کا خمیازہ پہلے عورت کو، پھر اس کی اولاد کو اور پھر آنے والی نسلوں اور معاشرے کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ان خرابیوں اور نتائج کا تدارک آزاد عورتوں اور لڑکیوں کو تکمیلی زندگی کے مواقع سے محروم کرکے اور پردے کی پابندیاں بڑھا کر نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ پردے کے حامیاں اور آئیڈیالوجسٹ چاہتے ہیں، بلکہ ہمارے معاشرے کو ماکرو سوشل بنیادوں پر منظم کرنے سے ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ حکومت ایسے قوانین اور پالیسی مرتب کرے تاکہ یک زوجگی کا قانون بلا استثنا نافذ کیا جائے۔ کسی مرد کو کسی صورت اور حالت میں بھی بیک وقت ایک رکھنے سے زیادہ بیوی کا حق نہیں ہونا چاہیئے۔ مگر چونکہ بعض شادی شدہ جوڑے ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو نفسیاتی، کرداری، خیالاتی یا کسی اور وجہ سے باہمی پیار و محبت سے نبھا نہیں کرسکتے، اس لئے یک زوجگی کے قانون میں طلاق کی شق بھی رکھی جائے، جس کا حق میاں اور بیوی کو یکساں حاصل ہو، تاکہ طلاق دینے میں

مرد کی فوقیت ختم ہو جائے۔ مگر طلاق کا حصول قدرے مشکل ہونا چاہیئے کیونکہ آسان طلاق خواہ میاں کی طرف سے دیا جائے یا بیوی کی طرف سے خاندانی زندگی کے فرائض اور ذمہ داریوں کے منافی ہے۔ طلاق کو مشکل بنانے کے لئے اس کا حصول تین مدارج میں ہونا چاہیئے پہلے مرحلے میں میاں بیوی کے احباب و دوست دونوں میں افہام و تفہیم سے معاملہ سلجھانے کی کوشش کریں اگر پھر بھی جوڑا طلاق پر بضد ہو تو دونوں فریق اپنے اپنے ثالث مقرر کریں، جو ان میں صلح و صفائی سے تالیف قلوب کی کوشش کریں یا مستقل علیحدگی کا فیصلہ کردیں۔ اگر مستقل علیحدگی کا فیصلہ ہو، تو آخری مرحلے پر عدالت سے چارہ جوئی کرکے طلاق ہونا چاہیئے۔ ان تمام مرحلوں میں کسی صورت میں بھی اتنا عرصہ نہیں لگنا چاہیئے کہ شوہر کی جانب سے ظلم و زیادتی کا احتمال پیدا ہو جائے، بلکہ اگر ثالثوں یا عدالت کو معلوم ہو جائے کہ شوہر طلاق کی کارروائی کی آڑ میں عورت سے ناروا سلوک کرتا ہے۔ تو طلاق جلد از جلد عائد کر دینا چاہیئے۔

دوسرا مسئلہ عورتوں کی ملازمت یا ایسا پیشہ اختیار کرنے سے پیدا ہوتا ہے جب وہ گھر سے باہر کام کرنے جانا پڑتا ہے۔ ایسی خاتون کو دن کا کافی وقت اپنے گھر اور کنبے اور بچوں سے پرے دفتر یا دکان، کارخانے یا اپنی ملازمت کی جگہ گزارنا پڑتا ہے۔ ایسی ملازم پیشہ عورتوں کو کئی طرح کی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ ایسی دقتیں اُن خواتین کے لئے بہت مشکل کا باعث ہوتی ہیں جو حاملہ ہوں یا دودھ پلانے والی یا چھوٹے بچے کی مائیں ہوں۔ ماں بننے والی خواتین کو وضع حمل سے تین ماہ قبل اور تین ماہ بعد پوری تنخواہ اور دوسری مراعات کے ساتھ رخصت ملنی چاہیئے[۱] دودھ پلانے کے ایام میں اور جب تک ننھا بچہ تین سال کا نہ ہو جاتے تو اس کی دیکھ بھال کے لئے اس کی ماں کو پوری تنخواہ پر اوقات کار کے نصف حصے کام لینا چاہیئے اور دودھ پلانے کے ایام میں اس نصف اوقاتِ کار میں بھی ایسی ماں کو ہر تین گھنٹوں کے بعد دودھ پلانے

---

[۱] اگر مسٹر قذافی حاملہ عورت کی ایام حمل میں ایسی مراعات کو مدنظر رکھتے تو ہیرا شوٹ چھلانگ کا اعتراض بھی نہ کرتے۔

کے لئے آدھ گھنٹے کی چھٹی ملنی چاہیئے۔ علاوہ ازیں ایسی ملازمت پیشہ خواتین کی سہولتوں کے لئے کارخانے، دفتر، سکول، دوکان یا کام اور کاروبار کی جگہ کی حدود میں یا اس کے قریب ہی نرسری، کریشے اور کنڈرگارٹن سکول قائم کئے جائیں جہاں تربیت یافتہ نرسوں، ڈاکٹروں اور ماہرین نفسیات، استانیوں اور ماہرین تعلیم وتربیت کی نگرانی اور سپردگی میں کارکن خواتین اپنے ننھے بچوں یا سکول جانیکی عمر سے کم بچوں کو چھوڑ جائیں جہاں انکی دیکھ بھال کی جاتی ہے تاکہ اوقات کار میں اُن کی مائیں پورے سکون اور اطمینانِ قلب سے اپنے کام اور فرائض سرانجام دے سکیں۔ اس طرح کی نرسری اور کنڈرگارٹن اور ابتدائی سکول ہر محلے بستی اور کالونی اور گاؤں میں کھولے جانے چاہئیں تاکہ ان خواتین کو بھی سہولت ملے جو اپنے گھروں یا محلوں میں ہی کسی کام یا کاروبار میں مصروف ہوتی ہیں۔

مردوں کے پردہ سنڈروم کے باعث ملازم پیشہ عورتوں کو ایک اور مسئلہ درپیش آتا ہے۔ ایسی عورتوں کو اپنے دفتر یا کام کرنے کی جگہ میں ایسے مردوں سے واسطہ پڑتا ہے جو غالب جنس یا افسر یا بوس ہونے کے باعث غیر شریفانہ حرکات کرتے ہیں۔ اس خرابی کا تدارک عورتوں کی تنظیموں اور رائے عامہ اور ابلاغ عامہ کے اداروں کو حرکت میں لاکر ہی کیا جاسکتا ہے۔ عورت کا احترام جدید تکمیلی معاشرے کی تنظیم، تشکیل اور ارتقا کی شرط اولین ہے۔ مگر یہ ایسا جذبہ ہے جو ملک و قوم میں عورت کی عزت اور قدرومنزلت بڑھاکر ہی پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس فریضے میں ہمارے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کا رول اول حیثیت کا حامل ہے۔ مگر رائے عامہ کے تمام اداروں اور ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع کو بھی ملک اور معاشرے میں عورت کی عزت واحترام کے جذبات کی تلقین اور تبلیغ کرنی چاہیئے۔ آزادئی نسواں اور مرد اور عورت کی مساوات عورت کے احترام کو حقیقت بنانے کی طرف پہلے قدم ہیں، جو خاندانی زندگی، عائلی قوانین سے لے کر معاشرے اور قوم کی زندگی کے تمام پرائیویٹ اور پبلک اداروں شعبوں، کاموں، پیشوں، میدانوں اور مقامات میں پائی جانی چاہیئے۔

گھر سے باہر کام کرنے والی عورتوں کا ایک اور مسئلہ کم سن بچوں کی دیکھ بھال ہے۔ پردے کے حامیوں اور پردہ آئیڈیالوجسٹوں کا ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ ملازم پیشہ عورت اپنے بچّوں کی پرورش اور تربیت کے فرائض انجام نہیں دے سکتی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کا اٹھان اور ان کے کردار اور شخصیّت کی نشوونما پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ پردہ دار عورتیں اپنی لاعلمی اور پردے کی پابندیوں کے باعث اس فریضہ کو کماحقہ سرانجام دینے ہی کی اہل نہیں ہوتیں، جیسا کہ ہم نے گذشتہ ابواب میں وضاحت سے تجزیہ کیا ہے اس مسئلے کا صحیح حل خاندان اور معاشرے کی تنظیم نو میں ہے۔ علاوہ ازیں، گھر سے باہر ملازمت، کام، عمل اور تکمیل بذات خود ایسے تجربات ہیں جو ہر عورت کو ایک اچھی ماں بننے میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ زمانہ جدید کے تکمیلی معاشرے میں سمجھدار، باشعور، ذمہ دار، محنتی، مستعد اور فرض شناس ماؤں کی ضرورت ہے جو گھر سے باہر کی دنیا کے کاموں، سرگرمیوں اور واقعات سے کماحقہ واقف ہوں۔ ایسی مائیں جو سرگرم اور تکمیلی زندگی گزارتی ہیں اور جنہیں اُن کا معاشرہ بھی اُن کے مادری فرائض کی انجام دہی میں موزوں نرسری، کنڈرگارٹن جیسے سکولوں اور اداروں سے مدد دیتا ہے، انہیں ۲۴ گھنٹے گھر میں بند رہ کر بچوں کی دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ تکمیلی زندگی گزارنے والی مائیں اپنے ضروری کام یا ملازمت وغیرہ کے چند گھنٹوں کے بعد دن کا باقی وقت گھریلو امور میں، میاں بیوی کی باہمی خدمت گزاری میں اور دونوں میاں بیوی اپنے بچوں کی مشترکہ اور باہمی دیکھ بھال، پرورش اور تربیت میں گزارتے ہیں۔ یہ خاندانی زندگی ایسے گہرے اور مربوط رشتے پر قائم ہوتی ہے جس میں کوئی تکمیلی خلا باقی نہیں رہتا، نہ میاں بیوی کے مابین اور نہ ہی والدین اور بچوں کے مابین یہ ایسی زندگی ہے جس میں دلوں اور دماغوں کا میلاپ ہوتا ہے، جس میں تکمیلی شعلے سے شعلہ لپکتا ہے اور دیے سے دیا جلتا ہے۔ تکمیلی خواتین کی زندگی بذات خود ایسی مثال ہے جو انہیں اپنے بچوں، شوہر اور خاندانی زندگی کے مسائل سمجھنے اور تکمیل

کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے دونوں میاں بیوی میں تکمیلی ہم آہنگی اور تعاون بڑھتا ہے جو خاندانی زندگی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ مزید بر آں عورتیں جو ملک و قوم کی آدھی آبادی ہوتی جب وہ پوری طرح تکمیلی زندگی گزارتی ہیں اور ہر طرح کے پیداواری اور تخلیقی کاموں اور تکمیلات میں شرکت کرتی ہیں تو وہ اپنے ملک قوم کی قسمت بدل دیتی ہیں یہ ان کا تاریخی رول۔ وہ قوم جو اپنی آدھی آبادی کو، جو ساری قوم کو اپنی گود میں پالتی ہے۔۔ پردہ سسٹم اور اس کی آئیڈیالوجی کی جہالت اور لاچارگی میں رکھتی ہے اپنی تباہی اور بربادی کی قبر خود کھودتی ہے۔ یہ تکمیلی عورتوں کا ہی اعجاز ہے کہ وہ اپنی تکمیلات سے اپنی خاندانی زندگی اور ماحول، میاں بیوی کے تعلقات اور اپنے بچوں کے ذہن و فکر کو تکمیلی زندگی کی طرف اور اپنی قوم و ملک کو ترقی، خوشحالی اور بقاء و سلامتی کی جانب سمت بندی کر دیتی ہیں۔

تکمیلی عورت کا اعجاز

قدرت انسان کے قبضۂ قدرت میں ہوتی ہے۔ فطرت انسانی ہو یا کائناتی ، ویسی ہی ہوتی ہے جیسی انسان اُسے بناتا ہے۔ مگر وہ ابھی وقت تک انسان کے قبضہ میں ہوتی ہے جب انسان علم و فکر، عقل و فراست، تعاون اور اشتراک عمل سے کل انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے بلا تخصیص رنگ و نسل، حسب و نسب، جنس و ذات، مذہب، عقیدہ اور ملک، علاقہ یا زبان، عدل و انصاف، آزادی اور مساوات کے اصولوں پر کاربند ہو۔ پردہ آئیڈیالوجسٹوں کا یہ قطعی غلط اور فرسودہ خیال ہے کہ انسانی زندگی اور معاشرہ کسی ابدی، اٹل اور ناقابل تغیر قوانین اور نوامیس قدرت پر مبنی ہیں۔ کیونکہ ایسے قوانین و نوامیس کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ ان کا تصور ایسے روایتی اور جامد معاشرے کی پیداوار ہے جس کی چھوٹی سی دنیا میں ہر معاشری تعلق اور رسم و رواج ابدی اور اٹل معلوم ہوتے تھے۔ مگر آج کی دنیا میں ہر چیز ہر وقت بدل رہی ہے۔ جسے انسان اپنی محنت، مشقت، کام، عمل، جدوجہد اور کوشش اور تکمیل سے بہتر طور سے سمجھنے اور کنٹرول کر سکتا ہے۔ اس طرح انسان اپنے

علم، آگاہی اور عقل و شعور سے کائناتی فطرت اور انسانی فطرت پر عبور حاصل کر کے انسانی زندگی اور معاشرے میں انتخاب اور اختیار کی نئی نئی راہیں کھول سکتا ہے اور ترقی ممکن بنا سکتا ہے۔

پردہ آئیڈیالوجی کاہلی، لاپروائی، غفلت، جہالت اور ذہنی و فکری خلو کا فلسفہ ہے۔ یہ آئیڈیالوجی اور اس کی جدید "تاویلات اور توجیہات" مثلاً عورت کا حیاتیاتی المیہ، یا مرد کی فوقیت" سادست ذہن و فکر کی پیداوار ہیں۔ تاکہ عورتوں کی نسوانی تکالیف اور مصائب کو کم کرنے یا رفع کرنے میں علم و فکر عقل و شعور اور انسانی کوششوں اور قوتوں کو بروئے کار لانے کی بجائے "قدرت" یا "فطرت" یا مردانہ نعل کی فضیلت وغیرہ کی آڑ لیکر نا قابل تغیر اور نا قابل اصلاح قرار دے دیا جائے۔ ایسے طرز فکر کا لازمی نتیجہ ہے کہ پردہ اور تعدد ازدواجگی کے حامی اور مدعی دکھ اور تکلیف کو عورتوں کے جنس کی تقدیر میں لکھا ہوا خیال کرتے ہیں اور اسے "قدرت کا قانون" کہتے ہیں، مگر انسان کی ہر نئی دریافت ہر نئی ایجاد، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہر نئی تکنیک اور ہر نیا طریقہ، انسانی علم و فکر کی ہر نئی تھیوری ہر نیا خیال اور فلسفہ انسانی زندگی، معاشرے اور تاریخ کا ہر ایک نیا طرز عمل و فکر ہر نیا تصور اور نظریہ "قدرت" کے تصور اور معنول کو بدل دیتا ہے۔

انسانی علم و فکر، سائنس، آرٹ اور ٹیکنالوجی میں ہر ایک نئی پیش قدمی انسانی زندگی اور معاشرے اور تاریخ کو ایک قدم آگے بڑھا دیتی ہے، خواہ وہ قدم چھوٹا ہو یا عظیم۔ مگر اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ ترقی کا ہر ایک قدم بذات خود ایک سوالیہ نکتہ ہے، یہ قدم پیچھے بھی پڑ سکتا ہے اور انسانی علم و عقل، فکر و استدلال ہیں، "قدرت" کے رموز کے ادراک ہیں، یہ قدم پسپائی بھی ثابت ہو سکتا ہے جو انسانی زندگی اور معاشرے کو پیچھے کی طرف دھکیل دے۔ کیونکہ یہ قدم اس تاویل اور تشریح پر مبنی ہے کہ آیا وہ انسانی زندگی کے فروغ اور بھلائی اور خوشحالی کے لئے اور انسانی معاشرے میں عدل و انصاف، آزادی اور مساوات کیلئے کی جاتی ہے۔ جو قدم ان تکمیلی مقاصد اور نصب العین کے لئے نہیں اٹھے گا۔ وہ

ایسا ماحول اور معاشرہ قائم کر دے گا جس میں رجعت پسند طاقتوں، گروہوں اور طبقوں کو غلبہ اور تسلط حاصل ہو جائے گا۔ تب تکمیلات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور غیر تکمیلی، خلاف تکمیلی اور عدم تکمیلی رجحانات زور پکڑ جاتے ہیں۔ تب "قدرت اور زندگی اور معاشرے پر ناامیدی"، یاسیت، قنوطیت اور پژمردگی چھا جاتی ہے اور توہم پرستی، غیر معقولیت، ضعیف الاعتقادی، سادیت، تقدیر پرستی، جیسے واہمات اور امتناعات کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی اور معاشرہ ہر وقت اور ہر لمحہ اختیار اور ارادے رضا اور رغبتِ تکمیل کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔ اگر کوئی پیش قدمی نہیں ہو گی تو پسپائی، انحطاط، انتشار، ہزیمت اور شکست کے راستے کھلنا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو صدیوں سے ماضی کے ساتھ وابستہ اور پابستہ رکھا گیا ہے۔ مسلمان اہل فکر و نظر کی نگاہیں حال اور مستقبل کے تقاضوں کا سامنا کرنے کی بجائے ماضی کے دھندلکوں میں کھو کر رہ گئی ہیں۔ اس طرح پوری قوم پر ذہن و فکر اور غلو کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر مسلمان عورت کی تکمیلی زندگی کی کشمکش پر وہ آئیڈیالوجی کے اندھیروں کو ختم کر دے گی۔

عورت ہی عظمت انسانی کی نگہبان ہے۔ عورت میں بھی کام، عمل اور تکمیل کی وہی اور ویسی ہی صلاحیتیں ہیں جیسی مرد میں۔ اس میں بھی تفویضِ کار اور مادرانہ اور کمال کی وہی اور ویسی ہی توتیں جیسی مرد میں۔ صرف فرق ہے تو یہ کہ اپنی زندگی کے خاص ادوار او عمر میں اس کی حیاتیاتی تفویضات کو کام اور تکمیل کے تقاضوں پر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے تاکہ زندگی کا سلسلہ جاری رہے۔ لیکن ان دوہرے تقاضوں کو بطریق احسن سرانجام دینے کے لئے کسی تفریق و تقسیم کی نہیں بلکہ تعاون اور تنظیم نو کی ضرورت ہے تاکہ ساری انسانی زندگی اور معاشرے کو تکمیلی اور مائکروسوشل بنایا جائے۔ جب ایسا انقلاب حقیقت بن جاتا ہے تو عورت کے کام، عمل اور تکمیل کی صلاحیتیں اور قوتیں مرد کے برابر ہو جاتی ہیں۔ جب تک عورت انحصار پسند اور لاچار و مجبور ہستی رہتی ہے وہ انسانی دنیا کو بہتر زیادہ منصفانہ اور زیادہ تکمیلی بنانے میں کوئی حصہ اور رول ادا نہیں کر سکتی۔ مگر جب وہ خود مختار، آزاد اور باعمل اور باتکمیل بن

جاتی ہے تو اس کی فطری، محکومی، محتاجی لاچارگی اور طفولیت بھی ختم ہوجاتی ہے اور وہ مرد کے مساویانہ رفیق کار بن کر زندگی کی مہم میں برابر کی ساتھی بن جاتی ہے۔ انسانیت کا مستقبل عورت کی محکومی اور مظلومی اور مجبوری کا مقتضی نہیں بلکہ اس کے مساویانہ اشتراک عمل کا مقتضی ہے۔ تب عورت کی فطری برتری کے اوصاف، یعنی اس کی فطری ہمدردی، غمخواری، انسان دوستی، ملنساری، بردباری، احساس دیگراں، ایثار کا جذبہ اور قوت برداشت کی صلاحتیں اور خوبیاں انسان کی فطرت اور زندگانی میں انقلاب انگیز تغیرات اور ترقیات پیدا کر دیگی۔ تب ابدی عورت بنی نوع انسان کو بلند سے بلند تر عظمتوں پر لے جائے گی۔ یہ انسانی جنسوں کی جدلیات کا کمال اور تکمیل عورت کا اعجاز ہے۔

یہ آزادی عورت کی تکمیلیت اور مادرائیت کی خوبیاں ہیں مسلمان عورت میں بھی ایسی خوبیاں موجود ہیں۔ وہ بھی تکمیل اور ترقی کے معاشری اور تاریخی عمل میں ایک قوت ثابت ہوسکتی ہے، نہ کہ مسلمانوں کی زندگی، معاشرے اور تاریخ پر بوجھ اور سدراہ، جیساکہ وہ ماضی اور حال میں رہی ہے۔ لیکن اگر وہ پردہ سسٹم اور تعدد ازدواجگی کی زنجیروں سے رہائی حاصل کرلے، تو وہ بھی مسلمانوں کی زندگی، معاشرے اور تاریخ کو صدیوں پرانے انحطاط اور تنزل، زوال و سقوط کے چکر سے اور انکے نئے اور پرانے سامراجی اور مہا سامراجی دشمنوں کے نوآبادیاتی تسلط اور استحصال، توسیع پسندی، جارحیت اور نسل کشی کے عزائم اور سازشوں سے نجات اور رہائی دلا دے گی۔ اس طرح مسلمان عورت کی آزادی، تکمیل اور عظمت مسلمان اقوام اور ممالک کی آزادی، ترقی، خوشحالی اور عظمت کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔